UNIVERSAL
LIBRARY

بسم اللہ

فہرست مضامین الناظر بابت ماہ اگست ۱۹۲۶ء

جلد ۳۱ —— نمبر ۲

مطبوعاتِ جدیدہ

شعر الہند جلد دوم

(از مولانا عبد السلام ندوی)

جس میں اردو شاعری کے تمام اصناف یعنی غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ پر تاریخی اور ادبی حیثیت سے تنقید کی گئی ہے - اب یہ کتاب مکمل ہو گئی ہے - جن شائقین نے پہلے نہ طلب کی ہو وہ بھی اب منگا لیں - قیمت جلد اول للعہ جلد دوم للعہ

آئینۂ حقیقت نما

(از مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی)

اس لاجواب کتاب میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے گیارہ سو سال کے تعلقات باہمی پر تاریخی واقعات کے ذریعہ روشنی ڈالی گئی ہے اور اس بات کو بدلائل و شہادت نمایاں کیا گیا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت میں ہندوؤں کے ساتھ ظلم و ناانصافی کے بجائے بہت زیادہ محبت و مروت ملحوظ رکھی - اور اسوقت جو ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے بدگمانیاں نظر آتی ہیں یہ محض غلط تاریخوں کے رواج سے پیدا ہوئی ہیں - تاریخی غلط بیانیوں اور غلط فہمیوں کے لیے انشاء اللہ یہ کتاب بمنزلۂ تریاق ثابت ہوگی - قیمت جلد اول عہ

حقیقتِ اسلام

نواب سر امین جنگ بہادر ایم اے صدر المہام پیشی حضور نظام نے کچھ خیالات اپنے صاحبزادوں کی رہنمائی کیلیے اُسوقت قلمبند کیے تھے جبکہ وہ انگلستان میں زیر تعلیم تھے اور انگریزی میں عرصہ ہوا چھپ گئے تھے اب اُن کا اردو ترجمہ شایع کیا گیا ہے - انھوں نے موجودہ خیالات سائنس سے اسلام کی تطبیق اور اُس کی صداقت ظاہر کی ہے - قیمت عہ

فطرتِ اطفال

ایک انگریز فلسفی اور ماہر نفسیات کی کتاب "دی سائنٹفک ٹریننگ آف چلڈرن" کا اردو ترجمہ جس سے بچوں کی تعلیم و تربیت کے مسئلہ میں بہت مدد ملیگی - از مولوی حامد حسن قادری اڈیٹر اخبار سعید کانپور - قیمت ۸ر

منیجر الناظر بک ایجنسی - لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۲ جلد ۳۱ — اگست سنہ ۱۹۲۶ء

نظرے خوش گذرے

سر الیگزنڈر مڈیمن ہوم ممبر گورنمنٹ ہند نے لیجسلیٹو اسمبلی میں فرقہ وار فسادات کے متعلق جو بیان پیش کیا اُس سے ظاہر ہوا کہ گذشتہ تین سال کے اندر ان جھگڑوں کے بدولت دو سو ساٹھ جانیں تلف ہوئیں اور تین ہزار سے زائد اشخاص زخمی ہوئے۔ مالی نقصانات اور زیر باریوں کا اس بیان میں کوئی ذکر نہیں، ورنہ غالباً اُنکی تعداد کروروں روپیہ تک پہونچتی۔

اس اتلافِ جان اور بربادیِ سرمایہ سے ہندوؤں یا مسلمانوں کو کچھ فائدہ بھی ہوا؟ نطاق شدھی اور سنگھٹن یا تبلیغ و تنظیم کے کارکنوں میں سے ایک بھی ایسا نہیں جو نفع کی کوئی صورت بتا سکے ہاں مُلکی آزادی کی جد و جہد میں خلل پڑ گیا، سرفروشان و جاں نثاران ملک و قوم کی قدر و منزلت میں فرق آگیا، وفادارانِ حکومت اور موالاتی رہنماؤں کی گرم بازاری ہوگئی اور دفتری اقتدار کی گرفت پھر مضبوط ہوگئی۔ اور غالباً یہی اس باہمی نزاع کا مقصود تھا۔

ارکین حکومت، اُنکے وفادار اور قومی سرداروں نے کامل تین سال تک اس خونیں تماشہ کو جاری رہنے دیا اور اب اپنی اپنی جگہ پر سب کوشاں ہیں کہ کسی طرح یہ لڑائی رُک جائے۔ ان کوششوں اور کوششوں سے زیادہ اُنکے متعلق تقریروں اور اعلانوں کو سُن سُن کر اتلاف شدہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی روحیں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ — ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

پنڈت موتی لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تجویز ہے کہ ہندو مسلمانوں کی نزاع باہمی کو دفع کرنے کی جد و جہد کے لیے ایک جدید مجلس انڈین نیشنل یونین کے نام سے قائم کی جائے۔ ملک نے عموماً اس تجویز کو خوش آمدید کہا ہے۔ لیکن ہندو مسلمانوں کے اُن سرداروں نے اس سے اختلاف کرنے اور جدا رہنے میں معلوم ہوتا ہے کہ باہم اتحاد کر لیا ہے، جنھیں اپنے فرقہ پسندانہ خیالات کی بنا پر آج ہر دلعزیزی عوام کا فخر حاصل ہے۔ یہ بات کچھ زیادہ غیر متوقع نہیں ہو سکتی، البتہ دیکھنا یہ ہے کہ اتحاد کی جد و جہد کرنے والے سرداروں پر تو اس کا کوئی یاس انگیز اثر نہیں پڑتا۔

افسوس ہے کہ یہ تحریک بہت دیر میں شروع کی گئی، اور اب بھی جس مستعدی کی ضرورت ہے اُسکے آثار نہیں نظر آتے۔ سوراجی احباب اسے پسند نہ کریں گے، لیکن اگر وہ اتنا ایثار گوارا کر سکیں کہ کونسل میں آیندہ داخلہ کی جد و جہد سے دست بردار ہو جائیں، تو اتحاد باہمی کی کوششوں میں کامیابی زیادہ یقینی ہو جائے گی۔

ہندو مسلمانوں کی لڑائی تو شاید اب ختم ہو جائے، مگر اندیشہ ہے کہ کہیں مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی اس سے زیادہ خطرناک نتائج پیدا نہ کر دے۔ گذشتہ سال محض ایک فرضی اور بے بنیاد خبر نے تو یہ حالت کر دی تھی کہ دہلی اور لاہور میں باہم جھگڑا ہو گیا، اور لکھنؤ میں بھی اگر انتہائی احتیاط نہ کی جاتی تو پاسیوں کی لاٹھیوں سے خدا معلوم کتنے مسلمان زخمی اور شہید ہوتے۔ اور اب جبکہ واقعی جنۃ البقیع کے قبے ڈھا دیے گئے ہیں اور بڑے بڑے بزرگان قوم تک نجدیوں کے خلاف اظہار ملال کے لیے تیار رہیں، جتنا بھی جوش و خروش ظاہر کیا جائے کم ہوگا۔

جناب راجہ صاحب محمود آباد جو دسمبر ۱۹۱۸ء میں بمقام دہلی مسلم لیگ کے اُس اجتماع سے منہ چھپا کر چلے آئے تھے جس میں سب سے پہلے نہایت صفائی کے ساتھ حکومت پر ظاہر کیا گیا تھا کہ ترکی سلطنت، خلیفۃ المسلمین اور مقامات مقدسہ کے بارے میں مسلمانان ہند کے اصلی خیالات کیا ہیں اور گذشتہ سات سال کے اندر قوم سے زائد حکومت کے دامن دولت سے وابستہ رہے، اب اپنے انگریز آقاؤں کی ملازمت ہی سے فارغ ہو کر مسلمانوں کی قومی کشتی کے پھر ناخدا بننے کے متمنی ہیں۔ اور اس نزاع باہمی میں اس فرقہ کے سالار قافلہ قرار پائے ہیں جو اینٹ اور گارے کی چند عمارتوں کی خاطر

یا زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس ملک کے اندر اپنے روبہ تنزل اقتدار کو قائم و برقرار رکھنے کے لیے یا تقدیس تلوار لیے بغیر ایک مسلمان تاجدار پر یورش کرنا چاہتا ہے۔ مہاراجہ صاحب سے اسکے سوا اور توقع ہی کیا ہو سکتی ہے، ایک دفعہ نہیں کئی بار آزمایش ہو چکی ہے اور ہر دفعہ آگ نے پیتل کو سونے سے الگ کرکے دکھا دیا۔ البتہ حیرت ہوتی ہے اُن لوگوں کی عقل و دانش پر جو آزمودہ را آزمودن جہل است کو نظر انداز کرتے ہیں، اور عبرت ہوتی ہے اُن لوگوں کی غیرت و حمیت پر جو بار بار ٹھوکریں کھانے کے باوجود اتبک ایک ایسے رئیس کو اپنا قبلۂ حاجات بنائے ہوئے ہیں جو خود مجبور اور پابند غیر ہے۔

مہاراجہ صاحب یا خدام الحرمین مجاہدین کو اسکی پرواہ کیوں ہونے لگی کہ اس کشمکش کا حجاز کی نجدی حکومت پر چاہے پرکاہ کے برابر اثر نہ ہو، لیکن خود ہندوستان کے اندر مسلمانوں کا خون مسلمانوں کے ہاتھوں بہنے لگے گا۔ اس لیے اُن سے کچھ عرض کرنا فضول ہے۔ مسلمانوں کی ساری توقعات اُن سرفروش رہنمایانِ ملت سے وابستہ ہیں جنھوں نے ان راجاؤں اور انکے پرجاؤں کے علی الرغم شیر برطانیہ کے آہنی پنجوں سے ترکی حکومت کو چھڑانے کی عظیم الشان جد و جہد کی رہنمائی کرکے تمام دنیائے اسلام کو اپنا رہین منت بنا لیا ہے، امید ہے کہ وہ اس فتنہ کو اٹھنے نہ دیں گے، اور خواہ انھیں سلطان نجد کی ملوکیت سے کتنا شدید اختلافات ہی کیوں نہ ہو، لیکن اسکو کبھی روا نہ رکھیں گے کہ اصلاح کے طریقہ کو چھوڑ کر باہمی جنگ و جدل کا راستہ اختیار کیا جائے۔

حجاز کی موتمر اسلامی ختم ہو گئی۔ اُسکی مفصل روداد تو بعد میں شایع ہو گی، سر دست اخباری اطلاعات سے جو کچھ معلوم ہوا ہے اُسکی بنا پر یہ پیشین گوئی کرنا کچھ دشوار نہیں ہے کہ جو درخت اسوقت لگایا گیا ہے وہ انشاء اللہ ایک دن بار آور ہوگا اور اپنے ثمراتِ نیک سے تمام مسلمانوں کو متمتع کرے گا۔

مخالفین، خواہ وہ یورپ کے عیسائی ہوں یا ہندوستان کے مسلمان، موتمر کی کارروائیوں کو ناقابلِ اعتماد قرار دینگے اور طرح طرح سے اُس کا مضحکہ اُڑائیں گے، لیکن خدا کی مرضی ہے تو یہ موتمر اب سے چندسال بعد، خود اپنے نتائجِ کار سے ثابت کر دیگی کہ بلاد اسلامی کے محترم مدبرین کا یکجا ہوتے رہنا عظیم ترین فوائد کا موجب ہوا۔ ہندوستان کے جملہ محترم نایندے، علی الخصوص علی برادران سزاوار صد تبریک و تحسین ہیں کہ اُنھوں نے مسلمانوں کی اس پہلی بین الملی مجلس کو ہر طرح مفید و بامراد بنانے میں اپنے دل و دماغ کی اعلیٰ ترین قوتوں کو نہایت خوبی و خوش اسلوبی سے صرف کیا۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

ہندوستانی اکیڈمی کے بارہ میں یہ بھی اطلاع ملی ہے کہ اسکی ادبی کمیٹی دو حصوں میں منقسم ہوگی جن میں سے ایک اُردو سے متعلق ہوگی اور دوسری ہندی سے۔ ہندو مسلمانوں کے موجودہ نا خوشگوار تعلقات اور ہندی اُردو کے قدیم قضیہ کے لحاظ سے یہ تقسیم بہا ضروری تھی۔ اور اگر اسکے ساتھ ہی یہ امر بھی ابتدا ہی میں طے پا جاتا کہ سوائے اُن رقوم کے جو مخصوص معطیوں سے کسی مخصوص غرض کے لیے وصول ہوں یا اکیڈمی کی مشترکہ تنظیم کے لیے درکار ہوں اکیڈمی کا عام فنڈ دونوں شعبوں پر کس نسبت سے صرف کیا جائیگا تو غالباً تصادم و اختلاف کا ایک بہت بڑا سبب دفع ہو سکتا ہے۔

اکیڈمی کی صدارت کے لیے سر تیج بہادر سپرو کا نام جو تجویز ہوا ہے، یہ ہر نہج سے موزوں کہا جا سکتا ہے۔ ملک میں ایسے ممتاز ہندو مسلمان کم رہ گئے ہیں جن کی ناطرفداری پر دونوں فریق اعتماد کر سکتے ہوں اور اس صوبہ میں جو چند بزرگ ایسے ہیں اُن میں سپرو صاحب بلحاظ علمی قابلیت و ادبی ذوق کے ممتاز ہیں۔

وہ نالۂ بلبل کو سمجھے مرا افسانہ
گلگشت میں چال اُنکی کچھ اور ہے مستانہ

ہے دوست کی یاری میں غیروں سے بھی یارانہ
کیا ناز اُٹھایا ہے اے ہمت مردانہ

کیا شیشے ہیں کیا مینا کیا جام ہیں کیا ساغر
میخانہ سجا ساقی یا ہے یہ پریخانہ

مجھ سے نہ سنا اک دن رو رو کے مگر لعد اب
غیروں سے وہ کہتے ہیں آپ ہی مرا افسانہ

کچھ سوز محبت ہے کچھ حسن کا ساز اس میں
دل شمع سا روشن ہے ارمان ہے پروانہ

باتوں ہی میں ساقی کی سرشار ہے کل محفل
ہر بات ہے اک مینا ہر لفظ ہے پیمانہ

دُھن ہے کسی صورت سے مل جائے وہ ہرجائی
ہے اسکی تمنا میں ہر ایک سے یارانہ

رہ رہ کے مرا اُٹھنا جھک جھک کے ملیں آنکھیں
شرمیلی نگاہوں میں تھی لغزش مستانہ

اللہ کی یاد آتی رہتی تو کہاں رہتی
دل جو تھا خدا کا گھر اک بت کا ہے کاشانہ

میں کس لیے دل تشنہ میخانے میں آیا ہوں
اے ساقی دریا دل بھر دے مرا پیمانہ

اچھا نہ سنو صاحب میں بھی نہ کہونگا کچھ
اب میری خموشی سے سننا مرا افسانہ

ہے حسن پرستی ہی کام اپنا سدا یا رب
دل تو نے دیا مجکو یا عشق کا پروانہ

کس جی سے دعا مانگوں ارمان نکل جائیں"
دل کا سا بھرا گھر تو ہو جائیگا ویرانہ

غیروں کو جو رحم آیا کچھ ذکر کیا میرا
کس ناز سے وہ بولے کون آہ! وہ دیوانہ

آہ

منطق شہادت[1]

ذیل کا مضمون ناتکمل حالت میں رسالہ "شمع" آگرہ میں چھپ چکا ہے، لیکن اب پروفیسر صاحب نے تکمیل و نظرثانی کرکے الناظر میں اشاعت کی غرض سے عنایت فرمایا ہے۔ جو شکریہ کے ساتھ درج کیا جاتا ہے۔ سب ایڈیٹر

سرولیم ہیملٹن نے معلوماتِ انسانی کو، وسائل علم کی بناپر، دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلی صورت تو وہ ہوتی ہے، جہاں ہم اپنی معلومات کے لیے اپنے حواس، یہ ظاہری ہوں یا باطنی، کے دست نگر ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہماری یہ تمام معلومات احضارات حواس کا نتیجہ، اور اُن سے ماخوذ ہوتی ہیں اور ادراکات اس قسم کی معلومات کی بہترین مثالیں ہیں۔ اگر میرے سامنے میز پر کتاب رکھی ہوئی ہو، تو اسکا علم مجھکو صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ میں اپنی آنکھ کھول کر اُسکی طرف دیکھوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میں اس کتاب کی تصویر، آنکھ بند کرکے، اپنے ذہن میں قائم کر لوں۔ لیکن کتاب کا یہ علم بھی اسکے ادراک پر موقوف ہے، کیونکہ تصویر گویا کسی اصل کی نقل ہوتی ہے، جب اصل ہی موجود نہ ہو، تو نقل، ظاہر ہے کہ غیر موجود ہوگی، اور یہ اصل ادراک کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ بھی ہو سکتا ہے، کہ حافظہ کی مدد سے اس کتاب کے مضمون کو یاد کرنے کی کوشش کروں۔ اس صورت میں بھی ہم ادراک کو نظرانداز نہیں کرسکتے، کیونکہ حافظہ گویا ایک خزانہ ہے، جس میں ہمارے گذشتہ تجربات محفوظ رہتے ہیں، اور بوقت ضرورت کام میں لائے جاسکتے ہیں۔ جب گذشتہ تجربات ہی نہ ہونگے، تو خزانہ یقیناً خالی رہیگا۔ یہ گذشتہ تجربات ہمارے ادراکات ہیں۔ ایک اور صورت یہ بھی ہو سکتی ہے، کہ میں کتاب کا تصور قائم کرنے کی کوشش کروں۔ چونکہ اسکے لیے مجھکو بہت سی کتابوں کا آپس میں مقابلہ کرنا پڑتا ہے، لہذا یہاں بھی میں ادراک سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ مختصر یہ کہ کتاب کے علم کی یہ تمام صورتیں، بالواسطہ یا بلاواسطہ فعلیتِ حواس پر موقوف ہیں۔ اسی حقیقت کو اس طرح بھی بیان کیا جاسکتا ہے، کہ یہ علم تجربے کا نتیجہ ہے۔ بغیر تجربے کے یہ تمام علم ناممکن الحصول اور عدم محض ہوتا۔ یہی وجہ ہے، کہ اس قسم کے علم کو تجربی، شہودی، یا "تجربے کا" علم کہا جاتا ہے۔

[1] اس مضمون کا اکثر حصہ سرولیم ہیملٹن کے لکچرز جلد چہارم سے ماخوذ ہے۔

لیکن ہمارا تمام علم تجربے تک محدود نہیں ہوتا - بعض معلومات ایسی بھی ہوتی ہیں، جو واس کی فعلیت کا نتیجہ نہیں ہوتیں، بلکہ برخلاف اسکے وہ ہمارے ساتھ پیدا ہوتی ہیں - یہ صحیح ہے، کہ ان کے وجود کا علم ہمکو تجربے کے وقت ہوتا ہے، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا، کہ وہ تجربے کا نتیجہ ہوتی ہیں - تمام قوانین فطرت علم کی اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں - ایک بچہ، جو اپنے ہاتھ کی حرکات پر پوری طرح متصرف ہو، اپنی ناک پر کی مکھی کو اُڑانے کے لیے اپنا ہاتھ ہلاتا ہے - کیوں؟ صرف اس وجہ سے کہ مکھی کے بیٹھنے سے اُسکو ایک خاص قسم کا احساس حاصل ہوتا ہے - اب اُسکو خیال آتا ہے، کہ اس احساس کی کوئی نہ کوئی علت ہوگی، اور یہ کہ یہ احساس اُسوقت تک رفع نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ علت دُور نہ ہو جائے - اسی غایت کو حاصل کرنے کے لیے وہ ہاتھ ہلاتا ہے - بعینہٖ یہی منشا ہے قانونِ علت ومعلول کا اس قانون کا علم تجربے کے موقع پر ہوا، لیکن یہ تجربے کا نتیجہ نہیں - اس قسم کے علم کو خالص، ذہنی، عقلی، یا حضوری کہتے ہیں، اور یہ علم کی دوسری قسم ہے - علم کی ان دونوں قسموں کی خصوصیاتِ امتیازی یہ ہیں، کہ تجربے سے ہم کو کلیات کا علم نہیں ہو سکتا - یہاں ہمارا معلوم لازمی طور پر کوئی نہ کوئی فرد ہوتا ہے - دوسرے الفاظ میں ہمارا علم واجبات کے درجے تک نہیں پہونچتا - برخلاف اسکے علم حضوری سے ہم کلیات تک پہونچ سکتے ہیں -

گذشتہ تمام بحث میں ہمنے اپنے علم کے وسائل وذرائع کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، اول تجربہ اور دوم عقل - اب تجربہ پھر دو قسموں پر منقسم ہو جاتا ہے - ایک صورت تو یہ ہو، کہ یہ خود میرا اپنا ذاتی تجربہ ہو، مثلاً یہ کہ میں خود اپنی آنکھ سے کتاب کو میز پر رکھا ہوا دیکھوں - دوسری صورت یہ ہے، کہ یہ کسی اور کا تجربہ ہو، یعنی یہ کہ کوئی اور شخص مجھ سے آکر بیان کرے، کہ اُسنے وہ کتاب میز پر دیکھی تھی - ان میں سے صورت اول کو "ذاتی تجربہ" اور حالتِ دوم کو "غیر کا تجربہ" کہا جا سکتا ہے - یہ صحیح ہے، کہ تجربے کی ان دونوں قسموں سے ہم کو کتاب کا علم ہو سکتا ہے، لیکن یہ ظاہر ہے، کہ جس قدر اعتماد اور وثوق مجھ کو اپنے ذاتی تجربے پر ہوتا ہے، وہ غیر کے تجربے پر نہیں ہوتا - اگر ہم خود اپنی آنکھوں سے کتاب کو میز پر رکھا ہوا دیکھتے ہیں، تو ہم اس علم میں شبہہ نہیں کرتے، حالانکہ بعض اوقات ہماری نگاہ ہم کو دھوکا بھی دیا کرتی ہے، لیکن اگر کوئی اور شخص آکر بیان کرے، کہ اُس نے وہ کتاب دیکھی تھی تو ہمکو شبہہ ہوتا ہے کہ کہیں وہ جھوٹ نہ بول رہا ہو - دوسرے الفاظ میں ہمارا ذاتی تجربہ، غیر کے تجربے کے مقابلے میں، زیادہ واضح، زیادہ صاف اور زیادہ مکمل ہوتا ہے - اسی طرح اس میں صداقت، یقین اور صحت کا بہت غلبہ ہوتا ہے - لیکن غیر کا تجربہ ذاتی تجربہ پر اس لحاظ سے فوقیت رکھتا ہے،

کہ اس میں جامعیت زیادہ ہوتی ہے، اور یہ کہ اسکے بغیر انسان اکثر ایسی معلومات سے بے بہرہ رہجا تا ہے، جو اُسکے لیے بہت اہم اور ضروری ہیں۔ اسکا مطلب یہ ہے، کہ کسی چیز کے متعلق تجربی واقفیت حاصل کرنے میں ذاتی تجربہ اور غیر کا تجربہ، دونوں اپنی اپنی جگہ اہم اور فائق ہیں۔ ہم ان میں سے کسی ایک کو ترک کرکے دوسرے کو اختیار نہیں کرسکتے، اور اگر کرتے ہیں، تو صحت، صداقت اور جامعیت وافادیت کو قربان کرکے۔

ہمارا ذاتی تجربہ لازمًا منحصر ہوا کرتا ہے، ہمارے ذاتی آلاتِ حس کے تہیج پر۔ اگر ان آلات میں کسی قسم کا تہیج نہ ہو، تو ہم کو کسی قسم کا ذاتی تجربہ نہیں ہوسکتا۔ دوسرے الفاظ میں اگر بچہ پیدائش ہی کے وقت سے بالکلیہ فاقد الحس ہے، تو ظاہر ہے کہ اسکی حالت کیا ہوگی۔ اُسکو کسی طرح کا کوئی تجربہ نہ ہوگا، اور اسکا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ اسکی عمر اس دنیا میں بہت تھوڑی ہوگی۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ یہی آلاتِ حس ہیں جن کے ذریعے سے ہم مفید و مضر میں تمیز کرتے ہیں۔ ہمارے یہ آلاتِ حس بالعموم دو قسموں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ ایک قسم وہ ہے، جن کے تہیج کے لیے ضروری ہوتا ہے، کہ مہیج انکے مقارن ہو۔ یعنی یہ کہ جب تک مہیج انکے ساتھ مس نہیں کرتا، اُسوقت تک ان میں کسی قسم کا تہیج پیدا نہیں ہوتا، اور اس لیے انکے ذریعہ کسی قسم کا علم حاصل نہیں ہوتا۔ زبان اور جلد اس قسم کے آلاتِ حس کی مثالیں ہیں۔ کسی چیز کا ذائقہ ہم کو اُسوقت تک معلوم نہیں ہوسکتا، جب تک ہم اُسکو زبان پر نہ رکھیں۔ اسی طرح کسی چیز کی سختی و نرمی، ہمواری و ناہمواری، گرمی یا سردی کا علم اُسوقت تک ناممکن ہے جبتک کہ وہ ہماری جلد کے ساتھ مس نہ کرے۔ اس قسم کے آلاتِ حس کو مقارنہ کہا جاتا ہے۔ انکے مقابلہ میں بعض آلاتِ حس ہوتے ہیں، کہ اُنکے تہیج کے لیے ضروری نہیں ہوتا، کہ مہیج انکو مس کرے۔ وہ دُور ہی سے اسکے اثر کو قبول کرلیتے ہیں، اور اس اثر پذیری کی وجہ سے ان میں تہیج شروع ہوجاتا ہے۔ آنکھ، ناک، اور کان آلاتِ حس کی اس قسم میں داخل ہیں۔ کسی چیز کو دیکھنے کے لیے یہ لازمی نہیں ہوتا کہ وہ چیز ہماری آنکھوں کے ساتھ مس کرے۔ ایسی حالت میں ہم اُس چیز کو مطلقًا نہیں دیکھتے۔ اسی طرح ہم ایک میل کے فاصلہ پر بیٹھ کر آواز سُن سکتے ہیں، اور بو سونگھ سکتے ہیں، اس دوسری قسم کو آلاتِ بعیدہ کہتے ہیں۔

ہم نے ابھی کہا ہے کہ ذاتی تجربہ کے لیے آلاتِ حس کا تہیج لازمی ہے، اور یہ کہ یہ آلات دو قسم کے ہوتے ہیں، مقارنہ اور بعیدہ۔ اب ذرا غور و فکر سے معلوم ہوسکتا ہے، کہ مقارنہ آلاتِ حس کا دائرۂ عمل اس قدر محدود

ہے، کہ وہ بلحاظ ذرائع علم کے تقریباً بیکار رہیں۔ اس سے انکار نہیں کہ انکے ذریعہ سے علم حاصل ہوتا اور ہو سکتا ہے، لیکن اس علم کی کمیت و مقدار یقیناً بہت تھوڑی ہوگی۔ اگر ہر چیز کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہو، کہ اس کو آلاتِ حس سے معلوم کیا جائے، تو عمر بھر میں معدودے چند معلومات ہی حاصل ہوں۔ انکے مقابلہ میں آلاتِ بعیدہ کا دائرۂ عمل واقعی وسیع ہے، لیکن یہ بھی اتنا وسیع نہیں کہ انکے ذریعہ سے ہر قسم کی اور تمام معلومات حاصل ہو جائیں۔ آنکھ، ناک اور کان دور کی اشیاء سے متہیج ہو سکتے ہیں، لیکن اگر مہیج بہت زیادہ فاصلہ پر ہو تو یہ ذرائع بھی بیکار ثابت ہوتے ہیں۔ ہم یہاں بیٹھ کر سلطنت کی جوبلی کی رونق کو نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ وہاں کی تقریروں کو سن سکتے ہیں۔ گویا اسکے متعلق ہم کو کسی قسم کا ذاتی تجربہ نہیں ہو سکتا۔

پھر اسکے ساتھ اسکو بھی شامل کیجیے، کہ ہمارے آلاتِ حس کی فعلیت صرف زمانۂ حال تک محدود ہوتی ہے۔ ماضی و مستقبل انکے دسترس سے باہر ہوتے ہیں۔ یعنی یہ کہ گذشتہ و آئندہ واقعات کا بھی ہم کو ذاتی تجربہ نہیں ہو سکتا۔ اس میں کلام نہیں کہ ماضی کے واقعات بعض اس قسم کے ہوتے ہیں جن کا اگر ہم چاہیں تو اعادہ کر سکتے ہیں اور اس طرح انکو ذاتی تجربہ میں لا سکتے ہیں۔ لیکن ان واقعات کا اکثر و بیشتر حصہ ایسا ہوتا ہے جس کا کسی ممکن طریقہ سے اعادہ و تجربہ نہیں ہو سکتا۔ ہم اپنے ذاتی تجربہ سے اس بات کی تصدیق کر سکتے ہیں، کہ پانی دو مختلف گیسوں کے اجتماع سے بنتا ہے، لیکن ہیلی کے ومدار ستارے کو بچشم خود دیکھنا کس طرح ممکن ہے؟ تمام گذشتہ واقعات کا اعادہ ممکن بھی ہو تب بھی انکی تصدیق کے لیے انکو دوہرانے کا مطلب یہ ہے کہ علم کی ترقی یکلخت رک جائے۔

آلاتِ حس یا دوسرے الفاظ میں ذاتی تجربہ کے ذرائع کے ان نقائص کو بالکلیہ رفع کرنا ممکن نہیں اسمیں شک نہیں کہ جدید اختراعات کے طفیل میں ہم ہزاروں میل پر بیٹھکر کسی مغنی کا گانا سن سکتے اور اسکی شکل وغیرہ دیکھ سکتے ہیں لیکن اول تو اسکے لیے اس قدر بیش قیمت آلات کی ضرورت ہوتی ہے، جو ہر شخص مہیا نہیں کر سکتا، اور پھر یہ کہ ان تمام اختراعات و ایجادات کے باوصف اکثر باتیں ایسی رہ ہی جاتی ہیں جن کا ہمکو ذاتی تجربہ نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم یہ فرض بھی کر لیں کہ ان نقائص کا بالکلیہ رفع کیا جانا ممکن ہے، تب بھی دنیا میں قابلِ تحقیق باتیں اس قدر ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے ذاتی تجربہ کے لیے عمر نوح بھی کفایت نہ کریگی۔ معمولی بات ہے کہ اگر کوئی شخص تمام دنیا کے متعلق بذاتِ خود واقفیت حاصل کرنی چاہے، تو اسکو کس قدر وقت درکار ہوگا۔ محض سیر و سیاحت کے علاوہ بہت سی چیزیں دنیا میں ایسی ہونگی جنکی طرف علیحدہ علیحدہ توجہ درکار ہوگی۔ اسی طرح اگر ہر چیز کا بذاتِ خود معائنہ کیا جائے، اور اس کی تحقیق

کی جائے، تو اندازہ کیا جا سکتا ہے، کہ کس قدر وقت صرف ہوگا - لیکن اس سے ہر شخص واقف ہے، کہ ہماری حیاتِ مستعار اس قدر قلیل المدت ہے، کہ یہ تمام باتیں حاصل ہونا ناممکن محض ہے - اسکی مصروفیتیں اس قدر بکثرت ہیں، کہ اس قسم کی تمنا کرنا ہی حماقت کی نشانی ہے -

ان تمام باتوں کے علاوہ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے، کہ معلوماتِ انسانی مختلف شعبوں، جنکو عرف عام میں علوم کہتے ہیں، کی حدود اس قدر وسیع ہیں، کہ کوئی شخص تن تنہا ان کو قطع نہیں کرسکتا - اُسکو یار و مددگار کی ضرورت ہوتی ہے - ہر علم کی تمام باتوں کو وہ کسی طریقہ سے بھی اپنے ذاتی تجربہ میں نہیں لاسکتا - اسکو اکثر مقدمات فرض کرنا پڑتے ہیں - انکی صداقت کا وہ اور علوم کو ضامن ٹھہراتا ہے - بعض نتائج وہ اس قسم کے چھوڑ جاتا ہے کہ اُنکی تصدیق یا تردید متاخرین کو کرنا پڑتی ہے -

اس تمام تقریر کا ماحصل یہ ہے، کہ افزائش و ترقی علم اُسوقت تک خواب و خیال ہے، جب تک کہ ہم اپنے ذاتی تجربہ کے ساتھ غیر کے تجربے کو بھی شامل نہ کریں - جو چیزیں کہ ہمارے آلاتِ حس کے دائرۂ عمل سے خارج ہیں اُنکے متعلق اَوروں سے استفسار کریں، اُنکے بیانات پر اعتبار کریں اپنی حیات مستعار کی قلت مدت کو ملحوظ رکھکر اوروں کو اپنا شریک کار بنائیں اور انکی معلومات سے استفادہ کریں - جن گذشتہ چیزوں اور باتوں کا ہم کو ذاتی تجربہ نہیں ہوسکتا، یا جن کا اعادہ ناممکن ہے، انکے متعلق متقدمین کی تحریروں کو دلیل راہ بنائیں - مختصر یہ کہ ذاتی تجربہ کے نقائص کو غیر کے تجربہ سے رفع کریں، اور غیر ہی کے تجربہ سے اپنے تجربہ کی قلت کی تلافی کریں - یہی مطلب تھا ہمارے اس فقرہ کا کہ غیر کے تجربہ کے مقابلہ میں ذاتی تجربہ میں جامعیت کم ہوتی ہے اور یہ جامعیت اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ ہم اپنے ذاتی تجربہ سے اوروں کو مطلع کریں، اور اسی طرح اور لوگ اپنے اپنے ذاتی تجربہ سے ہمکو آگاہ کریں - اسکا مطلب یہ ہے کہ اگر ہمارے پاس اطلاع دہی کے ذرائع نہیں، اگر ہم اوروں کو اپنے تجربہ سے مطلع کرنے کے قابل نہ ہوں، اگر ہم سب ملکر معلومات فراہم نہ کریں تو ہمارا علم ترقی نہیں کرسکتا، نہ اُس میں کسی زیادتی کی اُمید کی جاسکتی ہے - لیکن خوش قسمتی سے ہم میں یہ قابلیت اطلاع دہی بحدِ وافر موجود ہے - یہی وجہ ہے کہ ہم اوروں کے تجربہ سے استفادہ کرسکتے ہیں، اور ہمارے تجربہ سے یہ استفادہ اُن بیانات کے ذریعہ سے ہوتا ہے، جو ہم اپنے ذاتی تجربہ کے متعلق دیتے ہیں - ان ہی بیانات کو وسیع معنوں میں شہادت کہا جاتا ہے - ایک شخص آگر علیگڈھ جوبلی کے حالات بیان کرتا ہے، یعنی اُن تمام باتوں کا ذکر کرتا ہے جو اُسنے وہاں دیکھیں یا سنیں، دوسرے الفاظ میں وہ اپنے ذاتی تجربہ کے متعلق بیانات دیتا ہے، اور اُنکے ذریعہ سے ہمکو وہاں کے حالات سے مطلع کرتا ہے -

وسیع معنوں میں اسے شہادت کہا جائیگا، اور بیان دینے والے کو شاہد۔

لیکن محدود معنوں میں شہادت ایسے بیان کو کہتے ہیں، جس سے ہم کچھ منتج کرسکیں۔ اس استنتاج کے لیے ہم کو اُس بیان کو صحیح تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ ہمارا یہ استنتاج بہت سی شکلیں اختیار کرسکتا ہے، یعنی یہ سادہ بھی ہوسکتا ہے اور ملتف بھی، یقینی بھی اور فرضی بھی۔ یہ کسی قسم کا ہو بیان اسکو مبنیٰ کیا جاتا ہے، وہ سننے والے کے نزدیک شہادت ہی ہوگا۔ میرا ایک دوست میرے پاس آکر کہتا ہے کہ اُسنے زید کو بازار میں دیکھا ہے۔ میرے نزدیک یہ شہادت ہے اس امر کی کہ زید واقعی اس شہر میں موجود تھا۔ ممکن ہے بعد میں یہ ثابت ہو، کہ میرے دوست نے شناخت کرنے میں غلطی کی، اور یہ کہ جس شخص کو اُس نے دیکھا تھا، وہ زید نہ تھا۔ لیکن اس حالت میں بھی اس بیان کو شہادت ہی کہیں گے۔ اسی بیان سے میں اور نتائج بھی اخذ کرسکتا تھا۔ مثلاً یہ کہ زید کی بیماری کی خبر غلط ہے، کیونکہ اگر وہ بیمار ہوتا، تو بازار میں دکھائی نہ دیتا، یا یہ کہ اُس نے اپنا مجوزہ سفر ملتوی کردیا۔ اسی طرح اخبار میں ایک خبر دیکھتا ہوں کہ موتمر اسلامی میں مولانا محمد علی نے "اپنی مخصوص عربی میں تقریر کی"۔ یہ بیان شہادت ہے اس بات کی کہ مولانائے موصوف اسوقت حجاز میں ہیں۔ ہوسکتا ہے، کہ میرا یہ نتیجہ غلط ہو، اور مولانائے محترم وہاں مقیم نہ ہوں، بلکہ انگریزوں کی ولایت جاتے ہوئے راستہ میں ٹھہر کر وہاں تقریر کی ہو، اور آگے بڑھ گئے ہوں۔ لیکن اس غلط استنتاج سے اس بیان کے شہادت ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بعض اوقات ایک ہی واقعہ کے متعلق بہت سی شہادتیں ہوتی ہیں۔ ایسی حالت میں ہم ان تمام شہادتوں کا آپس میں مقابلہ کرتے ہیں، اور پھر اس کی صحت کو معلوم کرتے ہیں۔

بعینہ یہی کیفیت ہمارے ذاتی تجربہ کی ہوتی ہے۔ لیکن یہاں ہم یہ فرض نہیں کرتے کہ ہمارا بیان صحیح ہے، البتہ یہ کہ ہمارا مشاہدہ غلطی سے بری ہے، اور یہ کہ حواس سے صحیح صحیح واقفیت حاصل ہوسکتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ہمارا مشاہدہ بعد میں غلط ثابت ہو۔ یہی علم جو ہم کو اپنے حواس سے حاصل ہوتا ہے، اوروں کے لیے شہادت کا کام دیتا ہے، یا اسی بات کے متعلق ہم اوروں کی شہادت کو شامل کرکے نتائج اخذ کرتے ہیں۔ میں ایک شخص کو پہاڑ کے دامن میں بیہوش پڑا دیکھتا ہوں۔ اس سے میں اس نتیجہ پر پہونچتا ہوں کہ وہ اوپر سے گر پڑا ہے۔ یہ بیان میرے لیے شہادت ہے، کیونکہ اسی پر میرا نتیجہ مبنی ہے۔ جب میں اُسکا ذکر اوروں سے کرتا ہوں، تو میرا بیان اوروں کے لیے شہادت بنجاتا ہے۔ اسکے ساتھ یہ ضروری ہے، کہ سننے والے مجھ کو معتبر سمجھتے ہوں۔ پھر وہ بھی میری اس شہادت سے نتائج

اخذ کر سکتے ہیں۔ ایک ڈاکٹر کسی جاں بلب مریض کو دیکھنے آتا ہے، وہ اس مریض کی حالت کو خود دیکھتا ہے، اور دوسروں کے بیانات سنتا ہے۔ اب وہ ڈاکٹر خود اپنے مشاہدہ اور اوروں کے بیانات پر اپنے نتائج کو مبنی کرتا ہے۔ اُسکا اپنا مشاہدہ اور اوروں کے بیانات اسکے شہادات ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ شہادت کی ضرورت ہم کو بالعموم اُسوقت پڑتی ہے، جب وہ بات جو اُسمیں بیان کی گئی ہے، خود ہمارے مشاہدہ میں آئی ہو یا نہ آسکتی ہو، اگر ہم خود علیگڈھ کی جوبلی میں شریک ہوے ہیں، تو ہم اوروں سے اسکے حالات سننے کے خواہشمند نہ ہونگے۔ اس سے یہ ظاہر ہے، کہ ہمارے استدلالات دوسروں کے مشاہدات پر نہ مبنی ہوتے ہیں اور نہ ہونے چاہییں، کیونکہ انکی صداقت کا ثبوت ہر شخص دے سکتا ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے، کہ شہادت ہمیشہ تجربات ہی کے متعلق ہوتی ہے، شرط صرف یہ ہے، کہ یہ ذاتی تجربات کی حدود سے خارج ہوں۔ اس لحاظ سے اب ہم شہادت کی محدود ترین معنوں میں اس طرح تعریف کر سکتے ہیں، کہ یہ کسی تجربہ کی اطلاع دہی ہے۔ اسی کو دوسرے الفاظ میں اس طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے، کہ شہادت مشاہدہ کیے گئے مظہر کی وہ اطلاع ہے، جو اُن لوگوں کو دی جاتی ہے، جن کے ذاتی تجربے اس مظہر کو معلوم نہ کر سکتے تھے۔ جس مظہر یا بات کے متعلق شہادت دی جائے اُسکو اصطلاحاً واقعہ کہتے ہیں، اور شہادت کی صحت کو تاریخی یقینیت۔

شہادت دو قسم کی ہوتی ہے، بلا واسطہ اور بالواسطہ۔ بلا واسطہ اسکو اُسوقت کہا جاتا ہے، جب اس واقعہ کا، جس کے متعلق شہادت جا رہی ہے، خود شاہد نے مشاہدہ کیا ہو۔ بالواسطہ اُس حالت میں ہوتی ہے، جب وہ واقعہ جس کو شاہد بیان کر رہا ہے، خود اُسکے اپنے مشاہدہ میں نہ آیا ہو، بلکہ اوروں کی شہادت پر اُسنے اسکو تسلیم کیا ہو، مثلاً میں خود علیگڈھ جوبلی میں شریک ہوں، اور وہاں سے واپس آکر میں خود اپنے مشاہدات بیان کروں۔ میرے یہ تمام بیانات بلا واسطہ شہادت میں شمار ہونگے۔ لیکن اگر میں خود وہاں کی تقاریب میں حصہ نہ لوں، بلکہ کسی اور کی کہی سُنی بیان کروں تو یہ شہادت بالواسطہ ہوگی۔ بلا واسطہ شہادت کو عینی اور بالواسطہ کو اُذنی بھی کہتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ عینی شہادت ہمیشہ اُذنی شہادت پر فائق ہوتی ہے۔ عینی شہادت میں یقین کا درجہ اُذنی شہادت کے مقابلہ میں بڑا ہوتا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے، کہ ہم ہر موقعہ پر بلا واسطہ شہادت کو عینی اور بالواسطہ کو اُذنی نہیں کہہ سکتے۔ بالواسطہ شہادت میں، جس شخص کی شہادت پر ہم ایک واقعہ بیان کرتے ہیں، اُسکو ضامن کہتے ہیں۔ مثلاً علیگڈھ جوبلی سے واپس آکر میں وہاں کے حالات زید سے بیان کرتا ہوں، اور زید عمر سے۔ اب زید کی یہ شہادت بالواسطہ ہوگی، اور میں،

جسکی شہادت پر اُسنے یہ تمام واقعات عمر سے بیان کیے ہیں ضامن ہوں۔ اب ضامن خود بلا واسطہ یا بالواسطہ شاہد ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہو سکتا ہے کہ عمر زید کی زبانی واقعات جوبلی سُن کر خالد سے بیان کرے۔ اس صورت میں زید ضامن ہوگا، اور اُسکی شہادت ظاہر ہے کہ بالواسطہ ہے بلا واسطہ نہیں، کیونکہ وہ خود جوبلی میں شریک نہ ہوا تھا، بلکہ مجھ سے سُن کر اُسنے تمام باتیں بیان کی ہیں، ضامن اگر بالواسطہ شاہد ہو، تو شاہد متوسطہ، یا منقول عنہ کہلاتا ہے۔ پھر بلا واسطہ اور بالواسطہ دونوں قسم کی شہادتیں جزئی ہوتی ہیں، مکمل اور مناسب ہوتی ہیں، یا متناقض۔ شہادت کی ان قسموں کی تشریح ضروری نہیں۔ پھر مستقیم ہوتی ہیں، یا غیر مستقیم۔ مستقیم یہ اُسوقت ہوتی ہیں، جب اُن سے سوائے واقعہ کی اطلاع دہی کے اور کچھ مقصود نہ ہو، مثلاً علیگڈھ جوبلی کے حالات صرف اس لیے بیان کیے جائیں، کہ لوگوں کو اُن سے واقفیت ہو جائے۔ غیر مستقیم انکو اُس حالت میں کہتے ہیں، جب اس اطلاع دہی کی غایت کچھ اور ہو۔ مثلاً علیگڈھ جوبلی کے حالات اس لیے بیان کیے جائیں، کہ عوام کو مسلم یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد کی مسرفانہ راہ و روش، اور دیگر فضولیات سے آگاہی ہو۔ یہاں ہماری شہادت کی غایت محض واقعات کی اطلاع دہی نہ تھی، بلکہ اسکے علاوہ کچھ اور۔

یہاں تک جو کچھ کہا گیا، وہ گویا اصل بحث کا دیباچہ تھا۔ عنوان میں ہمنے اس بات کا اعلان کیا ہے، کہ ہم شہادت پر منطقی نقطۂ نظر سے بحث کرینگے۔ اس لحاظ سے ہمارا اصلی کام یہ ہونا چاہیے کہ ہم یہ دکھائیں کہ شہادت کس وقت، کن حالات میں، اور کن شرائط کے ایفا کے بعد قابل اعتبار اور لایق وثوق یا صحیح ہوتی ہے۔ وجہ اسکی ظاہر ہے، کہ منطق میں اُن اصول و قوانین سے بحث ہوتی ہے، جن کا اتباع صحت و سلامتی فکر کے لیے ضروری ہے۔ لہذا ہمارے اس مضمون کا اصلی موضوع اُن شرائط کو بیان کرنا ہے، جن کے ذریعہ سے ہم شہادت کی جانچ کر سکتے ہیں۔ اسی ضمن میں اُن اصول پر بھی بحث ہوگی، جن سے شاہد کا امتحان ہو سکتا ہے۔

سہولتِ تفہیم کے لیے ہم اپنے موضوع کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلے حصہ میں عام شہادت کی قابلیتِ اعتبار پر بحث ہوگی، اور دوسرے میں بلا واسطہ اور بالواسطہ شہادت پر علیحدہ علیحدہ غور ہوگا۔ حصہ اول پھر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ یعنی جب ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ایک خاص شہادت لائقِ اعتبار ہے یا نہیں، تو ہم کو اس مسئلہ پر دو مختلف حیثیتوں سے نگاہ کرنی چاہیے۔ اول تو یہ دیکھنا چاہیے، کہ جس واقعہ کے متعلق شہادت دی جا رہی ہے، وہ کہاں تک ممکن الوقوع ہے۔ پھر یہ معلوم کرنا لازمی ہے، کہ شاہد کس حد تک ثقہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں عام شہادت کی بحث

دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہے۔ ان میں سے پہلے کو مشہود سے اور دوسرے کو شاہد سے تعلق ہے۔ ان میں سے پہلے کے مطابق امر زیر تحقیق یہ ہوتا ہے، کہ مشہود کے تعلق سے شہادت کی قابلیت اعتبار کے شرائط کیا ہیں؟ اور دوسرے کا سوال یہ ہوتا ہے، کہ شاہد کے لحاظ سے شہادت کن کن حالتوں میں لائق اعتبار ہوتی ہے۔ اب ہم اپنی تقسیم کے مطابق اور اسی ترتیب سے انکا تذکرہ کریں گے۔

مشہود، یا وہ واقعہ جسکے متعلق شہادت دی جا رہی ہے، کے تعلق سے شہادت کی قابلیت اعتبار کو معلوم کرنے کے لیے پہلی شرط تو یہ ہے، کہ وہ اطلاقاً اور اضافاً دونوں حیثیتوں سے ممکن الوقوع ہو۔ اس بیان میں اطلاقی امکان وقوع اور اضافی امکان وقوع تشریح طلب ہیں۔ ایک واقعہ کو اطلاقاً یا بنفسہ ممکن الوقوع اُسوقت کہا جاتا ہے، جب یہ منطقی قوانین فکر کے منافی و مخالف نہ ہو۔ ایک شخص آکر شہادت دیتا ہے، کہ اُسنے ایک ایسا پرندہ دیکھا ہے، جو ایک ہی وقت میں سفید بھی تھا اور سیاہ بھی۔ اب منطق کے قانون اجتماع نقیضین کا دعوے یہ ہے، کہ ایک ہی چیز کا ایک ہی وقت میں ب اور غیر ب ہونا ناممکن ہے۔ چونکہ یہ واقعہ منطق کے اس قانون کے خلاف ہے اس واسطے اسکو اطلاقاً ناممکن الوقوع کہا جائیگا۔ جب یہ ثابت ہوگیا کہ ایک ہی پرندے کا ایک ہی وقت میں بالکل سفید و سیاہ ہونا ناممکن ہے، تو یہ شہادت بھی بیکار ہوگئی، کیونکہ مشہود اطلاقاً ناممکن الوقوع ہے۔ اسکے مقابلہ میں اضافاً ممکن الوقوع اُس واقعہ کو کہا جاتا ہے، جو داخلی یا خارجی ادراک کا معروض بن سکے، جو حواس یا شعور ذات پر اثر آفریں ہو سکے، اور اسی اثر کی وجہ سے اسکا علم ہو سکے۔ اس حیثیت سے جن اشیاء کا ہمکو ادراک ہو سکتا ہے (یہ اشیا بلحاظ زمان و مکان کہیں ہوں) وہ اضافاً ممکن الوقوع کہلائیں گی۔ اسی طرح جن اشیا کی تصویر تخیل میں قائم کی جا سکتی ہے، وہ بھی اسی فہرست میں شامل ہونگی۔ لیکن جن اشیاء کا نہ ادراک ہو سکتا ہے، اور نہ اُنکی تصویر قائم کی جا سکتی ہے، اضافاً ناممکن الوقوع کہلائیں گی۔ ان اشیاء کے متعلق تمام شہادت بالکل لایعنی اور ناقابل اعتبار ہوگی۔ اسکا مطلب یہ ہے، کہ جس شہادت کا مشہود نفسہ، یا حضاری قواء کی معروض کی حیثیت سے، ناممکن ہو، اُسکو بلا تامل رد کر دینا چاہیے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے، کہ ایک چیز کی محالیت کا فیصلہ دو طریقوں سے ہو سکتا ہے، ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے، کہ وہ چیز بحیثیت محسوس کے محال ہو، یا یہ کہ عالم مادی کے قوانین و نوامیس کے مطابق اُسکا ادراک ناممکن ہو، اس قسم کی محالیت طبیعی محالیت کہلاتی ہے۔ اسکے مقابلہ میں ایک اور حالت یہ ہو سکتی ہے، کہ اُس کا ادراک فطری، یا مافوق فطری، طریقوں میں سے کسی سے بھی ممکن نہ ہو۔ اس قسم کی محالیت کو الہیاتی

محالیت کہتے ہیں۔ لیکن کسی چیز کی طبیعی محالیت کو ثابت کرنے کے لیے صرف یہ ہی دکھانا کافی نہیں ہوتا کہ اس چیز کے وجود کی توجیہ عام قوانین فطرت سے نہیں ہو سکتی، یا یہ کہ اس کا وجود بظاہر قوانین فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ برعکس اسکے ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ پہلے ایک عالمگیر اور اٹل قانون فطرت کے وجود کو ثابت کیا جائے۔ اب اگر وہ چیز طبیعی طور پر ممکن ثابت ہو جائے، تو وہ قانون فطرت خود بخود مسترد ہو جاتا ہے۔ اسی طرح الہیاتی محالیت کو ظاہر کرنے کے لیے صرف یہی دکھانا کافی نہیں کہ قوانین فطرت کے مطابق اس چیز کی توجیہ نہیں ہو سکتی، یا یہ کہ ایک خاص قانون فطرت اسکے مخالف ہے۔ اسکے ساتھ ہی یہ بھی واضح کرنا لازمی ہے، کہ ایک مافوق فطری ذات بھی اسکی تکوین و تخلیق کا باعث نہیں ہو سکتی، اور یہ کہ اسکے وجود کو تسلیم کرنا کسی نہ کسی اصول کے منافی ہے۔ جب ان اصول کے مطابق کسی چیز کی طبیعی یا الہیاتی محالیت ثابت ہو جائے، تو اسکے متعلق تمام شہادت کو بلا تردد رد کیا جا سکتا ہے۔

مشہود کے تعلق سے شہادت کی قابلیتِ اعتبار کو قائم کرنے کے لیے اسکے اطلاقاً ممکن الوقوع ثابت ہونے کے علاوہ یہ بھی ثابت ہونا چاہیے، کہ وہ اضافاً بھی ممکن الوقوع ہے۔ امکان کی یہ دونو صورتیں ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔ ان میں سے ایک دوسرے کی غائب ہونے کی صورت میں ناقص اور بیکار ہو جاتی ہے۔ اضافی امکان سے ہماری مراد یہ ہے، کہ اس چیز کی لازمی اور ضروری صفات میں کسی قسم کا تناقض نہ ہو (یہ تو ظاہر ہے، کہ اس چیز کے متعلق تمام غور و فکر صرف ان ہی صفات کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے)۔ اسکے ساتھ ہی اسکو بھی نظرانداز نہ کرنا چاہیے، کہ جن صفات کو شہادت میں بیان کیا جا رہا ہے وہ بھی تناقض سے بری ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے، کہ ایک شہادت من حیث الشہادت، اگر متناقض بیانات کا مجموعہ ہے، تو اسکو قابل اعتبار نہ سمجھنا چاہیے، کیونکہ ہر وہ چیز جو خود اپنی تنقیض کرے، منطقی حیثیت سے بالکل بیکار ہوتی ہے۔ اسکو معلوم کرنے کے لیے صرف یہ دکھانا کافی ہوتا ہے، کہ یہ شہادت خود اپنی تنقیض تو نہیں کرتی۔ کیونکہ ممکن ہے، کہ یہ تناقض شاہد کی رائے سے پیدا ہوا ہو۔ اس قسم کے تناقض کو نظرانداز کرنے سے شہادت کی قابلیت اعتبار میں کسی قسم کا کوئی فتور و نقص واقع نہیں ہوتا۔ اسلیے اسکو نہ مسترد کیا جا سکتا ہے اور نہ اسکی تکذیب لازم آتی ہے۔ ایک چیز کے وجود کی شہادت کو صرف اس لیے رد کر دینا یقیناً غلطی ہے، کہ شاہد نے اسکی علت کے متعلق خود اپنی رائے ظاہر کی۔ مثلاً ایک شخص آکر بیان کرتا ہے، کہ فلاں مقام پر زمین شق ہو گئی ہے۔ اسکے ساتھ ہی وہ یہ بیان کرتا ہے، کہ ایک شخص کے سر پر جن سوار تھا۔ ایک عامل نے اپنے عمل سے

اس جن کو اُتارا، اور وہ جن اُس زمین کو پھاڑ کر غائب ہوگیا۔ اب اس شہادت کو صرف اسو جہسے بیکار اور ناقص سمجھنا، کہ یہ تعلیل و توجیہ ناقص ہے، یقیناً غلطی ہے، کیونکہ زمین کا شق ہونا صحیح ہوسکتا ہے، ممکن ہے کہ اسکی وجہ وہ نہ ہو، جو شاہد نے بیان کی۔ دوسرے الفاظ میں شہادت کی جانچ کرتے وقت نفس مشہود اور اسکے متعلق شاہد کی رائے کو نہایت احتیاط سے علٰحدہ کرنا بہت ضروری ہے۔ ایسا نہ کرنے سے ممکن ہے، کہ غلط شہادت صحیح ہو جائے، اور صحیح غلط۔ شہادت کے اس نقص کو صرف اس طرح معلوم کیا جا سکتا ہے، کہ اسکے تناقص بیان کو معلوم کیا جائے۔

یہاں تک ہم نے اپنے آپ کو صرف مشہود تک محدود رکھا ہے۔ اب فرض کیا جائے، کہ مشہود اطلاقاً و اضافاً دونوں طرح ممکن الوقوع ہے، اس میں نہ طبیعی محالیت پائی جاتی ہے نہ الہیاتی۔ لیکن شہادت کی صحت کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہوتا۔ ایک شخص آکر بیان کرتا ہے کہ فلاں مقام پر بلوہ ہوگیا ہے۔ بلوے کا ہونا ناممکن الوقوع نہیں۔ اس کا وجود کسی قسم کی محالیت کو بھی مستلزم نہیں، لیکن کیا یہ ممکن نہیں، کہ اس شخص نے آکر جھوٹ بولا ہو؟ بلوے کا ہونا ممکن الوقوع سہی، لیکن اسکے امکان وقوع سے یہ کیسے لازم آتا ہے، کہ اس شخص کی شہادت بھی صحیح ہے؟ کیا ہم کو اپنی روزمرہ زندگی میں ایسی شہادتوں سے اکثر سابقہ نہیں پڑتا، جنکا مشہود ممکن الوقوع ہے، لیکن باوجود اسکے شہادت بیکار رہے۔ اس کا مطلب یہ ہے، کہ کسی شہادت کی جانچ کرتے وقت پہلے تو یہ دیکھنا چاہیے کہ مشہود ناممکن تو نہیں، اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ ناممکن ہے، تو شہادت کی غلطی میں کوئی شبہ باقی ہی نہیں رہتا۔ اگر اس کا امکان ثابت ہو، تو پھر دوسرا سوال یہ ہونا چاہیے، کہ شاہد کہاں تک معتبر ہے؟ اُسکے قول کا کس حد تک اعتبار کیا جا سکتا ہے؟

شہادت کی ماہیت کو جن الفاظ میں ہم نے پیچھے کہیں بیان کیا ہے، اُن پر نظر غائر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ دراصل دو اجزا سے مرکب ہوتی ہے۔ ہم نے کہا ہے، کہ ایک واقعہ کو کسی ایسے شخص سے بیان کرنے کو شہادت کہتے ہیں، جو اس واقعہ کا بذات خود تجربہ نہ کر سکتا ہو۔ اب ظاہر ہے کہ اگر میں کوئی واقعہ کسی شخص سے بیان کروں، تو لازمی ہے، کہ وہ پہلے میرے مشاہدہ میں آئے۔ اور اگر میری شہادت بالواسطہ ہے، تو اُس کا کسی اور کے مشاہدہ میں آنا لازمی ہے۔ جب تک خود مجھ کو، یا میرے منقول عنہ کو، اسکا مشاہدہ نہ ہو، میں یا وہ اسکے متعلق کوئی بیان نہیں دے سکتا۔ اسی تمام تقریر کو دوسرے الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے، کہ شہادت اصل میں مرکب ہوتی ہے مشاہدہ اور اس مشاہدہ کی اطلاع دہی سے۔ یہی اسکے غیر منفک اور لازمی

اجزا ہیں۔ ان میں سے ایک بھی غائب ہو، تو شہادت بھی کالعدم ہو جاتی ہے۔ جب یہ مسلم ہے، تو یہ بھی ظاہر ہے کہ قابل اعتبار شاہد وہی ہو سکتا ہے، جس میں یہ دونوں قابلیتیں بدرجہ اتم موجود ہوں یعنی یہ کہ اُس میں مشاہدہ کرنے کی قابلیت ہو، اور اُس مشاہدہ کو مناسب طور پر بیان کرنے کی اہلیت۔ لیکن اسکے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے، کہ وہ جو کچھ بیان کرے صدق دل اور خلوص نیت سے بیان کرے۔ اس میں مبالغہ آمیزی نہ کرے۔ جہاں تک ممکن ہو اُسکو واقعہ کے مطابق بیان کرے، یعنے جھوٹ کو اُس میں دخل نہ ہونے دے۔ مختصراً یہ کہ شاہد قابل اعتبار وہی ہو سکتا ہے جسمیں تین صفات پائی جائیں، اول قابلیت مشاہدہ، دوم اطلاع دہی کی اہلیت، اور سوم دیانتداری یا صداقت یا خلوص نیت۔ ایک شاہد واقعہ مشہودہ کے مشاہدہ کا اہل بھی ہے، اُسکی اطلاع بھی مناسب اور موزوں طریقہ سے کر سکتا ہے، لیکن شہادت میں اگر وہ اپنی طرف سے باتیں شامل کرتا جاتا ہے، یا کسی وجہ سے اصل واقعہ کو مسخ کرتا ہے، تو ظاہر ہے کہ شہادت بیکار ہو جائیگی۔ اسی طرح ایک شخص نہایت دیانتدار اور حق گو ہے، لیکن مشاہدہ کی قابلیت نہیں رکھتا، تب بھی بداہتہً اسکی شہادت قابل اعتبار نہ ہوگی۔ پھر اگر اُس میں مشاہدہ کی قابلیت بھی ہے اور دیانتداری بھی، لیکن ہاتھ میں قلم یا منہ میں زبان نہیں رکھتا، تب بھی شہادت ناقص ہو جائیگی۔ رائٹر ایجنسی ناقص شہادت کی زندہ مثال ہے۔ اسکے پاس ذی علم اور لائق نامہ نگاروں کی بہتات بھی ہے، مشاہدہ کرنے کی سہولت بھی حاصل ہے، اسکے آدمی ہر جگہ صف اول میں نظر آتے ہیں واقعات عالم کو معلوم کرنے کے تمام ذرائع بھی مہیا ہیں، غرض اسکے ذو اہلیت ہونے میں کسی قسم کا شبہہ نہیں، لیکن انکے تاروں کی جو وقعت آج کل، کم از کم ہندوستان میں ہے، وہ ہر ایک پر روشن ہے۔ کیوں؟ صرف اسلیے کہ اہلیت تو موجود ہے، لیکن صداقت اور دیانت مفقود ہے۔ اسکی شہادت پر کوئی اعتبار نہیں کرتا۔ اسی طرح ایک شخص ہے، کہ جس نے تمام عمر کبھی جھوٹ نہیں بولا، واقعات کو بیان کرنے میں وہ ہمیشہ بہت محتاط رہتا ہے، اسکی ایمانداری، دیانتداری اور پرہیزگاری تمام عالم کے نزدیک مسلم ہے، لیکن اثریات سے اسکو مس نہیں، اگر یہ شخص لارڈ کارنرون سے قبل توتن خامن کی قبر پر پہونچ جاتا، اور وہاں کے حالات بیان کرتا، تو کوئی شخص اسکو معتبر نہ سمجھتا۔ صرف اس لیے کہ وہ ذو اہلیت نہیں۔ اس تمام بحث سے یہ نتیجہ بآسانی نکالا جا سکتا ہے، کہ شاہد کی یہ دونوں، یا تینوں صفات، یعنی اہلیت مشاہدہ و اطلاع دہی، اور صداقت و دیانتداری منطقی حیثیت سے لازمی ہیں، ان میں سے ایک کے غائب ہو جانے سے شاہد اعتبار کے درجہ سے گر جاتا ہے

لیکن یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ان دونوں صفات میں سے کسی کو دوسری کا نتیجہ نہیں کہا جا سکتا۔ اوپر کی مثالوں سے واضح ہوا ہوگا، کہ اکثر الکثیر صداقت کے ساتھ اقل القلیل اہلیت کا ہونا بعید از قیاس و حقیقت نہیں۔ اسی طرح کثیر ترین اہلیت کے دوش بدوش قلیل ترین صداقت کا ہونا بھی ناممکن نہیں۔ ہم ایک کو دوسرے پر مبنی نہیں کر سکتے۔ لیکن بالعموم اگر ایک شخص کی صداقت غیر مشتبہ ہے، تو اسکی اہلیت بھی ثابت ہو جاتی ہے کیونکہ ایک صادق القول شخص کبھی ایسی بات نہ کرے گا جو اسکو پوری طرح یاد نہ ہو، یا جسکے مشاہدہ کرنے میں اُس نے اپنی پوری توجہ صرف نہ کی ہو، یا جس کا مشاہدہ کرنے کا وہ اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھتا۔ ہمارے اس قول سے یہ مراد نہ لینی چاہیے، کہ صادق القول شخص لازماً ہر قسم کے واقعات کا مشاہدہ کرنے کا اہل بھی ہوتا ہے۔ ہر کسان کتنا بھی حق گو کیوں نہ ہو، اُسکو کسی طرح بھی کیمیاوی مشاہدات کا اہل نہیں کہا جا سکتا۔ ہماری مراد صرف یہ ہے، کہ کسان اپنی صداقت و دیانتداری کی وجہ سے لوگوں کو اس دھوکے میں نہ ڈالیگا، کہ وہ کیمیاداں بھی ہے، اور اسلیے وہ اسکے واقعات و مظاہر کا صحیح مشاہدہ کر سکتا ہے۔ اور اگر وہ ایسا کر سکتا ہے، تو جس بات پر اُسنے پورا غور نہیں کیا، یا جس بات کو وہ یاد نہ رکھ سکا، اُسکو اپنی طرف سے جوڑ کر بیان نہ کریگا۔ اسی واسطے ہم روزمرہ زندگی میں ایک صادق، مگر نااہل کی شہادت کو کاذب، مگر اہل کی شہادت کے مقابلہ میں زیادہ قابل اعتبار نہیں سمجھتے۔ حقیقت تو یہ ہے، کہ جس واقعہ کے متعلق صرف ایک ہی شہادت میسر آسکتی ہے، وہاں ہم شاہد کی صداقت کو اُسکی اہلیت کا ضامن گردانتے ہیں۔ اگر ہم کو اسکی شہادت کا یقین ہوتا ہے، تو ہم کو یہ بھی اطمینان ہوتا ہے، کہ وہ اپنی ناقابلیت یا نااہلیت کو چھپائے گا نہیں۔ اسی واسطے ہم اُسکی شہادت کو بغیر چون و چرا کے تسلیم کر لیتے ہیں۔

ہم نے ابھی کہا ہے، کہ شہادت قابل اعتبار اُسوقت ہوتی ہے، جب شاہد میں مشاہدہ کرنے کی قابلیت ہو، اور اُسکو موزوں و مناسب طور پر بیان کرنے کی اہلیت۔ دوسرے الفاظ میں وہ اس واقعہ کا صحیح صحیح مشاہدہ کر سکتا ہو، اور صحت کے ساتھ اُسکو بیان بھی کر سکتا ہو۔ اس قابلیت و اہلیت کے لیے سب سے پہلی شرط تو یہ ہے، کہ وہ شخص معلومات انسانی کے اس شعبہ سے پوری پوری واقفیت رکھتا ہو جس سے وہ تعلق رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے، کہ اگر واقعہ کیمیا سے تعلق رکھتا ہے، تو شاہد کا ماہر کیمیا ہونا ضروری ہے۔ اس مہارت کی عدم موجودگی میں شہادت معتبر نہ ہوگی، خواہ شاہد کی صداقت کسی قدر مسلم کیوں نہ ہو۔ اسی طرح نفسیاتی واقعہ کو جس خوبی، عمدگی، تفصیل اور کمال کے ساتھ ماہر نفسیات بیان کریگا اور کوئی

شخص نہیں کرسکتا - قانونی عدالتوں میں مارپیٹ کے مقدمات میں چوٹ چپیٹ کے متعلق سوائے ڈاکٹر کی شہادت کے اور کوئی شہادت قبول نہیں ہوتی - رسم الخط کی شناخت کے لیے ڈاکٹر کی رائے نہیں بلکہ رسم الخط کے ماہر کی ضرورت پڑتی ہے، اسی طرح زہر کی نوعیت معلوم کرنے کے لیے کیمیکل اگزامنر کی طرف رجوع کی جاتی ہے - وجہ صرف یہ ہے کہ یہ سب کے سب اس شعبۂ علم سے تعلق رکھتے ہیں، اور اسکے ماہر ہیں، جس سے وہ واقعہ متعلق ہے، دوسرے الفاظ میں ان ماہرین کے علاوہ کوئی اور شخص اس خاص چیز کے مشاہدہ کا اہل نہیں سمجھا جاتا - پھر یہاں بھی ہر ایک ڈاکٹر، یا ہر ایک ماہر رسم الخط، یا ہر ایک کیمیکل اگزامنر برابر نہیں سمجھا جاتا، باوجود اس کے ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے فن سے واقف ہے، یہ عدم مساوات نتیجہ ہوتی ہے اس بات کا کہ بعض ڈاکٹر علیٰ وجہ کمال مشاہدہ نہیں کرسکتے، یا اُس مشاہدہ کو صحت کے ساتھ بیان نہیں کرسکتے، یا اُس مشاہدہ کو صحت کے ساتھ بیان نہیں کرسکتے - ان ڈاکٹروں کی شہادت ناقص سمجھی جاتی ہے - ہاں جن ڈاکٹروں کی قابلیتِ مشاہدہ وصلاحیتِ اطلاع دہی بہت سے موقعوں پر ممتحن ہوچکی ہے، اُنکی شہادت میں شبہہ نہیں کیا جاتا - جس قدر پختہ کار اور قابل یہ ڈاکٹر ہوتا ہے، اُسی قدر زیادہ معتبر اُسکی شہادت مانی جاتی ہے، اور اگر وہ واقعہ جسکا وہ شاہد ہے، بالکل معمولی اور عام ہے، تو اُسکی شہادت کو الہام کا درجۂ یقین حاصل ہوتا ہے - پھر اسکے ساتھ ہم کو اس بات کی بھی تحقیق کرنی چاہیے کہ جن حالات میں شاہد نے اس واقعہ کا مشاہدہ کیا ہے، وہ ایسے تو نہ تھے جنکی وجہ سے اس کا مشاہدہ، یا اُس مشاہدہ کا بیان غلط ہوگیا ہو - قانونی شہادتوں میں "سلامتی ہوش وحواس" اور بلوغت کی شرط اسی طرح لگائی جاتی ہے، کہ اگر ہوش وحواس درست نہ ہوں، یا شاہد بالغ العمر نہ ہو، تو اول تو مشاہدہ ہی درست نہ ہوگا، اور اگر مشاہدہ درست ہو بھی گیا، تو اُسکا بیان یقیناً صاف اور صحیح نہیں ہوسکتا - یہ اس قسم کے حالات ہیں جن میں مشاہدہ، یا اسکے بیان، کی درستی وصحت بہت مشتبہ ہوجاتی ہے، اور اسی اشتباہ کی وجہ سے اس شہادت کو قبول نہیں کیا جاتا -

منطقیوں نے مشاہدہ میں غلطی کے دو ممکن ذرایع بیان کیے ہیں - پہلی صورت کو وہ اصطلاحاً مغالطہ عدم مشاہدہ کہتے ہیں، اور دوسری کو مغالطۂ سوء مشاہدہ - عدم مشاہدہ کی پھر دو صورتیں ہوجاتی ہیں - انکی توضیح مثالوں سے ہوگی - بعض اوقات ایسا ہوتا ہے، جس شخص کا ذکر ہوتا ہے، وہ معاً آموجود ہوتا ہے، اور جس شے کو ہم خواب میں دیکھتے ہیں، وہ شے دوسرے ہی روز وقوع میں آجاتی ہے - ایک ہی نوع کی بہت سی مثالوں کی بناء پر بعض لوگ خوابوں کو سچا سمجھنے لگتے ہیں - اسی طرح اکثر اشخاص کو نجومیوں اور رمالوں سے آیندہ کے حالات دریافت کرنے کا شوق ہوتا ہے اور

صرف ان مثالوں کولیکر جن میں انکی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی تھی، نجوم ورمل پر ایمان لے آتے ہیں۔ اسی قسم کی اور صورتوں میں ہوتا یہ ہے، کہ وہ بات محض اتفاق سے صحیح ثابت ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ اُن مثالوں کو نظر انداز کر جاتے ہیں جن میں وہ بات ثابت نہ ہوئی تھی۔ صرف امثال موجبہ پر غور کرنے اور امثال سالبہ و مخالفہ کو نظر انداز کرنے سے یہ نتیجہ نکال لیا جاتا ہے

امثال مخالفہ کو نظر انداز کا فطری میلان اس وقت اور بھی قوی ہوتا ہے، جب امثال موجبہ کسی ایسے مسئلہ کی مثالیں ہوں، جسکو پہلے ہی تسلیم کرایا گیا ہو، یا جو شہادت ان مثالوں سے حاصل ہوتی ہو، اُسکی تائید میں تعصب، عقیدت، تنفر، محبت وغیرہ کے جذبات شامل ہوں۔ مثلاً عوام الناس نے سحر اور عملیات کے اثر اور چڑیلوں اور بھوتوں کے وجود کو تسلیم کر رکھا ہے، تو تمام ایسی روایات، جن سے ان اشیا کے اثر، یا وجود، کی تصدیق ہوتی ہے، نہایت شوق اور اعتبار سے سُنی جاتی ہیں، اور برخلاف اسکے ہزاروں ایسی مثالیں جہاں سحر کا کچھ اثر نہیں ہوا، یا بھوت اور چڑیلوں کی کی بابت، جو روایات ہوتی ہیں، غلط ثابت ہوتی ہیں، اکثر تو نظر انداز کردی جاتی ہیں، اور اگر اُن پر غور کیا جاتا ہے، تو دل کو اس طرح سمجھا لیا جاتا ہے کہ شاید ان موقعوں پر کسی اور اعلیٰ اور قوی تر علت نے سحر کے اثر کو زائل کر دیا ہو۔

اسکے علاوہ تعصب، عقیدت، تنفر، محبت وغیرہ جذبات اکثر اپنے معارض مثالوں کا مشاہدہ ہی نہیں کرنے دیتے۔ مثلاً عاشق اپنے معشوق میں، اور والدین اپنے بچوں میں سوائے حُسن و خوبی کے اور کچھ نہیں دیکھتے۔ اسی طرح ایک متعصب شخص کو اپنے مذہب میں سوائے خوبیوں کے، اور دوسروں کے مذہب میں سوائے بُرائیوں کے، اور کچھ نظر نہیں آتا۔ ان تمام صورتوں میں مشاہدہ بالکل غلط ہو جاتا ہے۔ تعصب وغیرہ کی وجہ سے اصلیت مسخ ہو جاتی ہے، اور ہر ایک چیز اپنی من مانی صورت میں دکھائی دیتی ہے۔

پھر تعصب وغیرہ جذبات کا صرف یہی اثر نہیں ہوتا، کہ امثال مخالفہ نظر انداز کردی جاتی ہیں بلکہ انکی وجہ سے لوگ ایسے اقوال و مسائل تسلیم کر لیتے ہیں، کہ اگر انکا تجربہ کیا جائے، تو بالکل بے بنیاد ثابت ہوتے ہیں۔ گیلیلیو کے زمانہ تک ہر شخص یہ مانتا چلا آرہا تھا، کہ گرنے والے اجسام اور زمین تک پہونچنے کی مدت میں نسبت معکوس ہوتی ہے۔ یعنی پانچ سیر کا وزن ایک سیر وزن کے مقابلہ میں ایک خمس مدت میں زمین تک پہونچے گا۔ اس قول کی صحت کی جانچ کے لیے ایک سادہ سا تجربہ کرنا کچھ مشکل نہ تھا، لیکن کسی نے یہ تکلیف نہ اُٹھائی اور ان مسائل کو بلا چون وچرا مانتے چلے آئے۔

فطرتِ انسانی کا ایک میلان یہ بھی ہے کہ وہ اکثر کسی واقعہ کی چند نمایاں اور اول ہی اول ظاہر ہونے والی امثال کو دیکھ لیتا ہے، اور ان ہی کی بنا پر کلیہ قائم کر لیتا ہے۔ جب ہم کسی قوم، یا پیشہ، یا جماعت کے چند اشخاص میں چند مخصوص خصائل دیکھ لیتے ہیں، تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم یہ ایمان لے آتے ہیں کہ تمام قوم، پیشہ، یا جماعت میں یہ خصائل پائے جائیں گے۔ اسی طرح جب کوئی شخص کسی غیر ملک میں سفر کرتا ہے، تو اکثر اُسکو پہلے پہل گاڑیبانوں، قلیوں اور بھٹیاروں سے کام پڑتا ہے، اور وہ سیاح ان ہی لوگوں کے خصائل پر استدلال کر کے تمام قوم کو متدین یا غیر متدین، خوش خُلق یا بد خُلق قرار دے لیتا ہے۔

یہ تمام مذکورہ صورتیں مغالطہ عدم مشاہدہ کی اُس قسم سے تعلق رکھتی ہیں، جس میں بعض امثال پر غور، اور بعض کو نظر انداز کر کے ایک خاص نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔ اسکے علاوہ اسی مغالطہ کی ایک قسم یہ ہوتی ہے، کہ ہم کسی ایک مثال کو بھی نظر انداز نہیں کرتے، لیکن ہر ایک مثال میں ہمارا مشاہدہ غلط ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہاں نقص مثالوں کی تعداد میں نہیں، بلکہ اُن کی کیفیت میں ہوتا ہے۔ ایسی حالتوں میں ہوتا یہ ہے، کہ چند ایسے ضروری عوارض کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، جنکو واقعہ زیر مشاہدہ سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ان ضروری عوارض کو نظر انداز کر کے استدلال کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ڈگبی نے زخموں کے علاج کا ایک نیا طریقہ نکالا تھا، کہ جس ہتھیار سے زخم پہونچا تھا، اس پر ایک سفوف چھڑک کر اور مرہم لگا کر دو تین دفعہ صاف کیا جاتا تھا۔ اسکے ساتھ ہی اس زخم کو روئی وغیرہ رکھ کر مضبوط باندھ دیا جاتا تھا۔ اور سات دن کے بعد جب کھولا جاتا تھا، تو وہ زخم بالکل مندمل ملتا تھا۔ اس قسم کی بہت سی مثالوں کے مشاہدہ کے بعد عام خیال یہ قائم ہوا تھا، کہ وہ اندمال زخم پہونچانے والے ہتھیار پر مرہم لگانے کا نتیجہ تھا، لیکن حقیقت میں زخم کے اچھا ہونے کا سبب یہ تھا کہ سات دن زخم مضبوط بند رہا تھا، اور اس وجہ سے باہر کی ہوا نہ لگی تھی۔

پھر مشاہدہ میں غلطی کی وجہ ایک اور یہ ہوتی ہے، کہ جس چیز کو ہم مشاہدہ کہتے ہیں، وہ اصل میں مشاہدہ نہیں ہوتا، بلکہ استدلال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ہم شام کے وقت باہر نکلتے ہیں، اور دیکھتے ہیں، کہ سڑکوں پر دورویہ پولیس کے سنتری کھڑے ہیں، تمام بازار سجے ہوے ہیں، تمام دوکانیں اور مکان آئینہ بند ہیں۔ لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوے ہیں، فوج کے گورے نہایت اہتمام وانہماک کے ساتھ ادھر اُدھر ٹہل رہے ہیں۔ ان تمام حالات کو دیکھ کر جب ہم گھر واپس آتے ہیں، تو بیان کرتے ہیں، کہ آج گورنر کی سواری نکلنے والی ہے۔ ہمارا مشاہدہ سواری کا نہ تھا، بلکہ اُس انتظام واہتمام کا تھا، جو اُس سواری کے لیے ہو رہا تھا۔ لیکن چونکہ ہمنے ہمیشہ اس قسم کے انتظام کو سواری کے لیے ہوتے

دیکھا ہے، اس لیے شہادت ہم نے انتظام کی نہ دی، بلکہ سواری کی دی، اور یہ شہادت ظاہر ہے، کہ مشاہدہ پر مبنی نہ تھی، بلکہ اُس نتیجہ پر موقوف تھی، جو ہم نے اُس انتظام کو دیکھ کر اخذ کیا تھا۔ ان حالات میں شہادت کا غلط ثابت ہونا بعید از قیاس نہیں۔ ممکن ہے کہ گورنر کی سواری نہ نکلی ہو، بلکہ کسی اور مصلحت سے یہ انتظام کیا گیا ہو۔

یہ سچ ہے، کہ مشاہدہ کے ان نقائص کو شہادت میں معلوم کرنا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے، لیکن اگر شاہد نے گذشتہ موقعوں پر اپنے آپ کو ہر قسم یا ایک خاص قسم کے واقعات کا مشاہدہ کرنے کا اہل ثابت کیا ہے، تو ہم کو یہ اطمینان ہو جانا چاہیے، کہ وہ اپنے آپ کو ان سے محفوظ رکھ سکیگا، اور اس طرح اسکے مشاہدہ میں نہ تو امثال مخالفہ وسالبہ کو نظرانداز کیا گیا ہوگا، نہ واقعہ زیر مشاہدہ کے بعض ضروری عوارض کو ترک کیا گیا ہوگا، اور نہ یہ اصلی و واقعی مشاہدہ کا نتیجہ ہوگا۔ یہی مطلب ہے ہمارے اس قول کا کہ شاہد میں اہلیت ہونی چاہیے۔

یہاں تک صرف مشاہدہ کرنے اور اُسکو بیان کرنے پر بحث تھی، لیکن اسکے ساتھ، جیسا کہ ہم اوپر دکھا چکے ہیں، یہ بھی ضروری ہے، کہ شاہد دیانتدار اور صادق ہو۔ مشکل یہ ہے، کہ ہم کو اسکی ان صفات کا پوری طرح یقین نہیں ہو سکتا، اگرچہ اس یقین کا ہم سے بڑا غلبہ ہو سکتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے، کہ اگرچہ ہم کو شاہد کے کیرکٹر اور اُسکی عادات وخصائل سے اس قدر مکمل واقفیت ہے کہ ہم اسکی صداقت پر اعتماد کر سکتے ہیں، لیکن دل کا حال سوائے عالم الغیب کے اور کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا۔ اس دنیا میں اکثر طاقتیں ایسی ہیں، جو بڑے سے بڑے متدین اور متقی شخص کو صراط مستقیم سے منحرف کر سکتی ہیں۔ عادات کا طبیعت ثانیہ ہونا مسلّم، لیکن جب ان طاقتوں کے زیر اثر طبیعتِ اولیہ بدل جاتی ہے، تو طبیعتِ ثانیہ تو یقیناً خارج از بحث ہے۔ فطرت انسانی کی کمزوریوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان ہی کمزوریوں میں سے کوئی ایک بروے کار آکر انسان کے ارادوں کو کچھ کا کچھ کر دیتی ہے۔ لیکن ہم کو اپنی روزمرہ زندگی میں شہادت پر ناچار و ناگزیر اعتماد کرنا پڑتا ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے، کہ ہم شاہد کے خلوص نیت پر اعتبار کرتے ہیں، اگرچہ بعض کو ہم مسترد بھی کر دیتے ہیں۔

شاہد کی دیانتداری اور صداقت کا اندازہ کرنے کے لیے ایک طریقہ تو ہم یہ اختیار کر سکتے ہیں، کہ اُسکی گذشتہ زندگی کے حالات پر غور کریں، اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں، کہ وہ صداقت دیانتداری کو محبوب رکھتا ہے یا نہیں۔ اگر رکھتا ہے، تو ہم کو اس خاص موقعہ پر بھی اسکی صداقت کا ایک حد تک یقین ہونا چاہیے۔ لیکن کیا فطرتِ انسانی کا یہ ایک معمولی اور عام منظر نہیں، کہ ایک شخص اپنا

اعتبار بڑھانے کے لیے کچھ مدت تک تو نہایت دیانتدار رہتا ہے، اور جب اعتبار بڑھ جاتا ہے، اور ساکھ قائم ہو جاتی ہے، تو ایک ایسا ہاتھ مارتا ہے، کہ گذشتہ دیانتداری سے جو نقصان ہوا تھا، اُسکو مع سود کے وصول کر لیتا ہے۔ اس بنا پر کسی کی عادتِ صداقت پر بھروسا نہ ہونا چاہیے۔ لیکن اس دُنیا میں رہنا، اور اپنے ہمجنسوں سے معاملہ نہ رکھنا، یا اُن سے قطع تعلق کر لینا، بقول ارسطو کے، یا تو فرشتوں سے ممکن ہے، یا وحوش سے، انسانوں سے ممکن نہیں۔ اب اگر ابنا ہجنس سے تعلق رکھنا بھی ضروری ہے، اور یہ تعلق بغیر اعتبار و اعتماد کے قائم نہیں رہ سکتا، پھر یہ اعتماد و اعتبار نتیجہ ہوا کرتا ہے عادات کا، کیونکہ عادات ہی کو دیکھ کر انکا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ وجہ اسکی یہ ہے، کہ عام خیال کے مطابق انسان اپنی عادات کا غلام ہوا کرتا ہے۔ ہرکیف باوجود ان تمام نقائص کے شاہد کی صداقت کو معلوم کرنے کا اگر کوئی ذریعہ ہمارے پاس ہے، تو عادات ہیں۔ ہاں اپنی تسلی کے لیے یہ کر سکتے ہیں، کہ اسکے ساتھ اسپر غور کر لیں، کہ شہادت دینے کے وقت کوئی ایسا محرک عمل تو نہیں کر رہا تھا، جسکے زیر اثر اُس نے اپنی عادت کو ترک کر دیا ہو۔ اگر اس قسم کا کوئی محرک ہے، تو عادت یقیناً ناقابل اعتبار ہو جاتی ہے۔ اپنی جان کس جانور کو پیاری نہیں ہوتی۔ ممکن ہے، کہ وہ شاہد جو راست گوئی کا عادی ہے، کسی مستبد اور ظالم حاکم کے سامنے شہادت دے رہا ہو۔ ایسی حالت میں یہ بعید نہیں، کہ وہ محض جان بچانے کے لیے، یا تکلیف و تعذیب سے محفوظ رہنے کی غرض سے جھوٹ بول جائے، اور اس طرح غلط شہادت دیدے۔ حاکمان پولیس کے روبرو جو شہادتیں گذرتی ہیں، وہ اس خاص صورت کی بہترین مثالیں ہیں۔ پھر بلووں کے مقدمات میں "سرکاری گواہوں" کی شہادت اسی لیے ناقص سمجھی جاتی ہے، کہ وہ قید و بند کی مصیبت سے نجات پانے کی امید میں غلط بیانی اور دروغگوئی کر سکتے اور کرتے ہیں۔ اطمینان مزید کےلیے ان پر جرح کے سوالات کیے جاتے ہیں۔ اگر ان سوالات کے دوران میں کہیں اُسکی تناقض بیانی منتج ہو جاتی ہے، تو محض اس تناقض کی وجہ سے اُسکی شہادت پایۂ اعتبار سے گر جاتی ہے، کیونکہ شہادت اگر سچی ہوتی تو یہ تناقض ناممکن تھا۔

مختصر یہ کہ شاہد کی صداقت و دیانتداری کو معلوم کرنے کا پہلا ذریعہ تو یہ ہے، کہ ہم اسکے کیرکٹر کی اچھی طرح جانچ کریں۔ دوم یہ کہ ایسے محرکات کی عدم موجودگی کو ثابت کریں جنکے زیر اثر وہ شخص دیدہ و دانستہ دروغ گوئی پر مجبور ہوتا، سوم یہ کہ جرح کے سوالات کر کے یہ دیکھیں، کہ اس میں کسی قسم کا تناقض تو نہیں پایا جاتا۔ لیکن اسکو نہ بھولنا چاہیے، کہ ان تینوں ذرائع سے ہمکو شاہد کی صداقت، دیانتداری اور خلوص نیت کا پورا پورا یقین نہیں ہو سکتا، البتہ یقین کا غلبہ ہو جاتا ہے۔

یہاں تک ذکر تھا اُس شاہد کا جو دیدہ و دانستہ جھوٹ بولتا ہے - یہ جھوٹ جلب منفعت کے لیے ہو، یا دفع مضرت کے لیے، یا کسی اور غرض سے - لیکن بعض شہادتیں ایسی بھی ہوتی ہیں، جن میں وہ اپنی طرف سے کسی قسم کی غلط بیانی نہیں کرتا، حالانکہ یہ شہادت بالکل، یا تقریباً غلط ہوتی ہے - دوسرے الفاظ میں اسکی دروغگوئی شعوری نہیں، بلکہ غیر شعوری ہوتی ہے - بعض طبیعتیں مبالغہ پسند ہوتی ہیں، وہ اسی مبالغہ پسندی کی وجہ سے ذرا سی بات کو افسانہ کر دیتی ہیں - نتیجہ اسکا یہ ہوتا ہے، کہ اصلیت بالکل مسخ ہو جاتی ہے - بعض اپنے تجربات و مشاہدات کی تفریط کی تلافی استدلال و تخیل کی افراط سے کرتے ہیں - بچوں کے بیانات میں تخیل کی رنگ آمیزی بکثرت ہوتی ہے بعض اشخاص محض اپنی شہرت اور عظمت بڑھانے کے خیال سے من گڑھت قصے بیان کر جاتے ہیں - یہ بھی عموماً ہوتا ہے، کہ واقعہ کی دلکشی اور دلچسپی بڑھانے کے لیے اُس میں اپنی طرف سے بہت سی باتیں شامل کر دی جاتی ہیں - شاہد بزعم خود تمام واقعات صحیح صحیح اور بلاکم وکاست بیان کرتا ہے، لیکن یہ اثرات برابر کام کیے چلے جاتے ہیں -

انکے ساتھ اس حقیقت کو بھی شامل کر لینا چاہیے، کہ ہمارا حافظہ بہت فریب دہ ہوتا ہے - اکثر اوقات تو ایک واقعہ کی بہت سی باتیں ہمکو یاد نہیں رہتیں - بعض اوقات اس واقعہ کو بیان کرنے میں ایسی باتیں شامل کر دی جاتی ہیں، جنکو اس واقعہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا - بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے، کہ واقعات کی ترتیب مختلف ہو جاتی ہے، جس ترتیب میں کہ وہ مشاہدہ میں آئے، وہ یاد نہیں رہتی - نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ انکو بیان کرنے میں انکی ترتیب بالکل من گڑھت ہوتی ہے - اس میں شک نہیں کہ عام طور پر اس اختلافِ ترتیب سے شہادت میں کچھ فرق نہیں آتا، لیکن بعض واقعات اس قسم کے ہوتے ہیں، جن میں ترتیب بہت ضروری ہوتی ہے - مطلب یہ ہے کہ حافظہ کی کمزوری کی وجہ سے تین مختلف قسموں کے نقائص پیدا ہو سکتے ہیں :- (۱) متعلق باتوں کا ترک کر دینا (۲) غیر متعلق باتوں کا شامل کر دینا اور (۳) ترتیب کا مختلف ہو جانا - پھر جس طرح وقت گذرتا جاتا ہے اسی طرح ان نقائص کا احتمال اور بڑھ جاتا ہے - یہی وجہ ہے، کہ سائنس کے تمام اختبارات میں تاکید کی جاتی ہے، کہ جو کچھ مشاہدہ کیا جائے، اُسکو فوراً تحریر میں ضبط کر لیا جائے، تاکہ ذہول کی وجہ سے کوئی بات چھوٹ نہ جائے - لیکن خرابی یہ ہے، کہ ہر شہادت میں یہ بات حاصل نہیں ہو سکتی - وہ لوگ، جن کی تحریرات آجکل کی تاریخ کا سنگ بنیاد ہیں، ہر وقت کاغذ پنسل نہ لیے پھرتے تھے - تحریری کاغذات ہمیشہ حافظہ کی مدد سے مرتب کیے جاتے ہیں - لہذا ظاہر ہے، کہ واقعہ کا جس قدر حصہ فراموشی کی نذر ہو جاتا ہے، اُسکو اپنی طرف سے پورا کیا جاتا ہے، اور اُس میں استدلال و تخیل سے مدد لی جاتی ہے - ناموافق اور

ناہموار باتیں نکال کر ایک مسلسل قصہ گھڑ لیا جاتا ہے، جو بظاہر اصلی تجربہ کی ہو بہو نقل نظر آتا ہے جسقدر وقت گذرتا جاتا ہے، اُسی قدر غلبہ اس تعمیری کام کا ہوتا جاتا ہے۔ ضعیف العمر اشخاص کا حافظہ خصوصیت کے ساتھ بہت خطرناک ہوتا ہے۔ دہلی کے غدر اور حیدرآباد کی موسیٰ ندی کی طغیانی کے چشم دید حالات بیان کرنے والوں کی شہادت کو اسی وجہ سے ذرا احتیاط سے صحیح تسلیم کرنا چاہیے۔ اکثر واقعات جن کو وہ بیان کرتے ہیں "ایجاداتِ بندہ" ہوتے ہیں، اور دقت یہ ہے، کہ انکو اصلیت سے علٰحدہ کرنے کا کوئی وسیلہ ہمارے پاس نہیں ہوتا۔ قلیل عرصہ کا بھی اگرچہ یہی حال ہے، لیکن اس میں غلطی کا احتمال کم ہوتا ہے۔ لہذا شاہد کی شہادت کی جانچ کرتے وقت، ہم کو یہ دریافت کرنا چاہیے، کہ وہ بلحاظ زمانہ، اس واقعہ کے کس قدر قریب تھا، اور یہ کہ اُس نے کتنے عرصہ کے بعد اس کو تحریر میں ضبط کیا ہے۔ تیسرے یہ کہ اسکا حافظہ کہاں تک قابل اعتماد تھا۔ پھر نفس شہادت کے نقد و نظر سے ہم تخمینی حد تک یہ کہہ سکتے ہیں، کہ فلاں حصہ نسیان کے نذر ہو گیا، فلاں استدلال کا نتیجہ ہے اور فلاں تخیل کا۔ وغیرہ

تعصب، بغض، محبت، وغیرہ کے جذبات کے زیر اثر شہادت میں جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، انکی طرف ہم پیچھے کہیں اشارہ کر چکے ہیں۔ صرف اُسی شاہد کی شہادت پر اعتبار کیا جا سکتا ہے، جو ان تمام باتوں سے بَری ہو۔ یہی وجہ ہے، کہ ایک غیر جانبدار اور بے غرض کی شہادت، غرضی شخص کی شہادت پر، من حیث الشہادت، فائق سمجھی جاتی ہے۔

اگر یہ شہادت تحریری ہے، تو اس میں مصنف کی انشا پردازی کی گنجائش رکھنی بھی ضروری ہے۔ بعض لوگ محض انشا پردازی کے زور میں آکر نادانستہ طور پر غلط بیانی کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ تشابیہ و استعارے، پُرشکوہ الفاظ، چُست بندشیں، نئی نئی تراکیب، اور اسی قبیل کی اور چیزیں انشا پردازی کی جان ہیں، اور یہی اصلیت کو مسخ کرنے میں نمایاں حصہ لیتی ہیں۔ تاریخی ناولوں، یا نظموں کا رتبہ بطور سند کے، تاریخی کتب کے برابر نہیں ہوتا، وجہ یہی ہے کہ مقدم الذکر میں محض زیبِ داستان کے لیے بہت سی بیکار باتیں شامل کر لی جاتی ہیں، اور مؤخر الذکر میں ضرورت شعری کی وجہ سے اصلی واقعہ میں تغیر و تبدل کر لیا جاتا ہے۔ آزاد مرحوم کی دربار اکبری اور آبِ حیات، اور شرر کے تمام تاریخی ناول اس قسم کی شہادتوں کی زندہ اور عمدہ مثالیں ہیں۔ بلحاظِ انشا پردازی ان کا رتبہ خواہ کچھ ہی ہو، لیکن بحیثیت تاریخی شہادت کے یہ بالکل بیکار ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے، کہ زبان جسکے ذریعہ سے مشاہدہ کی اطلاع دہی کی جاتی ہے، غلطی کا ایک اور ذریعہ ہے۔ ہو سکتا ہے، کہ مشاہدہ صحیح ہو، لیکن اسکو بیان کرنے میں اصلیت کا بدل جانا ممکن نہیں۔

جب شاہد کی ان دونوں صفات، یعنی دیانتداری اور اہلیت، کی طرف سے ہمکو اطمینان ہوجائے تو شہادت بھی قابل اعتبار ہوجاتی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے، کہ ان دونوں صفات کے باوجود، اگر وہ واقعہ، جسکے متعلق شہادت دی جارہی ہے، عام اور روزمرہ تجربہ کے خلاف ہے، تو شہادت غلط ہے۔ اسی خیال کی بنا پر ہیوم نے معجزات کو ناقابل ثبوت قرار دیا ہے۔ اس کا خیال ہے، کہ یہ تمام معمولی قوانین فطرت کے خلاف ہوتے ہیں، اور ہم کو انکے مشابہ واقعات کا اس سے قبل تجربہ نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے اُنکے متعلق ہر قسم کی شہادت قابل اعتبار نہیں، حالانکہ وہ لوگ، جو اُنکی شہادت دیتے ہیں، اُسکے نزدیک پوری طرح اور بالکل معتبر ہیں۔ لیکن ہیوم کا یہ خیال غلط ہے۔ برخلاف اسکے ہم یہ کہہ سکتے ہیں، کہ جہاں شاہد کا اعتبار مسلم اور ناقابل انکار ہے، وہاں صرف اس سبب سے کہ وہ واقعہ غیر معمولی اور عجیب ہے، شہادت اور پُرزور ہوجاتی ہے۔ وجہ اسکی یہ ہے، کہ انکے محض ایسا ہونے ہی سے صادق القول اور ذی عقل انسان انکی طرف اور زیادہ توجہ کریں گے اور اس طرح اپنے مشاہدات کو اور زیادہ صحت کے ساتھ بیان کرنے کے قابل ہوجائیں گے۔

اب عام شہادت کی قابلیتِ اعتبار کی گذشتہ تمام بحث کو مختصراً اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے، کہ ایک شہادت اُسوقت قابلِ وثوق ہوتی ہے، جب اُسکے مشہود و شاہد میں خاص خاص صفات پائی جائیں۔ مشہود کے لیے ضروری ہے، کہ وہ تجربہ کی اعلیٰ قوت، یعنی فہم، کے معروض کی حیثیت سے اطلاقاً اور تجربہ کے ادنیٰ قوا، یعنی حواس اور شعورِ ذات، کے معروض کی حیثیت سے، اضافاً ممکن ہو۔ جب یہ ثابت ہوجائے، تو شہادت، من حیث الشہادت، بیکار نہیں ہوتی۔ شاہد کے لیے صداقت اور اہلیت لازمی ہے۔ اسکی صداقت اُسوقت تک غیر مشتبہ ہوتی ہے، جب تک کہ ہمارے پاس اُس میں شبہہ کرنے کے کافی وجوہ نہ ہوں، یا جب خود فریبی کا عام امکان اسکی بنا ہو۔ شاہد کی اہلیت اُسوقت مسلم ہوتی ہے، جب مشاہدہ کرنے، اور اُس مشاہدہ کی اطلاع دہی، کی صلاحیت کے خلاف کچھ شکایت نہ ہو۔ عام شہادت کی قابلیت اعتبار پر اس تمام بحث کے بعد اب ہم اسکی مخصوص قسموں، یعنی بالواسطہ اور بلاواسطہ، کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

ہم نے اس سے قبل اس شہادت کو بلاواسطہ کہا ہے، جس میں وہ واقعہ، جسکے متعلق شہادت دی جارہی ہے، خود راوی یا ناقل کا ذاتی تجربہ ہو۔ وہیں ہم نے یہ بھی کہا تھا، کہ بلاواسطہ شہادت بالواسطہ شہادت کے مقابلہ میں زیادہ مرجح اور زیادہ معتبر ہوتی ہے۔ اب گذشتہ بحث سے ظاہر ہے کہ بلاواسطہ شہادت کی قابلیتِ اعتبار میں اُسوقت اور بھی اضافہ ہوجاتا ہے، جب شاہد و مشہود

میں وہ تمام شرائط و صفات پائی جائیں، جن کا اوراق ماقبل میں ذکر ہوا ہے۔ چنانچہ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ بلا واسطہ شہادت اُسوقت معتبر کہی جا سکتی ہے، جب اوّل شاہد میں مشاہدہ کرنے کی قابلیت زیادہ ہو۔ اس شہادت کی قابلیت اعتبار ہمیشہ شاہد کے مشاہدہ کرنے کی قابلیت کی نسبت سے ہوتی ہے۔ جس قدر زیادہ یہ قابلیتِ مشاہدہ ہوتی ہے، اُسی قدر زیادہ معتبر وہ شہادت ہو جاتی ہے۔ دوم یہ کہ کامل و مکمل مشاہدہ کرنے کے راستہ میں رکاوٹیں کم ہوں۔ یہاں قابلیتِ اعتبار اور مشاہدہ کرنے کے راستہ میں نسبتِ معکوس ہوا کرتی ہے۔ یعنی یہ کہ جس قدر کم یہ رکاوٹیں ہوتی ہیں، اُسی قدر زیادہ معتبر وہ شہادت ہوتی ہے۔ یہ شاذ ہی ہوتا ہے، کہ شہادت صرف ایک حادثہ یا ایک فرد کی محدود مشاہدہ کے اندر حادثات کے ایک سلسلہ تک محدود ہو۔ اکثر یہ ہوتا ہے، کہ جن واقعات کے متعلق شہادت دی جاتی ہے، انکو بسبب ترک، یا بوجہ وسعت، ایک شخص پوری طرح مشاہدہ کر ہی نہیں سکتا۔ ایک مورخ کسی محاصرہ کے چشمدید واقعات بیان کرتا ہے، اب اگر ہم صرف اُسی ایک شخص پر بھروسہ کریں، تو ظاہر ہے، کہ یہ تمام بیان بالکل غیر مسلسل اور جزئی ہوگا، کیونکہ اسکے لیے یہ ناممکن ہے، کہ وہ ایک ہی وقت میں حملہ کی تمام تفاصیل کا مشاہدہ کرے۔ ہو سکتا ہے، کہ اسکے فرائض کی ادائگی نے اسکو اتنی مہلت ہی نہ دی ہو، کہ وہ ہر جگہ پھرے، اور آنکھوں دیکھی باتیں بیان کرے۔ اسکے علاوہ بعض باتیں ایسی ہو جاتی ہیں، جو اُسوقت نظر نہیں آتیں، مثلاً قائدین کی روزانہ مشاورت۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے، کہ ہر ایک شخص کسی واقعہ کی تمام اہم باتوں کو معلوم نہیں کر سکتا۔ اسی وجہ سے عینی، یا بلا واسطہ شہادت کو خاص طور پر پرکھنے کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہ تحقیق کرنا پڑتا ہے، کہ شاہد نے اپنے آپ کو کہاں تک ان تمام نقائص سے بچایا ہے۔

بلا واسطہ شہادت کے معتبر ہونے کی تیسری شرط یہ ہے، کہ جو کچھ مشاہدہ میں آیا ہے، وہ پوری طرح اور صحت کے ساتھ یاد بھی رکھا گیا ہو۔ غلطی کے اس راستہ پر ہم اس سے قبل تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ یہ اس قسم کی دلدل ہے، کہ جس سے بمشکل کوئی شخص بچ سکتا ہے، فرق صرف اس قدر ہے کہ کوئی شخص کمر تک، یا اس سے بھی زیادہ اس میں پھنسا ہوتا ہے، اور کسی کا صرف پاؤں آلودہ ہوتا ہے، لیکن اس دلدل کے اثرات و نشانات ہر شخص پر پائے جانے لازمی ہیں بفرض محال اگر کوئی شخص ایسا مل بھی جائے تو اُسکی شہادت اُسوقت لایق یقین نہیں ہوتی، جب تک کہ وہ اپنے محفوظ مشاہدہ کو معقول اور غیر مبہم علامات کے ذریعہ سے ظاہر کرنے پر قادر نہ ہو، اور یہی چوتھی شرط ہے۔ ظاہر ہے، کہ دوسرے اشخاص اس مشاہدہ سے صرف اس صورت میں استفادہ کر سکتے ہیں، کہ انکو اسکی اطلاع ہو جائے۔ اگر یہ اطلاع مبہم

اور محل علامات کے ذریعے سے کی گئی ہے، تو اسکا ہونا اور نہ ہونا دونوں برابر ہیں - یعنی یہ کہ کوئی شخص اس سے استفادہ نہیں کر سکتا - دوسرے الفاظ میں شہادت کا مقصد فوت ہو جاتا ہے -

لیکن شہادت کے معتبر ہونے کی یہ شرائط پوری ہوتی ہیں یا نہیں؟ اس کا جواب ہم بالراست نہیں دے سکتے - پہلے کہیں ہم نے کہا ہے، کہ ہم انکو صرف شاہد کی صفات و خصائل کی بنا پر منتج کر سکتے ہیں - اسکا مطلب یہ ہے، کہ شہادت کی صحت کا صحیح اندازہ شاہد کی ذاتی سیرت کے تنقیدی علم سے ہو سکتا ہے - اسکی عقلی اور اخلاقی صفات، اور اسکے سوانح حیات ہمارے اس علم کے ماخذ ہوتے ہیں - لیکن اگر شاہد کی دیانتداری اور خلوص نیت قطعی اور ناقابل شک ہے، تو بلا واسطہ شہادت بے شبہہ بالواسطہ شہادت پر مرجح ہوگی - وجہ اسکی یہ ہے، کہ یہ شہادت صرف اس غرض سے دی جاتی ہے، کہ اُس واقعہ کی قطعیت ثابت ہو جائے، اور اس شاہد کی اہلیت پر کوئی اعتراض نہ ہو سکے - برخلاف اسکے اگر شاہد کی صداقت و ایمانداری مشکوک فیہ ہے، یا اگر مشتبہ ہے، بالواسطہ شہادت بلا واسطہ شہادت کے مقابلہ میں زیادہ قاطع اور قوی ہوگی، اس لیے، کہ واقعۂ مشہودہ کو ثابت کرنا اس قسم کی شہادت کی غایت نہیں - اسکی غایت کچھ اور ہی ہوا کرتی ہے - اس لحاظ سے اس واقعہ کی تکذیب کرنا اس شاہد کی نیت کا جزو نہیں ہوتا - اسکے مقابلہ میں اگر شاہد کی اہلیت و صداقت دونوں مسلم ہوں، تو ایک واقعہ کے متعلق ایک شاہد، یا بہت سے شاہدوں کا ہونا بالکل غیراہم ہے کیونکہ اس حالت میں ایک ہی شاہد کی شہادت کافی قطعی ہوتی ہے، اور اگر یہ دونوں صفات مشکوک ہوں تو جسقدر زیادہ شاہدوں کا باہم اتفاق ہوگا اُسی قدر زیادہ قابل اعتبار شہادت ہوگی لیکن اس ضمن میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جب ایک ہی واقعہ کے متعلق بہت سی شہادتیں ہوں، تو یا تو سب کی سب ایک دوسری سے متفق ہوں گی، یا مختلف - اگر تمام شاہد متفق ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کی صداقت و اہلیت مسلم و ناقابل شک ہے، تو وہ شہادت سب سے زیادہ قابل اعتبار ہوگی - لیکن اگر شاہدوں کا آپس میں اختلاف ہو، تو دو صورتیں ممکن ہیں - یا انکا تخالف سلبی ہوگا، یا ایجابی - تخالف سلبی اُسوقت ہوتا ہے، جب ایک شاہد کسی ایسے واقعہ کو بیان کرنے سے صریحاً پہلو تہی کرے، جسکو اوروں نے صاف الفاظ میں بیان کیا ہے، مثلاً کسی لڑائی کے متعلق بہت سی شہادتیں ہیں، ایک شاہد بیان کرتا ہے، کہ لڑائی میں بادشاہ مقتول ہوا - دوسرا شاہد شاہ کے قتل ہونے کا ذکر تک نہیں کرتا - اب دونوں میں یہ تخالف سلبی ہوگا - اسکے مقابلہ میں ایجابی تخالف اُسوقت ہوتا ہے، جب ایک شاہد دوسرے کے بیان کی صریحی تردید کرے، مثلاً اوپر کی مثال میں دوسرا شاہد نہایت شدومد کے ساتھ قتل شاہ سے انکار کرتے - جب شہادتوں میں

محض سلبی ہوا تو اس خاموشی کے بہت سے اسباب فرض کیے جا سکتے ہیں۔ لہذا محض اس خاموشی کی وجہ سے اس واقعہ کا انکار لازم نہیں آتا۔ لیکن جب یہ ثابت ہو جائے، کہ جس شاہد نے اس واقعہ کو بیان نہیں کیا وہ اسکے وقوع پذیر ہونے سے بیخبر نہ تھا، اور اسکے ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو جائے، کہ وہ اسکو نظر انداز کرنے سے فعل انسانی کی ممکن صورتوں سے انکار نہیں کرتا، تو صرف ایک ہی شاہد کی خاموشی سے باقی تمام شاہدوں کی قابلیت اعتبار کم ہو جاتی ہے۔ بعض صورتوں میں تو صرف اسی وجہ سے انکی شہادتیں بالکل غیر معتبر ہو جاتی ہیں۔ اگر یہ تخالف ایجابی ہے، تو اسکی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے، کیونکہ ظاہری اور بیّن تناقض محض خاموشی کی بنا پر عدم تصدیق کے مقابلہ میں، بالعموم اور بنفسہ زیادہ قوی ہوتا ہے۔ اب ایجابی تخالف کی پھر دو صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو اسکو رفع کیا جا سکتا ہے، یا یہ بالکل نا قابل رفع ہوتا ہے۔ مقدم الذکر صورت میں شہادت کی قابلیت اعتبار میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ شاہدوں کے تخالف کی توجیہ ان حالات سے کی جا سکتی ہے، جو شہادت کی تشریح کر سکتے ہیں، بغیر اسکے کہ اسکو غلط ثابت کریں۔ لیکن موخر الذکر حالت میں ہر ایک شہادت دوسری شہادت کو عیب ناک اور غیر معتبر بناتی ہے۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ اس قسم کی متناقض شہادتوں میں اگر باہمی تناقض ہے، تو یہ دونوں صحیح نہیں ہو سکتیں۔ ان میں سے ایک کا غلط ہونا لازمی ہے۔ اگر ان میں باہمی تضاد ہے، تو ممکن ہے، کہ دونوں غلط ہوں۔ جب صورت حالات ایسی ہو، تو متخالف شہادتوں کی زیادہ یا کم قابلیت کا سوال رہ جاتا ہے۔ اگر دونوں شاہد مساوی طور پر معتبر ہوں، تو دونوں شہادتوں کو مسترد کر دینا اولی و افضل ہے۔ اگر دونوں، بلحاظ معتبر ہونے کے مساوی نہ ہوں، تو جو شاہد زیادہ قابل اعتبار ہے، اُسکی شہادت بھی زیادہ معتبر سمجھی جائے گی، اور دوسرے کی غلط۔ اگر ایک شاہد معتبر ہو، اور دوسرا بالکل غیر معتبر، تو ظاہر ہے، کہ غیر معتبر کی شہادت بالکل بیکار ہے۔

یہاں تک بلا واسطہ شہادت سے بحث تھی۔ یاد ہوگا، کہ ہم نے پیچھے اس شہادت کو بالواسطہ کہا ہے، جس میں وہ واقعہ جسکے متعلق شہادت دی جا رہی ہے، خود شاہد کا تجربہ نہ ہو، بلکہ کسی اور شخص کا ہو۔ اس نوعیت کی شہادت کی قابلیت اعتبار مبنی ہوتی ہے اس بات پر، کہ بلا واسطہ اور بالواسطہ دونوں، شاہدوں کی اطلاع معتبر ہے۔ اب بلا واسطہ شاہد کی اطلاع کے معتبر ہونے کو ہم خود معلوم کر سکتے ہیں۔ یعنی اسکی دیانتداری و اہلیت کے متعلق اپنی واقفیت کی بنا پر اسکا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اگر ہم کو پوری طرح واقفیت ہے، کہ وہ راستباز ہے، اور یہ کہ اس خاص واقعہ کے مشاہدہ کرنے کا اہل بھی ہے، تو اُسکی شہادت بالکل معتبر کہی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے، کہ یہ شہادت ہر جگہ اور ہر شاہد کے متعلق میسر نہیں آتی۔ ایسی صورت میں

ہم اس شہادت کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے، ایسے موقعوں پر بالواسطہ شاہد بلاواسطہ شاہد کے معتبر ہونے کا ضامن ہوتا ہے، کیونکہ بالواسطہ شاہد میں بلاواسطہ شاہد کی قابلیت اعتبار کو جانچنے اور اسکی اطلاع کو بلاکم و کاست ابلاغ کرنے میں دیانتداری کو معلوم کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ وہ خود کسی ایسی شہادت کا راوی و ناقل بننا پسند نہیں کرتا، اور نہ کریگا، جسکا شاہد کسی حیثیت سے ناقص ہو۔ لیکن جب بالواسطہ اور بلاواسطہ دونوں شاہدوں کی ثقاہت کافی طور پر ثابت ہو چکی ہو، تو قابلیتِ اعتبار کے لحاظ سے دونوں نوع کی شہادتیں مساوی ہوتی ہیں۔ ہم یہاں تک کہہ سکتے ہیں، کہ اگر خود بالواسطہ شاہد بلاواسطہ شاہد کی شہادت کو جانچنے کا اہل ہے، تو اسکی شہادت سے بلاواسطہ شاہد کی تصدیق ہوتی ہے۔ ایک اور صورت یہ ہو سکتی ہے، کہ بلاواسطہ شاہد کی قابلیت اعتبار تو ناقابل انکار ہے، لیکن اس شہادت کا دوسرا راوی یا ناقل معتبر نہیں۔ اس حالت میں بالواسطہ شہادت بلحاظ استناد کے بلاواسطہ شہادت کے مقابلہ میں کمتر ہوتی ہے اور استناد کی یہ کمتری اسی نسبت سے ہوتی ہے جو دونوں شاہدوں کی قابلیت اعتبار میں ہے۔ بالواسطہ شاہد بلحاظ مکان و زمان قریب ہوتے ہیں یا بعید۔ پھر ان میں سے ہر ایک یا تو اپنی شہادت کے لیے کسی اور پر موقوف ہوتا ہے، یا غیر موقوف۔ بالعموم زمانۂ قریبہ کے شاہد زمانۂ بعیدہ کے شاہدوں کے مقابلہ میں، اور غیر موقوف شاہد موقوف شاہدوں کی نسبت، زیادہ معتبر ہوتے ہیں۔ زمانۂ بعیدہ کے شاہد اس صورت میں ناقابل اعتبار رہوتے ہیں، جب انکے اور اصل شاہد کے درمیان شاہدوں یا راویوں کا سلسلہ معدوم ہو، یا ناقص ہو۔ موقوف شاہد اسوقت بلحاظ استناد کمتر ہوتے ہیں، جب وہ بات، جس پر انکی شہادت موقوف ہے، غلط ہو، یا ابھی تک ثابت نہ ہوئی ہو۔ بلاواسطہ شہادتوں کی طرح، بالواسطہ شہادتیں بھی کبھی مستقیم ہوتی ہیں اور کبھی غیر مستقیم۔ اسی طرح جب بہت سے بالواسطہ شاہد ہوں، تو انکی شہادت یا تو متفق ہوتی ہے یا متخالف۔ دونوں صورتوں میں شاہدوں کی قابلیت اعتبار انھیں اصول سے جانچی جاتی ہے، جن کا ذکر بلاواسطہ شہادت کے ضمن میں ہوا ہے۔

بہت سے بالواسطہ شاہد، اگر ہمعصر ہیں، تو ان کی شہادت کو افواہ کہتے ہیں۔ اور اگر ہمعصر نہ ہوں، بلکہ بلحاظ زمان متعاقب ہوں، تو ان کی شہادت روایت کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ لیکن دونوں صورتوں کے لیے مشترکہ شرط یہ ہے، کہ ان کا کوئی مسلّم بلاواسطہ شاہد نہ ہو۔ پھر اگر جس بات کی افواہ ہو، یا جو بات روایت کی جائے، اُس کی تکذیب نسبتہً آسان، اور اس لیے نسبتہً ممکن ہو، تو انکی قابلیتِ اعتبار بھی اسی نسبت سے کم ہو جاتی ہے۔

یہاں تک تقریری شہادت کا ذکر ہوا ہے، لیکن شہادت دینے کا صرف یہی ایک طریقہ نہیں

لکہ اکثر اور بیشتر شہادتیں تحریری ہوتی ہیں۔ اُن کو جانچنے کے اصول ذرا مختلف ہیں، جن کا ذکر اگلی صحبت میں ہوگا۔

معتقد ولی الرحمٰن ایم اے
معلمِ فلسفہ، جامعہ عثمانیہ۔ حیدرآباد۔ دکن۔

عاشق کی التجا

اس عاشقِ بیتاب کو غم میں سسکتا چھوڑ کر
میرے دلِ صد چاک کو یوں ہی تڑپتا چھوڑ کر
سچ مچ چلی جائے گی تو؟ کیا پھر نہیں آئے گی تو؟
کہدے نہیں، کہدے نہیں!

اور آہ، کیا تو جائے گی؟ اُس دل کو تنہا چھوڑ کر
جس کی ہے تجھ سے زندگی تجھ بن ہے جو شمعِ سحر
جو تجھ پہ ہے ہر دم فدا پڑھتا ہے جو کلمہ ترا
کہدے نہیں، کہدے نہیں!

ہے آنکھ میں جلوہ ترا اور دل کو تجھ سے کام ہے
اس سر میں ہے سودا ترا اور لب پہ تیرا نام ہے
تیری قسم مجھ کو کہیں بھاتا نہیں کوئی حسیں
کہدے نہیں، کہدے نہیں!

ہاں ہاں جا میرا کہا بیکار کیوں بدنام ہو
میرے غم و اندوہ کا کیوں تجھ پہ کچھ الزام ہو
میری وفا کو جان کر اپنی جفا کو مان کر
کہدے نہیں کہدے نہیں!

جلیل قدوائی (علیگ)

زمانِ شرق کی ہمہ گیر بیداری

اس مضمون کو آئے ہوئے بہت عرصہ ہوا، مگر تلف ہو جانے کے باعث اس قدر دیر از وقت شایع ہو رہا ہے، جس کے لیے ہم مُلّا صاحب سے معذرت خواہ ہیں۔

سب ایڈیٹر

زمین کے وہ وسعت آباد حصے جو افریقہ و ایشیا کے دو بر اعظموں پر منقسم ہیں، اور جنھیں بر اعظم یورپ و امریکہ کے مقابل "مشرق" کہتے ہیں، آج سے صدیوں پہلے انسانی آبادی کے "نیم وحشی" اور "غیر متمدن" حصے سمجھے جاتے تھے، لیکن اس امر واقع سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، کہ عین اُسوقت جبکہ مغرب کی موجودہ تہذیب و شائستگی اور اُسکی ہمہ گیر رفعت و ترقی، اُسکی جہالت و بربریت کے تاریک ترین پردوں میں پوشیدہ تھی، یہی مشرق تھا جو انسانی تہذیب و ترقی، معاش و معاد، اور جہانگیری و جہانبانی کی درخشاں روایات کا جلوہ بردار بنا ہوا تھا۔ لیکن وقت آیا کہ مشرق کا یہی نور افگن و ضیا بار آفتاب جمود و بیخبری اور جہل و نادانی کی عمیق گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ اور ایک بڑھتی ہوئی تاریکی نے اسکی تمام افق تابانیوں کو گھیر لیا۔ شاید مشرقی زوال و برہمی کا یہ قدرتی لازمہ تھا کہ مغرب کی سوتی ہوئی قومیں نئی اور محیر العقول بیداریوں کے ساتھ اُٹھیں، اور انھوں نے مشرق کی تمام پچھلی تابناک روایات کو چھین لیا، اور نہ صرف یہی، بلکہ اُنھوں نے جراُت و الوالعزمی اور ذہنی تفوق کے ساتھ مشرق کی تمام ارضی وسعتوں کو فاتحانہ اقدام کے ساتھ روند ڈالا۔ اب مشرق دنیا کے اُن مقہور و مفتوح حصص ارضی میں شمار ہونے لگا جن کی عظمت و سطوت پر خدائے جلال و جلیل کا قہر و غضب نازل ہو کر اُنھیں کسی ذلیل ترین مخلوق کے زیر نگیں کر دیتا ہے۔ پس مشرق کا یہی وہ زوال تھا جسکے ساتھ اُس نے اپنی نکبت و غلامی کی کئی صدیاں گذار دیں۔ اور کوئی نہیں تھا، جو آج سے چند سال پہلے مشرق کے کھوئے ہوئے عروج و اقبال کے از سر نو جلوہ گر ہونے کی پیشگوئی کر سکتا۔ لیکن اسے نظام عالم کا ایک قدرتی انقلاب کہیے، کہ سنہ ۱۹۱۴ء کا وہ زمانہ آگیا جبکہ مغربی نظام اقتدار کی اُستوار بنیادیں جنبش میں آنے لگیں، اور سنہ ۱۹۱۶-۱۷-۱۸ء میں ایک غیبی بھونچال آیا جسنے یورپ کی کبھی نہ فنا ہونے والی متحدہ قوت کو "وردٌن" کی پہاڑیوں میں ٹکرا کر پاش پاش

کر دیا۔ اور "بلجیم" "سرویا" "رومانیہ" و "مانٹی نگرو" اور "روس وشمالی فرانس" کا وہ عظیم الشان جرمن فاتح فیلڈ مارشل وان ہنڈنبرگ، جسکی قہرمانی کمانڈ نے دنیاے امن وعافیت کو لرزہ بہ اندام کر دیا تھا، ایک مایوس وحرماں نصیب انسان کی طرح برلن واپس ہو گیا۔ "آسٹریا وہنگری" کے اندرونی خلفشار نے خاندان ہیپسبرگ کا خاتمہ کرکے جمہوری نظام حکومت کا علم بلند کر دیا۔ اور برلن سے وہ انسانِ اعظم قیصر ولیم جو ہلاکو اور چنگیز خانی قوتوں کا مالک بنا ہوا تھا، سوئٹزرلینڈ کی تاریکیوں میں بند کر دیا گیا، اور اس طرح مغرب کی یہ غلغلہ انداز باہم آویزی ختم وتمام ہو گئی جو "جنگ فرنگ" کے نام سے نمودار ہوئی تھی۔

اب حادثۂ فرنگ جہاں بہت سی ہلاکت باریاں اپنے ساتھ لایا تھا، وہاں وہ ایک دوسرے خطۂ ارضی کے دوبارہ عروج وارتقاء کے لیے حیرت انگیز اثرات بھی اپنے پیچھے چھوڑتا گیا، اور جنگ مذکور کے یہ وہ بقیہ اثرات تھے جنکے ذروں سے آج مشرق کا پھر وہی آفتاب طلوع کرتا دکھائی دے رہا ہے جو صدیوں سے گہن میں آ چکا تھا۔

آپ غور کیجیے کہ سنہ ۱۹۱۴ع سے پہلے مشرقی اقوام کے عروج وکامرانی اور اُنکی دوبارہ سربلندی و سرفرازی کا تصور بھی ایک مضحکہ خیز عقیدہ سمجھی جاتی تھی۔ لیکن یہ غلط ہے کہ مشرق کی تمام قوتیں سلب ہو چکی تھیں، اور وہ ایک کبھی دُور نہ ہونے والی گراں خوابی کا شکار ہو چکی تھیں، بلکہ اصل یہ ہے کہ مشرق عروج وترقی اور کمال وسرفرازی کی ان تمام وہبی قوتوں کو اپنے آغوش میں تربیت کر رہا تھا البتہ اُنکا نشوونما ایک غیر معمولی حادثہ کا منتظر تھا۔ لہذا حادثۂ فرنگ نے بیک جنبش اُن تمام پردہ پوش بیداریوں کو بے نقاب کر دیا جنکی جلوہ ریزیوں سے آج اُفق مشرق جگمگاتا نظر آتا ہے اور مشرق کی انھی غیر متوقع بیداریوں میں وہ ایک لطیف بیداری بھی جلوہ فرما ہے جسے مشرق کی صنفِ نازک سے تعلق ہے۔ اور آج مشرقی دماغ زنانِ شرق کی موجودہ بڑھتی ہوئی رَو میں انسانی عظمت وبرتری کی وہ تکمیل دیکھ رہے ہیں جو صنفِ نازک ہی کے ساتھ مخصوص ومتعلق ہے۔ اور وہ لوگ اب حیرت زدہ ہیں جو عورت کو حیاتِ اجتماعی کا ایک غیر ضروری جزء تصور کرتے تھے۔ وہ دیکھ رہے ہیں اور حیرت سے دیکھ رہے ہیں کہ مشرق کے ہر حصۂ ملک میں عورت مرد کے ہمدوش وہمرکاب حیات انسانی کے تمام شعبوں میں اپنی اُن خداداد قوتوں سے سرگرم عمل ہے، جو آج سے پہلے صرف مرد کا مخصوص ورثہ سمجھی جاتی تھیں۔

اب یہ معلوم کرنے کے لیے کہ زنانِ شرق نے صرف دوازدہ سالہ فرصت اور اپنے موجودہ محدود دائرۂ عمل میں کن مافوق الادراک کارناموں کا اظہار کیا، میں مشرق کے ہر ملک کی نسوانی بیداری کا ایک خلاصہ پیش کرتا ہوں:

خواتین ترکی

عہدِ رفتہ میں تو شاید عورت کی ترقی اور اُسکا منتہائے کمال چند خانگی اور معاشرتی کارگذاریوں اور ذمہ داریوں تک محدود تھا، لیکن عہدِ حاضر میں "تہذیب و تمدن" "سیاست و جہاں بانی"، اور سب سے آخر ملکی و قومی مدافعت کے خوں ریز و جرأت آزما فرائض کا بوجھ بھی اس نازک ترین ہستی کے ناتوان کاندھوں پر ڈال دیا گیا ہے، لہذا مذکورہ امور و ذمہ داریوں کی حیرت انگیز تکمیل و بجاآوری میں جو مرتبہ ترکی خواتین کو حاصل ہے وہ مشرق کی کسی دوسری قوم کو حاصل نہیں، اور میں اپنے انتہائی غور و مطالعہ کے بعد یہ کہنے کے لیے تیار ہوں کہ بہ اعتبارِ عمل مشرقی ممالک میں عورتوں کا جو کارکن طبقہ سب میں اوّلیت کا فخر حاصل کر چکا ہے وہ "زنانِ ترکی" ہیں۔

میں ترکی عورتوں کے عہدِ بیداری کی کسی قدیم ترین تاریخ کو دہرانا نہیں چاہتا، بلکہ یہ دکھلانے کے لیے کہ خواتینِ ترکی ہی زنانِ شرق کی موجودہ بیداری کی نقیب و رہنما ہیں، اُنکے اُس تاریخی مظاہرہ سے ابتدا کرتا ہوں جبکہ وہ ۱۹۱۲ء-۱۳ء کی مشہور جنگِ بلقان کی خونابہ فشانیوں میں ملک و ملت کے حفظ و دفاع کی خاطر میدانِ عمل میں گام زن ہوئیں اور ترکی قوم کی یہ وہ صاحبِ عزم و ثبات بیٹیاں تھیں جو عہدِ حمیدی میں تعلیم و تربیت اور تہذیب و عملیت کے جواہر سے آراستہ ہو چکی تھیں۔ جنگِ بلقان میں جب ترکی تہذیب و قومیت پر ریاستہائے بلقان نے متحدہ اور تباہ کن حملہ کیا تو ترکی عورتیں قومی مدافعت کے لیے مردانہ وار میدانِ عمل میں آگئیں، اور اُنھوں نے داخلی انتظامات کے ساتھ ساتھ میدانِ کارزار میں مردوں کی امداد کے لیے جماعتیں اور انجمنیں قائم کیں، اور ایک ایسا متحدہ نظامِ عمل وضع کیا جس کی ترتیب و تنظیم میں مردانہ اصولِ کار کی تمام تر تکمیل کی گئی تھی، ان جماعتوں کی سرگروہ خاتون وہی خالدہ خانم تھیں جن کے لیے صدرِ اعظم دولتِ عظمیٰ انگورہ حسین رؤف بے نے ایک موقع پر کہا تھا کہ:-

"مشرق نے کئی صدی کے بعد ایک عورت پیدا کی ہے، اور وہ خالدہ ادیب خانم ہیں"۔

خالدہ ادیب خانم اُسوقت "عثمانیہ زنانہ کالج" کی پروفیسر ادبیات و السنۂ مغرب تھیں۔ وہ اس سے پہلے ترکی میں حسبِ ذیل انجمنوں کی بنیاد رکھ چکی تھیں:- جمعیۃ اصلاحِ رسوم۔

جمعیۃ تبلیغ تعلیم - جمعیۃ پرورشِ اطفال، جمعیۃ امداد و اصلاح بیوگان و یتامیٰ، جمعیۃ حقوقِ نسواں، اب جو ملک و وطن پر حملہ ہوا، تو انھوں نے عورتوں کے ذریعہ ناموسِ وطن کی حفاظت اور اپنی قومی آزادی کی بقا کے لیے ذیل کی نسوانی جماعتیں بنائیں:-

(۱) انجمن تبلیغ و اشاعت - جو اندرونِ ملک تقریروں اور مظاہروں کے ذریعہ جنگی روح کو بیدار کرتی تھی - اس جمعیۃ کی صدر سیدہ فہیمہ نزہت خانم تھیں، جو عثمانیہ یونیورسٹی سے فن تاریخ میں اعلیٰ درجہ کی کامیابی حاصل کر چکی تھیں، اور اسوقت ترکی اخبار "عالمِ نسواں" کی ایڈیٹر تھیں، اسی جماعت کی ایک شاخ اہلِ قلم خواتین پر مشتمل تھی، جو تحریر کے ذریعہ تمام دنیا سے استمداد کرتی تھی -

(۲) انجمن خدامِ جنگ - اس جماعت میں وہ عورتیں شریک تھیں جو مجروحین کی خدمات انجام دیتی تھیں، اور اس مجلس کی صدر کلثوم خانم تھیں، جو سینٹ پٹیرس برگ یونیورسٹی کی اعلےٰ گریجویٹ تھیں -

(۳) انجمن بار برداری و متفرقات - اس جماعت کے متعلق متفرق خدمات تھیں، اور اسکی صدر فاطمہ خانم تھیں - جنھوں نے معاشیات کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی، اور اخبار عالمِ نسواں کی نائب مدیر تھیں -

(۴) انجمن تلمیذاتِ عثمانی - یہ جماعت دارِ نسوانیہ کی طالبات پر مشتمل تھی، جو علاوہ متفرق خدمات کے مردوں کو میدانِ جنگ کے لیے ابھارتی تھی، ان لڑکیوں کی انجمن کی صدر سیدہ نقیہ خانم تھیں، جو انسپکٹر تعلیمات نسواں رہ چکی تھیں

مذکورہ انجمنوں نے ترکی قوم کی جو خدمات انجام دیں اور ملک و ملت کو جن مصائب و خطرات سے بچایا، انکی تفصیلات سے قطع نظر ترکی خواتین کے ایک ایسے تاریخی جلسہ کا خلاصہ پیش کرتا ہوں جسکے حاضرین میں صرف عورتوں کی تعداد چھ ہزار تھی، اس جلسہ میں ترکی عورتوں کی اعلیٰ تعلیم یافتہ، پروفیسر، ایڈیٹر، اور لیکچرار عورتوں کی ایک کافی تعداد موجود تھی، جو ترکی عورتوں کی تمدنی اور قومی بیداری کی تصدیق کرتی تھی - ان میں نگار خانم مشہور ترکستانی شاعرہ جنکا ایک دیوان خاکسار راقم الحروف کے پاس موجود ہے، امیرہ نعمت خانم، حلیمہ سعدی خانم، جمیلہ محمود خانم، اور فہیمہ نزہت خانم ایڈیٹر عالمِ نسواں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں - ان فضیلت پناہ ترکی خواتین کے اُن کارناموں کو اگر میں یہاں نقل کر دوں، جن سے "عثمانی سرکاری رپورٹیں" اور بعض ترکی مطبوعات بھرے پڑے ہیں، تو ہیجان و ولولہ انگیزی کا ایک طوفان اُمنڈ سکتا ہے، لیکن جلسہ مذکور میں فہیمہ نزہت خانم ایڈیٹر عالمِ نسواں

کی ایک ایسی تقریر کے چند الفاظ پیش کرتا ہوں جسکا ایک ایک فقرہ حیات و کامرانی، اور مصائب کے وقت جرأت و شہامت، اور مردہ دلوں کی گرمی کے لیے اپنے اندر سیکڑوں شعلہ سامانیاں لیے ہوئے ہے۔ عثمانی قوم کی یہ صاحبِ علم و تاریخ خاتون طلبۂ عام میں مَردوں اور عورتوں کو مخاطب کرکے اپنی قومی حمیت اور تاریخی معلومات کے جواہر ریزے اس طرح بکھیرتی ہے:

"تم میں سے ہر فرد جانتا ہے کہ ہمارے اجداد نے یورپ کی چالیس ملین آبادی پر حکمرانی کا جھنڈا اُڑایا ہے، تم اگر توپ و تفنگ سے بھی سوال کروگے کہ جنگ و نبرد آزمائی کے ابطال و اقطاب کون ہیں؟ تو وہ جواب دیں گے "عثمانی" جن کی خارا شگاف تلواریں دشمنوں کے سینوں میں درآنے کے لیے میانوں کی تنگ دامانی میں تڑپتی رہتی تھیں۔

جاؤ۔ وائنا کے قلعوں کی سیر کرو، ایشیا میں گشت لگاؤ، تمھیں ہر جگہ اپنے آبا و اجداد کے مناقب منقوش نظر آئیں گے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ تاریخ بوتونیا عثمانیوں کی شجاعت کی تابناک شہادت ہے۔ اگر شاہ سویڈن شارل دوازدھم اپنی قبر سے اُٹھکر آسکتا تو وہ اسوقت بھی تمھارے سامنے سرخمیدہ ہوکر عثمانی عظمتوں کا اعتراف کرتا۔ ہم تاریخی مسلم الثبوت شجاعوں کی اولاد ہیں جن پر دشمن حملہ کرنے میں اب بھی سہم جاتے ہیں۔ باوجودیکہ کعبۃ اللہ کی خدمت، اور شام و بغداد، بلادِ عرب اور اناطولیہ ہمارے زیرِ امارت ہیں، لیکن پھر بھی تمھارے دل بیقرار اور مُنہ اُترے ہوے ہیں، اے غیور عثمانیو۔ ایسا نہ ہو کہ دشمن تمھارے اس ہراس سے فائدہ اُٹھائے۔ لہذا تم اُس پر ثابت کردو کہ ہمارے چہروں پر ہراس و بے خونی کے اثرات نہیں، بلکہ ہمارے آبا و اجداد کے خون کا عکس ہے جسنے ہمارے چہروں کو سرخ بنا دیا ہے۔

اُٹھو۔ اور ایک مرتبہ بلغاری بزدلوں کو پھر بتلا دو کہ ہم اُن غیور عثمانیوں کی اولاد ہیں جنھوں نے مغرب کی تمام عظمتوں کو بیزانطائن میں دفن کر دیا تھا۔" (مقتبس از الشعب مصر القاہرہ - ۷ فروری ۱۹۱۳ء)

ترکی خواتین کا عہد اول ختم ہوگیا۔ ۴۔ اگست ۱۹۱۴ء کو یورپ کی وہ ہولناک جنگ شروع ہوئی، جسکے برہم کن اثرات سے آج بھی دنیا کو رستگاری نصیب نہیں۔ لیکن جنگ مذکورہ کی ان تمام ہلاکت بار آویزشوں نے ترکی خواتین کی عملیت کو متاثر نہیں کیا، بلکہ وہ اسی حادثہ میں تعلیم و معاش کے شعبوں میں مصروف رہیں، اُنکی تمام انجمنیں اُسی اطمینان سے کام لیتی رہیں۔ جس وقت جرمنی نے اعلانِ جنگ کیا اور اسکی ٹڈی دَل فوجوں کے اقدام سے مملکت بلجیم کا چپہ چپہ دہل رہا تھا،

ترکی خواتین ایک سو کی تعداد میں جرمن درسگاہوں میں ترکی حکومت کے وظائف سے تعلیم پا رہی تھیں۔ سینٹ پٹیرسبرگ یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم ترکی خواتین کی تعداد (۱۴۰) تھی۔ وہ سیاسی مراعات کے حصول میں قدرے کامیابی حاصل کر چکی تھیں۔ نوجوان ترکی پارٹی کے بیدار مغز رہنما نسوانی تعلیم کے لیے حوصلہ افزا جد و جہد سے کام لے رہے تھے۔ یہاں تک کہ جس وقت ۱۹۱۶ء میں عراقی حدود میں ترکی و انگریزی معرکہ آرائی ہوئی تو ترکی عورتوں کی ایک ذی حوصلہ جماعت میدان جہاد میں نکل آئی، اُنکی تمام اصلاحی مجلسیں دفاعِ وطن کی خدمات میں مصروف ہو گئیں، اُنھوں نے دنیائے تہذیب میں اپنی حیرت انگیز خدمات سے نہایت بیدار کن اثرات پیدا کیے، اُسوقت بھی ترکی خواتین کی مشہور قائدہ خالدہ ادیب خانم وزارتِ جنگ کا ہاتھ بٹانے میں مصروف تھی۔ چنانچہ ۱۹۱۷ء میں ممدوحہ نے ترکی فوجوں میں جذباتِ جہاد پیدا کرنے کے لیے ایک معرکۃ الارا ناول لکھا۔ جو وزارت جنگ کی طرف سے ہزاروں کی تعداد میں شایع ہو کر فوجوں میں تقسیم کیا گیا، اور جس وقت برطانی فوجوں نے مقام غازہ کی ترکی خندقوں کو فتح کیا، تو اُن میں اس ناول کے سیکڑوں نسخے پائے گئے تھے۔

اب ۱۹۱۹ء میں اتحادی فوجوں نے ترکی حکومت کے دار الصدر قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا اور ایشیائے کوچک کا زرخیز علاقہ یونان کے قبضہ میں دیدیا گیا جسکے اثر سے انگورہ میں ترکی احرار کی تحریک وطنی کا آغاز ہوا، اور ترکی خواتین جوق جوق حفظِ وطن کے لیے میدان عمل میں پھر گامزن نظر آنے لگیں، مارشل مصطفےٰ کمال پاشا نے ترکی خواتین کی بیداری اور حب وطن کے جذبات سے کام لیکر جسوقت میدانِ جنگ میں ترکی خواتین کو شرکتِ عمل کی دعوت دی تو خالدہ خانم ہی سب سے پیش پیش نظر آتی تھیں۔ وہ اپنی خداداد قابلیت کی بنا پر اپریل ۱۹۲۰ء والی پہلی انگورہ وزارت میں وزیرِ تعلیمات مقرر ہوئیں اور ستمبر ۱۹۲۱ء میں وہ مشہور یونانی حملہ میں خواتین کے ایک جرار لشکر کے ساتھ انگورہ کی حفاظت کے لیے میدان جنگ میں خدمات انجام دیتی رہیں۔ اناطولیہ میں ترکی زنانہ لشکروں کی تحریک پر تمام عورتیں شریکِ جہاد ہوئیں، جن میں میجر عائشہ خانم، لفٹنٹ فاطمہ خانم اور کمانڈر انچیف خالدہ خانم کی نبرد آزمائی کی تہلکہ انداز شہرت ابدالاباد تک قائم رہیگی۔ یہ بہادر ترکی عورتیں اس وطنی جہاد میں اسی ہزار کی تعداد میں شریک ہوئی تھیں، اور آخر اگست ۱۹۲۲ء میں مارشل مصطفےٰ کمال پاشا نے سمرنا پر جو تاریخی حملہ کیا، اُنکے لشکروں کے عقب میں زنانے لشکر ہی پیشقدمی سے مصروف پائے گئے۔ ان میدانی مجاہدات کے ساتھ ہی جو صاحب فضل و کمال خواتین حکومت انگورہ کے دوسرے محاکم انتظامی میں کام کر رہی تھیں اُنکی تعداد حسب ذیل تھی:

۱-	محکمۂ تعلیمات عامہ	۳۵،
۲-	شفاخانے	۱۴،۹۳
۳-	محکمہ ٹیلیگرافات	۳۰۱
۴-	باربرداری	۹۵۹
۵-	متفرق دفاتر	۵۰۴۳

(مقتبس از خواتین انگورہ۔ مطبوعہ دائرۂ ادبیہ لکھنؤ۔ صفحہ ۹)

تحریک انگورہ کے بعد عین اس حالت میں جبکہ کامل دس سال کی متواتر معرکہ آرائیوں کے بعد بھی ابھی ترکی فوجوں نے ہتھیار نہیں کھولے تھے، ذی حوصلہ ترکی خواتین، تمدنی، معاشی، علمی و ملکی اصلاحات میں مردوں سے آگے سرگرم عمل نظر آنے لگیں۔ فیلڈ مارشل مصطفےٰ کمال پاشا کی کارکن گروہ سے زیادہ بیدار مغز جماعت نے ترکی خواتین کے نئے عمل سے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے انھیں مراعات و ترقی کے تمام وسائل بہم پہونچائے۔ ۱۷۔ فروری ۱۹۲۳ء کو سمرنا میں ترکی خواتین کی علمی و اصلاحی سرگرمی کا وہ زبردست مظاہرہ ہوا جسکی عملیت اور رہنمائی پر مشرق کے بڑے بڑے مدبرین عش عش کر اٹھے۔ سمرنا میں فیلڈ مارشل کاظم قرہ بکر پاشا فاتح آرمینیا ترکی کی صدارت میں اقتصادی کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا، جسکے متعدد دور تین دن تک تجاویز و لوائح عمل مرتب کرتے رہے۔ اس کانفرنس میں ترکی خواتین نے جو زبردست حصہ لیا اسکا ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ اس میں ترکی خواتین کی تنہا نمایندہ عورتوں کی تعداد ۵۰۰ تھی۔ ان نمایندہ عورتوں نے اقتصاد و معاد کے اہم شعبوں کے لیے (۱۳) مسودے اور (۱۷) تجاویز پیش کیں۔ شادی سے لیکر طلاق و تعدد ازدواج تعلیم، حفظانِ صحت، سیاسیات اور پرورش اطفال کے مہتم بالشان مسائل حل کیے گئے۔

۱۹۲۴ء میں قسطنطنیہ کے مشہور لیکچر ہال (ترک اوجاغی) میں ترکی خواتین کا دوسرا مظاہرہ ہوا، جہاں نسوانی امور خانہ داری کی تنظیم و اصلاح اور فرائض کی ترمیم و تشکیل کے لیے ترکی خواتین کی وہ عظیم الشان کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ترکی حکومت کے بڑے بڑے وزراء، ایڈیٹر، مصور، اور عوام کے نمایندے موجود تھے۔ اس کانفرنس میں ترکی عورتوں کی تعداد تین ہزار تھی۔ اور اس عظیم الشان کانفرنس کی صدر علامہ زبیدہ محی الدین خانم تھیں، انکی زیر صدارت متعدد مسائل پیش کیے گئے، جن میں سے بعض یہ تھے:

(۱)　امور خانہ داری کی تنظیم

(۲) مرد و عورت کے فرائض کی تقسیم
(۳) نسوانی حقوق و مطالبات کی تعیین
(۴) حق تلفیوں پر احتجاج
(۵) تعدد و طلاق کی اصلاح
(۶) زنانہ جرائد و رسائل کا اجراء

ان عظیم و مہتم بالشان مسائل کے حل کے لیے ترکی خواتین کی جو کمیٹی اس کانفرنس نے مقرر و منتخب کی تھی، اور جس نے بڑی قابلیت سے ان امور کا حل قوانین و ضوابط کی صورت میں مرتب کر کے کانفرنس کے عام اجلاس میں پیش کیا وہ یہ تھیں:۔

خالدہ ادیب خانم وزیر تعلیمات انگورہ، صبحیہ زکریا خانم، نقیہ خانم، عزیزہ خانم، زاہیہ محی الدین خانم، کانفرنس مذکور میں حسب ذیل خواتین خاص طور پر قابل ذکر و تعارف ہیں۔ بیگم حکمت خانم حکمت خانم مشہور ترکی صحافی ڈاکٹر احمد احسان بے اڈیٹر "ثروت و فنون" کی صاحبزادی ہیں جنھوں نے زنانہ امریکن کالج میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے "ثروت و فنون" ترکی زبان کا وہ مجلۂ علمیہ ہے، جس کی دیدہ زیبی اور معارف پروری میں ہندوستان کا ایک پرچہ بھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ "ثروت فنون" کے باصرہ نواز تین پرچے راقم الحروف کو مارچ ۱۹۲۳ء میں بمقام بمبئی اپنے ایک ترکی دوست سے حاصل ہوے تھے جو بلحاظ مضامین و طباعت اپنا جواب نہیں رکھتے۔ صبحیہ زکریا خانم جو واشنگٹن کالج کی اعلیٰ گریجویٹ ہیں۔ عزیزہ قبرسی خانم، جو مصطفےٰ پاشا کی صاحبزادی اور زنانہ ٹرینگ کالج کی پرنسپل ہیں۔ نازلی وکلیہ خانم آپ فرانسیسی زبان کی ادیب اور زبردست مقررہ ہیں۔ آپ کے والد ولی شمسی بے کسی زمانہ میں پیرس میں ترکی سفیر مختار رہ چکے ہیں۔ سعدی خلیل خانم، جو ہز اکسیلنسی خلیل ادہم پاشا ڈائرکٹر جنرل شاہی عجائب خانہ کی صاحبزادی ہیں۔

یہ تو وہ حالات تھے جو ترکی خواتین کی ذاتی عملیت اور کوششوں سے متعلق تھے، اب ترکی حکومت اپنی عورتوں کو تہذیب و ترقی کے جو مدارج طے کرا رہی ہے، اسکی تفصیل یہ ہے کہ ملک میں کثیر التعداد زنانہ درسگاہیں قائم کی گئی ہیں۔ تمام زنانہ مدارس میں فرنچ، انگریزی، جرمنی زبانیں پڑھائی جاتی ہیں جن میں فرنچ و انگریزی لازمی ہے۔ فنون لطیفہ کے متعلق اسکولوں کے ساتھ ایک زنانہ ٹرینگ کالج بھی ہے، جسکی تمام عہدہ دار ترکی عورتیں ہیں جنھوں نے یورپ سے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ زنانہ ہائی اسکولس میں جو نصاب رائج ہے اُس کا ایک حصہ یہ ہے:

علم حفظانِ صحت، تربیت اطفال و امورِ خانہ داری، تاریخ علم الاجتماع، علم الاقتصاد، سیاسیات و مذہبیات[۱]۔

ترکی خواتین کی علمی و سیاسی بیداری کے یہ وہ مختصر حالات ہیں جنھوں نے اس قلیل عرصہ میں مشرق کی تمام عورتوں میں قومیت اور عملیت کی ایک نئی روح پیدا کردی ہے، اور آج جو مشرق کے ہر گوشہ سے نسوانی تحریکات کی آواز سنائی دیتی ہے وہ انھیں بیدار مغز اور روشن خیال ترکی عورتوں کے عمل کی صدائے بازگشت ہے۔

خواتینِ روس مملکت روس مشرق کی وہ عظیم الشان حکومت ہے، جسکے متعلق کبھی یہ مشہور تھا کہ اُسکی حدود میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا، ۱۹۱۷ء کے انقلاب نے اسکے شاہنشاہی اقتدار کو ملیا میٹ کرکے ایک نئے قومی دَور کا آغاز کیا۔ جس کا بانی کامریڈ لینن تھا۔ عہد انقلاب سے قبل روسی قوم کی حالت ایک غلام اور ماتحت قوم سے کچھ زیادہ نہ تھی، جو شاہی خاندان کی مستبدانہ پالیسی کے تحت ذلت و زوال کی عمیق غار میں پڑی زندگی کے دن گزار رہی تھی، باوجودیکہ روسی جماعتوں میں "کاسک" ایسی زندہ اور جنگجو قوم کے افراد ترقی کی طرف زبردست میلان رکھتے تھے مصلحین روس قومی اصلاح و ترقی کے لیے سرگرم عمل تھے، مختلف الخیال جماعتوں میں وحدت پیدا کی جا رہی تھی اسلامی آبادی میں خصوصیت سے تنظیم و ترقی کے اثرات موجود تھے جو سینٹ پٹرسبرگ کی استبدادی طاقت کے خلاف متعدد مظاہرے کر چکی تھی، لیکن روسی جماعتوں کی یہ تمام جدوجہد "زاریت" کی جابرانہ پالیسی کی شکار ہو رہی تھی، اور کوئی نہیں تھا جو قومیت اور بیداری کے لیے ان مستبدانہ حدود سے آگے قدم بڑھاتا، لیکن وقت آیا کہ قدرت نے ان تمام اندرونی بے چینیوں اور مغلوب قوتوں کے لیے ایک راستہ پیدا کردیا ۱۹۱۴ء میں جب آسٹریا نے سرویہ پر حملہ آور ہونے کا اعلان کیا تو زار کی گورنمنٹ نے سرویہ کی حمایت میں اپنی فوجوں کو گلیشیا میں جنگ آزما ہونے کا حکم دیدیا، اُدھر آسٹریا کی حمایت میں جرمن اپنی قہار فوجوں کے ساتھ روسی فوجوں پر ٹوٹ پڑا۔ لیکن اس حادثہ سے زار کی عشرت پسند زندگی میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی، البتہ روسی قوم میں حفظ وطن و قومی استقلال کا ایک طاقتور جذبہ پیدا ہوا جو اُسکی آنے والی ترقی کا پیش خیمہ تھا۔ پس انھیں حوادث و حالات کے ساتھ خواتین اُٹھیں اور انھوں نے

[۱] ان حالات میں سے بعض کے لیے دیکھو۔ وطن قسطنطنیہ، شہبال قسطنطنیہ، تفاذلی دنیا سی، المرأة الجدیدة، بیروت۔ المقتطف مصر۔

سب سے پہلے وطنی مدافعت کے فرض کو ادا کرنے کا تہیہ کرلیا۔ وہ ماسکو و ژماتسک، ریگا، والگا سے جوق جوق میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہونے لگیں جنکی ہراول کاسک خواتین تھیں۔ خواتین روس نے ملکی مدافعت کے لیے جو مردانہ وار اور خونریز مظاہرہ کیا اُس نے روسی مردوں میں غیرت وحبِ وطن کے جذبات کو بے انتہا مشتعل کردیا۔ ان بہادر روسی عورتوں نے میدانِ جنگ کے متعدد مواقع پر اپنی جاں نثاری کے ثبوت دیے، جن میں اگستوو کا میدانِ قتال خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ یہ عورتیں میدانِ جنگ کے سوا محکمۂ باربرداری، ٹیلیفون، اور جاسوسی کے فرائض میں بجید کارآمد ثابت ہوئیں۔ جن روسی عورتوں نے زنانہ لشکروں کو میدانِ جنگ میں لڑایا اُن میں سے بعض کے نام یہ ہیں، ہیلن چوبہ، ٹامل آفسکیہ، یہ مشرقی پروشیا کی زنانہ فوجوں کی کمانڈر تھی اور اسکے تین زخم کاری لگے تھے۔ اسکانو۔ یہ ماسکو کے ایک کمانڈ افسر کی بیوی تھی، جو کوزنٹز رجمنٹ کی کمانڈ کر رہی تھی۔

روسی خواتین کی مردانہ وار کارگزاریوں کے ساتھ روس کی وہ مسلمان خواتین ہیں جن کی بیداری اور جد وجہد کا لطیف ترین پہلو اُن کا ملکی اور اصلاحی معاملات میں دخیل ہونا ہے۔ گو روسی مسلم خواتین کی بیداری نہایت قدیم ہے اور مفتی موسیٰ جاراللہ اور مفتی عالم جان ایسے مسلمان مصلحین اور زعماء کی جد وجہد نے روسی خواتین اسلام کے لیے ترقی و تمدن اور تعلیم و تہذیب کی تمام راہیں پہلے ہی صاف کر دی تھیں، لیکن زاریت کے تباہ کن اثرات نے انھیں عملی مواقع سے روک دیا تھا۔ آخر ۱۹۱۷ء کے انقلاب نے ان عورتوں کو سرگرمی کا ایک ہمت آزما موقع بہم پہونچایا، اور وہ نہایت جوش کے ساتھ میدانِ عمل میں اُتر آئیں۔ پٹروگراڈ، وارسا، بخارا، طفلس، کوہ قاف، کریمیا اور یورال میں ایک نسوانی تحریک کا آغاز ہوا، جسکا مقام اتحاد ۱۹۲۱ء میں علاقہ ماوراء النہر قرار پایا تھا جہاں روسی مسلم خواتین کی ایک متحدہ کانفرنس منعقد ہوئی جسنے مسلم خواتین کی اصلاحی، تعلیمی، اور معاشی زندگی کے تمام حالات کو منتظم کرنے کے لیے ضوابط بنائے۔ اس کانفرنس کے سب سے اہم مقاصد میں اشاعتِ تعلیم کا مقصد نہایت ممتاز و نمایاں تھا۔ اس کانفرنس نے جو رزولیوشن حکومت مرکزیہ کے پاس ارسال کیے وہ یہ تھے۔

(۱) تعدد ازدواج کی کمی کے اسباب

(۲) کم عمری کی شادی کا انسداد

(۳) شادی کے مواقع پر مضر مراسم کا انسداد

یہ تجاویز روس کو اطلاعاً بھیجی گئی تھیں اور انکے نفاذ و اجراء اور عمل کے لیے خود ان عورتوں نے متعدد کمیٹیاں بنائی تھیں۔ ان کمیٹیوں میں سب سے نمایاں اور کارکن کمیٹیاں داغستان، آذربائیجان، کریمیا، اور کوہ قاف کی تھیں، جنکا صدر مقام سمفرا پول تھا۔ ان کمیٹیوں نے تعلیم کا نہایت زبردست پروپیگنڈا کیا، جسکی وجہ سے تمام اسکول اور کالج لڑکیوں سے پُر نظر آنے لگے ۱۹۲۱ء میں ماسکو کانگریس میں مسلم خواتین کی نمایندہ جماعت کی تعداد ۲۵۵ تھی۔

آج روسی مسلم خواتین کی مذکورہ بیداری کو فروغ دینے والی اور رہنما مسلم خواتین یہ ہیں: الہیۂ اسمٰعیل مصنفر لقی ایڈیٹر ترجمان حقیقت، صدر انجمن اصلاح خواتین روس، بیگم عائشہ اسکودا خانم صدر جمعیۃ تہذیب نسواں، داغستان۔ بیگم دل آرا بلگا کو داخانم، بیگم الیا سہ کمارو اخانم۔ ان حالات کے ساتھ آج روسی قوم کی عورتیں ملکی و اصلاحی معاملات سے لیکر امور خانہ داری تک کے تمام مسائل میں مردوں کے دوش بدوش مصروف عمل نظر آرہی ہیں، اور گو مخالفین بالشویک اس امر کو ثابت کرنے میں کوشاں ہیں کہ بالشویک حکومت "عورت" کے حقوق کو نہایت بیدردی سے پامال کر رہی ہے، لیکن حالات اس کے سراسر خلاف ہیں بلکہ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ طبعی ارتقاء کی زبردست رَو خواتین روس کے ان بیدارکن حالات کو ایک دن دنیا کے سامنے بے نقاب کرکے رہیگی[۱]۔

خواتین مصر

ممالک مشرق میں مملکت مصر تہذیب و تمدن، فنون و معارف، اور نظم و سیاست کی نہایت قدیم روایات کی حامل حکومت ہے، لیکن جسوقت سے مصری قوم کی گردن میں انگریزی غلامی کا جوا ڈالدیا گیا، اور اس کی قومی خصوصیات فنا ہونے لگیں۔ اسکے سیاسی و ملکی حقوق سلب کیے جانے لگے۔ اس نے جنگ یورپ میں انگریزوں کی امداد کیلیے دس لاکھ قومی نوجوان میدان جنگ کی بھینٹ چڑھا دیے، لیکن ان تمام قربانیوں کا بدلہ یہ ملا کہ حقوق طلبی کے جائز اور آئینی مظاہرات مارشل لا اور مشین گنوں کے فیر سے روکدیے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نوجوان مصری ملک کو غلامی کی لعنت کو یکسر فنا کر دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوے اور انکے ساتھ ان کی مجاہد و اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین بھی میدان عمل میں آگئیں۔ مصر کی یہ وہ عورتیں تھیں جو باعتبار تعلیم و تہذیب تمام مشرقی ممالک میں دوسرا درجہ رکھتی ہیں۔ مصری عورتوں نے اپنی انجمنوں کی بنیادیں استوار کیں، اخبارات و رسائل جاری کیے، تحریر و تقریر سے ملکی نوجوانوں کو ملکی آزادی کے لیے ابھارا، انگریزوں سے مقاطعہ کی تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے بے انتہا مستعدی سے کام لیا، متعدد وفود

[۱] ان حالات کے اقتباس کے لیے دیکھو اسٹیٹسمین کلکتہ مورخہ ۱۴ دسمبر ۱۹۲۴ء البرید کانپور مورخہ یکم دسمبر ۱۹۲۲ء المرأۃ الجدیدہ اپریل و مارچ ۱۹۲۲ء

کے ذریعہ اُنھوں نے ملکی آزادی کا مطالبہ پیش کیا۔ غرض ایک عام بیداری تھی جو مصر کی ہر تعلیم یافتہ اور نیم تعلیم یافتہ عورت میں نمو پذیر نظر آنے لگی۔ مصلحین نے ایک صدر انجمن نسواں کی بنیاد ڈالی اور اسکی جو متعدد شاخیں ملک میں اسوقت بھی مصروفِ عمل ہیں اُنکی تعداد (۱۱) ہے۔ انھوں نے تعلیم و تربیت کے لیے اپنی ہزاروں لڑکیاں اسکولوں میں داخل کرائیں، جسکے متعلق مصری حکومت کے سرکاری اعداد یہ ہیں: ابتدائی اسکولوں میں (۴۶۵۸۲) سرکاری اسکولوں میں (۷۶۹۰) صوبوں کی پرائیوٹ مجالس کے اسکولوں میں (۷۵۹۲) لڑکیاں زیرِ تعلیم ہیں[۱]۔

مصری خواتین نے اپنی فضیلت و روشن خیالی کا سب سے بڑا ثبوت اُسوقت دیا جبکہ ۱۹۲۳ء میں اُنکا ایک زنانہ وفد اٹلی کی مشہور زنانہ کانفرنس میں شریک ہوا، جہاں مصری خواتین نے مغربی خواتین کو مشرقی عالم نسواں کی روزافزوں ترقی اور حیرت انگیز بیداری کے اعتراف پر مجبور کرتے ہوئے تمام مغربی خواتین کے اُن شکوک کو رفع کیا جو اُنھیں مشرقی عورتوں کے متعلق عرصہ سے متفکر بنائے ہوئے تھے۔

مملکتِ مصر کے سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں اسوقت جس قدر لڑکیاں تعلیم حاصل کر رہی ہیں اُن میں [۱] قانون، فلسفہ، معاشیات، مذہب و تاریخ، اور صحافیات کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی ہیں، بکثرت عورتیں ایڈیٹر اور ناول نگار ہیں، جو اعلیٰ اخبارات و رسائل کے ذریعہ ملک و قوم کی خدمت میں مصروف ہیں، اُنھوں نے ملکی آزادی کے لیے اکثر خونبار قربانیاں بھی پیش کی ہیں، اُنھوں نے انگریزی فوجوں اور توپ خانوں کی موجودگی میں تمام ملکی مظاہرات میں حصہ لیا، اُن میں سے متعدد خواتین اسوقت بھی سیاسی محاکم میں کام کر رہی ہیں، اور وہ کسی طرح دنیا کی مہذب ترین خواتین سے پیچھے نہیں ہیں، اور اُن میں ڈاکٹر، ایڈیٹر، قانون داں، فلسفی، مورخ اور شاعر، غرض سب ہی کچھ موجود ہیں جو مصری مطبوعات و صحائف ہی کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ مصری خواتین کی موجودہ سرگرمیوں اور کامیاب بیداری کی روح رواں حسب ذیل خواتین ہیں: بیگم صفیہ زغلول خانم، بیگم ہدیٰ شعراویہ خانم، آنسہ می، بیگم عائشہ خانم، بیگم بہاء الدین وغیرہ ۔ . . . .

یہ ممتاز مصری خواتین ہیں جو انگریزی، فرانسیسی، ترکی، اور جرمنی زبانوں کی ماہر اور بعض مصری یونیورسٹی کی فارغ التحصیل ہیں۔ یہ معزز خواتین اپنے قلم اور اپنے دماغ کی بہترین اور قابلِ تحسین قوتوں سے مصری خواتین کی اصلاح و ترقی میں ہمہ تن مصروف رہتی ہیں۔

---

[۱] مجلہ معارف جلد ۱۸، ص جولائی ۱۹۲۶ء

بیگم صفیہ زغلول خانم، حضرۃ سعد اللہ زغلول وزیر اعظم اور قائد اعظم مصر کی اہلیہ ہیں۔ آپ اپنے موقر شوہر کے ساتھ عرصہ سے مصری خواتین کی رہنمائی فرما رہی ہیں، وہ عربی، فرنچ اور ترکی زبانوں کی ماہر ہیں۔

بیگم ہدیٰ شعراویہ خانم مشہور شعراوی پاشا کی بیوی ہیں، جو عربی، فرنچ، انگریزی اور ترکی زبانوں میں کامل دستگاہ رکھتی ہیں۔ اور متحدہ مملکت مصر کی مرکزی جمعیۃ النسواں کی صدر ہیں۔

آنسہ می۔ مصر کی ممتاز ترین اخبار نویس و ناولسٹ خاتون، جو عربی، انگریزی، فرنچ، جرمنی، اطالوی، روسی، ترکی، یونانی اور عبرانی زبانوں پر کامل عبور رکھنے والی جادو نگار خاتون ہے۔

"ملا رموزی"

پیغام بہار

صحرا سے چلے ہیں سوئے گلشن
خونیں جگراں چاک دامن

پیغام بہار دے رہی ہے
داغوں کی جھلک دنوں کی الجھن

دل کھینچ رہی ہے اپنی جانب
نرگس کی نگہ زبان سوسن

پھولوں سے لپک رہی ہیں شامیں
خوشبو سے مہک رہا ہے گلشن

رقصاں ہے نسیم برگ گل پر
شبنم میں ہے گھنگروؤں کی چھن چھن

غنچوں کے بدن میں سنسنی ہے
مستی میں چھوا صبا نے دامن

کیا سیر چمن کو تم گئے تھے؟
ہے بلبل و گل میں آج ان بن

غصے میں بھرا ہے چپ ہے کوئی
یہ اس سے خفا وہ اس سے بدظن

مانوس قفس ہوا ہے اسیرو!
منزل گہ برق ہے نشیمن

بہتر نہیں دل سے کوئی رہبر
بڑھ کر نہیں دل سے کوئی رہزن

دلکش نہ ہو کیوں کلام آثر کا
اک فن ہے مگر مناثر فن

آثر لکھنوی

جہیز

چیکوف کی چوتھی کہانی

میں نے اپنی زندگی میں بہت سے مکانات دیکھے ہیں، چھوٹے اور بڑے، نئے اور پرانے، پتھر کے اور لکڑی کے، لیکن ایک مکان کی یاد خصوصیت کے ساتھ میرے دل میں باقی ہے، اصل میں وہ کوئی بڑی بھاری عمارت نہ تھی، وہ ایک معمولی مختصر ایک منزلہ مکان تھا، اُس میں تین کھڑکیاں تھیں، اپنی ظاہری صورت میں وہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی ضعیف العمر خمیدہ قامت عورت سر پر ایک ٹوپی پہنے کھڑی ہو۔ اُسکی سفید دیواروں اور اُسکی کھپریل کی چھتوں پر کائی جم گئی تھی، وہ چاروں طرف درختوں، سبز جھاڑیوں، اور مختلف قسم کے پھولوں کی بیلوں سے ڈھکا ہوا تھا جو اُسکے موجودہ رہنے والوں کے بزرگوں نے لگائے تھے۔ اُسکے وسیع صحن کے سامنے ہی ایک راستہ ہے جس پر کوئی گاڑی نہیں چلتی اور بہت کم راہگیر آتے جاتے دیکھے گئے ہیں۔

اس چھوٹے مکان کی کنڈیاں ہمیشہ بند رہتی ہیں، اسکے رہنے والے سورج کی روشنی کی پروا نہیں کرتے — روشنی اُنکے لیے بیکار ہے۔ کھڑکیاں کبھی نہیں کھلتیں، کیونکہ اُنھیں تازہ ہوا کا شوق نہیں، جو لوگ اپنی زندگی پھول اور سبزہ کے درمیان گذارتے ہیں اُنھیں فطرت کے مناظر سے دلچسپی نہیں ہوتی، یہ صرف سیاح اور اہل دل ہیں جنھیں خدا نے حُسنِ فطرت کے مطالعہ کے لیے آنکھ دی ہے، باقی انسان ایسے حُسن کے وجود سے بیخبر ہیں، لوگ اُس چیز کی قدر نہیں کرتے جو اُنھیں افراط سے ملتی ہے۔ "جو ہمیں حاصل ہے ہم اُسے جمع کرنے کی فکر نہیں کرتے" اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ہمیں اُس چیز سے محبت نہیں ہوتی۔

یہ چھوٹا مکان سبز درختوں کی جنتِ ارضی کے درمیان جن کی شاخوں پر آزاد و مسرور چڑیوں کے گھونسلے ہیں واقع ہے، لیکن مکان کے اندر..... افسوس.... ! گرمیوں میں یہ ہر طرف سے بند، رندھا ہوا، جکڑا ہوا رہتا ہے، جاڑوں میں ترکی حماموں کی طرح گرم، کہیں نام کو ہوا نہیں اور افسردگی، وحشت! .....

پہلے پہل اس مکان سے میری واقفیت اُسوقت ہوئی جب بہت عرصہ گذرا میں اپنے

کاروبار کے سلسلہ میں یہاں آیا، میں کرنل کے پاس جو اس مکان کا مالک تھا اُسکی بیوی اور لڑکی کے پاس ایک خط لایا تھا، اپنی پہلی آمد مجھے خوب یاد ہے، دراصل اُسکا بھولنا ناممکن ہے۔

ایک چالیس برس کی ضعیف و کمزور عورت کا تصور کرو جو حیرت و خوف کی نظروں سے تمھیں دیکھ رہی ہو، تم گھر میں داخل ہو رہے ہو، یہاں پہلے پہل آئے ہو، نووارد ہو، "ایک نوجوان آدمی" ہو، اُسے خوفزدہ بنانے اور گھبرا دینے کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے، تمھارے پاس کوئی خنجر نہیں کوئی پستول نہیں، کوئی بندوق نہیں، تم خندہ پیشانی سے مسکراتے بھی ہو مگر وہ ڈرے جا رہی ہے۔

"کس سے خطاب کرنے کی عزت و مسرت حاصل کر رہی ہوں؟" عورت کانپتی ہوئی آواز میں پوچھتی ہے۔

میں نے اپنا تعارف کرایا اور آنے کا سبب بتایا۔

اب خوف اور حیرت کی جگہ جھٹ ایک پُر مسرت اور تیز لہجہ میں "اچھا!" بولی اور اپنی آنکھیں چھت کی طرف اُٹھا دیں، اس "اچھا!" کی آواز بازگشت ہال سے کمرہ میں آئی، کمرے سے باورچیخانہ میں گئی، باورچیخانہ سے کوٹھری میں پہونچی، اور ذرا دیر میں پورا مکان "اچھا!" کی مختلف الآواز صداؤں سے گونجنے لگا۔

پانچ منٹ کے بعد میں نے اپنے کو ڈرائنگ روم میں ایک بڑی، ملائم اور گرم کرسی پر بیٹھا چاروں طرف "اچھا!" کی صدائے بازگشت سے گھرا ہوا پایا، کمرہ میں برسات کی اور بکری کی کھال کے جوتوں کی جو ایک رومال میں لپیٹے ہوئے میرے پاس ہی کرسی پر رکھے تھے بُو آ رہی تھی، کھڑکیوں پر تن زیب کے پردے تھے اور پردوں پر بے حس و حرکت مکھیاں، دیوار پر کسی پادری کی روغنی تصویر لٹک رہی تھی، جسکے شیشہ کا ایک کونا ٹوٹ گیا تھا، اسکے برابر برابر گھر کے بزرگوں اور بڑھوں کی تصویریں تھیں، میز پر کچھ بڑی بڑی سوئیاں، دھاگے کی ایک گرہی اور آدھا بُنا ہوا موزہ، اور چند کاغذی نمونے، دوسرے کمرے میں دو خوفزدہ و متحیر بڑھی عورتیں فرش پر سے اسی قسم کے کچھ نمونے اُٹھا رہی تھیں،

"آپ معاف کریں گے، ہم بہت میلے ہیں" چھوٹی عورت نے کہا

مجھ سے باتیں کرتے ہوئے وہ دوسرے کمرے میں جہاں اب بھی نمونے اکٹھا کیے جا رہے تھے، خجالت آمیز، دزدیدہ نظروں سے دیکھتی جاتی تھی، دروازہ بھی شرمندہ و خجل معلوم ہوتا تھا، ایک انچ دو انچ کھلتا تھا اور پھر بند ہو جاتا تھا۔

"کیا بات ہے؟" چھوٹی عورت نے دروازہ کی طرف مخاطب ہوکر پوچھا،
اندر سے ایک عورت کی آواز نے فرنچ میں کچھ کہا،
نیم فرنچ اور نیم روسی زبان میں جواب دیا گیا،
"ہم فرنچ اچھی بول لیتے ہیں" چھوٹی عورت کی خوشی سے تمتماتی ہوئی آنکھوں میں میں نے پڑھا
اسکے بعد دروازہ کھلا اور اُنیس برس کی ایک لانبی، پتلی لڑکی کو میں نے دیکھا وہ تنزیب کی پوشاک پہنے تھی، اُسکی کمر میں ایک سُنہری پیٹی تھی جس میں ایک خوشنما پنکھیا جھول رہی تھی، وہ داخل ہوئی، اُس نے ایک کرسی بچھائی، اُسکے چہرہ کا رنگ اُڑنے لگا، پہلے اُسکی لانبی ناک جس پر چیچک کے ہلکے ہلکے داغ تھے سرخ ہوئی، پھر اُسکی آنکھیں اور پیشانی چمک پڑیں۔
"میری لڑکی ہے" عورت نے مجھ سے کہا "اور منچکا! یہ ایک نوجوان آدمی ہے جو آیا ہے" وغیرہ میرا تعارف کرایا گیا، کاغذی نمونوں کی تعداد پر میں نے تعجب ظاہر کیا، ماں اور بیٹی نے اپنی نگاہیں جھکالیں،
"یہاں ایک میلہ تھا، اسٹشن کے مقام پر" ماں نے کہا "ہمیشہ اس میلہ میں ہم مال خریدتے ہیں اور سال بھر تک کام کرتے ہیں یہاں تک کہ دوسرے سال پھر میلہ کا وقت آجاتا ہے، دوسروں کی بنائی ہوئی چیزیں ہم نہیں خریدتے، میرے شوہر کی تنخواہ زیادہ نہیں ہے اور عیش کی زندگی ہم کہاں سے بسر کریں، ہر چیز خود بنا لیتے ہیں"
"لیکن اتنے اقسام کی چیزیں کون پہنے گا؟ تم تو صرف دو ہی ہو؟"
"آہ ..... پہننے کا خیال کسے ہے، یہ جہیز کے لیے ہیں"
"اماں! یہ کیا کہتی ہو" بیٹی نے کہا اور وہ زرد پڑگئی "یہ نہ معلوم کیا سمجھتے ہونگے سچ سمجھتے ہونگے! میرا ارادہ شادی کا نہیں ہے، میں کبھی شادی نہ کروں گی!"
اُس نے یہ کہا تو لیکن "شادی" کے لفظ پر اُسکی آنکھیں چمک پڑیں۔
چاے، بسکٹ، مکھن اور جام لائے گئے، سات بجے ہم نے کھانا کھایا، چھ دو رتھے، میں کھانا کھا رہا تھا کہ پاس کے کمرے سے میں نے ایک زور کی انگڑائی سُنی، دروازہ کی طرف تعجب سے دیکھا، مرد ہی کی انگڑائی ہوسکتی تھی،
"یہ میرے شوہر کے بھائی ہیں" چھوٹی عورت نے میرے تعجب کو دیکھ کر کہا "سال بھر سے ہمارے ہی پاس رہتے ہیں، کسی سے نہیں ملتے، ملتے ہوے شرماتے ہیں، یہ خانقاہ جانے والے ہیں،

نوکری میں انکے ساتھ بے انصافی کی گئی، اس مایوسی نے اِنکے دماغ پر بہت اثر ڈالا ہے"
کھانے کے بعد چھوٹی عورت نے کپڑے دکھائے جن پر اُنکے شوہر کے بھائی نے کام بنایا تھا، منجکا نے تھوڑی دیر کے لیے اپنی شرم ہٹا دی اور مجھے تباکو کی تھیلی دکھائی جو اُس نے اپنے باپ کے لیے بنائی تھی، میرے مصنوعی تعجب اور حیرت کو دیکھ کر اُسکے چہرے پر ایک سرخی آگئی اور اُس نے اپنی ماں کے کان میں کچھ کہا، ماں اُچھل پڑی اور مجھے اُسکے ساتھ اُسکے کمرے میں جانے کی دعوت دی، وہاں مجھے پانچ بڑے ٹرنک اور کچھ چھوٹے ٹرنک اور صندوق دکھائے گئے۔
"یہ اِن کا جہیز ہے" اُسکی ماں نے آہستہ سے کہا "سب ہم نے ہی بنایا ہے"
ان صندوقوں کو دیکھنے کے بعد میں نے اپنے دونوں مہربان میزبانوں سے رخصت چاہی، اُنھوں نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں وقتاً فوقتاً ان کے یہاں پھر آتا رہوں گا۔
ایسا کچھ ہوا کہ میں اپنا یہ وعدہ پورا کر سکا، اپنی پہلی آمد کے سات برس بعد مجھے اس قصبہ میں ایک مقدمہ کی شہادت کے سلسلہ میں پھر آنا پڑا، اس مکان میں داخل ہوا تو میں نے وہی طمانیت خیز "اچھا!" کی آواز اپنے چاروں طرف پھیلتی ہوئی سُنی، اُنھوں نے مجھے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا ..... خیر، مجھے پہلی نظر میں پہچان لینے کے اُنکے پاس معقول وجوہ ہونگے، میری پہلی آمد اُن کی خاموش و پُرسکون زندگی میں ایک مخصوص اہمیت رکھتی تھی اور جب اہم واقعات کم ہوتے ہیں تو وہ عرصہ تک یاد رکھے جاتے ہیں۔
میں ڈرائنگ روم میں پہونچا، ماں جو پہلے کے بہ نسبت زیادہ کمزور ہوگئی تھی اور جسکے بال سفید پڑنے لگے تھے، فرش پر رینگ رہی تھی، وہ کوئی نیلی چیز کاٹ رہی تھی، اُسکی بیٹی مونڈھے پر بیٹھی کپڑا کاڑھنے میں مشغول تھی۔
پہلے کی طرح وہاں ہلکی ہلکی نمی کی بُو تھی، کاغذ کے مختلف قسم کے نمونے تھے، وہ تصویر بھی تھی جسکا شیشہ ٹوٹ گیا تھا، مگر کچھ تبدیلی ضرور تھی، پادری کی تصویر کے پاس کرنل کی ایک تصویر لٹک رہی تھی، دونوں عورتیں ماتمی لباس میں تھیں، کرنل کی ترقی ہونے کے ایک ہفتہ بعد ہی اُس کا انتقال ہوگیا تھا،
پچھلے واقعات دوہرائے گئے ..... بیوہ نے آنسو بہائے۔
"ہمارا بہت بڑا نقصان ہوگیا" اُس نے کہا "آپ کو معلوم ہے، میرے شوہر کا انتقال ہوگیا۔ اب دنیا میں ہم اکیلے ہیں، اپنے سوا ہمارا کوئی نہیں، میرے شوہر کے بھائی زندہ ہیں، مگر انکی بابت

میں کوئی اچھی خبر نہیں سنا سکتی، انھیں خانقاہ والوں نے نہیں لیا، کیونکہ ـــــ کیونکہ وہ شراب بہت پینے لگے ہیں، اور اب اس مایوسی کی وجہ سے انھوں نے اور کثرت سے پینا شروع کردی، سوچتی ہوں، کہ ڈپٹی صاحب کے پاس جاؤں، اور شکایت کروں، کیا بتاؤں، ایک سے زائد دفعہ ہمارے صندوقوں کے قفل توڑ چکے ہیں ...... منچکا کا جہیز انھوں نے فقیروں کو بانٹ دیا، دو صندوق تو بالکل خالی کردیے، یہی حال رہا، تو میری منچکا کا تمام جہیز غائب ہو جائے گا۔"

"اماں، آپ کیسی باتیں کرتی ہیں؟" پریشان ہوکر منچکا نے کہا "یہ سمجھیں گے .... یہ نہ معلوم کیا سمجھیں گے .... میں شادی نہیں کروں گی ـــــ کبھی نہیں"

منچکا نے اپنی آنکھیں چھت کی طرف اٹھا دیں جن میں امید و آرزو کی جھلک تھی، صاف معلوم ہوتا تھا، کہ اُسے اپنی باتوں کا یقین نہیں ہے۔ ایک چھوٹے قد کا آدمی جسکے سر کے بال غائب تھے، چوہے کی طرح آہستہ آہستہ سامنے سے گذر گیا، اسکے شوہر کا بھائی ہوگا، میں نے خیال کیا۔

میں نے ماں اور بیٹی دونوں پر ایک ساتھ نظر ڈالی، وہ بہت بدل گئی تھیں، ماں کے بال سفید ہو گئے تھے، لیکن بیٹی اس طرح مرجھا گئی تھی کہ اسکی ماں اُس کی صرف چار پانچ برس بڑی بہن معلوم ہوتی تھی۔

"میں ڈپٹی صاحب کے پاس جانا چاہتی ہوں" ماں نے مجھ سے کہا، اُسے یاد نہ رہا کہ وہ مجھ سے یہ کہہ چکی ہے" "شکایت کروں گی، وہ اب ہماری ہر چیز پر ہاتھ ڈالنے لگے ہیں، جو چیز ہم بناتے ہیں، وہ اُسے خیرات کردیتے ہیں، کہتے ہیں ثواب ملے گا، میری منچکا بغیر جہیز کے رہی جاتی ہے"

منچکا کے چہرہ کا رنگ پھر فق ہوگیا مگر اُس نے اس دفعہ کچھ نہ کہا۔

"اب سب سامان پھر جمع کرنا ہوگا، اللہ جانے کہاں سے آئے گا، ہم چھوٹی اوقات کے آدمی ہیں، دنیا میں ہمارا کوئی نہیں ہے"

"دنیا میں ہمارا کوئی نہیں ہے" منچکا نے دوہرایا

ایک سال گذر گیا اور قسمت نے مجھے ایک مرتبہ پھر اس مکان میں لا ڈالا۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے میں نے بڈھی عورت کو دیکھا، ایک سیاہ لباس میں لپٹی ہوئی وہ ایک صوفے پر بیٹھی کچھ سی رہی تھی، اُسکے پاس اُسکے شوہر کا بھائی ایک پیلا کوٹ پہنے بیٹھا تھا، مجھے دیکھ کر وہ اُچھل پڑا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

"آپ کیا بنا رہی ہیں؟" تھوڑی دیر بعد میں نے اُس سے پوچھا۔

"شلوکہ ہے، بن جائے تو پادری کے پاس لے جاؤں گی، نہیں تو یہ اسے لے بھاگیں گے

اب سب چیزیں پادری ہی کے یہاں رکھتی ہوں" اُس نے آہستہ سے میرے کان میں کہا۔

اور اپنی لڑکی کی تصویر دیکھ کر جو سامنے میز پر رکھی تھی، اُس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا:

"ہم دنیا میں اکیلے ہیں"

اور اُسکی بیٹی کہاں گئی؟ منچکا کہاں گئی؟ میں نے یہ اُس سے نہیں پوچھا، میں نے بڈھی ماں سے جو نئے ماتمی لباس میں تھی یہ پوچھنے کی جراءت نہ کی، جب تک میں کمرے میں رہا، اور جب میں جانے کے لیے اُٹھا، منچکا مجھ سے ملنے نہیں آئی، میں نے اُسکی آواز نہیں سُنی، نہ اُسکے قدموں کی نرم آہٹ ....

میں سمجھ گیا اور میرا دل بیٹھنے لگا۔

جلیل قدوائی (علیگ)

ارشادِ جگر

نظر میں ہیچ ہے گلشن تمام دُنیا کا
نہ پوچھ حوصلہ مرغانِ رشتہ بر پا کا

اثر ہے جس میں کہ ہر موجِ کارفرما کا
وہ ایک قطرہ ہے حاصل تمام دریا کا

نجات روح کو ملتی نہیں ہے نفس سے آہ!
بنا ہوا ہے یہ مجنوں، حجاب لیلا کا

ہر ایک ذرہ سے نکلے تڑپ کے برقِ جمال
کوئی بنے تو طلبگار حُسنِ معنیٰ کا

خدا ہی رحم کرے اُس کی تشنہ کامی پر
سراب پر جسے کامل یقیں ہو دریا کا

وہ اک فریبِ تصور، یہ اک طلسمِ نظر
یہ ماحصل ہے کُل اے شیخ دین و دُنیا کا

رواں اگرچہ ہیں اس میں بھی سب وہی موجیں
مگر ہے قطرہ پہ فرض احترام دریا کا

لیے ہے محشرِ صد اضطراب پہلو میں
سکون بھی تو مرے قلبِ ناشکیبا کا

سمجھتے ہیں جسے ہم دل وہ اک مرکب ہے
امید و آرزو و حسرت و تمنا کا

کہاں میں خاک کا پُتلا کہاں یہ نفسِ لطیف
فریب تھا دل بیدار و چشمِ بینا کا

ہر ایک قطرہ انا البحر کہہ اُٹھے گا ضرور
یہی جو رنگ رہا اتحادِ معنیٰ کا

جگر مرادآبادی

جذباتِ سلیم

گریباں سے ترے کس نے نکالا صبحِ خنداں کو
کیا کس نے نہاں دامن کی کلیوں میں گلستاں کو

اڑایا چٹکیوں میں میرے ذرہ نے بیاباں کو
مرے قطرہ نے پانی کر دیا ہر موجِ طوفاں کو

دیے ہیں کھول دفتر زندگی کے تیرے غمزوں نے
دیا تھا چھیڑ یہ کس نے تری چشمِ سخنداں کو

مری کشتی بھنور سے کھیلنے کا شوق رکھتی ہے
یہ کس نے کر دیا خاموش یارب موجِ طوفاں کو

یہ کیا نغمہ تھا چھیڑا جو لیکایک قلبِ مضطر نے
کہ میری لَے نے رقصاں کر دیا سارے نیستاں کو

میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ چمکا تیرے پرتو سے
لگی ہیں کھینچنے کرنیں مری مہرِ درخشاں کو

نہ کرتی تو اگر بروقت اے الفت مسیحائی
لپیٹا تھا کفن میں عقل نے جذباتِ انساں کو

مرے گوہر کو ڈھالا کس صدف نے اپنے سانچے میں
کہ میری آب ہردم سینچتی ہے ابرِ نیساں کو

ترے دل میں ہے تاریکی تو پھر لاکھوں ستارے بھی
نہ روشن کر سکیں گے اے جواں تیرے شبستاں کو

ہر اک افسردہ دل میں پھونک دونگا روحِ بیداری
ذرا کروٹ بدلنے دو مرے خوابیدہ ارماں کو

مرے ذوقِ فنا پر زندگی ہے خضر کی قرباں
مرے تلخابۂ غم میں ڈبو دو آبِ حیواں کو

محبت کی کشمش کی داستاں پوچھو زلیخا سے
نکالا چاہِ کنعاں سے اسی نے ماہِ کنعاں کو

تری صنعت پہ میں اے موسمِ گل کیوں نہ حیراں ہوں
پہنایا ہے لباس رنگ میں کس حسنِ عریاں کو

بھرا افسردگی سے ہے جو کنجِ آشیاں میرا
فلک پر ڈھونڈھتی ہیں میری آنکھیں برقِ خنداں کو

مجازی حسن کے پھولوں کو حیرت سے رہا تکتا
نہ سمجھا میں حقیقت کے تبسمہائے پنہاں کو

بہاریں بوسہ دیں خاکِ لحد کو تیری اے سعدی
ترے خونِ جگر نے کر دیا رنگیں گلستاں کو

بہت منصور ہیں جو دار پر چڑھنے کے شائق ہیں
بہت یوسف ہیں اب جو ڈھونڈتے پھرتے ہیں زنداں کو

مری بیکار ہستی ہے تری زینت کا سرمایہ
بنا کر دیکھ زلف اپنی، مرے بختِ پریشاں کو

دکھاتا ہوں نظارے اپنے دل کو دین و دنیا کے
کھلونے دے کے بہلاتا ہوں میں اس طفلِ ناداں کو

جھجکتا ہے اگر جلوت سے۔ آ خلوت میں بے پردہ
تھپک کر میں سلا دیتا ہوں ساری بزمِ امکاں کو

مری پرواز فکر اے فقر ہو اتنی بلندی پر
کہ دفنا دوں خوشی سے خاک میں تختِ سلیماں کو

میں اُس حسنِ لطافت ریز کا شیدا ہوں اے زاہد
سمجھ کر گرد جو دامن سے جھاڑے باغِ رضواں کو

کلیم طورِ معنیٰ ہوں۔ ید بیضا ہے دل میرا
منور کر دیا جس نے مرے چاکِ گریباں کو

آیولینتھی

[ایک ڈراما]

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

دوسرا منظر

[بادشاہ رینی، ابن یحییٰ اور برٹرانڈ چور دروازہ سے داخل ہوتے ہیں، ایلمرک اور مارتھا پہلے سے موجود ہیں]

رینی۔ مارتھا! میں تیرے پاس نیک نفس ابن یحییٰ کو لایا ہوں۔ یہ مجھے معلوم ہے کہ آج ہی وہ ایک مرتبہ اور یہاں آچکے ہیں۔ کیا حال ہے؟

مارتھا۔ خداوندا! ہر کام حضور کی مرضی کے مطابق ہوا

رینی۔ جو کچھ حکیم صاحب نے ہدایتیں کی تھیں اُنکی تعمیل کی گئی؟ کوئی بات چھوٹی تو نہیں؟ آیولینتھی کی آنکھوں پر ہر شب سوتے وقت پٹی باندھی گئی؟

مارتھا۔ جی حضور!

رینی (ابن یحییٰ سے مخاطب ہو کر) یہ ایک خطرناک امتحان تھا۔ تعجب ہے کہ یہ زحمت اُس نے برداشت کی۔ لیکن یہ حُسن اتفاق کہ حال ہی میں مامکھی نے اُسکی کنپٹی میں کاٹ لیا، اس سے ہمیں ایک بہانہ ہاتھ آگیا۔ یقیناً ننھی مامکھی کو دھوکا ہوا۔ اس خوشنما دنیا میں جو آیولینتھی کی پرداختہ ہے اور جہاں وہ ایک پھول کی طرح پھولوں میں نشو ونما پاتی ہے، مامکھی اس شوخ رنگ کے شگوفہ کو دیکھ کر چوندھیا گئی اور سمجھی کہ گلاب کی کلی سے ہم آغوش ہو رہی ہے۔ معاف کرو۔ اپنی ہی لڑکی کے متعلق اس قسم کی گفتگو گناہ ہے۔ خیر۔ تمھیں فکر ہوگی کہ اپنی محنت کا نتیجہ دیکھو۔ آیولینتھی کے پاس جاؤ۔ برٹرانڈ! مارتھا! حکیم صاحب کو اندر لیجاؤ شاید انھیں تمھاری ضرورت ہو۔

[ابن یحییٰ مکان کے اندر برٹرانڈ اور مارتھا کے ہمراہ داخل ہوتا ہے]

کیوں ایلمرک، اس خاموش و پُرسکون وادی کو دیکھ کر تمھیں اچنبھا تو نہیں ہوا؟ یہ ایک مختصری بہشت ہے۔

ایلمرک۔ بیشک خداوندا!

رینی۔ حُسن و علم و فن میں جو کچھ محبوب ترین ہے یہاں موجود ہے۔ کاش میں ایسا خوش نصیب ہوتا کہ اپنی زندگی انکے درمیان بسر کر سکتا اور ٹھنڈے دل سے نیپلس اور لورین اور اس طولانی نزاع کو جو ووڈمانٹ سے درپیش ہے ہمیشہ کے واسطے بھول جاتا۔

ایلمرک۔ حضور، اُسکا تو تصفیہ ہو چکا عنقریب کاؤنٹ ٹرسٹان قدم رنجہ فرمائیں گے اور ان تمام

جھگڑوں کا خاتمہ صلح و آشتی پر ہو جائے گا۔

رینی ۔ مجھے بھی یہی اُمید ہے اور اس امید کو روز بروز تقویت ہوتی جاتی ہے۔ کیا میں نے تم سے نہیں کہا کہ میں جیوفری آف آرنج کا منتظر ہوں۔ وہ ٹرسٹان کے قلعہ میں عرصہ تک مقیم رہ چکے ہیں۔ اور کاؤنٹ کو کبت، شاعری اور موسیقی کی تعلیم دی ہے۔ جیوفری مجھ سے کہتے تھے کہ نوجوان کاؤنٹ کو شاعری سے خاص مناسبت ہے۔ اسکا مذاق شستہ و متین ہے۔ تخئیل میں جدت اور خیالات میں بلندی ہے۔ ایک مرتبہ انھوں نے میرے سامنے ایک گیت گایا تھا جو ٹرسٹان کا موزوں کیا ہوا تھا۔ اُس کا موضوع بھی عمدہ تھا بندشیں بھی چست و خوبصورت تھیں انصاف مقتضی ہے کہ میں اُسکے کمال شاعری کا اعتراف کروں۔ حالانکہ وہ مجھ سے برسرِ پرخاش ہے اور موقع پا جائے تو لورین کو غصب کر لے۔ لیکن خاموش رہو، میں نے ایک آواز سُنی۔

[دروازہ کے پاس جاکر دیکھتا ہے]

دیکھو! ابن یحییٰ نے اُسے جگا دیا، آہستہ آہستہ اُس نے آنکھیں کھولیں۔ وہ کچھ کہہ رہی ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواب میں باتیں کر رہی ہے۔ ابن یحییٰ غور سے اُسکی آنکھوں کی طرف دیکھ رہا ہے۔ وہ طلسمی نقش پھر اُسکے سینہ پر رکھ دیا اور وہ پھر سو گئی۔

ایلمرک ۔ عجیب و غریب عمل ہے!

رینی ۔ نہایت حیرت خیز! اس مراکش کے حکیم کو ایسی قدرت حاصل ہے کہ میں اس سے ڈرتا ہوں۔ وہ آرہا ہے۔ ایلمرک مجھے تنہا چھوڑ دو۔ لیکن سنو! تم محل میں جاؤ، میں یہیں ٹھہروں گا۔ جسوقت ٹرسٹان کا خط آئے فوراً لیکر یہیں حاضر ہو۔

ایلمرک ۔ رخصت! خداوند!

[ایلمرک باہر جاتا ہے اور ابن یحییٰ دوسرے دروازہ سے داخل ہوتا ہے]

رینی ۔ کہو ابن یحییٰ۔ کیا تم فاختہ کی طرح زیتون کی شاخ لائے ہو؟ تم فکرمند ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا نتیجہ نکالوں؟

ابن یحییٰ ۔ مجھے صحت کی قوی اُمید ہے۔

رینی ۔ کیا یہ سچ ہے؟ تم فرشتۂ آسمانی ہو جو میری مدد کو بھیجا گیا۔ تمہارا سیاہ چہرہ شاہ مراقش کی طرح جو ہمارے عیسیٰ مسیح کے گہوارہ کے سامنے سجدہ میں جھکا تھا اُس ستارے کا پیش خیمہ ہے جو میری تاریک راتوں کو منور کر دے گا۔ یحییٰ مجھے بتاؤ کہ تم نے اپنی امیدوں کو کس بنیاد پر قائم کیا ہے۔ اب تم کیا صلاح دیتے ہو اور کیا کرنا چاہتے ہو؟ میں بیتاب ہوں بولو! حال ہی میں میں نے ایک کتاب پڑھی جس میں تحریر تھا کہ آنکھ کی اکثر بیماریاں قدح کرنے سے اچھی ہو جاتی ہیں۔ میرے ابن یحییٰ۔ تم ایسا ہرگز نہ کرنا! تم جانتے ہو کہ آنکھ کیسی نازک چیز ہے۔

؎ اشارہ ہے طوفان نوح کی طرف۔ فاختہ شاخ زیتون لائی تھی جس سے امید ہوئی تھی کہ ساحل قریب ہے۔

کیا تمھارا دل ایسا پتھر کا ہو جائے گا کہ میری آیولنیھی کی آنکھوں کو نشتر فولاد سے چھوؤ؟ کیا تم یہ اندیشہ نہ کروگے کہ اُنکی نیلگوں گہرائیوں کی رعنائی کو صدمہ پہونچ جائیگا؟ کیا تم دیکھتے نہیں کہ باوجود اس اندوہ والم کے یہ گہرے اور سیاہ چشمے کس قدر ضو فشاں ہیں - آہ! اُسکی آنکھیں! کس طرح ممکن ہے کہ دو ایسے نورانی دائروں پر رات کی تاریکی چھا جائے -

ابن یحییٰ - اس قدر مضطرب نہ ہوجیے - اندیشہ کی بات نہیں ہے - نشتر وغیرہ اگر میں استعمال کروں بھی تو زیادہ مفید ثابت نہ ہوں گے -

رینی - تو پھر تم نے کیا طے کیا ہے؟

ابن یحییٰ - اے رحمدل بادشاہ! میں معافی کا خواستگار ہوں - میرا علاج میرے پیشہ کا ایک راز ہے، اور اُسکے افشا سے کوئی فائدہ متصور نہیں ہے یہ آن واحد میں شکل پذیر نہیں ہوا ہے بلکہ برسوں راتوں کو جاگ جاگ کر اس پر دماغ سوزی کیگئی ہے اب وہ موقع آگیا ہے کہ اگر خدا کی مرضی ہوئی تو مجھے کامیابی ہوگی - اور یہ کامیابی یا تو آج ہی رونما ہوگی یا کبھی نہیں!

رینی - آج ہی! یہ کیونکر؟

ابن یحییٰ - غروب آفتاب کے بعد جس وقت شفق پھولے اور صرف اتنی دھیمی روشنی ہو جسے اُسکی آنکھیں جو عادی نہیں ہیں بلاخطرہ برداشت کر سکیں میں اپنے علاج کی آزمایش کروں گا -

رینی - آہ ابن یحییٰ میں تیری التجا کرتا ہوں کہ آج نہیں - ہر روز نہیں بلکہ ہر ساعت میں نے بڑے اشتیاق سے اس لمحہ کا انتظار کیا ہے لیکن جب وقت آگیا تو میرا دل ڈوبا جاتا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اور توقف ہو - ابن یحییٰ خیال کرو کہ کس قدر خطرہ ہے - غروب آفتاب کے ساتھ ممکن ہے کہ میری تمام نازپروردہ آرزوؤں کا خاتمہ ہو جائیگا تم سوچ میں پڑ گئے - کیا توقف کروگے؟

ابن یحییٰ - التوا ناممکن ہے -

رینی - تو یہ بتادو کہ کوئی خوف تو نہیں ہے؟ کیا نتیجہ میں کوئی شبہہ تو نہیں ہے؟ تم نے خاموش ستاروں کے ذریعہ سے ساعت دیکھی تھی - تمھارا علم اُن پر بھی حاوی ہے، کیا جواب ملا؟ ابن یحییٰ مجھے بتادو - جو نقشہ تم نے بنایا اُس سے فال نیک نکلتی ہے؟

ابن یحییٰ - جی ہاں - یہ تو میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں - ستارے نیکی کی طرف مائل تو ہیں لیکن وثوق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ بالکل موافق ہیں - اُن کا اثر انسان کی قسمت پر ضرور ہوتا ہے مگر فطرت اُنکی غلام نہیں ہے - تاہم آپ مطمئن رہیں اس بنا پر مجھے کوئی اندیشہ نہیں ہے - ایک اور رکاوٹ پیدا ہو گئی ہے -

رینی - رکاوٹ؟

ابن یحییٰ - ہاں سرکار! اور میرا خیال ہے کہ آپ اس گتھی کو سلجھانے میں میری مدد نہ کر سکیں گے - قبل

اسکے کہ میں اپنا عمل شروع کروں آیو لینیقی کو معلوم ہو جانا چاہیئے کہ وہ نابینا ہے۔

ریتی۔ نہیں ابن یحییٰ - یہ نہیں ہوسکتا۔

ابن یحییٰ۔ ایسا ہونا چاہیے ورنہ میرا فن بیکار ہے۔

ریتی۔ نہیں نہیں۔ آہ! ہرگز نہیں۔ تم مجھے اس وحشیانہ ظلم پر مجبور نہ کرو گے۔ اور ایک جھٹکہ میں غفلت کے اُس پردے کو چاک نہ کرو گے جو اُسکی طمانیت کا موجب ہے۔ اُسکی نازک روح پر اس مہیب صداقت کا ایکا ایکی نہیں بلکہ تدریج اظہار ہونا چاہیے۔ اور اگر اُسکے بعد صحت نہ ہوئی؟ کیا تم بھول گئے کہ کس ہوشیاری سے جسکو سننے والا ! ورنہ کہے گا ہمنے سالہا سال اس دردناک حقیقت کو اُس سے پوشیدہ رکھا ہے۔ تمھارے ہی مشورہ سے ایسا ہوا! اور تمھیں نے بتایا کہ یہ دشوار مرحلہ کس طرح طے کرنا چاہیے۔ کیا جو عالیشان عمارت تم نے اُٹھائی اُسے چشم زدن میں ڈھا دو گے؟ بتاؤ بھلا کیوں؟ آہ کیوں!

ابن یحییٰ۔ اگر آپ متوجہ ہو کر سماعت فرمائیں تو وجہ عرض کروں۔ غالباً آپ کا خیال ہوگا کہ بصارت کا آلہ آنکھ ہے۔ دراصل ایسا نہیں ہے۔ آنکھ صرف ذریعہ ہے۔ قوت بینائی کا سرچشمہ روح ہے اور وہ نازک اعصاب جنکا اجتماع آنکھ کے گرد ہوتا ہے، دماغ کے پوشیدہ خزانہ میں بنتے ہیں۔ آیو لینیقی کو اپنی حالت کا احساس ہونا چاہیے۔ اولاً اسکی اندرونی آنکھیں کھولنا چاہیے، قبل اسکے کہ اسکی ظاہری آنکھوں پر نور کی بارش ہو اُسکی روح میں روشنی کی احتیاج پیدا ہونا چاہیے تاکہ وہ روشنی کی منتظر ہو آرزومند ہو، کیونکہ انسان کو وہ چیز کبھی عطا نہیں ہوتی جس کا وہ متمنی نہ ہو۔ اُسکی روح کی تہ میں ایک خواہش اور اُسکے حصول کا ارادہ پیدا ہونا چاہیے۔ مثال کے طور پر فن شاعری کو لیجیے جسکے واسطے تمام صوبہ پرووینس مشہور ہے۔ یہ ایک عطیۂ فطرت ہے۔ مگر کیا ہر انسان کو مل جاتا ہے؟ نہیں صرف وہ اسکے مستحق ہوا پاتے ہیں جنکے سینوں میں خواب کی طرح ایک درخشاں دنیائے شعرآباد ہوتی ہے جسکے وہ ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں اور اُنکی تشنگی کبھی نہیں بجھتی۔

ریتی - اچھے ابن یحییٰ - میں تم سے بحث میں نہیں جیت سکتا۔ میرا علم اتنا وسیع نہیں۔ لیکن رحم کی آواز میرے دل میں گونج رہی ہے اور تمھارے دلائل کو غرق کیے دیتی ہے۔ تم جو کہتے ہو ناممکن ہے اور میں ہرگز اُسے منظور نہیں کر سکتا۔

ابن یحییٰ - آپ کی مرضی - میں صرف مشورہ دے سکتا ہوں اور اگر میرے مشورہ پر عمل نہیں ہوتا تو میری موجودگی یہاں بیکار ہے، لہذا اللہ نگہبان! بندہ اپنی خانقاہ کو واپس جاتا ہے۔ اگر آپ نے اپنا ارادہ بدل دیا تو میں وہیں ملوں گا۔ لیکن ایک مرتبہ پھر غور کیجیے۔ اگر آفتاب ان پہاڑیوں کے پیچھے غروب ہوگیا تو پھر میرا تمام علم وفن کام نہیں آسکتا۔ (چوردروازہ سے باہر چلا جاتا ہے)

ریجی - آہ میں کس عذاب میں مبتلا ہوں - میں نے اس امید کو کس قدر گراں خریدا، اور اب ممکن ہے کہ وہ ایک لمحہ میں فنا ہو جائے - کیا میں اُسکی شگفتگی کو اُس سے چھین لوں؟ اور اُسکے بدلے تکلیف وہ یاس دیدوں - اُسکے شباب کو آہستہ آہستہ کُملاتے دیکھوں یہاں تک کہ وہ خشک ہو کر نوحۂ خزاں میں منتقل ہو جائے؟ نہیں! یہ ابن یحییٰ کی ہٹ ہے - وہ یقیناً رام ہو جائے گا - میں چین نہ لونگا جب تک وہ میری بات نہ مانے گا اور میری مرضی کے موافق کاربند نہ ہوگا -

[ریجی بھی باہر چلا جاتا ہے - ویسے ہی مارتھا اور بڑٹرانڈ داخل ہوتے ہیں]

مارتھا - بادشاہ سلامت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ غصہ میں ہیں - ابن یحییٰ کا بھی پتہ نہیں - یہ معاملہ کیا ہے؟

برٹرانڈ - خدا جانے کیا ہے - میں یہی ڈرتا ہوں کہ کہیں عین وقت پر ابن یحییٰ کو ناکامی نہ ہو -

مارتھا - خدا نہ کرے -

برٹرانڈ - کاش ایسا ہی ہو، لیکن میں اس شخص کے سوچ بچار اور اسکے تیوروں کو پسند نہیں کرتا، اور بھئی سچی بات تو یہ ہے کہ اُسکو ایسی عجیب و غریب قدرت ہے کہ میں ڈرتا ہی رہتا ہوں - دیکھو لڑکی اُس کوچ پر اس طرح لیٹی ہوئی ہے گویا اُس میں دم ہی نہیں، مگر اُسکے ہاتھ کے ایک اشارہ سے ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا سو رہی ہے - اسکا نتیجہ اچھا نظر نہیں آتا -

مارتھا - اطمینان رکھو! تمہارا خوف بیجا ہے - تمھیں معلوم ہے کہ جہاں اُسکے سونے کا وقت ختم ہوا اور ابن یحییٰ نے طلسمی نقش اُسکے سینے سے اُٹھایا تو وہ ہشاش بشاش اور صحیح و تندرست ہو جاتی ہے - حیرت ہوتی ہے کہ یہ غیر معمولی نیند اُسے رات کی نیند سے زیادہ قوت و فرحت بخشتی ہے - اور اُسکے حواسوں کو جلا دیتی ہے - میں نے اکثر دیکھا ہے کہ جب وہ جاگتی ہے تو اُسکی آنکھوں کی چمک اور بڑھ جاتی ہے - گویا روشنی کی چند شعاعوں کو سوتے میں چپکے سے داخل ہونے کا راستہ مل گیا - میرے نزدیک تو یہ اچھی علامت ہے -

برٹرانڈ - ممکن ہے کہ تمہارا ہی خیال درست ہو - یہ وقت گذرنے پر معلوم ہو جائے گا - آؤ چلیں، ابھی بہت سے کام باقی ہیں - دیکھیں مالیوں نے کیا کیا - اب آیولنتھی کے پاس چلو وہ سو رہی ہے اور ہماری واپسی تک نہیں جاگے گی -

[پشت مکان کی طرف چلے جاتے ہیں]

تیسرا منظر

[ٹرسٹان اور جیوفری دونوں ایک ایک ستار لیے ہوے آتے ہیں -]

جیوفری (چور دروازہ کے سامنے ٹھہر کر) ذرا ہوشیاری سے قدم بڑھاؤ - یہاں آدھی رات

کی تاریکی ہے -

ٹرسٹان - آگے بڑھو، گرد دیکھو تو یہاں ایک دروازہ ہے!

جیوفری - دروازہ!

ٹرسٹان - صبر کرو! کنجی لگی ہے - لے لو کھل گئی! ارے، یہ کیا نظر آتا ہے؟

(دونوں داخل ہوتے ہیں)

جیوفری - اللہ اللہ! کیسی عمدہ خوشبو کا جھونکا آیا!

ٹرسٹان - باغ! اور اس کوہستانی ویرانہ میں! کس سلیقہ سے آراستہ کیا گیا ہے - اور کس قدر خوشنما ہے! دیکھو تو!

جیوفری - میرے تو ہوش اُڑ گئے!

ٹرسٹان - وہ کون شخص ہے جو اس مسحور کرنے والے خطہ کا مالک ہے - تم گرد و نواح سے خوب واقف ہو اور قریب ہی رہتے ہو -

جیوفری - مجھے مطلق علم نہیں - یہ بہشت کبھی میرے خواب و خیال میں بھی نہیں آئی تھی - گرم مالک کا ایسا باغ ہے اور پھول ہر طرف نگینوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں - اُن سربلند کھجوروں کو تو دیکھو!

ٹرسٹان - انکے پس پشت محل ہے - کس قدر خوبصورت! اور تقریباً نصف چنبیلی اور گلاب کی جھاڑیوں سے ڈھکا ہوا ہے - یہاں رہتا کون ہے؟

جیوفری - ایک متنفس بھی دکھائی نہیں دیتا - شاید کسی مبارک رات میں جبکہ ڈائنا نے ایک زمیں سا اپنے انڈیمیوں کیلیئے وقف کی یہ ایکایک معرض وجود میں آیا، تاکہ ان چٹانوں میں اُنکی سرمست خوشیوں کا پردہ پوش ہو جائے - لیکن یہاں کے باشندے فرار ہو گئے!

ٹرسٹان - نہیں، یہاں انسان کی صناعی کے آثار نظر آتے ہیں - اور میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہاتھ خوبصورت اور نازک ہیں - دیکھو اُس روش پر پاؤں کے تازہ نشان ہیں -

جیوفری - تم سچ کہتے ہو - ایک چھوٹا اور نفیس نقش قدم - آؤ اور آگے بڑھیں - اسی کے ذریعہ سے پتہ لگائیں - اس طرح ہم بھٹک نہیں سکتے وہ محل کی طرف رہنمائی کرتا ہے -

ٹرسٹان - یہیں انتظار کرو جب تک کوئی شخص نہ آئے - تہذیب مقتضی نہیں کہ یوہیں درانہ داخل ہوں - یہی کون اچھی بات تھی کہ یہاں تک بلا اجازت چلے آئے -

جیوفری - تمہاری خوشی - خدا کرے قسمت ہمارا ساتھ نہ چھوڑے - میں اپنی تہذیب پر جبر اور کسی کے آنے کا صبر کے ساتھ انتظار کروں گا - ابھی تک تو ستارہ موافق ہے - کیوں ٹرسٹان تم نے کچھ غور کیا کہ یہ سب واقعات کس طرح ظہور میں آئے - ہم دونوں خانقاہ کے قریب بلا مقصد ٹہلتے اور گیت گا گا کر وقت گزار رہے تھے کہ میں نے شاہ زینی کو جاتے دیکھا - وہ قرطبہ کے حکیم سے سرگرم گفتگو تھا - اسلیے کہ اُسکی نظر ہم پر نہ پڑے، تم مجھے اپنے ساتھ کھینچ لائے - چٹان اور جھاڑ جھنکاڑ طے کرتے ہوئے

دامن کوہ میں پہونچے، اور اتفاق سے یہ پوشیدہ راستہ مل گیا، جو عجب حکمت سے وضع کیا گیا ہے۔ تھوڑی دور تو ہم اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے چلے، اسکے بعد وہ دروازہ دکھائی دیا۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ رینی سے تم نے احتراز کیوں کیا۔ تم تو اُس سے ملنے ہی کی غرض سے آئے تھے اور مجھ سے وعدہ تھا کہ کل دوران ملاقات میں تمھارے ہمراہ رہوں اور تم .... اس واقعہ کو عالم جانتا ہے۔ اور اُسکی لڑکی سے تمھاری نسبت بھی قرار پا چکی ہے۔

ٹرسٹان - نسبت! ہاں لوگ کہتے ہیں۔ لیکن میں مشکل سے نو برس کا تھا جب منگنی ہوئی۔ جنگ موقوف ہوکر جب صلح کی گفتگو ہو رہی تھی، اُسوقت میرے والد نے برگنڈی کے ذریعہ سے شرائط طے کیے۔ لیکن جیوفری، اب میں سن تمیز کو پہونچا ہوں اور چونکہ اس معاہدہ نے باوجودیکہ ہنگام فتح کیا گیا تھا، میرے اکثر حقوق سے مجھے محروم کر دیا ہے، لہذا اس شادی کو میں نفرت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ میں اپنی خوشی سے نہیں آیا، اور میری مرضی کے خلاف یہ ناگوار کام ہوگا۔

جیوفری - بادشاہ رینی کی خاطر مجھے اسکا افسوس ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اس شادی کے وعدہ سے وہ کس قدر خوش ہے، اور ہر وقت اسکا تذکرہ رہتا ہے۔

ٹرسٹان - وہ خوش ہوا کرے۔ کیا تم نے اُسکی لڑکی کو دیکھا ہے؟

جیوفری - نہیں۔ کسی بعید ہسپانوی خانقاہ میں اُسکی تعلیم و تربیت ہوئی ہے، اور اب وہ تم سے تعارف پیدا کرنے کے لیے بُلائی گئی ہے۔ لیکن مہربان من، ان باتوں میں ہمیں یہ نہ بھولجانا چاہیے کہ ہم کہاں ہیں؟ اور زبردستی داخل ہوے ہیں لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ مقام بہت دلکش ہے سوال یہ ہے کہ کیا اسی آسانی سے ہم یہاں سے جا بھی سکتے ہیں؟

ٹرسٹان - اندیشہ کی کوئی وجہ نہیں۔

جیوفری - پس یہ بھی دریافت ہونا چاہیے کہ اس محل کے باشندے کون ہیں؟ دروازہ پر خود حملہ کرو یا مجھے اجازت دو۔

ٹرسٹان - مجھی کو جانے دو۔ اگر یہاں کوئی عفریت برسرِ حکومت ہے، تو انصاف یہی چاہتا ہے کہ پہلے میں خطرہ کا مقابلہ کروں۔ کیونکہ میں ہی تمھیں یہاں تمھارے خلاف منشا لے آیا۔ (دروازہ پر دستک دیتا ہے) کوئی نہیں آتا۔

جیوفری - دیکھو دروازہ کُھلتا بھی ہے۔

ٹرسٹان - اندر سے بند ہے۔

جیوفری - اور زور دو، ممکن ہے کہ کُھل جائے۔

ٹرسٹان - یوں ہی سہی۔ (دروازہ کُھل جاتا ہے) ارے جیوفری! عجب شکل نظر آرہی ہے۔

جیوفری - کوئی ارواح ہے؟

ٹرسٹان - کیا! ارواح! شاید ایسا ہی ہو مگر ایسی روح جو خود روشن ہے، اور پیام نور پہونچاتی ہے۔

جیوفری - (اندر جھانک کر) ایک خوبصورت لڑکی ایک نفیس کوچ پر لیٹی ہے - بیشک وہ سو رہی ہے -

ٹرسٹان - سو رہی ہے اور اسکی دھیمی سانس میں خاموش ترنم ہے اور گلابی ہونٹوں پر خفیف تبسم گویا وہ ہماری حیرت کو خواب میں دیکھ رہی ہے -

جیوفری - ٹرسٹان، آؤ یہاں سے بھاگیں - یہ جادو بھرا نظارہ میری روح میں تلاطم پیدا کر رہا ہے - اور اس قدر دلفریب ہے کہ سحر کے سوا کوئی اصلیت نہیں ہو سکتی - کسی جادوگر کا محل ہے - آؤ چلیں - آؤ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ طلسمی سانپ ہم کو ڈس لینگے - ٹرسٹان تم ابھی سے مبہوت ہو گئے - زمین نے تمہارے قدم تھام لئے ہیں اور تمہاری آنکھوں کی گردش بند ہو گئی ہے تم اُسکی طرف گھور رہے ہو - آؤ ٹرسٹان آؤ -

ٹرسٹان - جیوفری آہستہ بولو - ممکن ہے کہ خفیف ترین جنبش اُسے بیدار کر دے - میرے نزدیک اس قابل پرستش سکوت کو توڑنا گناہ ہے جو اُسکی نیند نے ہر شے پر طاری کر دیا ہے -

جیوفری - آفریں! آفریں!

ٹرسٹان - خاموش! اب ایک لفظ بھی نہ بولو - یہ جگہ مقدس ہے - (دروازہ کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتا ہے اور ہاتھ پھیلا کر کہتا ہے) خفا نہ ہونا کہ دل اور نامحرم نگاہوں نے تجھے تیری خوابگاہ میں دیکھا -

جیوفری - اُٹھو! میں تمہارے واسطے کانپ رہا ہوں - تم پر جادو چل گیا - یہ منظر محض دھوکہ کی ٹٹی ہے - میرے ساتھ آؤ -

ٹرسٹان - میں مجبور ہوں -

جیوفری - اچھا تو سنگ مرمر کے میل کی طرح زمین میں تو نہ گڑے جاؤ - مرد بنو - اگر یہاں سے بھاگنا نہیں چاہتے، تو اپنے دل ہی پر قابو رکھو، اور یہ دریافت کرو کہ یہ خوبصورت مخلوق کون ہے اسے جگاؤ!

ٹرسٹان - نہیں! یہ ایک گناہِ عظیم ہوگا -

جیوفری - اگر تم نہیں جگاتے تو میں جگاتا ہوں - (داخل ہوتا ہے)

ٹرسٹان (اپنے آپ سے) لے لو! گستاخ شخص! اُسے پکار رہا ہے، اُسکا ہاتھ پکڑ لیا -

جیوفری (دوڑتا ہوا باہر نکلتا ہے) بھاگو! بھاگو! وہ جاگ نہیں سکتی - کسی سیاہ دل جادوگر کے منتروں نے اُسکے حواسوں کو جکڑ دیا ہے - آؤ! میں خوف کے مارے کانپ رہا ہوں - ہم ایسے مقدس مکان میں گستاخانہ داخل ہوئے - شاید اسکی سزا موت ہو!

ٹرسٹان مقدس مقام! یہ سچ ہے - لیکن یہاں موت نہیں، بلکہ حیات تقسیم ہوتی ہے - خیر کچھ حرج نہیں! آؤ اس جگہ سے روانہ ہو جائیں جہاں ہمیں داخل نہ ہونا چاہیے تھا - وہ سو رہی ہے - اور یہ شیوہ مردانگی نہیں کہ ہم یہاں ٹھہرے رہیں!

جیوفری - آؤ چلیں -
ٹرسٹان - لیکن ٹھہرو، جاتے جاتے ایک نظر اُسے دیکھ لوں دم بھر کو اُسکے قریب جا کر اُسکے خط وخال کو اپنے حافظہ کی لوح پر نقش کر لوں (وہاں ہوتا ہے)
جیوفری - دیکھو وہ جھکا اور اُسکے ہاتھ کو بوسہ دیا! کس طرح اُسکی طرف دیکھ رہا ہے - اے لو اُسکے گلے سے ایک فیتہ کھول لیا - خدا کا شکر ہے کہ آ رہا
ٹرسٹان (آتا ہے) اب اُسکا سراپا میرے دل پر نقش ہوگیا اور کبھی نہیں مٹ سکتا - آؤ چلیں، اور اس جادو سے پناہ مانگیں - تاہم میں نے عہد کیا ہے کہ یہاں دوبارہ آؤں گا اور اگر میں غلطی نہیں کرتا تو وہ میری قسم سنکر لطف آمیز طریقہ سے مسکرائی تھی اور خواب میں میرے ارادوں کو برکت دی تھی - دیکھو جیوفری میں یہ زیور لے آیا یہ کوئی قیمتی جواہر ہے جو اُسکے سینہ پر رکھا ہوا تھا جس طرح "حبشی" کا لڑکا مصروف خواب "سال" کی عبا کا ایک ٹکڑا لے آیا تھا تاکہ یہ ثابت ہو کہ بادشاہ کی زندگی اُسکی مٹھی میں تھی اُسی طرح یہ جواہر اس بات کا شاہد ہوگا کہ میں یہاں آیا تھا اور اپنی زندگی اُس کی مٹھی میں دیکر چلا گیا درانحالیکہ وہ محو خواب تھی - آؤ - جیوفری!

[دونوں چور دروازہ کی طرف روانہ ہوتے ہیں، اِدھر آیو لینتھی مکان کے دروازہ پر آتی ہے]

(باقی)

اثر لکھنوی

غزل

شکوہ کرتے ہو کہ ملتا نہیں پیکاں میرا
تم نے کب دل سے نکالا کوئی ارماں میرا

وطن آوارہ ہوں کوئی نہیں پرساں میرا
پاس سے تکتی ہے منہ شام غریباں میرا

اس قدر ہوں میں شہیدانِ وفا میں ممتاز
نام لکھا ہے سرِ گورِ غریباں میرا

کام آئی مرے وحشت میں مری جامہ دری
اپنے دامن میں لیے ہیں وہ گریباں میرا

قید ہستی میں کبھی پاؤں کو پھیلا نہ سکے
وسعتِ دل سے بہت تنگ ہے زنداں میرا

پردہ داریٔ شب ہجر جنوں میں بھی رہی
صبح کے بھیس میں نکلا ہے گریباں میرا

دل میں سو رنج یہاں نجھکو بس اک پھول کا غم
سامنا کرتی ہے کیا بلبلِ نالاں میرا

مجھ کو کیا اہل ہنر یاد کریں گے صفدر
بعد میرے جو چھپا بھی کبھی دیواں میرا

صفدر مرزا پوری

سفر حجاز کی مختصر روداد

(سلسلہ الناظر بابت جون ۱۹۲۵ء)

پورا ایک سال گذرا کہ روداد کے اوراق نذر ناظرین نہیں ہو سکے جسکے لیے نادم اور عذر خواہ ہوں - اور اب اس طرح تلافی کرنا چاہتا ہوں کہ اس ششماہی میں روداد مکمل ہو جائے - اسکے بعد احباب کی خواہش ہوگی تو ساری روداد کتابی صورت میں انشاء اللہ علحدہ شایع کردی جائیگی -

ظفر الملک

ساتویں منزل

۸ - جولائی کو مدینہ منورہ سے قافلہ روانہ ہوا تھا، جس راہ سے آنا ہوا تھا اُسکے بجائے قافلہ نے دوسری راہ اختیار کی - جب تک حوالیِ شہر کے قریب قافلہ رہا، دور سے مدینہ منورہ کی عمارتیں، مسجد نبوی کے مینار اور روضۂ اطہر کا سبز گنبد نظر فروز ہوتا رہا تا آنکہ مغرب تک یہ ایک ایک کرکے سب نشانات نظر سے اوجھل ہوگئے - جس راستہ پر قافلہ جا رہا تھا، ناہموار اور پتھریلا تھا، کچھ تو اس سبب سے اور کچھ اس لیے کہ مسلسل چڑھائی تھی شغدف میں بیٹھنا زیادہ آرام دہ نہیں معلوم ہوا لیکن تازہ دم اونٹ ذرا تیز رفتاری سے چل رہے تھے اور ضعف کا اثر بھی بہت کچھ موجود تھا لہذا نمازیں بھی شغدف ہی پر پڑھی گئیں - منزل چھوٹی تھی اس لیے جلد طے ہوگئی اور عشا کے وقت بیر الماشی پہونچ گئے -

دوشنبہ ۹ جولائی - بیر الماشی کا پانی مدینۂ منورہ کی طرح نہایت شیریں اور ٹھنڈا تھا، ہوا بھی یہاں خوب ٹھنڈی چل رہی تھی، جسکی وجہ سے تمازتِ آفتاب سے ذرا تکلیف نہیں ہوئی - کنوئیں سے کچھ فاصلہ پر خرمے کے درخت لگے ہوے تھے - بازار بہت مختصر تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ عارضی طور پر محض قافلہ کی آمد سنکر کچھ دوکاندار جمع ہوگئے ہیں، کیونکہ سبزی ترکاری، تربوز، خربوزہ اور گوشت کے سوا یہاں کچھ نہیں بکتا تھا، قریب ہی ایک قلعہ کی عمارت بنی ہوئی تھی جو بالکل اُجڑا ہوا سا تھا - سہ پہر کو عصر کے قریب قافلہ یہاں سے اُٹھا - اب راستہ ہموار اور ریتیلا تھا - گو دونوں جانب قریب قریب پہاڑوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا - عصر کے وقت نماز کے لیے اُترا،

عینک شغدف پر رکھدی تھی، اسلیے نماز کے بعد اپنے شغدف کو نہ پہچان سکا اور آگے نکل گیا، دُور تک چلتا رہا اور ہر شغدف کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا، کمزور پہلے ہی سے تھا، دیر تک پیدل چلنے کی وجہ سے بہت خستہ ہوگیا۔ ایک بدو سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ میرا اونٹ قافلہ کی جس ٹکڑی میں ہے، وہ پیچھے ہے۔ لہذا وہیں رُک گیا۔ کچھ دیر میں شغدف ملا تو اُس پر سوار ہوا۔ خستگی سے حد درجہ طبیعت نڈھال ہوگئی تھی۔ مگر اس راہ میں چوروں کی کثرت ہے، اس لیے عادت کے خلاف قافلہ کے ساتھ ساتھ مشعلیں روشن رہیں اور بدو برابر شور کرتے رہے اور ہوشیار رہو، جاگتے رہو، کا شور مچاتے رہے۔ جسکی وجہ سے اچھی طرح نیند نہ آئی۔ تھوڑی ہی رات سے ٹھنڈک بڑھ گئی تھی، جیسے جیسے رات بڑھتی گئی، ہوا سرد ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ رضائی اوڑھنے پر بھی سردی معلوم ہو رہی تھی۔ اوڑھنے کا مزید سامان ساتھ نہ تھا اس لیے بہت تکلیف پہونچی۔ اور سردی سے بخار آگیا۔ قافلہ رات ہی میں غائر پہونچ گیا تھا، جلدی جلدی شغدف اُتارا اور اوڑھ لپیٹ کر سو رہا۔ منزل پر کچھ سردی کم تھی۔ کرب کی وجہ سے نیند اچھی طرح نہیں آئی، لیکن تمام جسم میں درد تھا جسکی وجہ سے ہلنے کو بھی جی نہ چاہتا تھا۔ نماز فجر کے بعد پھر سونے کے خیال سے لیٹا اور تقریبًا ۹ بجے تک کروٹیں بدلتا رہا۔

سہ شنبہ۔۱۰۔جولائی　صبح کو کھانا پکانے کا وقت تھا، ضرورت تھی کہ حاجی شبراتی صاحب کو ضروری سامان بازار سے لاکر دیا جاتا، مگر میری خرابی طبیعت پر لحاظ کرکے اُن غریب نے سارا کام خود ہی کرلیا۔ اور جب کھانا تیار کرچکے تو مجھے بھی اُٹھایا۔ میں نے پہلے تو تھوڑا سا خمیرہ بنفشہ کھایا۔ اسکے کچھ دیر بعد کھانا، مگر منہ کا مزا خراب تھا اس لیے اچھی طرح کھانا نہ کھایا گیا۔

بیر الماشی پر تو کچھ دینا نہیں پڑا تھا، مگر یہاں ۵ قرش چوکیداری کے دینا پڑے۔ غائر سے روانگی کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ پہاڑ سے پیدل اُترنا پڑے گا، کیونکہ راستہ بہت پیچیدہ اور خطرناک ہے، اونٹ سواریاں لیکر نہیں چل سکتے۔ میں بہت نحیف ہو رہا تھا اسلیے مجھے اس میں تامل ہوا۔ مگر کوئی چارہ نہ تھا۔ عورتیں تک شغدفوں پر نہیں بٹھائی گئیں۔ آگے آگے اونٹ اور پیچھے پیچھے حجاج۔ تھوڑی راہ طے ہوئی تھی کہ میں تھک کر بیٹھ گیا۔ لاچار ہو کر جمّال نے ایک خالی اونٹ پر مجھے بٹھا دیا۔ مگر تھوڑی ہی دُور چلے ہونگے کہ راستہ میں ایک موڑ پر ایک اونٹ گرا پڑا تھا، جسے بدوؤں نے وہیں ذبح کر ڈالا تاکہ راستہ سے لاش ہٹا کر نیچے کھڈ میں ڈال دیں۔ شتربان نے یہ حالت دکھا کر مجھ سے اُتر پڑنے کی خواہش کی، مجبورًا مجکو پھر اُترنا پڑا۔ اونٹ پر چڑھتے وقت

میں نے اپنی سلیپر حاجی شبراتی کو دیدی تھی، کیونکہ اُنکا جوتہ شغدف پر رہ گیا تھا اور ننگے پاؤں چلنے میں اُنھیں تکلیف ہو رہی تھی، اب خود مجھے ننگے پاؤں چلنا پڑا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ تمازتِ آفتاب سے پتھریلی زمین تپ رہی تھی، ...... تلوے بھُنے جاتے تھے، مگر مجبوری تھی۔ حاجی شبراتی شغدف کے ہمراہ آگے جاچکے تھے۔ بہزار خرابی و تکلیف یہ راستہ طے ہوا۔ اُتار ختم ہو جانے اور ہموار راستہ آجانے کے بعد بھی کسی سبب سے اونٹ نہیں رُکے۔ یہاں تک کہ کچھ دور آگے چل کر میں ماندگی کے باعث گر پڑا۔ میری بیچارگی کو دیکھ کر ایک بدو کو رحم آیا اور اُس نے میرے جمّال سے جاکر اطلاع کی تب کہیں شغدف پر سوار ہونے کی نوبت آئی۔ تھوڑی ہی دیر میں منزل پر پہونچ گئے، خستگی کی وجہ سے رات بھر غفلت کی نیند آئی۔

چہارشنبہ ۱۱۔ جولائی — بیر الشہب میں قافلہ پورے چوبیس گھنٹے رہا۔ پژمردگی اور کمزوری کے باعث میں تو دن بھر شغدف کی آڑ میں لیٹا رہا۔ بیچارے حاجی شبراتی سارا کام کرتے رہے۔ پانی یہاں کا بھی نہایت اچھا تھا۔ اگرچہ غائر کی سی سردی نہ تھی۔ عصر کے وقت قافلہ روانہ ہوا۔ راستہ میں کسی مقام پر شب میں قافلہ بہت دیر تک رُکا رہا۔ میں شغدف سے اُترا نہیں مگر لیٹے لیٹے بدوؤں سے دریافت کیا کہ قافلہ کیوں رُکا کھڑا ہے۔ کوئی معقول جواب تو ملا نہیں، لیکن قیاس یہ چاہتا ہے کہ جن قبائل نے پہلے راستہ کا ٹیکس وصول کیا تھا اُنھیں میں سے کسی نے روکا ہوگا۔ اور جب اُنھیں یہ اطمینان ہوگیا کہ جاتے وقت معقول رقوم دی جاچکی ہیں، تب قافلہ کو آگے بڑھنے دیا۔ راستہ میں رُکے رہنے کی وجہ سے خواہ مخواہ منزل کھوٹی ہوئی اور بیر حسانی پہونچتے پہونچتے آفتاب نکل آیا تھا۔

پنجشنبہ ۱۲ جولائی تا پنجشنبہ ۱۹۔ جولائی — بیر حسانی سے مکہ معظمہ تک اُسی راہ سے واپسی ہوئی جس راستہ سے قافلہ آیا تھا، اور جسے سلطانی راستہ کہا جاتا ہے۔ جاتے وقت گرمی بہت تھی۔ مگر واپسی میں گرمی بہت کم رہی اور ٹھنڈی ہوائیں برابر چلتی رہیں جس سے اندازہ ہوا کہ موسم میں تبدیلی ہوگئی ہے۔ ورنہ احرام بند ہونے کی وجہ سے زیادہ تکلیف ہوتی۔ طبیعت کی کمزوری کے باعث میں عموماً منزلوں پر لیٹا رہتا، اور سارا کام کاج حاجی شبراتی کیا کرتے۔ ضعف کے دفعیہ کی غرض سے میں نے کھچڑی کھانا موقوف کردی تھی، بلکہ ہر منزل پر گوشت لیکر شوربہ تیار کر آتا تھا۔ شوربہ کے مسلسل استعمال سے ضعف میں خاطر خواہ کمی ہوئی۔ راستہ میں کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا، البتہ مستورہ میں سابقہ تجربہ کے خلاف میٹھے پانی کے ملنے سے بہت خوشی ہوئی۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ کچھ فاصلہ پر

پرساتی پانی جمع ہے وہیں سے مشکیزے بھر لاتے ہیں - اس پانی کی قیمت ضرور زائد تھی -
مدینہ منورہ کی حاضری کے وقت راستہ جس قدر دیر میں اور دشواری سے طے ہوا تھا، واپسی میں اُسی قدر جلد اور آسانی سے تمام ہوا - موسم بھی نسبتًا خوشگوار تھا، اور باوجودیکہ حاجی شبراتی کے سوا کوئی اور رفیق سفر نہ تھا، طبیعت بھی ناساز تھی، لیکن کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں پہونچی - ہمارا جمال محسن بھی بہت شریف اور نیک تھا، اگرچہ اُسکا نوجوان لڑکا کبھی کبھی تقاضائے عمر بربنائے شرارت سبب پریشانی بنجاتا تھا، لیکن جہاں باپ کو بیٹے کی غفلت یا شرارت کا حال معلوم ہوتا وہ بیچارہ فورًا رفعِ شکایت کی کوشش کرتا - مکہ معظمہ پہونچنے کے بعد جب اپنے مقام پر اطمینان سے بیٹھ کر اُس سامان کی جانچ کی جو اس سفر میں ہم لوگوں کے ساتھ تھا تو پتہ چلا کہ حاجی شبراتی کے کچھ کپڑے غائب ہیں - جمال اپنا بقیہ کرایہ لینے کے لیے آیا تو اُس سے کہا گیا، اور اگرچہ اُسکو اور اسکے لڑکے کو کپڑوں کی تلاش میں بہت کافی دوڑ دھوپ کرنا پڑی اور سوائے ایک کے سب چیزیں مل بھی گئیں، پھر بھی وہ غریب اس بات پر نادم و متاسف رہا کہ ایک کپڑا ضایع ہوگیا - اور جب اُسکو بقیہ اُجرت دی گئی تو بہت خوش ہوا، اور مزید بخشش کا قطعًا کوئی مطالبہ نہیں کیا - تجربہ سے معلوم ہوا کہ بدوؤں کی وحشت اور تیزی شہر میں داخل ہونے کے بعد بہت کچھ قابو میں آجاتی ہے - جمال کا لڑکا جو راہ میں بہت شوخ و شریر نظر آتا تھا، مکہ معظمہ پہونچکر حلم و اطاعت شعاری کا مجسمہ معلوم ہوتا تھا - اس تبدیلی کا باعث غالبًا حکومت کے تعزیری قوانین قرار دیے جا سکتے ہیں، جنکی وجہ سے ذرا سی شکایت پر فورًا گرفتاری ہوجاتی ہے -

آٹھویں منزل

۱۹ - جولائی کو ظہر کے وقت مکہ معظمہ پہونچے - احباب سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ جب قوافل مدینہ منورہ سے واپس آئے اور شریف صاحب تک شکایت پہونچی کہ راستہ میں حجاج سے بہت روپیہ بدوقبائل نے لے لیا ہے، تو اُنھوں نے اکثر حجاج کو بُلا کر نصف رقم واپس دلادی - میرے لیے بھی لوعہ مجیدیاں وصول کرلی گئی تھیں جو شفقی میر عبدالعزیز صاحب سے مل گئیں -
عبدالقادر مطوف کے بیٹے حسن سکندر بھی اس اثنا میں آگئے تھے، اُن سے معلوم ہوا کہ چچی صاحبہ، اُنکی صاحبزادی اور عزیزی انور علی سلمہٗ خلف اصغر منشی اطہر علی صاحب مرحوم ومغفور بھی آگئے ہیں - اور حرم شریف کے قریب ہی مقیم ہیں - یہ سب لوگ میرے ہمراہ آنے والے تھے، مگر

بعض اسباب سے رُک گئے تھے اور عید بعد وطن سے روانہ ہوے۔ عصر کے بعد میں ان لوگوں سے جا کر ملا، اور شام کو بعد مغرب طواف اور سعی سے فراغت کرکے سر کے بال ترشوائے اور احرام اُتارا۔

دوسرے روز جناب مولانا محمد سعید صاحب کے یہاں جاکر ہندوستان کی آئی ہوئی ڈاک وصول کی۔ بعد نماز جمعہ حکیم موسیٰ سے مل کر کچھ دوا لی، کیونکہ بخار اگرچہ اب نہ تھا مگر نزلہ کا زور باقی تھا۔ پھر عبدالستار عبدالجبار کی کوٹھی پر جاکر حاجی شبرانی کو اُس تحریری حوالہ کی بنا پر جو وہ مدینہ منورہ سے اپنے ہمراہ لائے تھے روپیہ دلایا۔ اور گھر آکر اخبار ہمدم کے پرچے اور الناظر پڑھتا رہا۔ خطوط لکھنے کے ارادہ سے سویرے ہی ناشتہ وغیرہ سے فراغت کرکے بیٹھا تھا کہ حاجی برہان الدین صاحب تاجر ادویہ لکھنؤ آگئے، جو معہ نذیر حسین صاحب تاجر پارچہ اور مولوی عبدالرشید صاحب فرنگی محلی کے قریب کے ایک مکان میں ٹھہرے ہوے تھے۔ اُنکی معیت میں حکیم موسیٰ کے یہاں گیا اور اُن سے کچھ اور دوا لی۔ اور وہاں سے رباطِ بھوپال جاکر الطاف حسین صاحب سے ملا، اور علی میاں صاحب کا خط جو مدینہ منورہ سے آیا تھا، اُنکو دیا۔ پھر محی صاحبہ کے یہاں حاضری دیتا ہوا مکان واپس آیا، اور بعد نماز ظہر خطوط لکھے۔ شام کو بازار جاکر مجیدیاں وغیرہ بھنائیں، کیونکہ دوسرے دن حج کے لیے منا جانا تھا۔

مکہ معظمہ میں رویت کے مشتبہ رہنے کی وجہ سے تعین تاریخ میں دقت پیش آئی، اور جب بالآخر یہ طے پاگیا کہ ۲۳- جولائی دوشنبہ کو حج ہوگا، تو اب اتنا وقت نہیں رہا تھا کہ اطمینان سے پورا ایک دن منیٰ میں بسر کرسکیں۔

رسیدِ کتب

۱- وقارِ حیات	آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علیگڈھ	قیمت صہ؍
۲- التربیۃ الاستقلالیہ	ایضاً	” عہ؍
۳- شعرالہند حصہ دوم	دارالمصنفین اعظم گڈھ	” للعہ؍
۴- آئینۂ حقیقت نما	مولانا اکبرشاہ خاں نجیب آبادی	” عہ۸؍
۵- مثنوی مطلع الانوار (فارسی)	مسلم یونیورسٹی پریس علیگڈھ	” سے؍
۶- بدھ اور اسلام	رائے بہادر پنڈت شیونرائن شمیم ایڈوکیٹ لاہور	
۷- رحمۃ للعالمین	مولوی حبیب حسن ردولوی	” ۸؍
۸- بچوں کا قاعدہ	مولوی سجاد مرزا ایم اے (کنٹب)	” ۴؍

تنقیدیں

تاریخ نجد۔ از مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری۔ سلطان ابن سعود نے حجاز پر جب سے چڑھائی کی ہے، لوگوں کو نجد اور اہل نجد کے حالات سے ایک قسم کی دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔ اسی عام دلچسپی کے لحاظ سے یہ نہایت باموقع کتاب شائع ہوئی ہے جسکے مطالعہ سے جزیرۃ العرب کے اس نہایت اہم جزو کے ضروری حالات سے لوگوں کو آگاہی ہو جائے گی۔ اور عام طور پر جو بے سروپا باتیں نجدیوں یا وہابیوں کے عقائد سے متعلق مخالفین نے مشہور کردی ہیں اُنکا ازالہ ہو جائے گا۔ اس مختصر تاریخ میں نجد کے مختلف حصوں کے جغرافی حالات اور اہل نجد کی عام معاشرت لکھنے کے بعد وہابیوں کی مذہبی تحریک اور آل سعود کے حکمرانوں کے مختصر کارنامے درج کیے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہابی فرقہ کے عقائد و خیالات ایسے خطرناک نہیں ہیں جیسے کہ عام طور پر ظاہر کیے جاتے ہیں۔ بلکہ وہابی عام اہل سنت کی طرح ائمۂ اربعہؒ کو مانتے اور جزئیات فقہ میں امام احمد حنبلؒ کے اتباع کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ خود محمدؒ بن عبدالوہاب بانیٔ فرقۂ وہابیہ نے جو خط عراق کے ایک عالم عبدالرحمن بن عبداللہ سویدی بغدادی کے نام لکھا ہے اُس میں اپنے عقائد کو یوں واضح کیا ہے:۔

"بحمداللہ میں متبع سلف ہوں نہ کہ مبتدع۔ میرا دین وہی ہے جو اہل سنت وجماعت یعنی سلف صالح مثلاً ائمہ اربعہ اور اُنکے تابعین کا تھا۔ میں نے لوگوں کو توحید کی تعلیم دی۔ اولیا و صلحا مدفون کے پکارنے اور اُن سے امداد مانگنے کو منع کیا، اُنکی قبروں پر نذر و نیاز چڑھانے اور سجدہ وغیرہ کرنے سے روکا، کیونکہ یہ سب حقوق اللہ کے ہیں، جو نہ کسی نبی مرسل کو حاصل ہیں نہ کسی فرشتہ مقرب کو۔

یہی وہ تعلیم ہے جو تمام انبیا، اول سے آخر تک دیتے چلے آئے ہیں، اور اسی پر اہل سنت وجماعت قائم ہیں .... میں نے اپنے متبعین پر لازم کیا ہے، کہ وہ نماز باجماعت پڑھیں، زکوٰۃ وغیرہ فرایض ادا کریں، منہیات و منکرات، ریا کاری و شراب خواری وغیرہ سے بچیں۔" (صفحہ ۵۵)

بعض روسا کو اُن سے اختلاف تھا اور اُنھوں نے عوام کو اُنکے خلاف بھڑکانے کے لیے طرح طرح کی باتیں مشہور کی تھیں جنکا ذکر اسی خط میں یوں کیا گیا ہے:۔

" منجملہ ان کے (افتراپردازیوں کے) ایک یہ بھی ہے، جو آپ نے اپنے خط میں لکھی ہے کہ میں سوائے اپنے متبعین کے سب کو کافر کہتا ہوں اور انکے نکاحوں کو صحیح نہیں سمجھتا۔ تعجب ہے کہ کیونکر کسی عاقل کے دماغ میں یہ بات سما سکتی ہے کہ کوئی مسلمان ایسا کہے گا۔ میں اس قول سے اللہ کو شاہد گردان کر اپنی براءت کا اظہار کرتا ہوں۔ یہ تو وہی کہے گا جسکی عقل مختل ہو۔ اہل غرض سے اللہ کی پناہ۔

ایسے ہی لوگوں نے مجھ پر تہمت لگائی کہ میں کہتا ہوں کہ اگر مجھے قدرت ہوتی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار مبارک کے قبہ کو گرا دیتا۔ دلائل الخیرات کا جلانا یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے سے منع کرنا بھی میری طرف منسوب کرنا خواہ کسی لفظ میں ہو سراسر کذب و بہتان ہے ....

تکفیر کی بابت جو آپ نے ذکر کیا ہے، تو میں صرف اس شخص کو کافر سمجھتا ہوں جو جان بوجھ کر دین حق سے روگردانی کرے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر طعن کرے یا انکی تعلیمات کی طرف آنے سے لوگوں کو روکے۔ یہی لوگ میرے نزدیک کافر ہیں لیکن امت کا بڑا حصہ بحمداللہ ایسا نہیں ہے"۔ (ص۵۵،۵۶)

ایک دوسرے خط سے جو علماء قصیم کے نام ہے، شیخ کے عقائد کی مزید صراحت یوں ہوتی ہے :-

" میں اللہ کو شاہد قرار دیکر کہتا ہوں کہ میرا وہی عقیدہ ہے جو فرقۂ ناجیہ اہل سنت و جماعت کا ہے یعنی اللہ۔ ملائکہ۔ کتب۔ رسل۔ بعث بعد الموت اور تقدیر پر ایمان رکھتا ہوں۔ صفات الٰہیہ کو بلا تحریف و تعطیل کے اسی طرح مانتا ہوں جس طرح وہ کتاب و سنت میں بیان کی گئی ہیں۔ نہ انکی نفی کرتا ہوں، نہ انکے الفاظ میں تحریف، اور نہ انکو مخلوق کی صفات سے تشبیہ دیتا ہوں۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت پر ایمان رکھتا ہوں کہ وہی اولین شافع ہوں گے اور اسکے منکر کو گمراہ و بدعتی سمجھتا ہوں۔ لیکن یہ شفاعت بعد اذن و رضائے الٰہی ہوگی اور کوئی شفاعت مشرکین کے کام نہ آئے گی ...... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین مانتا ہوں، اور کسی شخص کو اس وقت تک مومن نہیں سمجھتا جب تک کہ انکی رسالت پر ایمان نہ لائے۔ اس امت میں سب سے افضل حضرت ابوبکر صدیق پھر عمر فاروق، پھر عثمان

ذو النورین، پھر علی مرتضیٰ، پھر بقیہ عشرۂ مبشرہ رضوان اللہ علیہم کو سمجھتا ہوں۔ انکے بعد اہل بدر اور پھر تمام صحابہ کو........

ابن سحیم نے میرے اوپر جو الزامات لگائے ہیں، مثلاً یہ کہ میں مذاہب اربعہ کی کتب کو باطل سمجھتا ہوں، یا یہ کہ چھ سو برس سے امتِ اسلامیہ میرے نزدیک گمراہی میں ہے، یا میں مجتہد یا تقلید سے خارج ہوں، یا علماء کے اختلاف کو بجائے رحمت کے نقمت کہتا ہوں، یا جو لوگ صالحین سے توسل کریں انکو یا بصیری (صاحب قصیدۂ بردہ) کو "یا اکرام الخلق" والے شعر کی وجہ سے کافر سمجھتا ہوں، یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر یا اولاد کے لیے والدین کی قبروں کی زیارت کو حرام جانتا ہوں، یا غیر اللہ کے نام کی قسم کھانے والے یا ابن الفارض اور ابن عربی کو کافر قرار دیتا ہوں، یا دلائل الخیرات کو جلا دیتا ہوں اور روض الریاحین کو روض الشیاطین کہتا ہوں، ان سب کا جواب صرف یہ ہے کہ سبحانک ہذا بہتان عظیم۔

رہی یہ بات کہ میں کہتا ہوں کہ کسی شخص کا اسلام کامل نہیں ہوسکتا جبتک کہ وہ کلمۂ طیبہ کے معنی نہ سمجھے، یا تقرب لغیر اللہ کے لیے نذر ماننا کفر اور ذبیحہ حرام ہے۔ یہ مسائل حق ہیں اور میں انکا قائل ہوں اور ان پر کتاب و سنت سے پختہ دلائل رکھتا ہوں"۔ (ص ۵۶ و ۵۷)

اقتباسات بالا سے عیاں ہو جاتا ہے کہ جو عقائد عام طور پر وہابیوں سے منسوب کیے جاتے ہیں، وہ درحقیقت وہ باتیں ہیں جو انکے دشمنوں اور مخالفوں نے انکے زور و قوت کو گھٹانے کے لیے مشہور کردی تھیں۔ ورنہ فی الاصل وہ اہل حدیث یا غیر مقلدوں کے مانند بھی دین میں متشدد نہیں۔ حالانکہ اس زمانہ میں جو خرابیاں رائج ہیں، انکے لحاظ سے اُسی قسم کے تشدد کی ضرورت ہے۔

نجد کی حکومت مختلف امراء کے ہاتھوں میں رہی۔ ۱۱۵۹ھ سے ۱۲۳۴ھ تک آل سعود قابض رہے، اسکے بعد سے ۱۳۰۲ھ تک آل معمر متصرف رہے۔ ۱۳۰۲ھ سے موجودہ سلطان عبد العزیز ابن سعود حکمراں ہیں جنھوں نے رفتہ رفتہ تمام قرب و جوار کے علاقوں کو اپنے زیر نگیں کر لیا، تاآنکہ اب خاص عرب میں امام یمن کے سوا انکا کوئی حریف نہیں رہا۔

اہل نجد کی عام معاشرت (ص ۱۱ لغایۃ ص ۱۸) اور حکومت نجد کے حالات (ص ۱۹ لغایۃ ص ۲۹) کے پڑھنے سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس چودھویں صدی میں اگر کسی کو اسلام کے ابتدائی عہد کا نمونہ دیکھنا ہو تو وہ نجد میں جاکر دیکھے۔

کتاب بہت مختصر ہے، ابتدائی تاریخ بالکل نظر انداز کردی گئی ہے اور ترتیب کے لحاظ سے بھی تاریخ کہے جانے کے بجائے نجد اور نجدیوں کے متعلق چند متفرق مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں فرقۂ وہابیہ کو

بہت اچھی صورت میں پیش کرنے کی نمایاں کوشش کی گئی ہے - اور اسی حیثیت سے اس کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا۔ کتابت و طباعت متوسط درجہ کی - قیمت عہ ملنے کا پتہ :- مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔ **ظ**

فغانِ آرزو جناب انور حسین صاحب آرزو لکھنوی کا پہلا دیوان ہے ' جو چھوٹی تقطیع کے ۲۹۵ صفحات پر ادبی پریس لکھنؤ نے شایع کیا ہے - شروع میں وصی احمد صاحب اخگر کا ایک مختصر مقدمہ ہے اسکے بعد آرزو صاحب کی تصویر ہے - پھر اصل دیوان شروع ہوتا ہے ' آخر میں " چہل چراغ " کے عنوان سے آپ کی چالیس رباعیات ہیں اور " دل صد پارہ " کے عنوان سے متفرق اشعار - آرزو صاحب کا شمار لکھنؤ کے اچھا کہنے والوں میں ہوتا ہے ' اور اُن کی پاک سلیس اور شیریں زبان پڑھکر خوشی ہوتی ہے - زبان لکھنے کا دعوٰے اکثر کیا گیا ہے ' لیکن عام بازاری محاورات کو نظم کر دینا زبان نویسی نہیں ہے - آرزو صاحب کی زبان ان آلایشوں سے پاک ہے - اُنکی زبان کی سادگی ' گھلاوٹ اور نرمی سے لکھنؤ کا نام روشن ہے۔

بحیثیت مجموعی دیوان بہت امید افزا ہے ' گو یہ سچ ہے کہ زیادہ تعداد ایسے اشعار کی ہے جو اوسط درجہ کے ہیں ' اور بلند و عمدہ اشعار کی تعداد کم ہے ' لیکن جو اشعار عمدہ ہیں وہ بہت عمدہ ہیں۔

جس طرح علیگڈھ کالج اپنی پچاس سالہ حیات میں اپنی طرز معاشرت اور ایک مخصوص شان بہت کم بدل سکا ' اسی طرح لکھنؤ اسکول کی شاعری اپنے قدیم رنگ پر قائم ہے ' اور خارجی اثرات سے بہت کم متاثر ہوئی ہے - آرزو صاحب کے یہاں بھی یہ لکھنؤ کا رنگ شروع سے آخر تک پایا جاتا ہے مگر جہاں کہیں اُنھوں نے پامال اور فرسودہ مضامین لکھے ہیں ' اپنے انداز بیان اور ندرت ادا سے اُنھیں عام سطح سے اُٹھا لیا ہے - ملاحظہ ہو :

چارہ گر فکرِ دوا چھوڑ کے ہیں محو دعا ۔۔۔ ہو گیا حال کچھ ایسا کہ گماں اوپرے اب
گرتے ہی اشک تنِ بیدل سے ہو گئے ہم ۔۔۔ یہ اور کوئی شے تھی قطرہ نہ تھا لہو کا

بعض اشعار بہت ہی اچھے ہیں :

کیا حالتِ بسمل پہ ہو انگشت بہ دنداں ۔۔۔ اب کاہے کو ہوگا اثرِ تیرِ ادا یاد
اپنا جو بنانا ہے تو او دشمنِ ایماں ۔۔۔ اتنا بھی نہ کر ظلم کہ آ جائے خدا یاد
ہاں ہاں یہی ہے شانِ حجاب اے کلیمِ طور ۔۔۔ پردہ سے اُٹھیں ہزار نگہ سامنا نہ ہو
کہتے کہتے حالِ ضبطِ عشق آنسو گر پڑے ۔۔۔ ہائے وہ دعوے کہ بے تردید خود باطل ہوا
فروغِ حسن کی بنیاد بھی ہے آتشِ عشق ۔۔۔ کہ شمع سوختہ تن ہو کے جاں گداز ہوئی

انتہائی ندرتِ بیان کا ذائقہ چکھنا ہو ' تو ذیل کے اشعار سے دل بہلائیے :-

میٹھی میٹھی اسکی باتیں یاد آنا خود بخود — دل ہی دل میں سوچنا، پھر مسکرانا خود بخود
دیکھ اس قدر لپٹ کے نہ چل اے ہوائے یاس — دامن سے پھول باغِ تمنا کے گر پڑے

ذیل کے اشعار کی مخصوص لطافت اور ایک خاص طرح کی ندرت آپ کو کہیں اور نہ ملے گی :-

بنا لیں سوزِ نہاں کو ابھار کر شعلہ — بیانِ حال کو ہے اک زبان کی حاجت
چھٹے جو تم سے زمانے کو ہم نے یوں چھوڑا — کہ چاند تک نہیں دیکھا کسی مہینے سے
یہ سنتے ہی جھلا کر باہر تھا وہ پردے کے — کچھ ہے بھی پسِ پردہ یا پردا ہی پردا ہے
ادا سے بل تیوریوں پہ لانا، نگاہ بچا کے مسکرانا — شکایت اس طرح سن رہے ہیں کہ جیسے انکو بھی کچھ گلہ ہے

یہ شاعری نہیں، مصوری ہے، اعجاز ہے، آخری مصرعہ کا طرزِ ادا کس قدر دلفریب ہے۔

آرزو صاحب کو چھوٹی بحروں میں بہت کامیابی حاصل ہوئی ہے، غالباً انکی یہ خصوصیت اور تمام خصوصیات پر بھاری ہے، ملاحظہ ہو :-

کچھ کہتے کہتے اشاروں میں شرما کے کسی کا رہ جانا — وہ میرا سمجھ کر کچھ کا کچھ، جو کہنا نہ تھا وہ کہہ جانا
ہم آنکھیں کھولے بیٹھے تھے جب سارا عالم سوتا تھا — مانندِ چراغ اک سوختہ تن گہ ہنستا تھا گہ روتا تھا
وہ جھونکے سرد ہواؤں کے وہ دل کے کنول کا لہرانا — تھیں آنکھیں بند زمانے کی یہ کس کو خبر کیا ہوتا تھا

”یہ کس کو خبر کیا ہوتا تھا“ یہ ٹکڑا بلاغت کی جان ہے۔

پوچھو نہ بس اب وہ رازِ نہاں مدت سے جو کروٹیں لیتا ہے — کہنے میں الجھ جاتی ہے زباں لکھنے میں قلم تھراتا ہے
حیراں ہو نہ اے قاصد اسپر یہ پیام ہے شکووں کا دفتر — کہدے مری جانب سے جا کر جی اب تو بہت گھبراتا ہے

”جی اب تو بہت گھبراتا ہے“ اس جانِ بلاغت فقرہ میں بلا شبہہ ”شکووں کا دفتر“ پنہاں ہے، رموزِ محبت کی صحیح نکتہ دانی آرزو پر ختم ہے!

ذیل کے اشعار میں استادِ سخن میرؔ کا انداز ملاحظہ فرمائیے :-

سامان کیے دن بھر میں ہم اور چھوڑ کے وقتِ شام چلے — سنسان ہے گھر سونا بستر، دکھ جھیل کے بے آرام چلے
گھر کیا ہے مسافر خانہ ہے گردش میں مدام زمانہ ہے — اک روز یہاں سے جانا ہے یا صبح چلے یا شام چلے

ان محاسن کے باوجود ”فغانِ آرزو“ کا تاریک رخ چھپایا نہیں جا سکتا۔ افسوس ہے اب بھی ایسے اشعار کہنے والے موجود ہیں :-

طے کر رہا ہوں راہِ عدم لیکے الٹی سانس — جانا اسی طرف ہے جدھر کی ہوا نہ ہو

ذیل کے اشعار پڑھ کر کسی بدمست، نیم برہنہ، شاہدِ بازاری کی تصویر آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے :-

بھری جوانی اُمنگ کے دن اُڑیں نگاہیں کہ نیصلہ ہے — بخیر انجام ہو الہٰی یہ دل کا پہلا معاملہ ہے
بادۂ ہوش کندھا ساغر تمکیں ٹوٹا — ہاتھ مارا ہے یہ کس مست کی انگڑائی نے

یہ شعر کس قدر بدمزہ، ثقیل اور مکروہ ہے :-

جان چھوڑ اب لے گراں جانی خدا کے واسطے — جیتے جی مُردہ کی بو آنے لگی بیمار سے

لیکن جیسا ہم اوپر کہہ آئے ہیں، ایسے اشعار کی تعداد کم ہے اور باوجود تلاش ہیں بدرنگ و بدنما اشعار اس سے زیادہ نہ مل سکے۔ کتاب کی قیمت عہ اور الناظر بک ایجنسی لکھنؤ سے دستیاب ہوسکتی ہے

گلشن حیات - مولفہ معین الدین احمد قیس رضوی - مولانا شاد عظیم آبادی ملک کے مسلم الثبوت اُستادوں میں ہیں، جن کی تمام زندگی اُردو علم و ادب کی خدمت میں گذری ہے، اور جو اپنی کبیر سالی کے باوجود اب تک ملک کے جرائد کو اپنے پُرلطف اور اُستادانہ کلام سے سیراب کرتے رہتے ہیں۔ صوبہ بہار میں اُردو کی ترویج کو اس زمانہ میں جس قدر تقویت پہونچی اُس میں بہت بڑا حصہ آپ ہی کا ہے، سید معین الدین احمد قیس نے یہ کتاب آپکے اور آپ کے شاگردوں کے حالات پر لکھی ہے - افسوس ہے کہ حضرتِ شاد کی سوانح نگاری اور اُنکے کلام کی تنقید کا فرض باحسن وجوہ ادا نہیں کیا واقعات کی صحت اور اُنکے جمع کرنے میں محنت کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو، کم از کم یہ کتاب اس زمانہ کی تو معلوم نہیں ہوتی - مولف صاحب شاید بھول گئے کہ وہ حضرت شاد کی سوانحعمری لکھ رہے ہیں، نہ کہ کوئی ناول یا کہانیوں کی کتاب، اور یہ تو اُن کا خیال ہی خیال ہے کہ کتاب ہذا اپنے موضوع و مبحث کا پہلا خاکہ ہے۔

پہلے مولف نے سر فخرالدین صاحب وزیر تعلیمات بہار کے نام نامی کے ساتھ اس کتاب کو معنون کیا ہے، اسکے بعد "عرض حال" میں بھولے پن سے "پبلک اور گورنمنٹ" کی ادب نوازی کے متعلق بہت خوش فہمی سے کام لیکر کتاب کی قدر افزائی کی التجا کی گئی ہے۔ کتاب کا آغاز اس دلچسپ خطیبانہ عبارت سے ہوتا ہے :-

"زبان وطن کے شیدائیو! نظم سخن کے نکتہ شناسو!! میں تو کوئی ایسا سخنور شیوا زباں ہی ہوں کہ کسی صفت کمال کی طرف منسوب کیا جا سکوں؟ (!) اور نہ کوئی اعلیٰ درجہ کا ادیب و انشا پرداز کہ محفل ادبائے روزگار میں بار پا سکوں، الکن ہیچ زبان، ژولیدہ بیاں کی تحریر میں کشش و دل آویزی کہاں، کہ آپ جیسے سنجیدہ خیالوں اور سخن شناسوں کو اپنی طرف کھینچ لے سکے، صاحبو! ....."

کہیں کہیں ایسا معلوم ہوتا ہے، گویا "فسانہ عجائب" اور "باغ و بہار" کی سرزمین کی سیر ہو رہی ہے :-

۱- اس حکایت کا گو حرف حرف با کار مگر اس مختصر کتاب میں اُسکا بیان خیلے دشوار ہے ؎
جو سنے اُسے بھی خلش رہے جو کہوں تو ختم نہ ہو سکے
یہ فسانۂ زلفِ دراز کا کہیں زندگی سے دراز ہے
۲- تو پھر اس کہانی کا سنانا ؎ سورج کو چراغ ہے دکھانا۔
۳- وہ صحت سے عاری اور غلط العوام کے ساتھ بازاری ہے۔

ایک جگہ مولف نے حضرت شاؔد کو اس جملہ کا مرتکب بتایا ہے "شعر کی معیار یہ نہیں ہے جو تم کہہ رہے ہو" دَورِ حاضر میں شعرا کی قحط سالی (!) کا دوسری جگہ یوں رونا رویا "اب تو یہاں تک نوبت آگئی ہے کہ شاعر کا وجود صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح اُڑ رہا ہے"۔

حضرت شاؔد "اس دورِ سخن کے میر" تو تھے لیکن یہ خبر شاید ادبی حلقوں میں دلچسپی کے ساتھ سنی جائیگی کہ وہ مرثیہ گوئی میں مولف کے نزدیک میر انیس کے ہم پلہ ہیں، اور ایک بےمثل ناولسٹ کی حیثیت سے اُنکی "انگلستان و فرانس دونوں ملکوں کے اخباروں نے بیحد تعریفیں لکھیں"۔

شاگردوں کے ذکر میں مؤلف نے کسی کو حتیٰ کہ حضرت یاؔس عظیم آبادی کو بھی اس قابل نہ سمجھا کہ ایک یا ڈیڑھ صفحہ سے زائد جگہ دیتے، ہاں اپنے حالات کے لکھنے میں سات صفحے سے زائد صرف کرکے اس شکایت کا ازالہ کر دیا گیا ہے۔

حضرت شاؔد کے انتخاب کلام سے جو کتاب کے آخر میں درج ہے ذیل کے اشعار بہت لطیف ہیں:—

شب کو مری چشمِ حسرت کا سب درد دکھ اُسنے کہہ جانا
دانتوں میں دبا کر ہونٹ اپنا کچھ سوچ کے اُنکا رہ جانا

مانا کہ فقط موہوم سہی ملنے کی ہیں اک آس تو ہے
دیدار تو ہوئے دید نہ تر ہونا ہے اگر تو بہ جانا

شب کو وہ ہتھیلی سے اُنکا شرما کے چھپانا آنکھوں کو
برچھی کا ادا کی چل جانا، اُس تیر نگہ کا رہ جانا

ہم باغ میں ناحق آئے تھے بلبل کی حکایت کیا کہیے
منقار کو رکھ کر کلیوں پر کچھ اپنی زباں میں کہہ جانا

نہ آئینہ کا قصہ اور نہ حال شانہ کہتے ہیں
حقیقت میں جمالِ یار کا افسانہ کہتے ہیں

انھیں غزلوں پہ حال آتے ہیں میخانوں میں رندوں کو
انھیں شعروں کو سنگیش نعرۂ مستانہ کہتے ہیں

بسے ہیں کیسے کیسے ذی شرف گورِ غریباں میں
بڑے بیدرد ہیں بستی کو جو ویرانہ کہتے ہیں

ہوا در در لیے پھرتی ہے اب تو میری مٹی کو
یہ ہے وہ خاک جو اکدن ترے قدموں پہ ڈالی تھی

کتاب کی لکھائی چھپائی معمولی ہے - ۱۶۴ صفحات - حضرت مولف سے لودی کٹرہ، پٹنہ کے پتہ پر عہ میں مل سکتی ہے۔

ج - ق

پچھلے مہینے کے رسالے

معارف رسالہ معارف، اعظم گڈھ کے جولائی نمبر میں فلسفۂ اخلاق" کے زیر تحت مسئلہ جبر و قدر پر نٹشے کے حسب ذیل خیالات ظاہر کیے گئے ہیں :۔

"ہم اپنے ناکافی و ناقص تجربہ اور مشاہدہ کی بنا پر" افعال" کے مابین حد فاصل قائم کر کے ایک کو دوسرے سے ممتاز کر لیتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ افعال انسانی واقعات کا کوئی غیر مربوط سلسلہ نہیں ہیں، بلکہ وہ ایک چشمۂ رواں کی طرح مسلسل اور مربوط ہیں، موجودہ افعال کی قدر و قیمت سابق اور آئندہ افعال سے الگ ہو کر متعین نہیں کی جا سکتی، یعنی قدرت و اختیار کے قائل قبل سے یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ افعال انسانی کی کوئی اجتماعی حیثیت نہیں ہوتی اور ہر فعل دوسرے فعل سے علیحدہ اور ممتاز ہوتا ہے، اور نٹشے کہتا ہے کہ یہ تسلیم کرنا ہی سرے سے غلط ہے، لہذا کسی فعل کی ذمہ داری اُسکے فاعل پر عائد کرنا اور سابق روایات اور ماحول کی خصوصیات کو نظر انداز کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔"

اس سلسلہ میں علماے اسلام کا اختلاف آرا ملاحظہ ہو :۔

"علماے اسلام بھی "مسئلۂ جبر و قدر" میں مختلف الرائے ہیں۔ جبریہ قائل ہیں کہ انسان مجبور اور بے بس ہے، اور جو کچھ ہوتا ہے، وہ صرف خدا کی قوت و قدرت سے ہوتا ہے، انسانی ہاتھ کو کوئی دخل نہیں ہے، معتزلہ کا دعویٰ ہے کہ انسان کو اپنے افعال پر قدرت حاصل ہے، اور اسی پر اچھے کاموں کے واسطے ثواب اور بُرے کاموں کے واسطے عذاب ملتا ہے، اشعریہ نے "جبر و قدر" کے مابین ایک نئی راہ نکالی، یعنی انسان کو "کسب" کی قوت حاصل ہے، لیکن یہ قوت اور اس قوت کے نتائج دونوں، خدا کی مخلوق ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان تینوں اقوال میں کوئی نہ کوئی مصلحت نظر آئے گی، جبریہ نے خداوند کریم کی عظمت و جلال کو مد نظر رکھ کر اُسے تمام جزو و کل کا خود تنہا خالق قرار دیا۔ معتزلہ کی نظر حکمت پر پڑی، اور اُنھوں نے افعال کی نسبت بندوں کی طرف کر دی، تاکہ خدائے پاک کی ذات مجمع الصفات افعال قبیحہ کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائے۔ اشعریہ نے ان دونوں خیالوں کو مجتمع کر کے خدائے عز و جل کو حکمت و عظمت دونوں کا مجموعہ قرار دیا۔"

دوسرا مسئلہ "امتیاز خیر و شر" ہے، نٹشے کا خیال ہے کہ :۔

"ضمیر یا فطرت کسی فعل کو اچھا یا بُرا صرف اسلیے کہتی ہے، کہ زمانہ اسکو ایسا ہی کہتا آیا ہے، ضمیر و فطرت کا کام صرف نقل کرنا ہے، اختراع کرنا نہیں۔ نٹشے کے نزدیک ہر شے میں کوئی نہ کوئی خاصیت پنہاں ہوتی ہے، جس کے نتائج صفحۂ ہستی پر نمودار ہوتے رہتے ہیں، یہ نتائج طبقۂ عوام کے لیے نفع و ضرر کے لحاظ سے اور طبقۂ خواص کے لیے "قوت و ضعف" کے لحاظ سے امتیاز خیر و شر کا باعث ہوتے ہیں۔"

علماے اسلام اس مسئلہ پر یہ خیال رکھتے ہیں :۔

"علماے اسلام بھی اس مسئلہ میں مختلف الرائے ہیں، اشعریہ کا اعتقاد ہے کہ خیر و شر اور حسن و قبح

کی تفریق خدائی احکام پر موقوف ہے۔ بعض افعال اچھے ہیں کیونکہ خداوند کریم نے انکے کرنے کا حکم دیا ہے اور بعض کام بُرے ہیں کیونکہ خدائے پاک نے اُنکے کرنے کو منع کیا ہے۔ معتزلہ کا دعویٰ ہے کہ عقل خود اچھے اور بُرے، نیک اور بد کے درمیان تمیز کر لیتی ہے۔ سچ بولنا فعل نیک ہے، اس لیے نہیں کہ خدائے عز و جل نے اسکا حکم دیا ہے، بلکہ اس لیے کہ عقل اُسے اچھا کہتی ہے۔ ڈاکہ ڈالنا بُرا ہے، مگر اس وجہ سے نہیں کہ خالق عز و جل نے اسکی ممانعت کی ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ عقل اسے ایک فعل قبیح سمجھتی ہے۔"

زمانہ جولائی نمبر میں خواجہ عبد الرؤف صاحب عشرت لکھنوی کا نہایت دلچسپ مضمون "اودھ کے شاہی میلے" شائع ہوا ہے جو انداز بیان کی سادگی و دل کشی کے علاوہ نہایت پُر لطف معلومات سے لبریز ہے۔ خواجہ صاحب عرصہ سے اودھ کے قدیم شاہی حالات اور واقعات لکھنے میں مشغول ہیں، اور اُنکے ذرائع معلومات نہایت معتبر اور وسیع ہیں۔ عیش باغ جس کی موجودہ حالت دیکھ کر آنکھیں نم ہو جاتی ہیں، نواب آصف الدولہ کے وقت میں "فردوس بر روئے زمین" تھا، جس کا نقشہ خواجہ صاحب ان دل کش الفاظ میں کھینچتے ہیں:—

"اس باغ کی خدمت کے لیے ایک ہزار سات سو مالی مقرر تھا، جو دن رات وہیں رہتا تھا، مالیوں کے رہنے کے لیے جا بجا گمٹیاں بنی ہوئی تھیں، جا بجا فوارے چھوٹ رہے تھے، کنوئیں سب سنگ مرمر کے بنے ہوئے تھے۔ موتی جھیل نام وسط باغ میں ایک جھیل تھی، جس میں ہمیشہ صاف اور شیریں پانی لبریز رہتا تھا، اکثر پیراک وہاں پیرنے آتے تھے، عالیشان مسجد اور پُل کے دوسری طرف جدھا بھی ایک جھیل تھی جسکے قریب تمام سیوؤں کے درخت تھے، اور اس سے کچھ فاصلہ پر کھوریہ بھی ایک جھیل کا نام ہے جس میں ابتک تھوڑا بہت پانی رہتا ہے، اس جھیل کی تمام زمین کالی مٹی کی ہے اور یہاں کی مٹی برتنوں کے کام آتی ہے۔ اسکے علاوہ بہت سی نہریں تھیں جو گرمی میں خشک ہو جاتی تھیں، آصف الدولہ کے زمانہ کا حال تو لکھنا نہیں کہ اس باغ پر کیا جوبن تھا، ستر اسّی برس تک کا نقشہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں، سُنی سنائی کہتے ہیں کہ آصف الدولہ بہادر کے زمانہ میں یہ باغ گرمی کے موسم میں رشک کشمیر تھا، جو کوئی سفید پوش ہوا کھانے آتا تھا، سردی سے کانپنے لگتا تھا، اگر کوئی مسافر کسی درخت کے سایہ میں دوپہر کو سو جاتا تھا تو شام تک اسکی نیند نہ بھرتی، بندر جیسا سیانا حیوان ہے اُس نے ایسا آرام پایا کہ اسی باغ میں ڈیرا لگایا۔"

آگے چل کر نواب صاحب ممدوح کی رحمدلی اور نیک نفسی کا نقشہ پڑھ کر دل میں ایک عجیب حس پیدا ہوتی ہے:

"مالیوں نے شکایت کی کہ یوں تو ہم پرندوں کے واسطے کھٹکے لگا دیتے ہیں تو پرندوں کے ہاتھ سے پھل محفوظ رہتے ہیں، مگر کچھ دنوں سے بندر گھس آئے ہیں، اور وہ کسی صورت سے باغ سے باہر نہیں جاتے، سرکار سے بندوقیں ملیں تو انکو ڈرا کر نکال دیں۔ حکم ہوا وہ باغ کی پناہ میں آئے ہیں انہیں نکالو نہیں، انکے لیے ہماری سرکار سے بھیگے ہوئے چنے مقرر ہو جائیں گے ....."

میلوں کے سلسلہ میں علی گنج کے میلہ کا مختصر حال خوب ہے:—

"علی گنج لکھنؤ کا محلہ ہے اور دریا کے پار شروع جیٹھ کے مہینے میں پیر کے روز ہنومان جی کا میلہ ہوتا ہے، مراد پانے والے پیکرماں کرتے ہوئے یعنی زمین کو اپنے قد سے ناپتے ہوئے اپنے گھر سے مندر تک

زمین پر لیٹتے ہوئے اور اُٹھتے ہوئے، لنگوٹے والے کی جے پکارتے ہوئے آتے ہیں اور حسب توفیق نذر چڑھاتے ہیں۔"

جامعہ رسالہ جامعہ دہلی کے جولائی نمبر میں "مشرق و مغرب" کے عنوان سے وہ گفتگو شایع ہوئی ہے جو فلورنس میں ڈاکٹر ٹگور اور آلدے سورانی کے درمیان ہوئی، ایک حقیقی شاعر کی حیثیت سے اطالیہ کی حسین و خوشنما سرزمین سے متاثر ہو کر ڈاکٹر ٹگور نے اس حقیقت کا اقرار کیا کہ

"اطالیہ کی خوشنمائی روز بروز میری نظر میں کھبتی جاتی ہے، اور فلورنس مجھے اطالیہ کے سب شہروں میں زیادہ خوبصورت نظر آتا ہے، لیکن مجھے اس سے زیادہ خوشی ہوتی اگر میں عمر اور شہرت کا بار دوش پر لیکر اطالیہ نہ آتا، بلکہ کیٹس اور شیلے کی طرح تو گرفتار کی حیثیت سے زیارت کرنے نکلتا، شباب اس پیام کو بہتر سمجھتا جو اطالیہ کی شاعری دے رہی ہے۔"

اندیشہ ہے کہ اُردو کے بعض "نادان دوست" ٹگور کے دیگر روحانی نغموں کی طرح اس مرتبہ بھی کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں، اسلیے ٹگور کے ذیل کے ولولہ خیز اور حوصلہ انگیز خیالات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے:۔

"میں اس لیے نہیں تیا ہوں کہ مارا مارا پھروں اور مجمع میں خصوصاً اہل مغرب کے مجمع میں مجھ پر انگلیاں اُٹھیں، میری زندگی اور اُسکا پیغام داخلی ہے۔ سچی زندگی تمام و کمال داخلی ہوتی ہے، لوگ جمع ہوتے ہیں کہ شاعر کو دیکھیں اور اُسکی باتیں سنیں، لیکن دیکھنے اور سننے کے بعد بھی وہ اُسے نہیں پہچانتے، کیونکہ شاعر پوشیدہ رہتا ہے، جتنا زیادہ شور ہوتا ہے، اور جتنا کثیر مجمع ہوتا ہے اُسی قدر گہرے پردے میں شاعر اپنی روح کی آڑ میں چھپ جاتا ہے اور لوگ اُسے نہیں پہچان سکتے ......"

آلدے سورانی کے اس سوال پر کہ ٹگور یورپ کے کن مصنفین کو پسند کرتے ہیں، اُنھوں نے روسی لٹریچر سے اپنی شدید عقیدت کا اظہار کیا جس میں سادگی، گھلاوٹ اور قلب کی تسکین ہے۔

آگے چل کر ڈاکٹر ٹگور نے صاف صاف کہا:۔

"تم لوگ آجکل پہلے سے زیادہ کھرے، خود سر اور سخت گیر ہو اور لڑائی کے بعد تمھاری ملک گیری کی ہوس اور نااتفاقی میں ترقی ہو رہی ہے، لیکن تمھارے لیے اس سے بھی بڑا خطرہ یہ ہوگا کہ تم بے آہنگی کو زندگی کا ناگزیر اور اٹل قانون سمجھنے کی عادت ڈالو، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تم اندرونی بے آہنگی یعنی روح انسانی کی خانہ جنگی کو ضروری اور اچھا سمجھو، آج ایسے لوگ موجود ہیں جن کے خیال میں سچی زندگی اسی دائمی اندرونی نقیض، اسی خیالات، جذبات اور خواہشات کی گھمسان لڑائی کا نام ہے، یہ ایک خطرناک غلطی ہے۔ تخیلی زندگی خود اپنے سے اور دوسروں سے نقیض کا نام نہیں ہے، کیونکہ زندگی کا کام یہ ہے کہ وہ ہمارے نفس میں ہم آہنگی پیدا کرے اور امن و اتحاد کی روشنی سے دُنیا کو منور کر دے ....."

.... ایک دن تم پر یہ راز کھل جائے گا کہ خارجی منافع کی خواہش اور اُنکا اکٹھا کرنا بیفائدہ اور خطرناک ہے، اور تمھیں اپنے گھروں اور اپنے دلوں کی تہذیب کے ضروری ہونے کا احساس ہونے لگے گا، اُسوقت تمھیں معلوم ہوگا کہ بہت سی چیزیں جنھیں تم قابل قدر سمجھتے تھے صدیوں کا کوڑا ہیں اور اُسوقت

تم وہاں یہ ٹھان لوگے کہ اس کوڑے کو جو تمہارے راستہ میں حائل اور تم پر بار ہے دم بھر میں صاف کرکے پھینک دو، اسوقت تم دراصل اندر اور باہر نئی خداداد زمین کے مالک ہو گے اُس پر عمارت بناؤگے، اور اُس میں آنے والی نسل کے لیے بیج بوؤگے، اُسوقت تم تہذیب کی ایک بلند سطح پر پہونچ گے اور اپنے اور دوسروں کے ساتھ ہمسائگی کا حق ادا کرنا سیکھو گے۔"

ہمایوں "اسلام کا اثر مغربی تہذیب پر" کے عنوان سے میاں بشیر احمد نے ایک سلسلۂ مضمون شروع کیا ہے جو معلومات اور مواد کے لحاظ سے نہایت دلچسپ ہے۔ اس مضمون کی تیاری میں، امیر علی، ڈریپر اور "تمدن عرب" وغیرہ سے مدد لی گئی ہے، جس کا حوالہ صاحب مضمون نے جا بجا دیدیا ہے۔ آجکل کے مشغول اور کاروباری زمانہ میں جبکہ مسلمانوں کی آنکھیں یورپ کی خیرہ کن روشنی میں چوندھیا کر رہ گئی ہیں، اور فرصت نہیں، کہ بڑی بڑی ضخیم کتابیں دیکھ کر حالات سے آگاہی حاصل کی جائے، ضرورت ہے کہ مستند کتابوں کے اوراق سے نکال کر مسلمانوں کے عروج و ترقی کے واقعات متفرق مضامین کی صورت میں نگاہوں کے سامنے لائے جائیں۔ لاہور کے پرچوں کے متعلق یہ خیال بالکل صحیح ہے، کہ وہ ملک کی دماغی نشو و نما میں حصہ نہیں لیتے، وہ صرف تفریح اور تھکن دُور کرنے کا باعث ہوتے ہیں۔ ہمایوں نے یہ مضمون نکال کر اس الزام کو رفع کرنے کی بڑی حد تک کوشش کی ہے۔

ولید اول کے زمانہ میں طارق و موسیٰ کے حملوں کے وقت اسپین کی جو قابل رحم حالت تھی، اُسکا نقشہ مسٹر امیر علی نے نہایت تشریح سے کھینچا ہے، ذیل کے سطور میں بھی تفصیل سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے:۔

"..... نوابوں اور امیروں اور پادریوں کے طبقے ہر قسم کے ٹیکس سے بری تھے، طبقۂ متوسط کی حالت قابل رحم تھی، صنعت و حرفت طرح طرح کے محصولوں کے شکنجہ میں جکڑی ہوئی تھی اور تجارت محض نام کو باقی رہ گئی تھی، حقوق یافتہ امرا نے ملک کو بڑی بڑی جاگیرداروں کی صورت میں منقسم کر رکھا تھا جہاں دنیاوی اور کلیسائی لوگ خوب گلچھرے اُڑاتے تھے اور اپنے غلاموں اور رعیتوں کی محنت و مشقت سے فائدہ اُٹھا کر اُنھیں طرح طرح کے عذابوں میں گرفتار کیا کرتے تھے، عام لوگ جہالت اور توہمات کے سخت پنجوں میں پھنسے ہوئے تعلیم سے عاری اور عقل و فہم سے کوسوں دُور پڑے تھے، یہودیوں کے ساتھ حد درجہ کی سختی کیجاتی تھی، بادشاہ اور امرا اور پادری سب اُنکی گردن پر سوار تھے اور اُنکی زندگی کو جہنم کا نمونہ بنائے ہوئے تھے، غرض ہسپانیہ اور بالعموم یورپ کی حالت صدیوں سے اسی طور پر تھی کہ تاریکیوں پر بدیوں اور علم و حکمت پر لاعلمی اور جہالت کے ہزاروں لاکھوں پردے پڑے ہوئے تھے۔ ....."

اسی نمبر میں مولانا تسلیم پانی پتی کے "حیاتیات" کے عنوان سے متفرق اشعار ایک مستقل درس ہیں، جن سے ہر وہ شخص جو خون میں حرارت رکھتا ہے، متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے گا:۔

زندگی نام ہے حرکت کا، تم افسردہ نہ ہو　　نبض کے خون کے مانند اُچھلنا سیکھو
خاک میں اُن کو ملادیتی ہے خود دنیا　　قوت نشو و نما جب نہ رہے دانوں میں
زندہ رہنے کا اُنھیں حق نہیں دنیا میں تسلیم　　گر ترقی کی اُمنگیں نہ ہوں انسانوں میں

نگار

"سینما اور تعلیم" کے نام سے اس نمبر میں ایک مختصر مگر دلچسپ و پُر از معلومات مضمون شایع ہوا ہے، جس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سینما سے جسے ہمارے یہاں "پیٹ بھروں کا مشغلہ" اور تضیع اوقات کا سبب سمجھا جاتا ہے، مغربی ممالک میں بڑے بڑے کام لیے جاتے ہیں۔ تعلیم کا اصلی مقصد اگر یہ ہے کہ لڑکوں میں ایک خاص وسیع النظری پیدا کر کے اُنکے کیرکٹر کو مستحکم و مضبوط بنایا جائے اور اُنکے دل و دماغ میں ایک خاص تڑپ پیدا کر کے اُنکو بنی نوع انسان کی ہمدردی کا درس دیا جائے تو سینما یقیناً ایک زبردست آلۂ تعلیم ہے۔ کتابی طالب علموں کے متعلق عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ طالب علمی کو خیرباد کہنے کے بعد انھیں ایک عمر تک دنیاوی تجربہ کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ انھیں جیسی علمی بصیرت تو ہوتی ہے مگر مشاہدہ نہیں ہوتا، سینما اس مرض کا علاج ہے:

"یورپ و امریکہ کے ماہرین تعلیم و تربیت کا خیال ہے کہ "صور متحرکہ" تعلیم و تربیت کا بہترین ذریعہ ہے اور اسی غرض کے لیے خاص خاص فلم تیار کرائے جاتے ہیں جو لوگوں کی معلومات میں اضافہ کرسکیں، چنانچہ دنیا کے تمام مشہور حوادث و واقعات کے فلم تیار کرانا اسی اصول کی بنا پر ہے تاکہ ساری دنیا انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھ لے اور ظاہر ہے کہ دیکھنے سے جن حقیقتوں کا علم ہو سکتا ہے وہ صرف تقریر و تحریر سے نہیں حاصل ہو سکتا۔ گویا اس طرح فلم سے صحیفۂ اخباری کا کام لیا جاتا ہے

انگلستان کی وہ کمیٹی جو فلم کے احتساب کے لیے مقرر ہے اپنی رپورٹ میں ظاہر کرتی ہے کہ وہ طلبا جو سینما دیکھتے ہیں اُنکی معلومات دوسرے ہم عمر طلبا سے جو سینما نہیں دیکھتے کہیں زیادہ وسیع و عمیق ہوتی ہے۔ چنانچہ جب ایسے طلبا کا امتحان لیا گیا تو معلوم ہوا کہ اُنکی معلومات صرف ایک موضوع پر حاوی نہیں، بلکہ جغرافیہ، آداب، علم طبیعی، صناعت، تاریخ، حالات اجتماعیہ، اور واقعات عالم ان سب پر اُنکو نگاہ تھی اور اسی کے ساتھ یہ بھی تھا کہ جو حقائق کتابوں کے ذریعہ سے انھیں حاصل ہوئے تھے وہ ایسے مستحکم طور پر دماغ میں راسخ نہ ہوئے تھے جیسے وہ حقائق جن کو انھوں نے سینما میں دیکھا تھا۔"

نظام المشایخ

اس نمبر میں "قربانی" کے عنوان سے محترمی مولانا عبدالماجد صاحب بی اے نے مسئلہ تنازع للبقاء، مشرق و مغرب کے اختلاف کو یوں ظاہر کیا ہے:

"انسان کی ترکیب میں محض جسم ہی شامل نہیں بلکہ ایک شے اسکے علاوہ بھی ہے جسے روح کہتے ہیں اور جس طرح ایک عالم جسمانیات کا ہے ٹھیک اسی طرح ایک مستقل عالم روحانیات کا بھی ہے .... مغرب نے جسم کی فضا میں پرورش پا کر ارتقا کا آخری مرتبہ "عقل" کو خیال کیا، مشرق نے روح کی تربیت سے فیض پا کر ارتقا کی آخری منزل "وحی" کو تسلیم کیا، عقل و دانش کے بہترین ثمرات ڈارون و نیوٹن، آئنسٹائن و برگسان کے نظریات کی شکل میں ظاہر ہوے ہیں۔ وحی و الہام کی آخری معراج محمد رسول اللہ و ابراہیم خلیل اللہ کے ہدایات کی صورت میں موجود ہے۔ عقل کی تعلیم ہے کہ جو کچھ ہے سب انسان کا ہے، وحی کی ہدایت ہے کہ جو کچھ ہے سب خدا کا ہے، جہاں تک انسان خود بھی اپنا نہیں ہے۔ ایک کے سامنے صرف آج ہے، دوسرے کے پیش نظر کل ہے، ایک کو اسکی دھن ہے کہ خواہ میں کتنا وصول ہوا، دوسرے کو اسکی فکر ہے کہ خیرات میں کتنا صرف کیا۔"

(اقتباس نقل کیا جا چکا تھا کہ یہ معلوم ہو کر افسوس ہوا کہ ماجد صاحب کا یہ مضمون ۲۶ - جون ۱۹۲۵ء کے "سچ" سے بلا حوالہ دیے نظام المشایخ میں نقل کیا گیا ہے)۔

ع - ق

اُردو رسائل کے خاص مضامین

(جولائی ۱۹۳۱ء)

رسالہ دلگداز لکھنؤ

۱۔ سلطان عالم واجد علی شاہ

رسالہ معارف اعظم گڈھ

۱۔ مستدرک حاکم کا مطبوعہ نسخہ
۲۔ فقہ اسلامی کے مذاہب اربعہ
۳۔ فلسفۂ اخلاق
۴۔ حلب و دمشق کے قدیم اسلامی مدارس

رسالہ زمانہ کانپور

۱۔ کربلا (ڈراما)
۲۔ اودھ کے شاہی مینے

رسالہ ہمایوں لاہور

۱۔ شام کا اثر مغربی تہذیب پر
۲۔ بھنور کی دلھن (افسانہ)

رسالہ نگار بھوپال

۱۔ کیا ہندوستان ایک صناع ملک بن سکتا ہے؟
۲۔ رودکی

۳۔ سینما اور تعلیم

رسالہ جامعہ دہلی

۱۔ ہندوستان کی معیشت زرعی
۲۔ اسلام اور تصوف اسلامی
۳۔ مشرق و مغرب
۴۔ گوری اماں (افسانہ)

رسالہ نیرنگ خیال لاہور

۱۔ فنون لطیفہ
۲۔ سویرے جو کل آنکھ میری کھلی
۳۔ شارحین غالب

رسالہ نظام المشائخ دہلی

۱۔ جھوٹا دعوے
۲۔ قربانی

رسالہ مرقع لکھنؤ

۱۔ زندگی کا اصلی مذہب
۲۔ لسان العصر اور شاد عظیم آبادی

بسم اللہ

فہرست مضامین الناظر بابت ماہ ستمبر ۱۹۲۶ء

نمبر ۳ — جلد ۳۱

نئی کتابیں

نظریۂ اضافیت

(تالیف پروفیسر منہاج الدین - ایم ایس سی) جرمنی کے نامور سائنسداں آئن اسٹائن نے سر اسحاق نیوٹن کے مشہور نظریہ تجاذب اجسام پر ترقی کرکے ایک نیا نظریہ قائم کیا ہے جسے نظریۂ اضافیت —— (Relativity Theory) کہتے ہیں۔ اور جس میں تجاذب و کشش کے بغیر بھی اجسام میں حرکت کا پایا جانا ثابت کیا گیا ہے۔ پروفیسر منہاج الدین صاحب نے اسی نظریہ کی توضیح و تشریح پر یہ لاجواب کتاب لکھی ہے۔ مقدمہ میں پروفیسر آئن اسٹائن موجد نظریۂ اضافیت کے مختصر حالات اور اخیر میں انگریزی مصطلحات اور انکے تراجم کی ایک فہرست دیگئی ہے۔ کتاب پر بہت خوشنما انگریزی جلد ہے جس پر کتاب اور مصنف کا نام سنہرے حرفوں میں چھپا ہوا ہے۔ قیمت غیر مجلد للعہ مجلد ۱۲ آنہ

ہیئت جدید

(تالیف پروفیسر منہاج الدین ایم ایس سی و پروفیسر برکت علی ایم اے) مصنف نظریۂ اضافیت نے پروفیسر برکت علی ایم اے کی مدد سے ہیئت جدیدہ پر تین ضخیم جلدیں تصنیف فرمائی ہیں۔ بڑی خوبی اس کتاب میں یہ ہے کہ جا بجا ہیئت قدیم سے بھی مقابلہ کیا گیا ہے۔ قیمت حصہ اول عہ حصہ دوم ۸ حصہ سوم عہ

زینت آسمان

(تالیف پروفیسر برکت علی ایم اے و پروفیسر منہاج الدین ایم ایس سی) ستاروں کی شناخت پر اُردو میں پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب میں ستاروں کے بارہ نقشے ہیں اور ہر نقشے کے ساتھ خاص خاص ستاروں کے مختصر حالات بھی قلمبند کردیے ہیں کہ ستاروں کے پہچاننے میں کوئی دقت نہ ہو۔ قیمت عہ

روح تنقید

(تالیف سید غلام محی الدین قادری زور بی اے) سید محی الدین زور نے جنکا ایک مضمون اسی پرچہ میں ملاحظہ سے گذریگا، فن تنقید پر یہ دلچسپ و مفید کتاب لکھی ہے، جسمیں مقاصد و اصول تنقید پر مشرقی و مغربی نقطہ ہائے نظر سے بہت اچھی بحث کی گئی ہے اور نمونہ کے طور پر مثنوی سحر البیان پر تنقید بھی پیش کی گئی ہے تنقیدی مضامین لکھنے والوں کے لیے بہت کارآمد ہوگی ۱۲ آنہ

طلسم تقدیر

مصنف روح تنقید کا ایک دلچسپ افسانہ ہے، جس میں شہنشاہ اورنگ زیب کے آخری ایام کی ایک عبرت خیز داستان بیان ہوئی ہے۔ شروع میں عبد القادر صاحب بی اے کے قلم سے فن افسانہ نویسی پر ایک مختصر مقدمہ بھی ہے۔ قیمت ۸

منیجر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۳ جلد ۳۱ — ستمبر سنہ ۱۹۲۶ء

نظرے خوش گذرے

جنوری نمبر میں نئے انعامی مقابلہ کا اعلان کیا گیا تھا۔ مضمون ایسا تجویز کیا گیا تھا کہ شعر وشاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کی کثرت کو دیکھتے ہوئے یہ توقع شاید بیجا نہ تھی کہ انشاپردازی کے عنوان سے زیادہ طبع آزمائی کرنے والے اہل قلم کی توجہ اس طرف مائل ہوگی۔ لیکن رقم انعام کی کمی یا کسی دوسرے سبب کے بدولت افسوس ہے کہ سوائے میرے دیرینہ کرم فرما جناب قاضی غلام امیر صاحب امیر بدایونی کے اور کسی صاحب نے اس مقابلہ کے لیے مضمون لکھنے کی زحمت گوارا نہ فرمائی۔

قاضی صاحب کا اس پیرانہ سالی میں ایسی جواں ہمتی ظاہر فرمانا غایت درجہ موجب امتنان ہے، خصوصاً اس لیے کہ انعام کی رقم اُنکے ذوقِ نگارش کے لیے وجہِ تحریک نہیں ہوسکتی تھی۔

چونکہ اور کسی صاحب کا مضمون نہیں آیا اسلیے طباعت سے قبل اراکین مجلس انتخاب کی خدمت میں اظہار رائے کی غرض سے مضمون بھیجنے کی ضرورت نہیں رہی۔ بلکہ انشاءاللہ الناظر کے آیندہ دو نمبروں میں یہ مضمون شایع ہوجائے گا۔ اور اگر اراکین کی رائے میں مضمون لائق انعام ہوگا تو قاضی صاحب کی خدمت میں الناظر کا نذرانہ روانہ کردیا جائے گا۔

انعامی مقابلہ کا جو مقصد تھا وہ چونکہ اس طریقہ پر نہیں پورا ہوتا، اسلیے اب جب تک بہت کافی رقم کا انتظام نہ ہوجائے یہ سلسلہ جاری نہ رہے گا۔

حجاج کی واپسی نے مسلمانوں پر انتشار و تفرق کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ اور اگرچہ ڈاکٹر کچلو صاحب اور بعض دیگر اصحاب کوشش فرما رہے ہیں کہ ہمارے رہنماؤں کے درمیان کوئی ایسی صورت مفاہمت پیدا ہو جائے جس سے آپس کی یہ تفریق رفع ہو جائے، مگر اندیشہ ہے کہ اُنکی کوششیں زیادہ بار ور نہ ہوں گی۔ بہرحال نتیجہ جو کچھ ہو، اُنکی یہ سعی لایق شکرگزاری ہے۔

ابھی تک ہندو لیڈروں کی اس نادانی پر ماتم کیا جاتا تھا کہ اُنکی بے بصیرتی سے ملکی کام برباد ہو گیا اور جو قوتیں جنگ آزادی پر صرف ہونا چاہیے تھیں وہ باہمی خانہ جنگی میں رائیگاں ہو رہی ہیں، مگر یہ کیا بدبختی ہے کہ جو لوگ اس مصیبت عظمیٰ پر غیروں کو ملامت کر رہے تھے اور باوجود انتہائی اشتعال کے صبر و سکون کے پیکر بنے ہوئے تھے وہ خود مسلمانوں کے اندر خانہ جنگی کی آگ کو ہوا دے رہے ہیں۔

خدام الحرمین کی تعمیر جن عناصر سے ہوئی ہے اُن میں غالب حصہ اُنکا ہے جو ملکی آزادی کے خیال سے بے پروا اور حکومت سے ٹکرانے کو اپنی عافیت پسندی کے خلاف جانتے ہیں اس لیے اگر وہ مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی کا سبب بنے تو کچھ زیادہ محل شکایت نہ تھا۔ لیکن خلافت کمیٹی کے ہنماؤں سے تو بدرجہا زائد تدبر و دانشمندی کی توقع کیجاتی تھی، مگر آج ہم دیکھتے ہیں کہ وہ خود ایک شدید قسم کی نزاع باہمی کا ذریعہ بنے جا رہے ہیں۔

حجاز کی مقدس سرزمین کے ساتھ مسلمانوں کا گہرا تعلق مسلّم ہے۔ اس سے کبھی انکار کرنے کی ضرورت نہیں کہ نجدیوں نے مقابر و آثار کو اپنے عقائد مذہبی کے اتباع میں مسمار کرکے ہندوستان کے کثیر التعداد اشخاص کو متاثر کیا ہے اور یہ بھی مان لیا جا سکتا ہے کہ مناسب طریقہ پر وہاں کے حالات میں اصلاح کی کوشش ہرگونہ لائق ستائش ہے۔ لیکن اس سے آگے جانے کی کوشش صریح غلطی و کج رائی ہے جسکے صرف دو ہی نتیجے ہو سکتے ہیں۔ خود اس ملک کے مسلمانوں میں نزاع قائم ہو کر ہماری مشکلات میں اضافہ کرتی رہے اور سرزمین مقدسۂ حجاز کے امن و امان کو برباد کرکے حجازیوں اور عربوں کو یورپ کی فرنگی قوتوں کی حرص و آز کے جال میں پھنسا دے۔

خدام الحرمین والوں کے نزدیک [illegible] ہے کہ حجاز کا موجو[illegible] ا اور اُسکی قوم دائرۂ اسلام سے خارج ہو، لیکن خلافت کمیٹی والے تو ایسے عقا[illegible] اس قسم کی خام خیالیوں کو جائز و پسندیدہ [illegible] سمجھتے ہوں۔ پھر کیا ایک مُسلم حکمراں [illegible] جنگ کیجائیگی کہ وہ مقابر و آثار کی شکست کو اپنے مذہبی عقیدہ کی بنا پر ضروری جس[illegible] لڑائی کی بنیاد یہ قرار

دی جائے گی کہ ابن سعود نے خاندان شریف کو نکال کر حجاز پر تسلط قائم کر لینے کے بعد وہاں خلفاے راشدین رض کے نمونہ کی جمہوریت نہیں قائم کی۔

حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق کہا گیا ہے کہ

سر داد و نہ داد دست در دستِ یزید

اور غالباً کسی مسلمان کو ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال نہ آتا ہوگا کہ حضرت امام ہمام رض سے زیادہ حریتِ دینی اور فداکاری ملت کا جذبہ کسی مسلمان میں ہوگا یا آج ہو سکتا ہے۔ پھر کیا کوئی اسکا دعویٰ کر سکتا ہے کہ حضرت امام رض نے حضرت امیر معاویہ رض یا اُنکے بعد یزید ابن معاویہ کی خلافت و حکومت کو شکست کرنے کی کوئی کوشش فرمائی؟ اگر ملوکیت کے خلاف حضرت امام حسین رض علمِ جہاد بلند کرتے اور خلفاے راشدین رض کے نمونہ کی جمہوریت قائم کرنے کے لیے امت اسلامیہ کو دعوت شرکت دیتے تو کیا پہلی صدی ہجری کے مسلمان ایسے گئے گذرے تھے کہ خاندان رسالت کی اُس بزرگترین یادگار کی طلب دعوت کو اُسی طرح رد کر دیتے جس طرح گذشتہ محاربۂ عظیم کے زمانہ میں ترکی خلیفہ کی دعوت کو زمانۂ حال کے مسلمانوں نے ٹھکرا دیا۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اُنھیں جنگ جمل کی افسوسناک داستان نہ بھولی تھی، اور وہ مسلمانوں کی خانہ جنگی کو اس سے بدرجہا بدتر جانتے تھے کہ ملوکیت کو توڑ کر پھر خلافت راشدہ کے نمونہ کی خلافت قائم کریں۔ اس لیے حضرت امام رض شروع ہی میں اس خیال سے دست بردار ہوگئے تھے۔ پھر کیا ہمارے لیے حضرت امام رض کے طرز عمل میں سوا اسکے کوئی درس عبرت نہیں کہ

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ہمارے جن بزرگوں کی رائے میں خلافتِ راشدہ کے نمونہ کی جمہوریت کا قیام ممکن ہے اُن سے اختلاف رکھنے کے باوجود ہم یہ عرض کرنے کی جسارت کریں گے کہ انکو اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے وقت اور حالات کے مقتضیات کو پیش نظر رکھ کر کام کرنا چاہیے۔ ہندوستان کو اگر آزادیِ کامل میسر ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ انکا اشارۂ چشم حجاز کی حکومت کو تہ و بالا کر دیتا۔ مگر موجودہ حالت میں تو صرف اسی طرح یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے کہ سلطان ابن سعود کو اپنی مخلصانہ کوششوں سے اپنا گرویدہ بنایا جائے، انکے خیالات کی اصلاح کی جائے تاکہ وہ خود ہمارے ان بزرگوں کی طرح اسے ایک مذہبی فریضہ تصور کرکے حجاز کی عنانِ حکومت موتمر اسلامی کے سپرد کر دیں۔

لیکن سلطان سے ان کو اپنے ہاتھ میں لینے اور انکو اپنا ہم خیال بنانے کی صورت تو نہیں ہو سکتی کہ اُنکے خلاف جنگ و جہاد کا اعلان کر دیا جائے۔ اسکا تو صرف یہی طریقہ ہو سکتا ہے کہ انکو آپ کے

خیال و آرا کے خلاف اور صد بڑھے، اور اگر جیسا کہ آپ کا خیال ہے وہ حکومت و اقتدار کے ہوسمند اور اپنے اور اپنے بیٹوں کے لیے سلطنتیں قائم کرنے کے متمنی ہیں تو بہت ممکن ہے کہ حصول مدعا کی تمنا میں وہ انگریزوں یا فرانسیسیوں یا اور کسی مسیحی قوت سے ساز باز کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔

سلطان ابن سعود نے سال گذشتہ کچھ وعدے کیے تھے جنکو پڑھکر ہمارے بعض احباب اس دھوکہ میں آ گئے کہ حجاز کو خاندان شریف کے قبضہ و تصرف سے نکالنے کے لیے آدمیوں اور روپیہ کی اُس قربانی کے بعد جو ہر معرکۂ جنگ کا لازمہ ہیں، سلطان نجد حکومت حجاز کو بزم میلاد کی شیرینی کی طرح لوگوں پر تقسیم کر دینگے۔ اور اگر اپنے بھولے پن یا غلط توقعات کی شکست پر یہ ساری برہمی ہے تو ہمارے بزرگوں اور دوستوں کو ابن سعود سے برسرپیکار ہونے کے بجائے خود اپنے تدبر اور فراست کو مورد الزام قرار دینا چاہیے اور کم سے کم آئندہ کے لیے زیادہ ہوشیار رہنا چاہیے کہ بادشاہوں کے وعدے اور ارادے ہمیشہ اپنے حالات گرد و پیش کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔

مختلف خیال کے اصحاب نے حجاز کے موجودہ حالات کے بارہ میں اب تک جو اطلاعیں بہم پہونچائی ہیں، انکو پڑھنے کے بعد مایوسی کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ اور اگر تدبر و خوش اسلوبی سے سلطان ابن سعود کے ساتھ اتحاد عمل کیا جائے تو اسکی قوی امید ہے کہ حجاز کا نظم و نسق ہر حیثیت سے قابل اطمینان ہو سکتا ہے۔ اور بہت ممکن ہے کہ ہمارے واجب الاحترام بزرگوں کی جو تمنائیں ہیں، ایک بڑی حد تک وہ بھی بر آئیں۔ یعنی حجاز میں ایک ایسی پائدار اور خوش انتظام حکومت قائم ہو جائے جو ایک طرف اگر اغیار کی تمام ریشہ بازیوں اور وغا بازی کی کوششوں کا سد باب کر دے تو دوسری طرف حجاج و زائرین کے لیے وہ تمام ممکنہ آسانیاں فراہم کر دے جو از روے شریعت اسلام جائز و مناسب ہوں۔

نجد کا بدوی سلطان مہذب فرنگیوں کا سا دل و دماغ اگرچہ نہیں رکھتا لیکن شریعت اسلامیہ کی تابعیت کرنے کی تمام اہلیتیں رکھتا ہے بشرطیکہ دنیاے اسلام کے بہترین دل و دماغ قرآن و حدیث کی روشنی میں اور مسلمانوں کے مصلحانہ طرز پر سلطان کو اپنے نیک مشوروں اور مفید تجاویز سے مدد دیتے رہیں اور اپنے معہودات ذہنی کی رو میں اس حقیقت کو نظر انداز نہ فرمائیں کہ

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

۲۱- ستمبر ۱۹۲۶ء

ظفر الملک

تاریخِ عرب

وحشی اقوام، مثلاً تاتاری اور افریقی کا تو ذکر ہی کیا، کہ اُنکے یہاں "لٹریچر" نہیں ہوتا۔ مگر جو اقوام گمنامی سے منصۂ شہود پر آئی ہیں، مثلاً عرب اور یوروپین، وہ اپنا کچھ نہ کچھ لٹریچر رکھتی تھیں۔ میں شاید غلطی کر رہا ہوں، کیونکہ ان دونوں اقوام کے پاس جو کچھ بھی تھا وہ کوئی چیز سینہ بسینہ تھی یا سینہ محفوظ۔ لٹریچر کا اطلاق اُس چیز پر کیا جاتا ہے کہ جو بقید تحریر ہو۔ ان دونوں کی یہ کیفیت نہ تھی لیکن اِلّا ماشاءاللہ۔ بہرحال اس قسم کی اقوام کی علمی تاریخ پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان لوگوں کی ترقی کا بنیادی پتھر تراجم ہوئے ہیں۔ میں نے بعض اقوام، مثلاً ہندی، مصری، یونانی، کا عمداً ذکر نہیں کیا۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے جو کچھ حاصل کیا وہ از خود اکتساب کردہ تھا۔ ایسی شہادت کم از کم مجھے، معلوم نہیں ہوتی کہ انکے یہاں بھی تراجم ہوے ہوں۔ لیکن ایک نے دوسرے سے بذریعہ تلمذ، ضرور فیض اُٹھایا۔ میں اسکو بھی تراجم ہی کی فہرست میں داخل و شامل کرتا ہوں۔ ہوتا یہ ہے کہ جب کسی قوم کی خواب گراں سے آنکھ کھلتی ہے تو وہ یہ دیکھتی ہے کہ اُسکو یہ حیثیت تو حاصل ہے کہ سکندر مقدونی جیسے فاتح کے ساتھ ایک ہی تخت پر بیٹھ سکے، لیکن علمی حیثیت سے وہ بہت پستی میں ہے۔ اس احساس کے بعد وہ اپنے گرد و پیش کی اقوام پر نظر ڈالتی ہے اور جسکو اس میدان میں آگے بڑھا دیکھتی ہے اُسکو اپنا اُستاد بنا لیتی ہے؛ جس طرح عربوں نے یونان یا ہندوستان کو بنا لیا، اور اُنکے علوم کو اپنے یہاں منتقل کر لیا۔ بدقسمت ہوتے عرب اگر وہ اکتساب یونانی و سنسکرت پر قانع ہو بیٹھتے اور اپنی زبان کو مالا مال نہ کر لیتے۔

مگر میں رہتا ہوں جھونپڑے میں، اور خواب دیکھ رہا ہوں محلوں کا۔ میں ایک مفتوح قوم کا فرد ہوں، اور جانتا ہوں کہ ایک لفظ "مفتوح" کی تفسیر دنیا بھر کی ذلت، بے شرمی، بدنامی وغیرہ وغیرہ ہے، اور ذکر کر رہا ہوں فاتحین کا۔ لیکن آخر نہ گیا وہ باغ اُمید۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے فاتح میرے نہیں ہیں، اسی لیے اُنکو میری زبان کے مرنے جینے کی چنداں پروا نہیں ہے۔ انصاف کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہیے: ہندوستان زبانوں اور بولیوں کا محشر ہے۔ یہاں بھانت بھانت کی چڑیاں ہیں اور بھانت بھانت کی بولیاں، ہر ایک کا دعویٰ ہے کہ اُسی کا نغمہ دلکش ہے! اس پر ہمصفیر و کا غوغا۔ گو اُردو یہ کہہ سکتی ہے کہ

تاک را سیراب سازے ابر باراں در بہار   تاک تا مے میتواند شد چرا گوہر شود

اس صورت میں سرپرستی شاہی کا ذکر فضول ہے؛ لیکن اس کا کیا علاج کہ بغیر بادشاہ کی سرپرستی کے کسی علم و فن کا سرسبز ہونا، گو ناممکن نہیں مگر مشکل ضرور ہے۔ مثلاً حیدرآباد کو لیجیے۔ اگر کسی نے زبان اردو کی تاریخ لکھی، تو ناممکن ہے کہ حضور خسرو دکن خلد اللہ ملکہ وحشمتہ کا احسان نہ مانے۔ ہندوستان میں افراد نے اپنی سعی بازو پر بھروسہ کرکے بہت کچھ کیا، اور کر رہے ہیں؛ مگر آخر یہ حرکت مذبوحی ہی ہے تاوقتیکہ اسے بادشاہ وقت کی سرپرستی نہ ملے۔ الحمد للہ کہ اس حرکت میں خدائے تعالیٰ نے بہت کچھ برکت عطا فرمائی اور بذریعہ تراجم اچھی اچھی چیزیں نکل رہی ہیں۔ مگر مشکل اور صعب مشکل یہ درپیش ہے کہ ہمارے ملک میں ترجموں کی کوئی قدر نہیں، ترجمہ کرنا یہاں ایک ایسی سعی نامشکور ہے کہ بیچارے مترجم کی دلشکنی تو ایک طرف اُسکو یہ ظاہر کرتے ہوئے شرم آتی ہے کہ میں کسی کتاب کا مترجم ہوں۔ یہ کہ کر اُسے جو جانگسل طعنے سننے پڑتے ہیں، وہ اُسی کا جی جانتا ہے۔ مثالوں کی کمی نہیں: میں آپ بیتی عرض کرتا ہوں، کہ میں نے اثنائے سفر ریل میں ایک "تعلیمیافتہ" بزرگ کے سامنے، جو فی الجملہ اُردو کے خیرخواہ، اور اُسکی حالت پر آہ سرد بھرنے والے تھے، ایک بہترین کتاب کے ترجمہ کا ذکر کیا۔ اُنھوں نے زہرخند فرماکر انگریزی کا ایک ذو معنی فقرہ صادر کردیا جسکے معنی اردو میں یہ ہوتے ہیں، کہ مترجم ہمیشہ دغاباز ہوتے ہیں۔ میں نے معاً دل میں یہ سوچا کہ اسکے بعد غریب مترجم کو اسکے سوا چارہ نہیں کہ وہ ریل کے نیچے اپنا سر رکھدے مگر

ایں شعلہ ہند گرم تیز است   اینجاست کہ آفتاب تیز است

یورپ میں، جو ہم سے صدیوں آگے بڑھا ہوا ہے، یہ کیفیت ہے کہ ایک خوش نصیب کسی کتاب کا ترجمہ کرتا ہے؛ لوگ اُسکو ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں، اخباروں میں اُس کا چرچا ہوتا ہے، رسالوں میں ریویو نکلتے ہیں، اعیان ملک اور عمائد سلطنت اُسکی قدر کرتے ہیں، بادشاہ کی طرف سے ادنیٰ قدر یہ ہوتی ہے کہ وہ نائٹ بنا دیا جاتا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ چند ہی روز میں مالامال ہوجاتا ہے۔ حالانکہ یورپ کو اب ترجموں کی چنداں ضرورت نہیں ہے، کیونکہ وہ عروج علمی کے زینہ یعنی ترجمہ و تالیف سے گذر چکا ہے اور اب تصنیف کے مقام اعتلا پر کوس لمن الملک الیوم بجا رہا ہے، اور بالکل سچا بجا رہا ہے۔ ویڈنی ہے میری بدقسمتی کہ میں قعر مذلت میں [illegible] ادبار میں گرا ہوا اُن لوگوں کو ذلیل سمجھ رہا ہوں جو پہلے زینہ تک بھی نہیں ہاتھ بڑھاتے [illegible] کہ ہمارے مقابلہ میں یورپ صدیوں بڑھا ہوا ہے، اُن تک پہونچنے میں [illegible] اس وقت

ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ایسا راستہ اختیار کریں جس سے ہم منزل مقصود تک جلد از جلد پہونچ سکیں۔ غور کرکے دیکھیے یہ راہ سوائے اسکے نہیں کہ ہم با لفعل ترجموں کے ہو رہیں

مصلحت بین من آنست کہ یاراں ہمہ کار بگزارند و سر طرۂ یارے گیرند

تالیف و تصنیف کا وقت پیچھے آتا ہے۔ پہلے مسالہ جمع کیجیے تو پھر محل بنانے کا فکر کیجیے۔

کیا یہ افسوسناک (بلکہ اگر مجھے مطعون نہ کیا جائے تو شرمناک) امر نہیں ہے کہ جو کام مسلمانوں کے کرنے کا ہے وہ عیسائی کرتے ہیں۔ پھر ستم پر ستم یہ کہ اگر انکی محنت پر کوئی غریب محنت کرکے وہ چیز مسلمانوں کے گھروں تک پہونچاتا ہے تو بجائے اسکے کہ وہ قابل شکریہ ہو محض مترجمی کے جرم میں سزائے ناقدری پاتا ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کلیہ کا استثنا بھی ضرور ہے۔ مگر ایسے خوش نصیب انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ عرب اور مسلمانوں کی تاریخ لکھنا ایشیا کے مسلمانوں کا کام یا یورپ کے عیسائی کا؟ مسلمان موجد تاریخ کہلاتے ہیں، لیکن زمانہ حال میں موسیو سیدیو فرنچ "تاریخ عرب" لکھتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ہم اُنکے مرہونِ منت نہ ہوں۔ مولوی حاجی ظفر الملک صاحب علوی اسکا ترجمہ کراتے، اور دلکش شکل و صورت میں شایع فرماتے ہیں؛ کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اُن کے ممنون احسان نہ ہوں۔ یہی ترجمہ اسوقت میرے زیر نظر ہے، اور اسی پر میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں۔ مجھے بلا اظہار کسر نفسی اس کا اعتراف ہے کہ مجھ جیسا خاک نشین صحرائے گمنامی اسکا اہل نہیں ہے کہ اتنی خطیر ذمہ داری اپنے اوپر لے۔ لیکن جو حضرات دیوانہ و مجذوب لوگوں کی بڑ سے نتایج اخذ کر لیتے ہیں وہ اگر مجھے بھی اُسی زمرہ میں سمجھ لیں تو میں اُن کا ممنون ہوں گا۔

تاریخ عرب کی شان یہ ہے کہ موسیو سیدیو نے اسے اپنی زبان (فرنچ) میں لکھا، اور علی پاشا مبارک، سابق ناظم تعلیمات مصر نے اسکو عربی میں منتقل کیا۔ اب مولوی حاجی ظفر الملک صاحب علوی کی سعی سے عربی ڈھیلی ڈھالی عبا کو چھوڑ کر لکھنؤ کے تنگ و چست تن زیب انگرکھے میں جلوہ گر ہوئی ہے ایک کہنے والے نے کہا کہ ترجمہ در ترجمہ میں کیا لطف ہے۔ میں نے جواب دیا کہ وہی جو مے دو آتشہ میں ہوتا ہے۔ جواب ملا کہ ہوش میں آؤ، کیا تمہارے نزدیک اس میں کوئی فرق نہیں کہ ایک بات ٹیلیفون میں خود قایل کی زبان سے سنو، اور وہی بات قاصد تم سے کہے۔ آخر اسی ہندوستان کے پنڈت نسیم (صاحب گلزار نسیم) اس تمنا کو سینے میں لیے ہوئے نہیں مر گئے کہ "اپنے منہ سے جواب دیے" لیکن اس جملہ معترضہ کو معنی آفرین حضرات کے سپرد کیجیے، اور ترجمہ کتاب کی طرف توجہ فرمایئے

علی پاشا کی عربی سے جناب مولوی عبد الغفور خاں صاحب رامپوری اور جناب مولوی محمد حلیم صاحب

انصاری ردولوی نے ترجمہ کیا ہے - میرے جیسے گمنام کی ایسی قسمت کہاں کہ جناب مقدم الاسم سے شرف ملازمت حاصل ہو، جناب مولوی محمد حلیم صاحب سے مجھے عزت نیاز حاصل ہے - ان دونوں بزرگواروں کا نام نامی ترجمہ کی کافی ضمانت تھی ؛ حضرت حاجی صاحب کی احتیاط کو دیکھیے کہ علامی سید سلیمان صاحب ندوی سے صداقت نامہ لیکر مہر کرالی - اس صورت میں ترجمہ بہترین ترجمہ سمجھے جانے کے قابل ہے بیرون عجب بدگماں وہم کی دارو نہیں لقمان کے پاس -

میں نے اوپر یہ شکایت کی ہے کہ ترجموں کی قدر نہیں ہوتی، مگر الحمد للہ کہ جناب حاجی صاحب بہت خوش قسمت نکلے کم ازکم مجھ سے تو کہیں زیادہ خوش نصیب نکلے کہ حکیم محمد اجمل خاں صاحب کی سفارش اور منشی محمد امین صاحب کی تائید سے حضور والیۂ بھوپال دامت اقبالہا کی سرپرستی نصیب ہوگئی - اگر ایک طرف میرے خیال کا بطلان ہوا، تو دوسری طرف میرا یہ قول صحیح نکلا کہ بغیر بادشاہ کی سرپرستی کے ترقی علم وفن معلوم - علیا حضرۃ نہایت غائر نظر رکھتی ہیں - اگر کتاب اور ترجمہ بہترین نہ ہوتا، تو مجھے شبہہ تھا کہ اس بارگاہ عالیہ سے عطیۂ خاص مرحمت ہوجاتا - میں اگر تہی دامن رہا تو اسکی وجہ صاف ہے ؛ تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا -

کتاب کے شروع میں جناب مترجم عربی کا دیباچہ ہے ؛ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب بیس برس کی محنت و جاں فشانی کے بعد لکھی گئی ہے - ظاہر ہے کہ ایسی کتاب کیوں اچھی نہ ہوگی - یہاں تک جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کتاب کی تصدیق و توثیق کے لیے لکھا ہے، مگر میں جناب پاشا کی اس رائے سے ہرگز متفق نہیں ہوں کہ " اس کتاب سے اہل یورپ پر بہت بڑا اثر ہوا - اہل یورپ کے ذہنوں میں عربوں کی جو برائیاں جمی ہوئی تھیں وہ دفعۃً کافور ہوگئیں "- مجھے حضرات یورپین سے تبادلۂ خیالات کا زبانی و تحریری اتفاق ہوا اور ہوتا رہتا ہے - میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان گورے چٹے صاحبوں کی گلیم بخت سیاہ بُنی جا چکی ہے - موسیو سدیو کے اصطباغ کے چھینٹوں سے تو کیا اثر ہو سکتا ہے آب کوثر و تسنیم بھی اُسکو سفید نہیں کر سکتی - جب تک پادریوں، بالخصوص رومن کیتھولک کے دم میں دم ہے اور " احمق درجہاں باقی ست " اسلام اور اہل اسلام کی دشمنی اُنکے دل سے نہیں نکل سکتی - اسکے مختلف وجوہ ہیں - اقتضاء زمانہ موجود، تعصب دینی پس پردہ ہے

اور ذہانت اور ہماری اہانت سب سے آگے آگئے - لیکن اگر سو برس تک

ہمارا یورپ میں تفوق، شمشیر بازی اور جوہر کاری (میرے گنوار یا تفتیل نفرہ

کہتا ہوں تو صحیح کہتا ہوں) اس کا اصل باعث ہے - آپ کہیں یہ احسان تو یورپ پر ہے

کہ ہم نے یورپ کو آدمیت کی طرف رہنمائی کی۔ لیکن پھر غور کیجیے؛ یہ کہتے ہوئے شاید آپ اسکو بھولتے ہیں کہ مفتوحین کی نگاہ میں چونکہ فاتحین کا سب سے بڑا جرم فتح کرلینا ہوتا ہے، اس لیے اُن پر فاتح جو احسان کرتا ہے وہ ملک نکل جانے کا کفارہ نہیں ہوسکتا، لہذا وہ احسان فراموش بھی ہوتے ہیں۔ تزک بابری پڑھیے۔ ہندوستان کی وہ حالت دیکھیے جو مغلوں کے حملہ کے وقت تھی۔ اور مقابلہ کیجیے اُس حالت کا جو بابر کے سپوتوں نے پیدا کردی تھی؛ اور پھر اخوان وطن کا اپنے ساتھ سلوک دیکھیے۔ یہ برسبیل تذکرہ ہے اور برادرانہ شکایت۔ حامیان اتحاد ہندو مسلم اسی کو لیکر مجھے مطعون نہ فرمائیں۔

فارسی کی ایک مثل مشہور ہے کہ "جبل گردد، جبلت برنگردد" اگر غور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ بالکل صحیح ہے۔ جو اقوام جس نسل سے تعلق رکھتی ہیں وہ اپنی خصوصیت کو ہزار ہا برس گذرنے کے بعد بھی نہیں چھوڑتے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ جب ایک نسل میں دوسری نسل کا خون آملتا ہے تو گو ایک نسل کی خصوصیات کمزور ہوجائیں، مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ بالکل نکل جائیں۔ سامی اقوام کی خصوصیات یہ بتائی جاتی ہیں کہ "وہ قدامت پسند ہیں، ہمیشہ قدیم رسموں کے پابند رہنا چاہتے ہیں، اپنے خیالات کے پکے ہوتے ہیں، کسی قسم کی تبدیلی یا اصلاح کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ دیندار ہوتے ہیں، تھورا ورتعصب مذہبی میں بڑے بڑے کام کرگذرتے ہیں۔ فنون لطیفہ سے انھیں تعلق نہیں۔ بڑی بڑی عمارتیں بنانے کا انھیں خیال نہیں آسکتا۔" مگر قابل رشک ہیں عرب کہ جو کارنامے دوسروں، مثلاً ایرانیوں، کے ہیں، وہ بھی انھیں سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ یہ ایک رحمت ہے کہ حضور رحمۃ للعالمین ؐ کے طفیل میں نصیب ہوئی۔ ورنہ کہاں عرب کے بادیہ نشیں، اور کہاں دہلی کا "بہشت زمیں لال قلعہ" یوروپین کی لکھی ہوئی تاریخوں میں اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ اُن کی "تاریخ عرب" کل مسلمانوں کی تاریخ ہوتی ہے۔ اسی طرح زیر نظر "تاریخ عرب" ہے۔

موسیو سیدیو نے عرب کا جغرافیہ بیان کرنے کے بعد تاریخ عرب قبل از اسلام بیان کی ہے حق یہ ہے کہ جہاں تک اختصار کام دے سکتا تھا اُنھوں نے حق ادا کردیا ہے۔ عربوں کے اُنھوں نے تقریباً وہی خصائل بیان کیے ہیں، جو میں اوپر سامی اقوام کے ڈاکٹر بریس کی کتاب سے مختصراً بیان کر آیا ہوں، مگر جس بات نے کہ مجھے اُنکا ممنون کیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ عرب کو سراپا عیب نہیں دیکھتے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "وہ (یعنی اعراب قبل از اسلام) حریت و آزادی کے دیوانے عزت نفس اور شرافت کے عاشق تھے۔ بلکہ سافرین اور درماندوں کی تواضع اور مہمانداری

کو تمام قوانین انسانیہ کا جامع قانون سمجھتے اور اس پر اپنی قوم میں بڑا فخر کرتے تھے - اسی کے ساتھ اپنے حقوق کے ثبوت میں صرف اپنی تلوار پر بھروسہ کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ مصنف علام نے ذرا اور تفصیل سے کام نہیں لیا، ورنہ وہ یہ لکھنے پر مجبور ہوتے کہ فی الحقیقت یہ بادیہ نشین ایسے پاکیزہ لوگ تھے کہ جیسے بارش کی بوندیں - گو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان میں عیوب بھی تھے، اور وہ کون ہے جس میں عیب نہیں ہوتے - انکی خصوصیات پر اگر غور کیا جائے تو عجیب متضاد کیفیت معلوم ہوتی ہے - ایک طرف تو وہ لڑکیوں کو کھود کر گاڑ دیتے ہیں، اور دوسری طرف عورتوں کی حمایت میں اپنی جانیں دیدیتے ہیں - دنیا کی بعض اقوام، جو اپنے آپ میں سوائے خوبیوں کے کوئی نقص نہیں دیکھتیں، شی ویلری کو اپنا مال سمجھتی ہیں؛ حالانکہ یہ انھیں بادیہ نشیں اعراب (میں لفظ "اعراب" دانستہ کہہ رہا ہوں) کا مال مسروقہ ہے - کون کہہ سکتا ہے کہ اعراب قزاقی پیشہ نہ تھے۔ مگر انکی صفتِ مہمانداری کو بھی تو دیکھنا چاہیے کہ بادشاہ کا نخچیر ہرن ایک کے خیمہ میں جان بچا کر گھس آتا ہے تو میزبان اپنی جان دینے پر تیار ہو جاتا ہے مگر اپنے ناخواندہ مہمان پر آنچ نہیں آنے دیتا - آپ فرمائینگے کہ جہالت ہے؛ میں کہوں گا کہ کرامت ہے - فرض کر لیجیے کہ یہ تجارت پیشہ قوم وحشی تھی، لیکن خدا کے لیے ایک ہی صفت افریقیہ کے حبشیوں میں، امریکہ کے ریڈ انڈینس میں دکھلا دیجیے - ایک طرف یہ فرزندان فطرت اتنے آزاد ہیں کہ شہروں کو زندان اور شہریوں کو قیدی سمجھتے ہیں - دوسری طرف یہی اپنے شیخ کے تابع فرمان نظر آتے ہیں، خواہ وہ پیٹھ پیچھے "لعنت اللہ علیک یا شیخ" ہی کہیں - میں نے ابھی انکے لیے لفظ "آزاد" کہا ہے - یہ تیرہ سو برس کا ذکر نہیں کرتا، آج کا مذکور ہے کہ اگر آزادی کے معنی آپ کو سمجھنے ہوں تو جائیے، کتاب بادیہ عرب کا مطالعہ کیجیے مجھے خود یہ شرف نصیب نہیں ہوا، حاجی ظفر الملک جیسے بزرگوں کی زبان سے سنتا ہوں کہ یہ "ہری کیپ" کمبل بلکہ آسمان کی چھت کے نیچے رہنے والا جب ننگی پیٹھ گھوڑے پر سوار ہو کر اور نیزہ ہاتھ میں لیکر نکلتا ہے تو ہمارے کنگ جارج کو کب خاطر میں لاتا ہے - آہ! یہی آزادی تھی جسکی بیخ و بنیاد کو ابو مسلم خراسانی کے ذریعہ سے اکھڑوا دیا گیا - اور جو کچھ کہیں گڑی دبی رہ گئی تھی اسکو برامکہ کے ہاتھ جلوا ڈالنے کی تدبیر کی گئی، اور پھر - اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے - اللہ بس باقی ہوس - کیا خوب کہا ہے موسیو سدیو نے "جب ... شت بدویہ اور صحرائی زندگانی کو پسند کرتے رہے ان میں ...... فرق نہ ... بڑھ کر اسکے متعلق پھر کچھ کہنے کا موقعہ نہ ملے۔

جناب مصنف نے عربی قبائل کا ذکر جس با تفصیل و دل طریق سے کیا ہے وہ انھیں کا حصہ تھا، "عرب تابعہ للعرب" کے عنوان کے نیچے وہ فرماتے ہیں کہ اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد جب بہت بڑھ گئی تو یہ لوگ قبائل میں منقسم ہو کر کچھ تو بادیہ میں چلے گئے۔ خیموں میں رہنے سہنے کی بدوی عادت اختیار کرلی۔" اگر میں غلطی نہیں کرتا تو یہ صحیح نہیں ہے۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ بنو اسمٰعیل نے کبھی بدویوں کو اپنے قبیلہ میں شامل کیا ہو۔ اسی کے متصل وہ فرماتے ہیں کہ "یہ لوگ حرم کے پتھر اپنے ساتھ لے گئے۔ جہاں کہیں قیام کرتے وہاں بیت اللہ کی عظمت کے لیے اُس کا طواف کیا کرتے تھے۔ بعد میں اسی دستور کی قدامت سے وہ پتھروں کی پرستش کرنے لگے" عربوں کی بت پرستی کی یہ توجیہ صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے عرب میں بُت پرستی کا بانی ابن لحی تھا (اگر میں غلطی پر ہوں تو کوئی صاحب صحت فرمائیں) حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی جُرم میں اس شخص کو بہت بُرا فرمایا ہے جسکا حقیقت میں یہ شخص مستحق تھا۔ یہ سن کر شاید تعجب ہوگا کہ یہ بلا بت پرستی کہیں عجم ہی سے عرب میں گئی تھی۔ رفتہ رفتہ بڑے بڑے آدمیوں کے بُت بنے اور پُجنے لگے۔ یہ بُت کیا تھے ان گھڑے پتھر تھے۔ اگر کہیں یہ ویسے ہی خوبصورت بُت ہوتے جیسے بُدھ مہاراج کے ہیں، یا آجکل جیسے "النقل کالاصل" ملکہ معظمہ یا مسٹر گلیڈسٹن کے بُت ہوتے تو جو کیفیت ہوتی اسکے خیال ہی سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ ان پتھروں کی توجیہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ کسی واقعہ کی یادگار میں پتھر گاڑے جاتے تھے وہ مرورِ زمانہ کے بعد پُجنے لگتے تھے۔ غرض جہاں تک میرا خیال ہے مصنف علام کا یہ بیان صحیح نہیں ہے۔ لیکن یقیناً وہ مجھ سے زیادہ جانتے تھے۔

آگے بڑھکر موسیو سیدیو قبل اسلام کی تاریخ کے ذیل میں بادشاہان بابل و نینوا و روم و فارس کے حملوں اور آپس کی جنگوں، کامیابیوں اور ناکامیابیوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ یہ حصہ نہایت دلچسپ اور پُر از معلومات ہے، اور اس قابل ہے کہ اسے بغور پڑھا اور یاد رکھا جائے۔ عکاظ کے میلہ میں جس طرح شعرا اپنے اشعار پڑھا کرتے تھے اُسکی لفظی تصویر جو مصنف علام نے کھینچی ہے نہ معلوم وہ کہاں سے پائی۔ چونکہ یہ کتاب آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے کی لکھی ہوئی ہے اس میں قصائد معلقہ کی نسبت وہی فرسودہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "وہ بیش قیمت کپڑے پر طلائی حروف میں لکھے جاتے اور حفاظت، دیرپائی اور نسلاً بعد نسلٍ باقی رہنے کے واسطے خانہ کعبہ کے دروازہ پر لٹکائے جاتے تھے"۔

عمان میں برہمنوں کے مذہب کا رائج ہونا ایک ایسی عجیب و غریب بات موسیو سیدیو نے لکھی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ اچھا ہوا کہ جناب مترجم (یا مترجم ؟) نے اسکو حاشیہ میں لغو قرار دیا ہے۔ یہ وہ غلطیاں ہیں جو یورپین علماء اپنی ذہانت کے غرور میں اکثر کر جاتے ہیں

مصنف علام نے ایک بحث یہ قرار دیا ہے کہ عرب کی آس پاس کی سلطنتیں بوجہ کسریٰ و قیصر کی باہمی جنگ کے ضعیف ہو چکی تھیں۔ یہ صحیح ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ آیا یہ سلطنتیں، ننگاں بھوکاں، ننگے اور ننگے عربوں کے مقابلہ میں بھی ضعیف تھیں۔ کیا یہ قدیم سلاطین اُس زمانہ کے آلات حرب سے مسلح نہ تھے، اور کیا اُنکی افواج قواعد حرب سے پوری واقف نہ تھیں؟ اگر ان باتوں پہ غور کیا جائے تو "یہ ضعیف سلاطین" ہر طرح برہنہ اعراب کے مقابلہ میں ہاتھی اور چیونٹی کی نسبت نہیں رکھتے تھے۔ دُور نہ جائیے، اسکو غور کر لیجیے کہ گو اسپین اسوقت عیسائی یورپ کی نسبت ضعیف ترین سلطنت ہے؛ مگر نہ اتنی کہ حضرت امیر عبدالکریم ایدہ اللہ بنصرہ العزیز (امیر ریف) کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اگر اعراب اور اہالی ریف کے غلبہ کو اسلام کا معجزہ نہ سمجھا جائے، تو نظام کی خوبی اور ایک مقصد خاص کے لیے جان دیدینے کا کرشمہ تو ضرور ہے۔ اسی فقدان نظام اور ایک ہی نصب العین پر اتفاق نہ ہونا وہ چیز ہے کہ مسلمان اس پہ جتنا روئیں بجا ہے، مگر

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

ضرورت ہے فعل کی، وہ کون کرے؟

مقالۂ دوم میں حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ، قرآن مجید اور دین اسلام سے بحث کی گئی ہے، اور حق یہ ہے کہ بہت خوب بحث کی ہے۔ اس میں غلط بیانیاں ہیں تعصب نہیں۔ مصنف علام کے زلات کو حاشیہ میں ظاہر کر دیا گیا ہے۔ اسکا علاج البتہ نہیں ہے کہ کتاب کے لکھے جانے سے زمانہ کئی برس ترقی کر چکا ہے، اور علمائے فرنگ کو بہت کچھ نئے انکشافات ہو گئے ہیں مگر بہر حال یہ قابل دید ہے؛ اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ مسلمان جناب مصنف کے شکر گذار نہ ہوں۔

مقالۂ ثالث ہے "فتوحات امت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم)" یہیں سے تاریخ اسلام شروع ہوتی ہے۔

"تاریخ عرب" کا اگر کوئی نقص ہے تو یہ کہ وہ بہت مختصر ہے۔ باوجود اسکے اگر اُس میں کوئی خوبی ہے تو یہی کہ وہ بہت مختصر ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ اگر کوئی تفصیل سے لکھنے بیٹھے تو بڑی بڑی ضخیم جلدوں میں نہیں سما سکتی۔ موسیو سیدیو کا یہ کمال ہے کہ اُنھوں نے ایسا اقل و دل اختصار کیا ہے، کہ اس سے زیادہ بہتر اختصار ناممکن تھا، گو اس سے بعض وقت ... کارڈ سائز پر
ایک بڑی فوج کا فوٹو لیکر دیکھیے، وہ الجھن کی تصویر ہوگی ... کا قصہ اُنھوں
نے صرف چار مختصر صفحوں میں ختم کر دیا ہے۔ اور اُس زمانہ یا ... ری فصلوں

کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ ترتیب ہمیں اسلیے اجنبی معلوم ہوتی ہو کہ ہم اسکے عادی نہیں ہیں۔

امیر المومنین و امام المتقین حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے مناقشات کے متعلق ایک بات میرے ذہن ناقص میں ہے جسکو میں یہاں ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔ اگر اس میں غلطی ہو تو امیدوار ہوں کہ میری اصلاح کی جائے۔ اصل یہ معلوم ہوتی ہے کہ بنو امیہ اور بنو ہاشم میں ایک مدت مدید سے منافست چلی آتی تھی۔ خدائے تعالیٰ نے نبوت کے لیے بنو ہاشم کو انتخاب فرمایا (واللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ) بعض، اور بالخصوص مورخین یورپ کا یہ خیال ہے کہ بنو امیہ نے بادلِ ناخواستہ اس نبوت کو تسلیم کیا۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو، خلفائے اول و دوم (رضی اللہ عنہم اجمعین) بنو امیہ میں سے نہ تھے۔ خلیفۂ سوم (رضی اللہ عنہ) اس خاندان سے ہوئے۔ اُنھوں نے نادانستہ بنو امیہ کی پرورش فرمائی۔ خلیفۂ چہارم (رضی اللہ عنہ) کو بوجوہ یہ ناگوار ہوا۔ حضرت امیر معاویہ رضی کو حضور امیر المومنین سے خاندانی وجوہ پر منافست پیدا ہوئی۔ حضرت امام المومنین حسن رضی اللہ عنہ کا خلع، واقعۂ کربلا، وغیرہ وغیرہ اسی منافست خاندانی کا نتیجہ ہے۔

مصنف علام نے یہ صحیح فرمایا ہے کہ "شوق جہاد" کے لیے بہت سی آیتیں اور حدیثیں ہمارے یہاں ہیں؛ اور سرداران فوج حملوں سے پہلے مسلمانوں کو یہ بشارتیں سناتے تھے (الفاظ میرے ہیں اور مقصد مصنف کا) لیکن یہ بات مسلمانوں ہی کے جہاد کے لیے مخصوص نہیں ہے کہ وہ قال اللہ و قال الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سناتے ہیں، اور انجام کار اُسکو کرکے دکھلا دیتے ہیں حیرت و حسرت ہے اُن پر جو غربائی امداد کو توملکشی اور لاکھوں بندگان الٰہی کی خوں چشی و خوں چکانی کا بہانہ بناتے اور انجام کار اپنی جوع الارض کی شہوت کو پورا کرتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ وہ حقیقی تہذیب پھیلانے کے لیے خالق کا حکم سناتے ہیں اور یہ مخلوق کے بنائے ہوئے اقتصادی اصول کا وعظ کرکے مزدوروں کے خون سے سرمایہ داروں میں بدہضمی پیدا کرتے ہیں۔ انصاف پسند اسکے ہیں کہ صواب پر کون ہے اور ثواب کس کو ملنا چاہیے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے کارناموں نے کتاب میں نسبتہً زیادہ جگہ لی ہے۔ اور فتوحات عمر (اعظم رضی اللہ عنہ) تو اسی قابل تھے کہ اُنھیں تفصیل سے بیان کیا جائے۔ لیکن پہلے یہ سوچنا چاہیے کہ ان فتوحات کی کیا ضرورت داعی ہوئی تھی۔ خدائی فوجداران یورپ نے اب یہ قرار دیا ہے کہ (حضرت) "خلیفہ اول (رضی اللہ عنہ) نے عربوں کی طبائع کو دیکھا تو خیال آیا کہ ان لڑاکوں کو اگر انکے مذاق کے موافق کام پر نہ لگایا گیا، تو ممکن ہے کہ یہ آپس میں

لڑ مریں، اور یوں اُس دین کو صدمہ پہونچے جسکا قائم رکھنا اُنکا فرض اولین ہے۔ اس لیے اُنھوں نے اور اُنکے بعد والوں نے روم وایران پر ہلّہ بول دیا" بات کام کی ہے، اس سے حضرت صدیق اکبرؓ کی دور اندیشی قابل داد بن گئی، اور دُور کی کوڑی بھی نکل آئی۔

یہ اصول موسیو سیدیو کے بعد تصنیف فرمایا گیا ہے، اسی لیے اُنھوں نے اپنی تصویر میں یہ رنگ نہیں بھرا۔ ذرا غور سے دیکھیے تو حقیقت حال معلوم ہوتی ہے کہ عرب (شریف) کی آستینوں میں دو سانپ روم اور ایران، موجود تھے۔ رب الافواج نے کعبہ شریف کو مسلمانوں کا مرکز قرار دیدیا تھا۔ چند ہی روز ہوئے تھے کہ اصحاب فیل اس پر حملہ کر چکے تھے، روم وایران تو بہت ہی مہیب بلائیں تھیں۔ اس لیے مقدم تھا اس مرکز کو بچانا، دونوں طرف سے برابر کی دھمکیاں تھیں اور دونوں کی طرف سے پورا پورا اندیشہ۔ کعبہ کی حفاظت کے لیے اشد ضروری تھا کہ ان دونو کے خدشہ کو مٹا دیا جائے۔ کیونکہ ظاہر تھا کہ اگر یہ باقی رہے تو مسلمان اور دین اسلام باقی نہ رہیگا۔ چنانچہ سب سے پہلے یہی کرنا پڑا۔ اُدھر صقلیہ اور ادھر لمبارڈ تک کی فتوحات کو ذرا غور سے دیکھیے اُسی کعبہ کو بچانے کی تدابیر کی شاخیں ہیں، باقی ہیچ۔ اب آپ موسیو سیدیو کی تفاصیل فتوحات کو پڑھیے تو آپ اور زیادہ لطف اُٹھائیں گے۔ مگر ذرا ٹھہریے، مجھے ان سرباز جاں نثاران اسلام سے اپنا مقابلہ کر لینے دیجیے۔ آج کعبہ کو کفار کے قدموں سے نجس کرانے میں سب سے پیش پیش میں ہوں اور بچ کرنے والوں میں سب سے آگے آگے۔ میری تصویر علامہ سر اقبال کا ایک مصرعہ ہے کہ "بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفےٰ" (صلی اللہ علیہ وسلم) میری ہی سعی بازو سے

لگئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ   خشت بنیادِ کلیسا بنگئی خاکِ حجاز

۔ میں ہوں کہ اس سودے پر نہ صرف نازاں، بلکہ شفاعتِ شفیع المذنبین صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا امیدوار۔ آہ گرازپس امروز بود فردائے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اُس صادق ومصدوق (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ قول صادق نہیں ہے کہ خیر القرون قرنی، ثم الذین یلونہم، ثم الذین یلونہم۔

صفحہ ۱۲۹ پر جناب مصنف نے تحریر فرمایا ہے کہ حضرت [illegible] میں حضرت خالد (رض) کی جانب سے اُس زمانہ سے کچھ رنج تھا جب سے کہ اُنھوں نے [illegible] کر دیا تھا" یہ واقعہ بالکل غلط ہے یورپ کے مورخین اسی قسم کی سحر کاریاں کیا کر [illegible] کی للّہیت اور ایک نفس [illegible] کی بیانیازی سے اگر قطع نظر کر بھی لیا جائے، تو کیا اس [illegible] اظہار، اور اس کا لازمی نتیجہ [illegible] فرض میں اہمال نظام فوجی کا منافی نہیں ہو سکتا؟ مصنف علام ابھی پانچ صفحہ پہلے

اس کا اعتراف کر آئے ہیں کہ عربوں میں نظام قائم ہو چکا تھا، حضرت سیف اللہ کا اُسی تن دہی سے اسلام کا ناصر رہنا اس قول کی تردید کے لیے کافی تھا - جناب مترجم نے اپنے حاشیہ میں اسکا دفعیہ کیا ہے - اس حاشیہ کے الفاظ سے مجھے اتفاق نہیں ہے کہ " حضرت عمرؓ نے دیکھا تھا کہ خالدؓ کو پیا پے فتوحات ہوتی جاتی ہیں اور مسلمانوں کے دلوں میں خالدؓ کی عظمت ضرورت سے زیادہ جمتی جاتی ہے جس سے اسلام میں ایک بڑا فتور پڑ جانے کا اندیشہ تھا، لہذا وہ معزول کر دیے گئے - جناب مترجم سے میں معافی مانگتا ہوں - میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شان والا کو اس سے ارفع و اعلیٰ سمجھتا ہوں کہ آپ کو وہی خیال پیدا ہو جو مطلق العنان بادشاہ عباسیوں، یا دُور نہ جایے، جہانگیر کو پیدا ہوا حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت سیف اللہ رضی اللہ عنہ کی معزولی کی وجہ یہ بیان فرمائی تھی کہ وہ حملہ سخت کرتے ہیں، اور اُس میں جانوں کا نقصان زیادہ ہوتا ہے - (الفاظ میرے ہیں)

صفحہ ۱۳۰ پر جناب مصنف کے اس قول سے مجھے اختلاف ہے کہ یرموک کی لڑائی میں جو فوج ہرقل نے بھیجی تھی اس میں مرتد جبلہ بن ایہم اس لیئے شامل ہوا تھا کہ وہ اُس توہین کا بدلہ حضرت عمرؓ سے لے جو اُسکی ہو چکی تھی - ہمارے پاس تو اسکے ثبوت موجود ہیں کہ وہ ہمیشہ اپنے ارتداد پر نادم رہا، مگر اُسے حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہونے کی جرأت ہی نہیں پڑی ورنہ وہ توبہ کرتا -

صفحہ ۱۳۳ پر جناب مصنف فرماتے ہیں کہ " حضرت عمرؓ نے بیت المال کے حساب وکتاب کے متعلق حضرت سیف اللہ پر الزام قائم کیا اور انکو امارت لشکر سے معزول کر دیا " یہ واقعہ میری نگاہ سے نہیں گذرا - گو مجھے اپنی ناقابلیت کا اعتراف ہے - شاید کوئی اور صاحب اسکی تصحیح و تغلیط کر سکیں مصنف علام یہ نہیں فرماتے کہ اُن سے مطالبہ ہوا یا نہیں، یا آنکہ اُنکی جائداد ضبط کی گئی یا کیا ہوا - مگر اسی عبارت سے متصل ہی فرماتے ہیں کہ " حضرت خالدؓ نے اسکو برداشت کیا، یہاں تک کہ ۲۱ھ میں وفات پائی - اسوقت اُنکے ترکہ میں جو کچھ باقی رہا وہ صرف ایک گھوڑا اور کچھ ہتھیار اور ایک لونڈی تھی، باقی کچھ نہ تھا ! عبارت زیر خط سے تو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ حضرت خالدؓ نے بیت المال کا روپیہ خورد برد کیا ہو - حضرت سیف اللہؓ کی وفات کے ذکر پر مجھے یاد آیا کہ نزع کے وقت آپ زار و قطار رو رہے تھے - کسی نے پوچھا کہ " کیا موت کے ڈر سے روتے ہو؟" فرمایا کہ " اس پر روتا ہوں کہ عورتوں کی طرح بستر پر مر رہا ہوں " - یعنی میدان جنگ میں شہید ہونا چاہیے تھا - کیا ایسے ہی لوگ تغلب کیا کرتے ہیں ؟

صفحہ ۱۳۹ پر مصنف علام نے لکھا ہے کہ حضرت عمرو بن العاصؓ نے نہر سویز کھودنے اور بنانے

نے ارادہ کیا تھا، مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ مانع ہوئے کہ اس سے مکہ و مدینہ تک رومیوں کے لیے دروازہ کھل جائیگا۔ قطع نظر اسکے کہ اس سے میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ اسلامی فتوحات کا تمامتر منشا یہ تھا کہ کسی طرح کعبہ شریف محفوظ رہے، آج دنیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی پیش بینی اور دور اندیشی کو براٴ العین دیکھ رہی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ امیر عبد الرحمن والی کابل کی یہ وصیت کہ "ملک میں ریل نہ بنانا" ایسی ہی دور اندیشی پر مبنی نہیں ہے۔

غنیمت ہے کہ جناب مصنف نے کتبخانہ اسکندریہ کے جلائے جانے کی مختصراً تردید کردی ہے، اس بیہودہ خیال کی اتنی تردیدیں ہوچکی ہیں کہ اب کوئی یوروپین بانگ دہل یہ الزام مسلمانوں پر لگانے کی جرأت نہیں کرتا۔ ممکن ہے کہ موسیو سدیو وہ پہلے آدمی ہوں جنھوں نے پہلی مرتبہ تردید کی ہو۔

صفحہ ۱۵۱ پر یہ واقعہ مجھے کچھ نیا سا معلوم ہوتا ہے کہ زیاد ابن امیہ نے حضرت امیر معاویہؓ کی اس بدعت کی مخالفت کی تھی کہ خلافت کو اپنے خاندان میں موروثی کردیں۔ کم ازکم مجھے اسکا علم نہیں۔ یہ مسلّم کہ حضرت امیر معاویہؓ نے زیاد کو اپنے نسب میں شامل کرلیا تھا، اُدھر زیاد کی پولٹیکل اور زباں آوری کی قابلیت بھی مسلّم؛ لیکن حضرت امیر معاویہ کے جیتے جی اُسکی یہ مجال نہیں تھی کہ وہ "خلافِ رائے سلطاں" رائے رکھ سکتا۔

اس سوال کو چھوڑ دیے کہ بنو اُمیہ کو سلطنت جائز طریقہ سے حاصل ہوئی یا ناجائز طریقہ سے، میرا مدت سے یہ خیال ہے کہ حجاج ابن یوسف ثقفی کے ساتھ مسلمانوں نے انصاف نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ اُسکے تاریک پہلو کو لیتے رہے۔ ملکی حالت یقیناً اسی کی متقاضی تھی کہ حجاج ہی جیسا "کماشتۂ شدید" حاکم بنایا جاتا۔ یہ یقینی بات تھی کہ اگر اس شخص کا وجود نہ ہوتا تو بنو امیہ کی سلطنت شروع ہی شروع میں پارہ پارہ ہوگئی ہوتی۔ موسیو سدیو سے یہ اُمید رکھنی تو فضول ہی کہ وہ حجاج کے متعلق تفصیل سے کام لیتے، مگر میں مسلمانوں کے نوجوانوں سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ حجاج کے متعلق وہ کنید کاوی سے کام لیں اور اُس غریب کی اصلی صورت نمایاں کردیں۔ بہت ممکن ہے کہ اُسکے سیاہ چہرہ پر کوئی نہ کوئی سفید دھبا نکل آئے۔

مجھے قدم قدم پر موسیو سدیو کی اختصار پسندی کی شکا... ...رع ہی سے اُنکا مقصد
اختصار رہا ہے۔ وہ مجبور تھے کہ دریا کو کوزہ میں بند کریں ... فتح اور قبضہ کے لیے
اُنکے یہاں دو سطروں سے زیادہ نہ نکل سکے۔ حالانکہ یہ واقعہ ... ...صار کا متحمل نہیں ہوسکتا،
کیونکہ یہی واقعہ مقدمہ فتح ملک اسپین ہوا۔ لیکن میں کسی تکلف سے ... سینے کو اتنی اہمیت نہیں

دیتا جتنی کہ اس ملک کو قبضہ میں رکھنے اور اسکے نظم و نسق کو دیتا ہوں۔ معہذا وہ مسلمان کافر نعمت ہے جو فاتحِ افریقیہ کے احسان کو نہ مانے؛ لیکن ذرا غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس معاملہ میں اصلی محسن حضرت موسیٰ ابن نصیرؒ ہیں (اللھم برد مضجعہ) یہی اصلی فاتح ہیں اور یہی وہاں کے ناظم۔ ممالک کے فتوحات کے بعد فاتحین کی بڑی ضرورت یہ ہوا کرتی ہے کہ وہ کہیں آرام سے اپنے پیر پھیلا سکیں۔ اور طلب معیشت کے لیے کوئی نیا میدان پائیں۔ شاید اسی کو زمانہ حال میں کالونی زیشن کہتے ہیں۔ گذشتہ جنگ عظیم کی ضرورت پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ بناء فساد محض کالونی زیشن تھی۔ اس حکمت کو اس زمانہ میں سب سے پہلے سمجھنے والے حضرت موسیٰؒ ہی تھے کہ مصر وایران وغیرہ باوجود اپنی وسعت کے مسلمانوں کے لیے تنگ ہے۔ اسکے لیے انھوں نے افریقیہ کو تاکا۔ اسکو از سرِ نو فتح کیا، مسلمانوں کو یہاں آباد کیا۔ اصلی باشندوں کی اسلامی تعلیم کا انتظام کیا، عربوں کو تحریص و تشویق کی کہ وہ یہاں کی عورتوں سے نکاح کریں، یہیں کے ہو رہیں۔ اسی تدبیر نے افریقیہ کے وحشیوں کو آدمی بنایا، اور عربوں کو گونہ فراغ بالی نصیب ہوئی۔ حضرت موسیٰؒ کی اصلی عظمت تو اسی واقعہ سے ثابت ہوتی ہے۔ افسوس ہے کہ مصنف علام کو یہ سب کچھ چھوڑ دینا پڑا۔

موسیو سیدیو نے ذرا بھی تحقیق سے کام لیا ہوتا تو وہ فتح اسپین کے معاملہ میں وہی پرانا دکھڑا نہ روتے کہ حضرت موسیٰؒ خلیفۂ وقت کے مقہور ہوے۔ جہاں تک میرا خیال ہے یہ واقعہ ہی غلط ہے؛ اور نہ معلوم کس (عرب یا غیر عرب) مورخ کا تصنیف کردہ ہے۔ کیا وہی شخص مقہور ہو سکتا ہے جسکو وہی خلیفہ اپنے ساتھ حج کو لیجائے؟ کیا میرے سوا کوئی اور صاحب اسکے متعلق ریسرچ کریں گے؟ میں بوڑھا ہوں اس بار کو نہیں اٹھا سکتا۔ اگر کوئی صاحب تکلیف فرمائیں تو احسان ہوگا۔ اسی ضمن میں حضرت طارق ابن زیاد رحمہ اللہ کی آخری زندگی کے متعلق تحقیق کرنا بھی ضروری ہے۔ گو واقعیت پر مبنی نہ ہو، مگر مجھے بالکل یقین ہے کہ فاتح اندلس کی حالت ہرگز ہرگز ایسی نہیں ہوئی تھی کہ وہ پردۂ دنیا سے بالکل محو ہو جائیں؛ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی بڑی مہم پر پھر نہ بھیجے گئے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص مٹھی بھر آدمیوں کو لیکر اتنے بڑے ملک کو فتح کر لے، اسکے عظمت و جلال کے لیے بڑی سے بڑی مہم بھی ایسی نہیں ہو سکتی کہ اسکا تذکرہ خاص طور پر کیا جائے۔ اگر یہ دونوں معاملے یوں ہی ڈھکے چھپے رہے اور اس روشن زمانہ میں بھی لوگ یوں ہی پرانے مورخین کی اندھا دھند پیروی کرتے رہے تو ایک طرف ایک خلیفہ اور دوسری طرف حضرت موسیٰؒ جیسا پاک نفس فاتح و ناظم قیامت تک کے لیے بدنام رہے گا۔ کیا غیرتمند مسلمان (اگر غیرت کا کہیں مسلمانوں میں نام و نشان

رہ گیا ہو) اسکو گوارا کرتے ہیں؟

موسیو سید یو نے (صفحہ ۱۷۵) یہ ستم ڈھایا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو خلیفہ کے ہاتھ، یا خلیفہ کے حکم سے قتل کرایا ہے - میں بآنگ دہل کہتا ہوں کہ یہ واقعہ غلط اور بالکل غلط ہے - بنو امیہ بُرے تھے یا بھلے (اور شاید ان میں بُرائی کا عنصر غالب نکلے) مگر اتنے محسن کش نہ تھے جتنے بنو عباس، یا کم از کم موسیو سید یو انکو ثابت کرنا چاہتے ہیں -

بنو اُمیہ کی سلطنت کا قصہ "پیرے بود، پسرے داشت، گم شد، باز یافت" کے اصول پر جناب مصنف نے ختم کر دیا ہے؛ حالانکہ یہی سب سے بڑی مہتم بالشان سلطنت تھی - عباسیوں پر آتے ہیں تو مامون الرشید کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کرتے ہیں اور انکی تعریفیں کرتے ہیں - مگر ہم مسلمانوں کے نزدیک اُن کی عظمت مسلّم؛ مگر اسکو کیا کیجئے کہ اُن کا وہاں وہی رتبہ ہے جو ہمارے ہندوستان میں اکبر کا کہ بانی عظمت اور قاطع سلطنت ہوا - مامون الرشید ہی تھے کہ جنھوں نے غیر ملکیوں (ایرانیوں) کو سلطنت میں دخیل کیا - جسکا انجام یہ ہوا کہ عباسیوں کی سلطنت پارہ پارہ ہو گئی - بنو امیہ ہزار برے ہوں مگر اُنھوں نے اس بدعت سیئہ کا ارتکاب نہیں کیا - وہ سمجھتے اور جانتے تھے کہ دوسرے کے ہاتھوں مرنے سے اپنوں کے ہاتھوں قتل ہونا بدرجہا بہتر ہے - مجھے اس سے انکار نہیں کہ حضرت عمر بن عبد العزیز کی متقیانہ پالیسی کی وجہ سے سلطنت اسلامی کی اقتصادی حالت خراب ہو گئی تھی، لیکن انکے بعد کے تاجداروں نے اس حالت کو بغیر پرانے ٹیکس بڑھانے اور نئے ٹیکس لگانے کے اپنے آپ کو سنبھال لیا - عباسیوں کی طرح یہ نہیں کیا کہ مال تو ایک طرف، جان بھی نکو کاموں کے سپرد کر دی - بنو امیہ میں ایسے ہوشیار پیدا ہو گئے کہ جنھوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا ابو عباس کچھ ایسے جال میں پھنسے کہ ان کی لاش ہی اُس سے نکلی -

تاریخ عرب کے صفحات ۱۸۰ لغایۃ ۱۹۵ واقعی قابل دید ہیں - ان میں خلفاء عباسیہ کا طریق حکمرانی اور اُنکے محاصل، اعمال عامہ اور انتظامات اندرونی، صنعت و حرفت و فلاحت، فنون ادبیہ وصناعیہ اور شان و شوکت کو نہایت خوبصورتی سے مختصراً بیان کیا ہے -

یہاں تک میں نے کتاب پر تفصیلی نگاہ ڈالی ہے - اس [illegible] گیا ہے کہ میر صاحب کا یہ شعر یاد آتا ہے کہ

جو اس شور سے میر روتا رہے گا [illegible] [illegible] سے گا

اس سلسلے میں آئندہ موسیو سیدیو کی اغلاط کی تلافی کروں گا -

مختلف فرق مبتدعہ کی ترقی اور اُنکی کا فرما جرائی کے ذیل میں صفحہ ۲۰۰ پر کہا گیا ہے کہ "کچھ علماء مفتون العقل اور فلاسفہ اور صوفیہ پیدا ہوگئے جو بواسطہ اعدام جمیع شہوات نفسانی اپنی ارواح کو ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رکھا کرتے تھے۔ انکا مذہب بھی پھیلا، خصوصاً فارس والوں میں خوب جاری ہوا" یہ فقرے ایسے ہیں کہ ان پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، اور یقیناً اسکے محتاج ہیں کہ ان پر مترجمان اول و دوئم میں سے کوئی حواشی لکھتا۔ مصنف نے بحیثیت مورخ اور عیسائی ہونے کے اپنے نزدیک جو کچھ لکھا صحیح لکھا۔ ...... میرا یہ منصب نہیں ہے کہ اس پر کچھ کہوں یا لکھوں، بجز اسکے کہ اس فقرہ کے بعض حصے غلط فہمی پھیلانے والے ہیں۔

علوئین کے متعلق جو زیادہ تفصیل نہیں ملتی اسکی شکایت حضرت حاجی مولانا ظفر الملک کو ہونی چاہیے؛ اس معاملہ میں وہ ہی احق ہیں۔

صفحہ ۲۳۴ میں ایک عنوان ہے "عربی حکومت کے زوال سے عربی تمدن زائل نہیں ہوا" اسکے ذیل میں جو کچھ لکھا ہے وہ دعویٰ ہی دعویٰ معلوم ہوتا ہے، ثبوت کچھ نہیں۔ توضیحاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ عربوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ممالک مفتوحہ، حتیٰ کہ وہ ممالک بھی جو اُنکے زیر اثر رہتے رہے، یا جو اُن کے ہمسایہ تھے اُنکی زبان کو بدل کر عربی کر دیتے ہیں، یا اُن ممالک کی زبانوں پر اتنا اثر ڈالتے ہیں کہ وہ نیم عربی ہو جاتی ہے۔ مثالاً افریقیہ اور ہندوستان کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اثر ہو قرآن مجید اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا؛ مگر اس سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ بالواسطہ یہ ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا، انشاء اللہ۔ بعض مقامات پر عرب غیر ممالک کے تمدن پر بھی یہی اثر ڈالتے ہیں۔ لیکن جو امر کہ زیادہ حیرت انگیز ہے وہ یہ ہے کہ اُن کی مفتوحہ اقوام چند ہی روز میں اُنکی ایسے گرویدہ ہو جاتے ہیں کہ اپنے دست و بازو بنجاتے ہیں۔ اور انکو اور ممالک فتح کرکے دیتے ہیں شاید اس کا باعث یہی ہوتا ہو کہ مفتوحین سے اُن کا سلوک اچھا ہو؛ لیکن خواہ مجھے تنگ خیال و واہمہ پرست کہا جائے میں تو یہ کہتا ہوں کہ عربی تمدن اگر زائل نہیں ہوتا تو یہ دلیل ہے اسلام کی صداقت کی، یا معجزہ ہے اسلام کا۔ اسکے متعلق بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ میں نے مثالاً دو ایک باتیں لکھدی ہیں۔

مقالۂ پنجم میں مصنف علام نے مسلمانوں کی قریباً ہزار برس کی کشمش و کوشش کا خوب خلاصہ کیا ہے جو قابل دید ہے۔

جو کچھ اوپر لکھا جا چکا وہ کافی سے زیادہ ہے؛ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ کتاب پڑھنے کے قابل ہے

خاص کر اسلامی تاریخ کے طالب علم، جو خلاصے ڈھونڈھتے پھرا کرتے ہیں، اس سے بہت فائدہ اُٹھا سکتے ہیں - کتاب کیا ہے، بقول انگریزی خوانوں کے بَرڈز آئی ویو ہے -

طباعت کی غلطیاں ایک مرض لا علاج ہیں، اس کی تو کیا شکایت، مگر افسوس ہے کہ امصار و رجال کے ناموں میں بہت غلطیاں ہیں، بالخصوص اندلس کی تاریخ میں - تعجب ہے کہ جناب مترجم اول نے اس سے اعتنا نہیں کیا - اور مترجمین ثانی نے تو مطلق توجہ نہیں فرمائی - خدا کرے کہ دوسرے ایڈیشن کی جلد نوبت آئے اور ان غلطیوں کا ازالہ ہو جائے -

محمد خلیل الرحمن
(مترجم اخبار الاندلس وغیرہ وغیرہ

اشعارِ نعت

پیامِ لطف و کرم کا پیامبر بھی کریم
شرف نصیب ہوا جسکے دم سے حُسنِ شہود

وہ جسکے فیض سے روشن چراغِ طور ہُوا
وہ جسکی ذات ہے رونق فزائے بزمِ نمود

وہ جس نے قول و عمل سے دیا یہ درسِ لطیف
عبادتوں کا سزاوار ایک ہے معبود

"محمدِ عربی کابروے ہر دو سراست
کسیکہ نیست غلامش بباد او نابود"

"زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا"
ہوا جو نطق کو بوسہ زباں کا مقصود

بہ ہر نفس ز غلاماں روانِ پاکش را
رسیدہ باد و رسد ہدیۂ سلام و درود

عبودیت کا ملا تھا جو خاص خلعت اُسے
کسی نے اُسکو بنایا نہ آج تک معبود

یہ خاص معجزہ قائم رہے قیامت تک
دعا ہے تجھ سے یہ اے خالقِ غفور و ودود

خدا کے حکم سے ثابت ہے اہلِ ایماں کو
ہے اتباعِ محمدؐ حیات کا مقصود

ہمیشہ اُسکی محبت سے دل رہیں معمور
جو یہ نہ ہو تو ہو عالم یہ دمِ زدن نابود

محبت اُسکی یہی ہے کہ ہو ہمیں بھی عزیز
ہر ایک بات جو نزدیک اُسکے تھی محمود

نصیب آنکھوں کی ٹھنڈک اُسے نماز میں تھی (قرۃ عینی فی الصلوٰۃ)
سرورِ دل کا سا[illegible] تھے اُسے رکوع و سجود

پسندِ خاطرِ مومن، پسند اُسکی رہے
یہی ہے [illegible]لیقۂ محمود

رضائے دوست سے باہر نہ آرزو ہو کوئی
یہی ہے [illegible]صل مقصود

م۔ اسن

روٹیوں کا نزاع

متحدہ[1] رومانی سلطنت کا آخری شاہنشاہ تھیوڈوسی[2] اس مرنے وقت ۳۹۵ء میں سلطنت اپنے دونوں بیٹوں میں تقسیم کر گیا۔ اس تقسیم کی رو سے مشرقی یا یونانی یا بزنطینی[3] سلطنت جسکے اجزاء ایشیا میں ممالک ایں روئے فرات، سواحل بحیرۂ اسود، اور ایشیائے کوچک۔ افریقہ ملک مصر اور یورپ میں آبنائے دردانیال سے لیکر لے کر بحیرۂ ایڈریاٹک[4] اور دریائے ڈینیوب[5] تک کل ممالک تھے بڑے بیٹے آرکے ڈیس[6] اس کو ملی جسکا پایۂ تخت قسطنطنیہ قرار پایا اور مغربی یا یونانی یا لاطینی[7] سلطنت، جس میں افریقہ میں ممالک ماورائے مصر، یورپ میں اٹلی، اسپین، فرانس، برطانیہ اور مغربی البانیا شامل تھے چھوٹے بیٹے ہونوریس[8] اس کے حصے میں آئی جس کا دار الحکومت رومۃ الکبرے (روما)[9] ہی برقرار رہا۔ یہ جیسے بچھڑے ایسی منحوس گھڑی میں ہوئے تھے کہ یونانی اور رومانی قصور محلات کی اینٹ سے اینٹ بج گئی مگر انھیں متحد ہونا پھر کبھی نصیب ہی نہ ہوا۔

:·※·:

اُس زمانے میں دین و دنیا اور مذہب و حکومت، آج کل کی طرح، ایک دوسرے کی جان کے دشمن اور خون کے پیاسے نہ تھے۔ بلکہ اُن کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ وہ مل جُل کر رہنا سہنا جانتے اور امداد و استمداد سے بسر کرنا چاہتے تھے۔ اب تک چونکہ سلطنت کے کل اجزاء باہم کر متحد اور ایک ہی فرماں روا کے زیرنگیں تھے اس لیے ساری سلطنت کا مذہبی سردار ایک ہی شخص مانا جاتا تھا، اور وہ رومۃ الکبرے کا اُسقف (بشپ) تھا، جو کل جماعتِ اساقفہ میں ممتاز و معظم سمجھا جاتا تھا۔ اور اگرچہ قسطنطنیہ کا بطریق[10] مشرقی کلیسیا کا لاٹ پادری مانا گیا تھا تاہم دنیائے مسیحیت میں سرداری اور پیشوائی کی کرسی روما کے بشپ ہی کے لیے مخصوص و مسلم تھی، چنانچہ ۴۸۰ء میں

---

(1) United Roman Empire — (2) Theodocius
(3) Eastern, Greek, or Byzantine — (4) Adriatic sea
(5) Danube — (6) Arcadius — (7) Western or Roman or Latin Empire
(8) Honorius — (9) Rome — (10) Patriarch

جو مجلس کلیسیائی قسطنطنیہ میں منعقد ہوئی اُس نے فیصلہ کر دیا تھا کہ اقتدار او راثر کے اعتبار سے قسطنطنیہ کے بطریق کا درجہ روما کے بشپ سے دوسرے نمبر پر ہے - لہذا جس طرح حکومتِ ملکی کا مرکز ایک تھا اُسی طرح حکومتِ مذہبی کا مرکز بھی ایک ہی رہا -

لیکن ۳۹۵ء میں جب حکومت کے حصے ہو چکے تو نا ممکن تھا کہ سجادۂ مذہب ٹکڑے ہونے سے بچ جاتا - قسطنطنیہ کی دنیوی حکومت کا فرماں روا جب اپنے آپ کو روما کی دنیوی حکومت کے فرماں روا سے کسی طرح کم نہیں سمجھنے لگا تھا اور اُن ممالک میں جو اُس کے لوائے تحکم کے سائے میں تھے اپنے رقیب کی طرف سے تنفیذِ احکام کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا تھا تو قسطنطنیہ کی دینی حکومت کا فرماں روا جبکہ وہ بھی اپنے آپ کو روما کی دینی حکومت کے فرماں روا سے کسی طرح کم نہیں سمجھنے لگا تھا اُن ممالک میں جو اُسکی ردائے تقدس کے سائے میں تھے اپنے رقیب کی طرف سے تنفیذ احکام کس طرح گوارا کر لیتا - چنانچہ جو مذہبی احکام روما کے بشپ کی پیشگاہ سے یونانی سلطنت کی قلمرو کے متعلق نافذ ہوئے، قسطنطنیہ کے بطریق کی طرف سے پہلے اُن کی تعمیل میں بے توجہی پھر پہلو تہی اور اور اُسکے بعد علانیہ سرتابی کی گئی - نتیجہ یہ ہوا کہ تفوق و اقتدار کی ناگوار بحث چھڑی اور نہایت ہی شد ومد کے ساتھ چھڑی -

روما کے بشپ کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ خداوند مسیح کے شاگردوں میں سب سے زیادہ ممتاز و مقدس شاگرد پطرس[1] کے تبلیغی صدر مقام روما کے لاٹ پادری اور پطرس ہی کے قائم کیے ہوئے سب سے قدیم کنیسے کے پیش نماز ہونے کی حیثیت سے، حقیقی معنی میں خلیفۃ المسیح کا سجادہ نشیں، اور اس اعتبار سے مشرق و مغرب کی ساری کلیسیاؤں کا تنہا واجب الاحترام مُقتدا اور رہنما ہے - اور اسی حیثیت و اعتبار سے دنیائے مسیحیت کی حدود کے اندر، ہر اسود و احمر اور ابیض و اصفر مسیحی پر، عام اس سے کہ وہ عامی ہو یا عالم، اُسکی حکومت نافذ، اُسکا حکم رائج، اور اُسکا اتباع لازم ہے -

اسکے جواب میں قسطنطنیہ کے بطریق کا یہ دعوےٰ تھا ... دن ہی سے مشرق ممالک کا اسقفِ اعظم بنایا گیا ہے اور اُسکے حیطۂ اقتدار ... - دمشق اور اسکندریہ

(۱) St. Peter

جیسے قدیم شہروں میں خداوند مسیح کے شاگردوں کے قائم کیے ہوئے کنیسے حتیٰ کہ ارض مقدس کا وہ محترم خطہ جس کا چپہ چپہ انبیاے سلف، خداوند مسیح اور اُسکے رسولوں کے متبرک مجاہد ومشاہد سے معمور ہے۔ اور اس اعتبار سے عظمت واقتدار میں وہ روما کے بشپ سے بدرجہا اور بمراتب افضل واعلیٰ ہے۔ لہذا بجاے اِسکے کہ اُسکا درجہ روما کے بشپ سے فروتر مانا جائے، مسیحی دنیا پر لازم ہے کہ ارض مقدس کے معابد ومشاہد کی حرمت کو پیش نظر رکھکر، نہ صرف قسطنطنیہ کے بطریق کا درجۂ اقتدار روما کے بشپ سے بالاتر قرار دے بلکہ یونانی سلطنت کی طرح کل رومانی سلطنت کو بھی بطریقی حدود میں شامل کر دے۔

اسکا جواب روما کے بشپ کی طرف سے یہ دیا گیا کہ جس زمانے میں روما کی خاک مسیحی شُہداء کے خون سے لالہ زار بن رہی تھی اور اُس میں سے ربانی انوار و برکات کی شعاعیں نکل نکل کر عالم کو منور و متبرک کر رہی تھیں اُسوقت قسطنطنیہ کا وجود بھی نہ تھا اور اُسکی جگہ بزنطیوم[1] اپنے اوثان واصنام اور اباطیل واوہام کی ضلالت میں گرفتار ہوکر دنیا میں کفر پاشی کر رہا تھا۔ روما کا تقدس اس سے ظاہر ہے کہ وہاں قصر مسیحیت کی تعمیر اُس ملبے سے ہوئی جو بے دین رومی شاہنشاہوں ٹائی ٹس[2] اور ہیڈری این[3] کے مقدس یورشلیم[4] کو تباہ کرنے کے بعد روما میں آیا۔ یعنی جب آخرالذکر ظالم نے خداوند مسیح کے مدفن مقدس کی جگہ یونانی دیوی وینس[5] کا بتخانہ تعمیر کرایا تو مسیحی رہبان واحبار کی جماعت ہجرت کرکے اسی شہر روما میں توآئی تھی۔ وہ واجب الاحترام ولیہ یعنے سینٹ ہلینا[6] روما ہی کی مسیحی ملکہ تو تھی جس نے ارض مقدس کے مسمار شدہ معابد ومشاہد کی مرمت اور جدید مقابر و آثار کی تعمیر کرائی تھی اور جس کی آغوش تربیت میں مسیحیت کے سب سے پہلے ممد و محب شاہنشاہ قسطنطین[7] نے پرورش پا کر ۳۳۰ء میں شہر بزنطیوم کو مسمار کرکے اُسکی جگہ شہر قسطنطنیہ کی بنیاد ڈالی، اور وہ روما کے آبائی مسیحین کی روحانی تعلیمات سے فیضیاب پادری ہی تو تھا جو نو تعمیر قسطنطنیہ کا پہلا بطریق تھا۔

---

(1) Byzantium (2) Titus (3) Hadrian (4) Jerusalem (5) Venus (6) St. Helena (7) Constantine (8) Eastern or Greek Church

یہ سلسلۂ بحث و نزاع ایک مدت تک جاری رہا جس میں ابتداءً متانت کے ساتھ منطقی، تاریخی، اور مذہبی استدلال سے کام لیا جاتا تھا، مگر اسکے بعد متانت و دیانت کو بالائے طاق رکھکر فریقین عالمانہ سُوقیت ملّایانہ سب وشتم اور فقیہانہ تکفیر و تفسیق پر اُتر آئے۔ یہ تلاطم دیکھ کر مسیحیت کے ارباب حل و عقد نے مناسب سمجھا کہ مجلس کلیسیائی پھر منعقد کرکے اس مسئلے کو پیش کیا جائے۔ چنانچہ سنہ ۴۵۱ء میں مجلس کلیسیائی منعقد ہوئی جس میں مشرقی کلیسیا[1] کے با اثر مندوبین کی تعداد غالب تھی۔ اس میں فریقین کے دعاوی پر کامل غور و توجہ اور مسئلۂ اقتدار کے مالہ وما علیہ پر کافی فکر و نظر کے بعد قطعی فیصلہ کیا گیا کہ رومۃ القدیم (روما) اور رومۃ الحدیث (قسطنطنیہ) کے بشپ، دونوں ہر اعتبار سے مساوی عظمت و اقتدار کے مالک اور اپنے اپنے حدود اثر و عمل میں کامل الاختیار ہیں، اور ایک کو دوسرے پر کسی حیثیت اور کسی لحاظ سے تقدّم و تفوق حاصل نہیں

مجلس کلیسیائی نے جو فیصلہ کردیا تھا چاہیے تو یہ تھا کہ اُس سے اقتدار و اثر کی اس ناشُدنی بحث کا تلاطم فوراً فرو ہوجاتا، اور دونوں تقدس مآب شخصیتیں اپنے اپنے مقام پر یہ کہکر خاموش ہوجاتیں کہ

تم اپنے گھر کے چاند ہو ہم اپنے گھر کے چاند

لیکن یہ مقولہ چاہے کسی وقت غلط بھی ہوجائے کہ "دو بادشاہ در اقلیمے نہ گنجند"، اسکی یہ مرمہ شکل ہر وقت صحیح رہیگی کہ "دو ملّا در دنیائے نہ گنجند"۔ چنانچہ دونوں میں سے ہر ایک کو اس بات کا سخت صدمہ ہوا کہ فریقِ ثانی بجائے ماتحت قرار دیے جانے کے اُسکا ہمسر اور مساوی الاقتدار قرار دیا گیا۔ اسپر مستزاد یہ ہوا کہ اسی عرصہ میں روما کے بشپ کا اعزاز و اقتدار رومانی سلطنت میں حد سے زیادہ بڑھ گیا اور اب وہ بجائے معمولی بشپ کے تقدس مآب پاپا[2] ئے اعظم کہلایا جانے لگا۔ اس ترقیِ مدارج نے پُرانی آگ پھر سلگادی جسے ایک طرف حسد اور دوسری طرف حرص کی ہوا نے خوب بھڑکایا، اور تکفیر و تفسیق کے شعلے پھر بلند ہوگئے۔ اس مرتبہ جن مسائل پر رسالہ بازی شروع ہوئی اُن میں ایک مسئلہ خصوصیت کے ساتھ پُرلطف، دلچسپ، بصیرت افزا [illegible] اسی لیے قابلِ گذارش ہے۔ مگر اُسکے سمجھنے کے لیے تھوڑی سی تمہید کی ضرورت ہے جو درج

---

(2) His Holiness　　　(1) Eastern Church

عیسائیوں میں ایک نہایت مقدس اور متفق علیہ رسم "عشائے ربانی" ہے جسے انگریزی میں یوکرسٹ[1] اور لارڈز سپر[2] اور ہولی کمیونی اَن[3] کہتے ہیں۔ اس رسم کی اصلیت متی[4] مرقس[5] اور لوقا[6] کی انجیلوں کی رُو سے (نہ اسلامی تعلیمات کی رُو سے) ملخصاً یہ ہے کہ جب حضرت مسیح آخر مرتبہ بیت المقدس میں تشریف لائے تو یہودیوں کی عید فطیر کا زمانہ تھا جس میں فسح[7] کی قربانی ہوتی ہے۔ اس دفعہ حضرت کی طرف رجحان عام زیادہ دیکھ کر احبارِ یہود نے طے کر لیا کہ اب جس طرح ہو آپ کی جان ہی لے کر قصہ پاک کر دیا جائے۔ چنانچہ جس رات کو صبح ہوتے فقیہوں[8] اور فریسیوں[9] نے آپ کو گرفتار کرا کے اس جرم میں کہ آپ عوام کو مذہب یہود سے روگردانی اور حکومتِ وقت سے بغاوت کی تعلیم دیتے ہیں، رومی گورنر پانطیوس پیلاطوس[10] کی عدالت سے صلیب پر چڑھائے جانے کا حکم حاصل کیا اُسی رات کی شام کو حضرت مسیح نے اپنے شاگردوں کے ساتھ آخری کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران میں آپ نے روٹی کے ٹکڑے توڑ کر دیے اور فرمایا "لو کھاؤ یہ ابن آدم (یعنی خود مسیح) کے بدن کے گوشت کے ٹکڑے ہیں۔ پھر پانی (یا شراب) کا پیالہ دے کر فرمایا "لو پیو یہ ابن آدم کا خون ہے"۔ عیسائی اس واقعے کے اندر ایک دقیق روحانی رمز مضمر اور ایک عمیق ربانی راز مرتکز سمجھتے ہیں اور اس کی یاد میں عشائے ربانی کی رسم ادا کرتے ہیں جس میں پادری دعا خوانی کے بعد اُس روٹی اور شراب کو جو میز پر رکھی ہوتی ہے مقتدیوں میں تقسیم کرتا ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ راسخ ہے کہ یہ روٹی حضرت مسیح کے جسم کے اصلی گوشت میں، اور شراب اُنکے خون میں تبدیل ہو جاتی ہے اور اس روٹی اور شراب میں کرامتاً سلب امراض اور طلبِ اغراض کی طاقت آ جاتی ہے۔ تبدیل ماہیت کا یہ مسئلہ عیسائیوں کا ایک مہتم بالشان اور معرکۃ الآرا مسئلہ رہ چکا ہے۔

اس تمہید کے بعد اب یونانی اور رومانی کلیساؤں کا مابہ النزاع مسئلہ بیان کیا جاتا ہے۔ رومانی کلیسا کے مذہب کے مطابق ضرور تھا کہ جو روٹی عشائے ربانی کے لیے پکائی جائے وہ تازہ گندھے ہوئے آٹے کی ہو، بخلاف اسکے یونانی کلیسا کے مذہب کی رو سے لازمی تھا کہ وہ روٹی تازہ گندھے آٹے

(1) Eucharist
(2) Lords Supper
(3) Holy Communion
(4) St. Mathew
(5) St. Mark
(6) St. Luke
(7) Pass-over
(8) Scribes
(9) Pharisees
(10) Pontius Pilate
(11) Doctrine of Transmigration

کی نہ ہو، بلکہ جب خمیر اُٹھ آئے تو پکائی جائے۔ بالفاظِ دیگر عشائے ربانی کے لیے رومی کلیسا نے فطیری اور یونانی کلیسا نے خمیری روٹی لازمی قرار دی تھی۔ جب روما کے پوپ اور قسطنطنیہ کے بطریق میں دوبارہ بحث شروع ہوئی تو دوسرے مسائل سے بڑھ کر یہی چھوٹا سا مسئلہ اُن مہات المسائل میں قرار دیا گیا جن پر نجات اور شفاعت مسیح کا دار و مدار تھا۔ چنانچہ فطیری اور خمیری روٹی کی بحث کے متعلق رسالہ بازی نے مسیحی دنیا میں وہ قیامت بپا کر دی کہ ایک کلیسا والے دوسرے کلیسا والوں کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ فطیریے علانیہ خمیریوں کو کافر کہتے تھے اور خمیریے کھلم کھلا فطیریوں کو بیدین۔

۱۰۵۳ء میں قسطنطنیہ کے بطریق مائیکیل کیرولاری اس(۱) اور روما کے پوپ لیو نہم(۲) میں آخری تحریری مناظرہ شروع ہوا، جو بڑھتے بڑھتے بہت جلد مشاتمہ تک پہونچ گیا۔ بطریق کی بحث کا پہلو یہ تھا کہ واقعۂ صلیب عید فطیر کے دوران میں ہوا جس میں یہودی فطیری روٹی کھایا کرتے ہیں، لہٰذا عشائے ربانی میں فطیری روٹی کے استعمال کے معنی یہ ہیں کہ خود خداوند مسیح نے شاگردوں کے ساتھ فطیری روٹی کھا کر ناپاک اور بے دین یہودیوں کی عید فطیر منائی۔ اور چونکہ اس سے خود خداوند کی ذات گرامی پر تشبّہ بالیہود کا ناپاک الزام عائد ہوتا ہے لہٰذا جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ خداوند مسیح نے اپنے آخری کھانے میں فطیری روٹی استعمال کی، اور جو شخص عشائے ربانی میں فطیری روٹی کے استعمال کا حکم دے، یا استعمال کرے، یا استعمال کو جائز قرار دے، یا جو شخص ایسے عقیدے، حکم، استعمال یا جواز کو کفر و ضلالت نہ جانے، وہ قطعی کافر، بے دین اور جہنمی ہے۔

۱۰۵۴ء میں پوپ صاحب کے سفیر قسطنطنیہ پہونچے۔ پہلے تو انھوں نے بطریق اعظم سے بحث کی۔ جب اس میں ناکام رہے تو سیدھے کنیسۂ ہجیا سوفیا(۳) میں پہونچے جو بحمد اللہ کہ قسطنطنیہ میں اسلام کی تشریف آوری کے بعد جامع ایا صوفیہ بن کر اس وقت تک مہبط انوار توحید ہے۔ یہاں انھوں نے قربان گاہ پر پوپ صاحب کا وہ دستخطی فرمان آویزاں کیا جس میں خمیری روٹیوں والے بطریق، اور اُس کے متبعین کو قطعی کافر اور ابدی جہنمی قرار دیا گیا۔ پھر [illegible] کے زینہ پر کھڑے ہو کر آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھائے اور بآواز بلند کہا۔

---

(۱) Machael Karularius
(۲) Leo
(۳) Hagia Sophia

"مقدس باپ ! مقدس بیٹے ! اور مقدس روح القدس ! اگر مردود خبیث تائی کیلئو
اُسکے بے دین متبعین خمیری روٹی کے متعلق اپنے عقیدۂ کفریہ سے جلد توبہ نہ کریں تو اُن سب
کی ناپاک روحیں قیامت تک شیطان اور اُس کی ذریات کے حوالے ! اور اُن کا ٹھکانا ہاویہ
کا درکِ اسفل ! آمین

بطریق صاحب کیا تھوڑے تھے ۔ اُنھوں نے جس وقت یہ واقعہ سُنا تو فوراً اپنی توپیں سنبھالیں اور اپنے جرنیلوں کی مدد سے پاپائی قلعے پر دھواں دھار گولہ باری شروع کردی اور پاپایانِ کار ۱۶ جون سنہ ۱۰۵۴ء کی ہمیشہ یاد رہنے والی تاریخ کو فطیری روٹی کا حکم دینے والوں اور اُسکے جواز کا عقیدہ رکھنے اور استعمال کرنے والوں کے کفر وارتداد، اور دائرۂ مسیحیت سے قطعی اور کُلی اخراج کا برسرِ منبر اعلان کرکے ہمیشہ کے لیے یونانی اور رومانی کلیسیاؤں کے درمیان **تفریق کامل**(۱) کی دیوارِ آہنیں کھڑی کردی ، جو تیرھویں چودھویں اور پندرھویں صدی کے مساعی اتحاد کے باوجود آج کے دن تک سربفلک موجود ہے اور ہمیشہ رہیگی ۔ انشاء اللہ تعالیٰ ۔

تفریق کے نتائج کی تفصیل لکھنے کے لیے مسیحیت کی آٹھ سو برس کی تاریخ کے صفحات مستعار مانگنے پڑیں گے ۔ لہٰذا صرف ایک ہی واقعہ سُن لو کہ سلطانِ غازی محمد خان ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے سنہ ۱۴۵۳ء میں جب فتح قسطنطنیہ کا عزم بالجزم کرلیا تو **مشرقی سلطنت**(۲) کے بوسیدہ مقبرے کے مجاور قسطنطین(۳) یازدہم شہنشاہ قسطنطنیہ نے جہاں یورپ کے اور بادشاہوں سے مدد مانگی وہاں پوپ نکولس(۴) پنجم کے آگے بھی ہاتھ پھیلائے ۔ پوپ نے اپنے ندیم خاص **کارڈی نل اِسیڈور**(۵) کو کچھ روپے اور سپاہی دیکر قسطنطنیہ بھیجا اور روانگی کے وقت مطلب کی بات چپکے سے کان میں کہدی کہ مشرقی کلیسیا کو مغربی کلیسیا میں جذب کرنے کی پوری کوشش کرے ۔ جب کارڈی نل مذکور نے قسطنطنیہ پہنچکر کنیسۂ ہجیا سوفیا میں مغربی طریقہ پر عبادت کی تو مشرقی کلیسیا والے غیظ وغضب سے آگ بگولا ہوگئے اور صلاح لینے کے لیے ایک مشہور راہب جناڈی اوس(۶) کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ اُسنے کہا

---

(۱) Schism
(۲) Easern Empire
(۳) Constantine
(۴) Nicholas V
(۵) Cardinal Isador
(۶) Gennadios

کہ جو شخص اپنے (یونانی) مذہب کے مقابلہ میں فطیریوں کا ذرا بھی لحاظ پاس کرے، اُس پر خداوند مسیح کا سخت عذاب نازل ہوگا - یہ شہ پاکر قسطنطنیہ کے پادریوں، سپاہیوں، اور عام باشندوں نے بلوہ کردیا، جس کا سرغنہ رکن حکومت گرانڈ ڈیوک نوٹارس[1] تھا - چنانچہ نوٹارس اور اُسکے بلوائی شرکاء علانیہ کہتے تھے کہ "سینٹ سوفیا کا گرجا، فطیری کتے کے بھونکنے (دعا پڑھنے) سے ناپاک ہوگیا - ہمیں اپنے معابد میں مسلمانوں کی پگڑیاں دیکھنی منظور، مگر رومانی پادریوں کی ٹوپیاں دیکھنی ہرگز گوارا نہیں" خدا کی شان، کہ کارڈینل صاحب کی پگڑی اُچھلنے کے بعد، تین ہلال بھی بدر نہ ہونے پائے تھے کہ اسلامی پگڑی جس پر سنہرا ہلال جگمگا رہا تھا سینٹ سوفیا کے معبد کے اندر آموجود ہوئی!

تم نے دیکھ لیا کہ خمیری روٹی جیسی نرم چیز نے مسیحیت کے ایک ہزار سال کی عمر والے تناور درخت کو کیسا بیچ میں سے چیر کر دو ٹکڑے کر ڈالا! اسکے بعد سے یہ دونوں ٹکڑے اپنی اپنی جگہ بڑھنے اور ہوا میں جھومنے لگے، اور ہر ایک میں سے پچاسوں ڈالیں نکل آئیں جو موٹی ہو ہو کر اصل درخت سے ہمسری کرنے لگیں - پراٹسٹنٹ[2] شاخ تو کہیں ۱۵۲۹ء کے موسم بہار میں جا کر پھوٹی ہے - اس میں سے اور نیز دوسری ڈالوں میں سے بعد کو بہت سی شاخیں نکلیں، جو اس وقت سرسبز شاداب، اور نئی نئی کلیوں اور کونپلوں، اور نئے نئے پھولوں اور پھلوں سے لدی ہوئی زمین پر لوٹ رہی ہیں -

کَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِن فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِن قَرَارٍ -

---

یہ تھے اُن لوگوں کے حالات جنکے متعلق فَأَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ کی وعید موجود ہے - کیا اس خیر الامم کے لیے جسے وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا اور وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا کے صاف اور صریح احکام مل چکے ہیں مقام صد عبرت اور باعث صد ہزار غیرت نہیں کہ فطیریوں اور خمیریوں کی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں کو بنائے تفریق و تمزیق قرار دیکر اپنے آپ کو اُولٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ کا مصداق بنائے؟ الله

"شمع بے نور"

---

[1] Grand Duke Notaras. [2] Protestant.

میر انیس کی شاعری کا ایک زبردست عنصر

میر انیس کے کلام میں عورتوں کی نفسیات کے جو مرقعے پیش کیے گئے ہیں، اور انکے جذبات و خیالات کو جس زبان و اسلوب بیان کے ذریعہ سے ظاہر کیا گیا ہے، وہی انکے کلام کا زیادہ قابل عظمت اور زیادہ بحث طلب عنصر ہے۔ موخر الذکر یعنی عورتوں کی گفتگو اور محاورات سے دیگر مرثیہ گو شعرا نے بھی بینوں میں خاطر خواہ کام لیا ہے۔ لیکن میر انیس کے یہاں اسکو جو وقعت حاصل ہے، کسی اور کے کلام میں نہیں۔ پہلے تو انکے گھرانے کی زبان ہی ایسی تھی کہ اگر وہ اپنی تمام زندگی میں اس پر ہر وقت فخر کیا کرتے تھے تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ اور پھر انکا ذاتی شوق اور کوشش جسکی بنا پر انکے ہر مرثیہ میں فصیح سے فصیح زبان اور لطیف سے لطیف محاورہ کا التزام رہتا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ انکے خاندان ہی میں فطرت کی جانب سے عورتوں کے جذبات و خیالات کی ترجمانی کے لیے ایک خاص قدرت ودیعت کر دی گئی تھی۔ انکے دادا میر حسن نے اپنی مثنوی (سحر البیان) میں بدر منیر کی جو حالت پیش کی ہے، وہ بھی صد درجہ پاکیزہ ہے۔ برخلاف اسکے میر حسن سے قریب زمانہ کے دوسرے شعرا کی مثنویوں میں جہاں کہیں عورت کا مرقع پیش کیا گیا ہے، اصلیت اور پاکیزگی کا بہت کم خیال رکھا گیا ہے۔

عورت کی نفسیات، مرد کی نفسی کیفیات سے متاثر ہوتی ہے۔ وہ اگرچہ انتہا درجے کی حساس ہوتی ہے، لیکن ہر وقت صبر و استقلال سے کام لیتی ہے۔ بعض نزاکتوں کی طرف اسکی طبیعت اس قدر سرعت کے ساتھ منتقل ہو جاتی ہے اور ان سے متکیف ہونے لگتی ہے، کہ مرد انھیں بدقت تمام معلوم کرکے ان سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اور جن باتوں کو وہ آسانی سے نہیں سمجھ جاتی، انھیں سمجھ جانے کے بعد ان پر ایسی راسخ العمل ہو جاتی ہے کہ پھر جان دیدینا گوارا کر لیگی، مگر اپنا خیال پلٹنا اسکے لیے ناممکن ہوگا۔

یہ باتیں ایسی ہیں جو ہر ملک و ہر قوم کی عورت کو اپنی ماں کے ورثہ میں ہاتھ آتی ہیں لیکن بعض خصوصیات ایسی بھی ہیں جو ہر جگہ کی عورت میں مشترک نہیں ہوتیں۔ اس بارے میں سب سے زیادہ ماحول کا اثر ہوتا ہے۔ عربستان، ہند، اور جاپان کی عورتوں کی طبیعتوں (متذکرہ بالا صفات کو چھوڑ کر) سے بے حد اختلاف ہوگا۔ عورتیں تو خیر ایک محدود فضا میں مقید رہتی ہیں، ان

ممالک کے مرد بھی نفسی کیفیات کے لحاظ سے آپس میں بے حد مختلف ہیں۔

اس روشن زمانہ میں جب تمام دنیا مختلف النوع ذرائع آمد و رفت کی آسانی کے باعث قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی ہے اور اس کے دور دور کے ممالک ایک ہی شہر کے متفرق گلی کوچوں کی شکل میں منتقل ہوتے جا رہے ہیں، اس بات کی ان تھک کوششیں ہو رہی ہیں کہ تمام دنیا کے مختلف میلانات کو ایک اور صرف ایک ہی نقطہ پر لا کر ٹھہرا لیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں اس مقصد کے حصول کے لیے جو ذریعے اختیار کیے جا رہے ہیں، وہ ایک حد تک مفید ضرور ہیں، لیکن ہمارا خیال ہے، جب تک کسی نہ کسی طریقہ سے تمام دنیا کی عورتوں کی طبیعتوں کو ایک نہ کر لیا جائے گا اس مقصد میں ہرگز کامیابی نہیں ہو سکتی۔

عربستان کی عورت ہندوستان کی عورت سے بالکل جدا ہوتی ہے۔ اگر ہندوستانی مرد کے سامنے ایک چینی عورت کی نفسیات پیش کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ "یہ ایک عورت ہے" تو وہ اس قسم کی فطرت والی ہستی کو ہرگز عورت نہ سمجھے گا۔ اسی طرح فرانس یا امریکہ والوں کے آگے ہندوستان کی پردہ نشینوں کی فطرت کا مرقع بغیر "ہندوستانی عورت" لکھے پیش ہو، تو وہ اسکو ایک عجیب اور نئی قسم کی مخلوق خیال کریں گے۔ مگر عورت خواہ کہیں کی ہو، جب مرد کے سامنے آجاتی ہے، اُسکے "دائرۂ پرستش" کا ایک مستقل مرکز اور تخیلات و جذبات کا ایک یقینی جولانگاہ بن جاتی ہے۔ وہ اپنے جنس مقابل کے لیے (اگرچہ اُسکا ہم رنگ و ہمزاج نہ سہی) ایک ایسا "نمونۂ سرمدی" چھوڑ جاتی ہے، جس سے متاثر ہوئے بغیر دنیا کا کوئی مرد نہیں رہ سکتا، اس کی مضراب ہستی مرد کے ساز فطرت کے ہر تار کو چھیڑ جاتی ہے۔ وہ اسکی عقلی، اخلاقی اور روحانی، غرض ہر قسم کی قوتوں میں ہیجان پیدا کر دیتی ہے۔

میر انیس اگر ہندوستانیوں کی نظروں کے آگے ایک عرب عورت کا مکمل نقشہ کھینچ دیتے تو اُنکے کلام کو اس قدر مقبولیت حاصل نہ ہوتی۔ کیونکہ ہندوستانی انکی پیش کردہ ہستیوں کو اپنی چیز نہ سمجھ کر ان سے غیریت برتتے، اور یہ مغائرت انھیں ان ہمدردیوں اور پُر خلوص محبت سے روکے رکھتی، جو آج میر انیس کا کلام پڑھنے کے بعد حضرت زہراؑ، حضرت زینبؑ، حضرت بانوؑ، حضرت صغراؑ اور حضرت کلثومؑ وغیرہ کے متعلق خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ [illegible] دست منازع کے

کے لیے اس راز سے واقف ہو جانا ضروری تھا۔ اسی لیے میر [illegible] رتوں کو پیش

کیا ہے اُن میں ایک حد معینہ تک ہندوستانی فطرت کو بھی شا[illegible] ل تک بین

کا تعلق ہے اُنکے مرثیوں کی جملہ عورتیں ہندی ہیں، رسم و رواج کے لحاظ سے یہ سب نصف ہندی ہیں اور نصف عرب۔ اور ان سے قطع نظر کرنے کے بعد جب حضرت زہراؑ اور حضرت زینبؑ کے کردار پر نظر ڈالی جاتی ہے تو وہ بالکل عرب عورتیں دکھائی دیتی ہیں۔

مجموعہ مراثی انیسؔ جلد اول (مطبوعۂ نظامی پریس بدایوں) کے سب سے پہلے مرثیہ میں حضرت فاطمہؑ کا کردار پیش کیا گیا ہے۔ ایک دفعہ حضرت امام حسنؑ اور امام حسینؑ (جب دونوں بچے تھے) آنحضرت رسولِ خدا کے پاس کھیلتے کھیلتے پہونچ جاتے ہیں۔ امام حسنؑ نانا کو اپنے بھائی کا منہ اور اپنا گلا چومتے ہوئے دیکھ کر غصہ میں آجاتے ہیں کہ نانا نے ہمارا بھی منہ کیوں نہ چوما، اور روتے ہوئے گھر واپس آتے ہیں۔ حضرت زہراؑ جب اپنے چھوٹے صاحبزادے کو روتا ہوا دیکھتی ہیں تو اُسوقت انکی جو کیفیت اور انکی زبان سے جو گفتگو ظاہر کی ہے وہ ایک حد تک ہندوستانی عورت کی فطرت اور نفسیات سے متعلق ہے۔ چنانچہ ماں بچہ سے کہتی ہیں:-

ہے ہے حسینؑ! کیا ہوا تو کیوں ہے تلملا؟
تجھ کو رُلا کے غم میں مجھے مبتلا کیا!
قربان ہو گئی تجھے کس نے خفا کیا؟
میرا کلیجہ پھٹتا ہے اے دلربا! نہ رو
زہراؑ ہزار جان سے تجھ پر فدا، نہ رو
مر میں نہ درد ہو کہیں لے مہ لقا، نہ رو
بس بس نہ رو حسینؑ! بلائے خدا، نہ رو

کہتے کہتے آخر کار چادر سے منہ ڈھانپ کر خود بھی رونے لگتی ہیں اور کہتی ہیں:-

گھر سے گئے تھے ساتھ جدا ہو کے آئے ہو
کیوں کیا ہوا بھی، کیوں حسنؑ سے خفا ہو کے آئے ہو
تم چپ رہو وہ گھر میں تو مسجد سے پھرتے ہیں
گندی ہیں کھیل سے مرے بچے کو کیوں رُلائیں
اُن سے نہ بولیو وہ تمہیں لاکھ گر منائیں
لو آؤ! جانے دو تمہیں چھاتی سے ہم لگائیں
واری اگر حسنؑ نے رُلایا برا کیا
پوچھوں گی کیا نہ میرے بچے نے کیا کیا؟

صورت کا جب اپنی ماں سے کہتا ہے کہ نانا نے آج بھائی کا منہ چوما اور ہمارا نہیں، اس لیے ہم رو رو کے اپنی جان گنوا دیں گے نہ پانی پئیں گے اور نہ کھانا کھائیں گے۔ اسپر ماں کی زبان سے حسب ذیل محبت بھرے جملے نکلتے ہیں:

صدقے گئی کر و نہ کلیجے کو میرے شق ہے ہے یہ کیا کیا مجھے ہوتا ہے اب قلق
میرا لہو بہے گا جو آنسو بہاؤ گے!
کاہے کو ماں بچے گی جو کھانا نہ کھاؤ گے

اسکے بعد صاحبزادی کو نانا کے پاس لیجانے اور وہاں کی گفتگو کا جو مرقع پیش کیا ہے اُس میں عربی کردار جھلک جاتا ہے۔ چنانچہ مُنہ کے نہ چومنے کے متعلق کسی قسم کا شکوہ وشکایت کرنے کے بجائے حضرت فاطمہؑ (اپنے والد سے) کہتی ہیں :-

روٹھے تھے سیدِ قدموں پہ سر دھرنے آئے ہیں مُنہ کے نہ چومنے کا گلہ کرنے آئے ہیں

اور جب رسول خدا اثنائے گفتگو میں رونے لگتے ہیں تو یہ تاڑ جاتی ہیں اور کہتی ہیں ؎

کیوں بابا جان خیر تو ہے اسکی جان کی فاقے ہیں کاٹتی ہوں مصیبت جہان کی

اور جب وہ حقیقتِ حال سے آگاہ فرماتے ہیں تو اپنے باپ کے برتے پر کہتی ہیں ؎

قدرت ہے سب طرح کی شہِ مشرقین کو حضرت سے لونگی اپنے حسن اور حسین کو

پھر غصہ میں آجاتی اور کہتی ہیں کہ "کیا اِنکو قتل کرنا آسان ہے؟ کیا اُس دن شیرِ حق کمرے ذوالفقار نہیں کھولیں گے؟ کیا میں بال کھولے ہوئے باہر نہ نکل جاؤں گی؟ اور عرشِ عظیم کا پایہ نہ ہلاؤں گی؟" تو حضرت فرماتے ہیں کہ اُس وقت نہ میں ہوں گا نہ علیؑ نہ فاطمہؑ اور نہ حسنؑ۔ تو زہراؑ کہتی ہیں کہ

ہم میں سے ایسے وقت جو کوئی نہ ہووے گا ہے ہے مرے حسینؑ کو پھر کون روئے گا

آخر کار مذہب اور بابا جان کی خاطر سینے پر پتھر رکھنا گوارا کر لیتی ہیں، لیکن محبت سے مجبور ہو کر بابا جان سے کہتی ہیں ؎

کیجے دعا کہ خالقِ اکبر مدد کرے اللہ یہ بلا مرے بچے کی رد کرے

حضرت زہراؑ کا تو ایک ضمنی ذکر تھا۔ میر انیس نے حضرت زینبؑ اور حضرت صغراؑ کا نسائی کردار نہایت مکمل حالت میں پیش کیا ہے۔ ان ہی دونوں کے بیانات میں اُنھوں نے عورتوں کی فطرت سے واقفیت کی پوری قدرت دکھائی ہے۔ حضرت صغراؑ کے کردار پر اب تک متعدد طریقوں سے روشنی ڈالی جا چکی ہے، اسلیے ہم اپنے اس مضمو نظر کر کے صرف حضرت زینبؓ کی سیرت پر ایک نظر ڈالتے ہیں انیس نے ب مجموعہ مراثی انیس جلد اول (مطبوعہ نظامی پریس بدایوں) کے مرثیوں نمبر ۲ - - ن انکے کردار کو

خاص طور پر ظاہر کیا ہے۔ ذیل میں ہم ان تمام مرثیوں کے متفرق بیانات کو ایک منضبط شکل میں پیش کرتے ہوئے انیس کی اس قسم کی صناعی پر روشنی ڈالتے ہیں۔

حضرت زینبؑ امام حسینؑ کی چہیتی بہن ہیں۔ انکو اپنے بھائی کے مقابلہ میں دنیا کی کوئی چیز عزیز نہیں۔ مدینہ سے نکلتے وقت جب محلہ کی عورتیں آکر سمجھاتی ہیں کہ

گھر فاطمہ زہرارضہ کا ہے اس گھر کو نہ چھوڑیں

اور رنج والم کا اظہار کرتی ہیں تو آپ فرماتی ہیں کہ صرف آپ لوگوں ہی کو اسکا رنج نہیں ہے بلکہ مجھ کو بھی ہے رنج ایسا کہ کچھ کہہ نہیں سکتی　　بھائی سے جدا ہو کے نگر رہ نہیں سکتی میں فاقے کرکے بھی اماں کی تربت کا پاس نہ جاتی لیکن کیا کروں بھائی کی طرف دیکھ کے میری چھاتی بھر آتی ہے، کیونکہ ظاہر میں تو اماں قبر میں سوتی نظر آتی ہیں لیکن جب کبھی خواب دیکھتی ہوں تو اُنھیں روتے ہوئے دیکھتی ہوں۔ اُنھوں نے مجھے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ "حسینؑ کا نہ باپ رہے گا نہ ماں رہیگی اس لیے اسکے غم میں تو رفاقت کرنا" اب مجھے اُنکی وصیت رہ رہ کر یاد آتی ہے کہ ؎

اُس دن مری تربت سے بھی مُنہ موڑیو زینب　　اس بھائی کو تنہا نہ کبھی چھوڑیو زینب

گھر بھائی سے تھا، جب بھائی نہیں تو گھر بھی نہیں۔ اب خواہ رسّی سے ہاتھ بندھیں یا بلوہ میں سر کھُلے۔ کچھ ہی ہو، زینب بھائی کے ہمراہ ہے اور اس کوچ کے انجام سے بھی آگاہ ہے۔ غرض ایک محبت والی اور وفادار بہن اپنے بیمار و ناتوان شوہر کو مدینہ میں چھوڑ کر بھائی کی رفاقت کے لیے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ اپنے گھر سے نکلتی ہے۔

کربلا پہونچنے کے بعد انتخاب قیام گاہ کے متعلق حضرت زینب اور حضرت عباس میں نہایت درد آمیز گفتگو ہوتی ہے۔ اسکے بعد اس فیاض عورت کے ایک ایثار کا موقع آتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب کربلا میں حضرت امام حسین اپنی فوج کی تنظیم کرنے لگتے ہیں تو حضرت زینب کے صاحبزادوں کو خیال پیدا ہوتا ہے کہ فوج کی علمبرداری ہمارا موروثی حق ہے۔ اسلیے دونو آپس میں مشورہ کرتے ہیں کہ "کیوں بھائی! علَم لینے کے لیے ہم ماموں سے کہیں؟ اسلیے کہ ہم دونوں طرف سے حقدار ہیں۔ ہمارے دادا اور نانا دونوں علمدار تھے"۔ بڑا کہتا ہے کہ "زنہار یہ عرض کرنے کا موقع نہیں، ماموں مالک و مختار ہیں، وہ جس کو چاہیں دیں، ہمارا بڑا عہدہ تو یہی ہے کہ ماموں پر فدا ہو جائیں، چپکے رہو اماں سُن کر کہیں خفا نہ ہو جائیں"۔

حضرت زینب پردے کے پیچھے سے یہ گفتگو سُن لیتی ہیں اور فضہ کے ذریعہ ان دونوں کو بُلا کر چھوٹے سے کہتی ہیں کہ "تم ابھی کیا باتیں کر رہے تھے۔

سمجھے نہ کہ مادر عقبِ پردہ کھڑی ہے ۔۔۔ گھر لُٹتا ہے میرا تمھیں منصب کی پڑی ہے

میں دیکھ رہی ہوں کہ جب سے علم نکلا ہے تمھارے تیور ہی اور ہو گئے ہیں۔ تمھارے سن ابھی کم ہیں، تمھارے قد ابھی چھوٹے ہیں۔ یہ کھیل نہیں، محمدؐ کا علم ہے! مانا یہ تمھارا حق ہے لیکن میں اپنے چھوٹے بھائی کو اپنے بیٹے کے برابر سمجھتی ہوں۔ یہ علم اُسی کو ملنا چاہیے ؎

بگڑوں گی گلہ گر کسی اسلوب کروگے ۔۔۔ عباس سے کیا تم مجھے محجوب کروگے؟

دیکھو عباس کو علم ملتے ہی تم اُنھیں جا کر تہنیت علم دو ؎

کنبہ میں اگر نے بھی اگر سُن لیا یہ حال ۔۔۔ کہتی ہوں صاف میں، مجھے ہوگا بہت ملال

صدقے گئی خلافِ ادب کچھ سخن نہ ہو ۔۔۔ میری خوشی یہ ہے کہ جبیں پر شکن نہ ہو

اور تم اپنے ماموں کے قدموں پہ اپنے سر کو فدا کردو۔ دیکھو! اگر قاسم و اکبر تم سے پہلے میدان میں زخمی ہوئے تو پھر تم میرے فرزند نہ میں تم دونوں کی ماں۔"

یہ ہے ایک عرب عورت کی فیاضی کہ اپنے بیٹوں کے مقابلہ میں اپنے بھائی کو ترجیح دیتی ہے! اور یہ ہے ایک بہادر عورت کا ایثار کہ اپنے بچوں کے موروثی حق سے اپنے چھوٹے بھائی کو سرفراز کرتی ہے!! یہی وہ مقام ہے جہاں میر انیس کی نسائی فطرت کی گہری واقفیت کا کمال ظاہر ہوتا ہے!!!

حضرت زینب کا کردار بالکل عربی ہے، انیس نے صرف ایک مفید حد تک انھیں ہندی نفسیات سے متعلق کیا ہے اور وہ بھی صرف بیٹوں میں، جہاں مجبوری تھی۔ کیونکہ بغیر اس عنصر کے مرثیہ گوئی کا مقصد (یعنی رونا اور رُلانا) فوت ہوا جاتا تھا۔ حضرت زینب کی عرب نفسیات اُس وقت بالکل نمایاں ہو جاتی ہے جب کربلا کے میدان میں تمام رفقاء شہادت سے سرفراز ہوتے ہیں، اور صرف گھر والے باقی رہ جاتے ہیں۔ حضرت زینب کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب تک اُنکے بچوں کی لاشیں کیوں نہ آئیں؟ چنانچہ [illegible] کے متعلق کہتی ہیں ؎

آتا ہے دمِ صبح سے یاں لاشہ پہ لاشہ ۔۔۔ ا[illegible] لڑائی ہے تماشہ

پائی نہ اجازت یہ سخن خوب تراشا ۔۔۔ باتیں [illegible] مجھے باور نہیں آتا

سمجھے ہیں دلاور کہیں ہم روکے سے کسی کے؟ ۔۔۔ وہ سب بھی تو پیارے تھے حسین ابن علی کے؟

میں جانتی تھی پہلے اجازت وہی لیں گے   اس کی نہ خبر تھی کہ دغا وقت پہ دیں گے

جب صاحبزادے ماموں سے بوقت تمام جنگ کی اجازت لیکر ماں سے رخصت ہونے آتے ہیں تو یہ خفا ہو جاتی ہیں کہ یہ دونوں اب تک کیوں نہ جنگ پر روانہ ہوئے اور ماموں کے لیے کیوں نہ جانیں دیں۔ چنانچہ انھیں ڈرپوک اور بے وفا سمجھ کر انکی طرف دیکھنا نہیں چاہتی بلکہ:-

منہ پھیر کے کہنے لگیں یہ شاہ کی ہمشیر   غیرت کی ہے جا غیر تو ہو فدیۂ شبیر
شکوہ ہے مقدر کا کچھ ان کی نہیں تقصیر   منہ پھیریں وہ مقتل سے جو ہوں صاحبِ شمشیر
انصاف تو کیجے مجھے کیونکر نہ گلا ہو
وہ پہلے نہ بیدم ہوں لہو جن میں ملا ہو؟

آفت ہے یگانے ہی جو ہمت نہ کریں گے   یہ کس نے کہا تھا کہ ہمیں پہلے مریں گے
فرزندِ حسن مرنے کو جالیں تو یہ جائیں   عباس علی خوں میں نہالیں تو یہ جائیں
ہمشکلِ علی برچھیاں کھالیں تو یہ جائیں   لاشے ابھی شہزادوں کے آلیں تو یہ جائیں
کھلتا نہیں کچھ زورِ شجاعت انھیں کیوں ہے
حضرت تو سلامت ہیں یہ عجلت انھیں کیوں ہے

کیوں روتے ہیں کیا چھن گئی سر سے مرے چادر   خالی ابھی ہونے دیں محمدؐ کا بھرا گھر
وقت آئے تو دکھلائیں گے تلواروں کے جوہر   جرأت میں وہ جعفر ہیں شجاعت میں یہ حیدر
جب کوئی نہ ہوئے گا تو یہ جنگ کریں گے
کیا عیب ہے؟ پہلے نہ مرے بعد مریں گے!

میں سمجھی تھی پہلے ہی یہ ڈھونڈیں گے بہانا   کچھ منہ کا نوالا نہیں تلواروں کا کھانا
لازم تھا اسی وقت انھیں خیمہ میں آنا   سچ ہے کہ دغا داروں سے خالی ہے زمانا
ماں کو تو خجل کر چلے کنبے کی نظر میں   میں مٹ گئی اس رنج و مصیبت کے سفر میں
پوچھے کوئی اِنسے کہ یہ کیوں آئے ہیں گھر میں   کھولیں اسے باندھے ہیں جو تلوار کمر میں
فوجوں میں یہی طور تھے نانا کے ولی کے؟
[illegible] ہے دھیان یہ کہ نواسے ہیں علی کے!

توڑ آئے ہوں خیبر سے کسی در کو تو کہدیں   مارا ہو جو مرحب سے دلاور کو تو کہدیں

تا کو نہ بھگا آئے ہوں لشکر کو تو کہہ دیں   خوشنود کیا ہو جو برادر کو تو کہہ دیں
چپ کیوں ہیں جو نصرت کی خبر لیکے پھرے ہیں؟
کیا شام کے سردار کا سر لیکے پھرے ہیں؟

عورت اکثر کسی بات کو صاف سیدھے طور پر نہیں بیان کرتی۔ خصوصاً جب وہ غصہ میں ہوتی ہے تو اپنے ہر مطلب کو طعن و تشنیع کے ذریعہ ادا کرنا چاہتی ہے۔ اور صرف اسی ایک بات کو پیش نہیں کرتی جس سے وہ متاثر ہوئی ہے بلکہ اُس سے متعلقہ تمام واقعات یکے بعد دیگرے سناتی جاتی ہے۔ جب اُسکے دل پر کوئی ٹھیس لگتی ہے تو پہلے زبان سے ظاہر کرنا تو کجا وہ حتی الامکان اس امر کی کوشش کرتی ہے کہ اپنی قلبی واردات اور ذہنی کیفیات اپنے بشرے سے بھی ظاہر نہ ہونے پائیں۔ لیکن جب کسی وجہ سے وہ پھوٹ پڑتی ہے تو اسکے محیط جذبات میں ایک ایسا تلاطم انگیز ہیجان پیدا ہوتا ہے کہ غم و غصہ کے تیز و تند سیلاب اُس کی آنکھوں اور زبان سے نکلے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور نہ دُنیا کی کوئی طاقت انھیں بہنے سے روک سکتی ہے۔ انیس اگر اس موقعہ پر نسائی نطرت کی اس خصوصیت کو نمایاں کرکے نہ دکھاتے تو اُنکی شاعری میں بہت بڑا نقص باقی رہ جاتا۔

حضرت زینب ایک عورت ہیں، اور خاص کر عرب کی عورت۔ ان کا جوش جسقدر بڑھا ہوا نظر آئے، کم ہے۔ اور اگر انکی زبان سے مسلسل ہمت افزا اور طعن آمیز جملے نکلتے جائیں، تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ تعجب تو اُسوقت ہوتا جبکہ وہ ایسی نازک حالت میں بھی متأثر ہوئے بغیر رہتیں۔ بیگانوں کو شہادت کا مرتبہ حاصل کرتا ہوا دیکھ کر انکی رگِ حمیت جوش میں نہ آتی۔ اپنے بھائی، عزیز ترین بھائی کے بُرے وقت میں اپنے بچوں کو قربان کیے بغیر خاموش رہ جاتیں۔ یہ ایک عورت، عرب عورت اور بالخصوص خاندان رسالت مآب کی عورت کے لیے ناممکن تھا!! جسکی رگ رگ میں محبت و الفت کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھر دیے گئے ہوں، جسکی بات بات میں صداقت اور حمیت کے پھول جھڑتے ہوں، اور جسکے قدم قدم پر فیاضی اور ایثار کے نشان قائم ہوتے جاتے ہوں! اس ہ [illegible] نے اپنی شاعری کو معراجِ کمال پر پہونچا دیا ہے۔ عورت کی اور پھر ایک عرب عورت [illegible] سے بہتر مرقعہ دستیاب نہیں ہو سکتا!

ماں کا غصہ دیکھ کر دونوں صاحبزادے کانپ جاتے ہیں [illegible]۔ عاجزی سے عرض

کرتے ہیں ؎

آزردہ نہ ہوں آپ یہیں تھا یہی وسواس　　جب بڑھتے تھے ہم روکتے تھے حضرت عباس
جوڑے ہیں کبھی ہات کبھی گر دپھرے ہیں
راضی ہوئے جب پاؤں پہ اسوقت گرے ہیں

ایک مرثیہ میں دکھایا گیا ہے کہ صاحبزادے خود آکر اپنی والدہ کو اجازت جنگ کی خوشخبری نہیں سناتے بلکہ فضہ معلوم کراتی ہے کہ "عون و محمد اب جنگ کو جارہے ہیں" تو حضرت زینب بجائے کسی قسم کی تشویش کے خدا کا شکر بجالاتی ہیں کہ اب میرا مطلب بر آیا - وہ عام عورتوں کی طرح اسوقت یہ آرزو نہیں کرتیں کہ میرے بچے جنگ سے زندہ بچ کر آئیں، بلکہ کہتی ہیں کہ "میرے بچوں کی عزت یارب! تیرے ہاتھ ہے، تو انکی مدد کر، کیونکہ وہ علیؑ کے نواسے ہیں، اور اب یہ خوشخبری آئے کہ دونوں مارے گئے اور ولی ابن ولی کے فدیوں میں محسوب ہوئے" ایک پُرخلوص، پاکباز اور فیاض عورت کی کس قدر صحیح تصویر ہے!

حضرت زینب صرف اپنے بچوں کی قربانی پر اکتفا نہیں کرتیں، بلکہ کہتی ہیں کہ "اگر انکا باپ (یعنی زینب کا شوہر) ہوتا تو وہ بھی آپ (یعنی امام حسینؑ) کے لیے جان دیدیتا - کیونکہ ہم سب پر آپ کا حق ہے - اور جب ہمارا حق ان بچوں پر ہے تو پھر کیوں نہ وہ اس حق کو ادا کریں" - چنانچہ کس خلوص سے کہتی ہیں ؎

باپ ان کا آج ہوتا جو یا شاہِ نامدار!　　کرتا قدم پہ سر کو تصدق یہ افتخار
ایک اُن کے بدلے آپ کے قدموں پہ ہوتے نثار　　میرے عوض فدا کرے ایک اپنی جان زار
ان پر ہمارا حق ہے، تو ہم پر حق آپ کا
یہ بھی تو حق ادا کریں کچھ اپنے باپ کا!

اسوقت حضرت امام حسین اپنی بہن کو ہر طرح سے سمجھاتے ہیں کہ "میں عون و محمد کو جنگ کی ضرور اجازت دیتا، لیکن اول تو وہ کمسن ہیں اور دوسرے یہ کہ انکے بعد جعفر طیار کی نسل کا خاتمہ ہو جائے گا، اس لیے مجبور ہوں" مگر حضرت زینب اپنے بھائی کے مقابلہ میں ایک نسل کے معدوم ہو جانے کو کچھ نہیں سمجھتیں - یہ عالیشان جذبۂ ایثار عام عورتوں اور حضرت زینب میں حدِ امتیاز قائم کرتا ہے - جب تک عورت اَن بیاہی رہتی ہے اپنے بھائی بہنوں سے اسکو بیحد محبت رہتی ہے - لیکن میکے سے نکلنے اور اولاد ہو جانے کے بعد اسکو اپنی اولاد اور اپنے خاوند سے

جس قدر محبت ہو جاتی ہے اپنے بھائی بہن سے اتنی ہرگز باقی نہیں رہتی۔ اگر اسکے بھائی اور بچے دونوں ایک ہی چیز کے خواہشمند ہوں تو اپنے بھائی پر اپنے بچوں کو ہر حال میں ترجیح دیگی۔ یہ دنیا کی تمام عورتوں کی سرشت میں داخل ہے۔ لیکن بعض غیر معمولی مردوں کی طرح بعض عورتیں بھی ایسی پیدا ہو جاتی ہیں جنکا ایثار اپنی قبیل کی اور مخلوق کے واسطے ایک خوشنما جادۂ عمل پیدا کر دیتا ہے اور جن کی محبت ساری دنیا میں ایک زندۂ جاوید نغمہ چھوڑ جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت زینب امام حسینؑ کی چھاتی سے سر لگا کر نہایت عاجزی سے کہتی ہیں ؎

لِلّٰہ ان کے باب میں اب کد نہ کیجیے
ہے یہ فقیر کا ہے اسے رد نہ کیجیے

ان بیانات کے بعد حضرت زینب کے کردار کا ایک زبردست عنصر ہمیں نظر ہوتا ہے، جو صرف ایک عرب عورت کے لیے مخصوص ہے۔ دنیا کی کوئی عورت جرأت و دلیری کے غالباً ایسے اعلیٰ جذبات و تخیلات نہیں رکھتی جیسے کہ ایک عرب کو عطا کیے جاتے ہیں۔ اس کا بچپن لڑکوں کے ساتھ ساتھ خونخوار معرکوں میں گذرتا ہے۔ اُسکی جوانی نوجوان مردوں کو اُنکے قلوب کے گرمانے، ان کی رگِ حمیت کے جوش میں لانے، اپنے گھر، اپنے قبلیہ، اپنی قوم اور اپنے ملک کیلیے جان دینے پر اکساتی ہے، نیز انکی کاہلی اور پژمردگی کو بجلی بنکر جلا دیتی ہے۔ اور اُس کا بڑھاپا عرصہ ہائے کارزار کے زخمی بچوں اور بھائیوں کی نگہداشت، بھولے بھٹکے مسافروں کی امداد، اور غریبوں لاوارثوں کی غمخواری میں گذر جاتا ہے۔ وہ ایک ہندوستانی عورت کی طرح کسی کو اپنے گھر، خاوند، اور بچوں پر حملہ کرتے ہوئے دیکھ کر، کسی تہ خانے کے گوشہ میں چھپنے، کسی باؤلی میں ڈوب مرنے، یا کسی آگ میں جل جانے کی کوشش نہیں کرتی، بلکہ ہمت اور عقلمندی کے ذریعے ایسے طریقے اختیار کرتی ہے کہ حملہ آور کو منہ کی کھانی پڑے۔ میر انیس نے حضرت زینب کا کردار پیش کرتے وقت ان تمام خصوصیات کو خاص طور پر مدنظر رکھا ہے۔

حضرت زینب کے صاحبزادے جب لڑائی کے لیے نکلتے ہیں تو وہ ایک ہندوستانی عورت کی طرح رونے رُلانے کے بجائے اُنکو جنگ کی ہمت دلاتی اور جوانمردوں کے ساتھ مرنے مارنے پر آمادہ کرتی ہیں۔ اسکے متعلق چند شعر ملاحظہ ہوں ان سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ میر انیس کی نگاہوں میں ایک مکمل عورت کن عظیم الشان صفات سے ... رہتی ہے ؎

ہاں چاہیے منہ نیزۂ و خنجر سے نہ پھیرو
دو شیر ہو ... شہ کو گھیرو
... رتی ہو ... تا ... سر دونوں ...
... کی ہو

ہاں سب میں یہ سرتاج دلیروں کے تمھیں ہو　　ہاں صدقے گئی شیر تو شیروں سے تمھیں ہو
اس گھر کے بزرگوں کا چلن تیغ زنی ہے　　جو فقر میں کرتا ہے سخاوت وہ غنی ہے
بودے کی کہاں آنکھ، کہاں مرد کے تیور　　چھپتے نہیں لاکھوں میں جو اَمرد کے تیور
ہمراہ کوئی واں سے نہیں لاتا ہے رتبہ　　جو نام پہ مرتا ہے وہی پاتا ہے رتبہ
سر بیچ کے ذی قدر کو ہاتھ آتا ہے رتبہ　　ہٹتا ہے قدم بڑھ کے تو گھٹ جاتا ہے رتبہ
مر کر نہ ہٹے، قابلِ احسنت وہی ہے
جو کھیت میں سرسبز ہو ساونت وہی ہے

دریا کی طرف پیاس میں تکتے نہیں غازی　　گر شیر بھی جھپٹے تو سرکتے نہیں غازی
تلواروں میں آنکھوں کو جھپکتے نہیں غازی　　بجلی بھی گرے گر تو بھڑکتے نہیں غازی
دم ہونٹوں پہ آئے تو شجاعت نہیں جاتی
مرنے پہ بھی چہرے کی بشاشت نہیں جاتی

ہاں صدقے گئی گھاٹ پہ دریا کے نہ جانا　　پانی کی طرف پیاس میں گھبرا کے نہ جانا
ساحل پہ کبھی ٹھنڈی ہوا کھا کے نہ جانا　　بھاری ہو تو رہواروں کو گرما کے نہ جانا
ایسے تو ہیں جو سب مجھے محجوب کر دیں گے!
میں دودھ نہ بخشونگی جو پیاسے نہ مروگے

بھائی کسی ہنگام بھی بھائی کو نہ چھوڑے　　دونوں میں کوئی عقدہ کشائی کو نہ چھوڑے
اک بھائی لڑے بڑھ کے جو ہاتھ ایک کا تھک جائے　　بلوہ جو بھرا سپر ہو تو یہ بڑھ کے لپک جائے
ہاتھوں میں صفائی ہو کہ بسمل بھی پھڑک جائے　　گر صف ہو تو پسپا ہو، پہاڑ ہو تو سرک جائے
حملوں میں سب انداز ہوں خالق کے ولی کے
پہچان لیں وہ سب کہ نواسے ہیں علی کے

اس جنگ کا چرچا سحر و شام رہیگا　　دنیا میں اگر تم نہ رہے نام رہے گا

ایک اور مرثیہ میں اسی موقع پر حسب ذیل طریقہ سکھاتی ہیں ؎

فوجوں کو مرے دودھ کی تاثیر دکھانا　　دادا کی طرح جوہر شمشیر دکھانا
مظلومیتِ حضرتِ شبیر دکھانا　　تن تن کے یداللہ کی تصویر دکھانا
تلوار اگر لاکھ چلے سر نہ نہ مڑے ہو　　جو سامنے آجائے وہ اک وار میں دو ہو

دم ہونٹوں پہ آ جائے اگر پیاس کے مارے غش کھا کے جو گر جاؤ بھی تو دریا کے کنارے
پانی کو ترستے رفقا مر گئے سارے یہ آبِ رواں بند ہے ماموں پہ تمہارے
تلواریں ہیں، موجوں کی روانی نہ سمجھنا
دریا ہے لہو کا اسے پانی نہ سمجھنا

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک زبردست اور تجربہ کار سپہ سالار اپنے نوجوان سپاہیوں کو کسی عظیم الشان معرکۂ جنگ کے لیے جوش دلا رہا ہے۔ وہ صرف خطرناک حملہ ہی کا حکم نہیں دیتا، بلکہ اپنے کمزور مخاطبوں کو اُنکے نامور اسلاف اور بہادر افراد کے کارنامے یاد دلا دلا کر اُنکی ہمت بڑھاتا ہے اور ساتھ ہی انکی ناتجربہ کاری کا بھی اُسے علم ہے۔ اس لیے وہ دوران تقریر میں نہایت خلوص اور محبت کے ساتھ اُنکو نصیحتیں بھی کرتا ہے تاکہ وہ اسرار فتحمندی سے واقف ہو جائیں۔ حضرت زینب اپنی قومی اور خاندانی روایتوں کے مطابق اپنے بچوں کو نام آوری کے لیے آمادہ کرتی ہیں اور اس جوش و طنطنہ سے فرماتی ہیں کہ ؎

جعفر سے نمودار کے دلبر ہو، دلیرو! حیدر سے دلاور کے دلاور ہو دلیرو!
جرار ہو، کرار ہو، صفدر ہو، دلیرو! ضرغام ہو، ضیغم ہو، غضنفر ہو، دلیرو!
تیروں سے جوانوں کے جگر توڑ کے آؤ
خیبر کی طرح کوفے کا در توڑ کے آؤ

خندق کی لڑائی کی طرح جنگ کو جھیلو بچے اسد اللہ کے ہو، جان پہ کھیلو
تیغوں میں دھنسو، چھاتیوں سے تیر کو ریلو کوفے کو تہ تیغ کرو شام کو لے لو
دو اور جلا آئینۂ تیغ عرب کو
لو روم کو قبضے میں تو قابو میں حلب کو

خاقاں کا رہے تخت نہ قیصر کا رہے تاج ہاں غازیو چین و حبش و زنگ سے لو باج!
چڑھنا ہے لڑائی پہ جوانمردوں کا معراج گیتی تہ و بالا ہو وہ تلوار چلے آج
میلے نہ ہوں تیور، یہ سپاہی کے ہنر ہیں ... جھکے ہیں ... ہیں اُدھر ہیں
... خون میں ڈوبے ہیں گئے خون میں تر ہیں ... صحبت ... ... سپر ہیں
وہ اور کسی سے نہ جھکیں گے نہ جُھکے ہیں
عزت میں نہ فرق آئے کہ سر نیچے جھکے ہیں

عون و محمد کی لڑائی کا بیان میرانیس کے رزمیہ کارنامہ کا ایک جزو لاینفک ہے جسکے بغیر انکی رزم نگاری مہتم بالشان نہیں کہلائی جا سکتی۔ حضرت زینب دم بدم بیٹوں کی جنگ کی خبریں منگاتی ہیں اور جب معلوم ہوتا ہے کہ وہ مستقل مزاجی سے لڑ رہے ہیں تو ؎

سنکر یہ بیاں شاد ہوئیں زینب خوشخو
پر جوشِ محبت سے رہا دل پہ نہ قابو
ہر بی بی سے ارشاد کیا پونچھ کے آنسو
میدان سے سرکے نہیں اب تک مرے گلرو
لاکھوں سے لڑے تشنہ دہن کام کیا ہے
سنتی ہوں کہ چھوٹے نے بڑا نام کیا ہے

آخر کار دونوں لڑکے ایک تہلکہ انداز لڑائی کے بعد جان دیدیتے ہیں۔ اور جب ماں کو انکی شہادت کی خبر ہوتی ہے تو بجائے آہ و زاری کے ؎

یہ سنتے ہی قبلے کی طرف جھک گئیں زینب
سجدے سے اُٹھیں جب تو کہا شکر ہے یارب
طالب تھی میں جس کی وہ بر آیا مرا مطلب
سب مٹ گئے دھڑکے کوئی تشویش نہیں اب
مٹنے سے محمدؐ کی کمائی کو بچالے
سب قتل ہوں پر تو مرے بھائی کو بچالے

کس منہ سے ترا شکر کروں بار خدایا
تو نے مرے دو بچوں کو پروان چڑھایا
گر بیاہ فلک نے نہ دکھایا، نہ دکھایا
جو مرتبہ اعلیٰ ہے شہادت ہے وہ پایا
عالم میں جو دُکھ انکے لیے سینے بھرے ہیں
تو رحم کر ان پر کہ یہ مظلوم مرے ہیں

اور جب دوسری عورتوں کی آہ و زاری دیکھتی ہیں تو حضرت زینب صابر اور مستقل مزاج زینب! تعجب کرتی ہیں کہ یہ کونسی بڑی اور نئی بات ہوئی ہے جسکے سبب سے اسقدر کہرام کی ضرورت ہے۔ چنانچہ تمام بیویوں سے مخاطب ہوکے کہتی ہیں ؎

باپ ان کا اگر ہوتا تو وہ سر نہ کٹاتا؟
زہرا کے کلیجے کے عوض برچھیاں کھاتا
بیٹوں کو یوں ہی میری طرح نذر کو لاتا
دیتے کوئی محسن کو نہیں دل سے بھلاتا
جو پاس ہے جسکے وہ عطا کے شہِ دیں ہے
کہدے مرے ماں جائے کا حق کسپہ نہیں ہے؟
بیٹوں سے ہوئی گر تو ہوئی آج جدائی
سر پر مرے دنیا میں سلامت رہے بھائی

اک دولتِ اولاد؛ لٹائی تو لٹائی کیا لٹ گیا وہ کون سی ایسی تھی کمائی؟
کیا دونوں میں دنیا میں جو دلبند نہیں ہیں
کیا اکبر و اصغر مرے فرزند نہیں ہیں؟

ایثار و محبت کی بھی ایک حد ہوتی ہے! حضرت زینب کی تشفی کے لیے یہی بہت کافی ہے کہ امام حسین، اکبر اور اصغر ابھی زندہ ہیں جن کی موجودگی میں ہاتمی صف کا نام تک لینا انھیں ناگوار گذرتا ہے۔ چنانچہ یہ بھی وہ مقام ہے جہاں انیس نے اپنے رموز دانِ فطرت ہونے کا ثبوت دیا ہے ؎

چلائیں ارے چپکے رہو غل ہے یہ کیسا! بھائی ہیں سلامت مجھے کیوں دیتے ہو پرسا؟
ہے ہے نہ کرو ماجوا گھبرائیں گے شبیر پھر کوئی ہے زینب کا جو مر جائیں گے شبیر؟
تم روتے ہو کس واسطے؟ میں تو نہیں روتی داماں مژہ بھی نہیں اشکوں سے بھگوتی؟
دل ہوتا جو ایسا ہی تو کیوں بیٹوں کو کھوتی؟ دولت کوئی ماں جائے سے پیاری نہیں ہوتی
قائم رہے اقبال محمدؐ کے خلف کا
بس نام بھرے گھر میں نہ لو ہاتمی صف کا

امام حسین اور علی اکبر دونوں لاشوں کو میدان جنگ سے خیمہ میں لے آتے ہیں تو حضرت سب سے پہلے بھائی سے انکی لڑائی کے متعلق دریافت کرتی ہیں۔ اور جب امام حسین سے ان کی بہادری اور جرأت کی بیحد تعریف سنتی ہیں تو انکی اسکے بعد کی حالت کا انیس نے اس طرح نقشہ پیش کیا ہے ؎

یہ سنتے ہی سرخی سی لب زرد پہ آئی حضرت سے کہا آپ کا صدقہ ہے یہ بھائی
کونین میں عزت مرے دلبندوں نے پائی اب شاد ہوئی ان سے ید اللہ کی جائی
آقا! مجھے پیار آتا ہے اقبال پہ انکے
بیکس ہیں خدا رحم کرے حال پہ انکے

آخر ماں ہی ہیں۔ اب انکا دل بھر آتا ہے۔ جب لوگ اٹھ ... بیدار کے لیے بڑھتے ہیں تو انکی نسائیت کی سوتیں ایک دم ابل پڑتی ہیں۔ تا ...

فرمایا میں ... بچوں کی لاش پر
آنچ آتا کی دل کو جلاسنے تو کیا کروں؟

گر فرق میرے صبر میں آئے تو کیا کروں؟

بس سُن چکی کہ نام کیا خوب اُڑ چکے لاشوں پہ لاشیں لوٹ چکیں، کھیت پڑ چکے
کنبہ تمام ہو چکا، دو گھر اُجڑ چکے گودوں میں جو پلے تھے وہ بچے بچھڑ چکے

اب ان کا غم نہ فکر مرے گھر کی چاہیے
بی بی سلامتی علی اکبر کی چاہیے

روؤں گی میں تو پھر علی اکبر بھی روئینگے صدمہ مجھے یہ ہے کہ برادر بھی روئینگے

لیکن جب بچوں کی لاشوں کو دیکھتی ہیں تو بیہوش ہو جاتی ہیں۔ آخر صبر کی کوئی حد بھی ہے! انسان، پھر عورت اور وہ بھی وہ جسکے دونوں بچے اسکی آنکھوں کے سامنے مارڈالے گئے ہوں، اگر متاثر ہوئے بغیر رہ سکے تو فوق الفطرت بات ہوگی! کس قدر صحیح اور پاکیزہ نقشہ پیش کیا ہے کہ حضرت زینب کو جب ہوش آتا ہے تو اُنھیں اپنے بچوں کے کفن دفن کی فکر نہیں ہوتی بلکہ ؎

ہوش آیا تو اکبر سے کہا "رانڈوں کو سمجھاؤ "ہے ہے نہ کرو صاحبو! اک لحظہ ٹھہر جاؤ"
عباس کی زوجہ سے یہ بولیں کہ "ادھر آؤ کیا روتی ہو کپڑے علی اکبر کے بدلواؤ"

! تو ہیں کدھر، آہ یہ کیا بیخبری ہے
سب خوں سے مرے لال کی پوشاک بھری ہے!

ایثار، اور محبت کی انتہا ہے کہ اپنے بچے تو مرے پڑے ہیں، لیکن زینب کو علی اکبر کی فکر لگی ہوئی ہے۔ اُنھیں یہ بُرا معلوم ہوتا ہے کہ بن بیاہے علی اکبر نے انکی لاشیں کیوں اُٹھائیں؟ انکی نسائیت کا اقتضا تھا کہ اس موقعہ پر وہ عورتوں کے عام اوہام سے بَری نہ ہوتیں۔ چنانچہ اسوقت اُنھیں ایک معمولی عورت کی طرح وسواس ہوا مگر یہ وسواس بھی ایک گہری محبت کا نتیجہ ہے ؎

زینب نے کہا کیوں نہ مجھے وسواس نہ آئے ہے ہے علی اکبر اسے کیوں گود میں لائے؟
لوگو! مرے پیارے نے بڑے رنج اُٹھائے صدقے یہ پھوپی لاش کے لے آنے کے جائے

دو دو زخم وہ سر پر وہ تشنہ دہاں ہے
اس بوجھ کی طاقت مرے بچے میں کہاں ہے

ان دونوں نے گر جان گنوائی تو گنوائی ہے ہے بیاہے مرے لال نے کیوں لاش اُٹھائی
میں ماں ہوں نہ کیوں رنج ہو یہ بات ہے بجا اکبر مری اٹھارہ برس کی ہے کمائی

دل سے نہ یہ داغِ الم و یاس مٹے گا
عدہ تہ اب اُتاروں گی تو وسواس مٹے گا

حضرت زینب امام حسین کے بچوں (بالخصوص علی اکبر) کی عاشقِ زار تھیں، اور اس قدر محبت کرتی تھیں کہ اکبر کا رونا تک اُنھیں پسند نہ تھا۔ اپنے ہر کام میں وہ علی اکبر کا لحاظ رکھتی تھیں۔ جب نیا چاند نکلتا تو وہ پہلے ان ہی کا چہرہ دیکھتی تھیں۔ اپنے بچوں اور شوہر کو بھی ہمیشہ انکا خادم سمجھتی تھیں۔ ایسی صورت میں وہ کب گوارا کر سکتی تھیں کہ علی اکبر عون و محمد کی لاشیں لے آئیں؟

یہاں تک تو انیس نے حضرت زینب کو ایک عربی شکل میں پیش کیا ہے۔ اسکے بعد جب بین شروع ہو جاتے ہیں تو وہ میر انیس کے لیے ایک ہندی عورت بن جاتی ہیں۔ اور چونکہ مرثیوں کی ظاہری کامیابی کے لیے اس عنصر کا شامل کرنا لازمات سے تھا، اس لیے انیس نے اس سے خاطر خواہ کام لیا ہے۔ اور اگرچہ اس امر میں وہ بعض جگہ جادۂ اعتدال سے متجاوز ہو گئے ہیں، لیکن یہ کوئی بڑا نقص نہیں ہے کہ صرف اسکی وجہ سے انکے شاندار شہ کاروں کی حقیقی قدر و منزلت میں کسی قسم کی کمی واقع ہو سکے۔ ان الحسنات یذہبن السیأت۔

سید محی الدین قادری زورؔ

واردات قلب

ہے آرزو کہ جلوۂ جاناں نہ دیکھیے
روشن جبینِ یار سے کاشانہ دیکھیے

چھٹ جائے جامِ ضبط نہ پھر ہاتھ سے کہیں
مستِ شرابِ شوق ہے دیوانہ دیکھیے

منزل کا ہوش کچھ ہے نہ ہے راہ کی خبر
لیجائے کس طرف دلِ دیوانہ دیکھیے

کسکے جمال سے چمک اُٹھے ہیں بام و در
کس سے ہوئی ہے رونقِ کاشانہ دیکھیے

رنگین جوشِ گل سے ہے پھر دامنِ بہار
پھر کہہ رہا ہے کچھ دلِ دیوانہ دیکھیے

لایا تو ہے نکال کے اُس بزم سے مجھے
لیجائے اب کہاں دلِ دیوانہ دیکھیے

لیکر نگاہِ شوق میں اُجلی ضیائے حسن
ہر ہر قدم پہ جلوۂ جانانہ دیکھیے

ذروں کو اک نظر میں گلستاں بنائیے
ملجائیں پھ [illegible] سانہ دیکھیے

نکلے نہ شانِ حسن میں اک آن تک [illegible]
[illegible]

مروائی

بیانِ واقعہ

شاعری نام ہے جذبات کی موزونی کا ۔۔۔ اور باقی مرے دل میں کوئی جذبہ ہی نہیں
میری اُس نظم کا مقطع ہے جو "وجہِ خموشی" کے عنوان سے ۱۹۱۴ء کے کسی نمبر میں درج الناظر ہو چکی ہے اور جسکے بعد سے میں ادبی دنیا سے بتدریج کنارہ کش ہوتا چلا گیا۔ غزل میں یوں بھی شاذونادر ہی کہتا تھا، اس ترکِ فکر کے بعد پھر کیا نوبت آتی، ۱۹۲۵ء کے دسمبر کی آخری تاریخوں میں جبکہ دورۂ دیہات پر تھا، ایک دلفریب شام کی لطافتِ منظری نے میرے سکوتِ شعری کو ۱۱-۱۲، سال بعد نطقِ تغزل میں منتقل کر دیا اور حالتِ بیاختگی میں میری زبان سے نکلا ؎

تیرے دیوانے بھی ہیں منتظرِ فصلِ بہار ۔۔۔ ہاتھ ڈالے ہوئے بیٹھے ہیں گریبانوں میں

جی چاہا، لکھوں، اب قلم کی دوسری گردش کا نتیجہ یہ تھا ؎

میری فردوس نگاہی بھی ہے تزئینِ جنوں ۔۔۔ کہ گلستاں ہی گلستاں ہیں بیابانوں میں

پھر فوراً ہی زبان پہ آیا

ہیں قدح خوار ترے مستِ الستِ ساقی ۔۔۔ مئے وحدت ہے چھلکتے ہوئے پیمانوں میں

آخرکار غزل مکمل ہو گئی، جو الناظر کے جنوری نمبر میں اشاعت پذیر ہو چکی ہے، اسکے بعد طبیعت جو متوجہ ہوئی، غزل گوئی کا سلسلہ چل گیا، جو دوست بھی فرمایش کرتے ہیں اُنکے رسالہ یا اخبار کے لیے غزل عرض کی اور پیش کر دی، ایڈیٹر صاحب مرقع کے خط کا جواب لکھنے بیٹھا، اُسی ضمن میں ایک غزل بھی کہہ گیا، عباس کی خیریت معلوم کرنا چاہی، آخر میں قوم کے لیے غزل بھی درج کر دی، ساغر صاحب کو ایک خاص معاملہ میں چٹھی لکھی پیمانہ کے لیے غزل بھی رکھ دی، غرضکہ میری ادبی زندگی کے دورِ جامہ بازی میں "فصلِ بہار کے منتظر دیوانوں" کا شعر ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے، جسکو پڑھنے کے ساتھ ہی سب سے پہلے میرے چھوٹے بھائی محمد عمر شوکت تھانوی نے مجھے لکھنؤ سے خط لکھا کہ رسالہ نقاد کا پُرانا فائل دیکھ رہا تھا، جناب جلیل کی غزل نظر پڑی جسکا ایک شعر یہ ہے

منتظر موسمِ گُل کے ہیں ترے دیوانے ۔۔۔ ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھے ہیں گریبانوں پہ

لہذا الناظر میں جو آپ کی تازہ غزل شایع ہوئی ہے اُسکا چوتھا شعر اپنی بیاض میں سے حذف کر دیجیے میں نے جواب دیا، آخر کیوں ؟ اگر جلیل القدر نے مجھ سے پہلے اسی مضمون کو انھیں الفاظ میں ادا

کر دیا ہے، تو صرف یہ وجہ میرے لیے اس شعر سے دست بردار ہو جانے کے واسطے کافی نہیں اُستادِ نظام ہی اپنا شعر کیوں نہ کاٹ ڈالیں، اور میری فکر ما بعد کو اپنے سے مقدم تصور فرمالیں اُنکو اگر اپنی قوتِ سخنگوئی پر اعتماد ہے تو مجھے بھی اپنے کلام سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کی طرف سے یہ سوظنی نہیں ہے کہ میری نسبت توارد سے زیادہ کوئی دوسری بدگمانی کریں گے"۔

اس موقع پر ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا، دو مہینے ہوئے میں لکھنؤ میں تھا، ایک پُرلطف صحبت میں حضرت وصل بلگرامی کے یہاں بسبیل تذکرہ مولانا عبدالباری آسی نے مجھ سے پوچھا کہ "سازِ عشق، نازِ عشق"، کوئی غزل بھوپال میں سُنی ہے؟ میں نے کہا، منشی سراج میر خاں صاحب سحر وہاں ایک مشہور اُستاد گذرے ہیں، اس زمین میں اُنکی ایک غزل بہت مشہور ہے، اور اُنھیں سے سُنے ہوئے یہ تین شعر مجھے بھی یاد ہیں :-

سینہ میں دل ہے دل میں داغ، داغ میں سوز و سازِ عشق
پردہ بہ پردہ ہے نہاں پردہ نشیں کا رازِ عشق

باندھ کے صف ہوں سب کھڑے، تیغ کے ساتھ سر جھکے
آج تو قتل گاہ میں دھوم سے ہو نمازِ عشق

فرش زمیں پہ مصطفےٰ، عرش بریں پہ کبریا!
پہونچا ہے دیکھنا کہاں سلسلۂ درازِ عشق

میرے اس بیان پر جرح ہونے لگی، کب سے بھوپال میں ہو؟ کیا خود سحر صاحب نے یہ شعر سُنائے تھے؟ کس جگہ پڑھے گئے تھے؟ وغیرہ۔ میں متعجب تھا اور جواب دینے پر مجبور، کہا، ۱۹۰۵ء سے وہاں مقیم ہوں، تقریباً ۱۵ سال ہوئے۔ شہید ٹونکی کے منعقدہ مشاعرہ میں غیر طرح کلام کی فرمائش متواتر پر "سحر مرحوم" نے خود یہ غزل پڑھی تھی، اور مدتِ دراز تک شہر بھوپال میں بچہ بچہ کی زبان پر اسکے اشعار رہے، آخر بات کیا ہے؟

جناب اُمید امیٹھوی بھی موجود تھے، فرمانے لگے، قنوج کے مرحوم رسالہ "پیامِ عاشق" میں بیس برس ہوئے یہ غزل میں نے صفدر مرزاپوری کے نام سے طبع ... چونکہ سحر بھوپالی کی شخصیت سے میں بخوبی واقف تھا، اور کسی طرح اُنکی طرف سے ... سلیے خیال ہوا کہ حضرت صفدر سے جو شریکِ بزم تھے اُمید صاحب تفریح فرما رہے ... ہوت کی کوئی انتہا نہ رہی جب وصل صاحب اور حضرت آسی نے بطور امر واقعہ فرمایا کہ صفدر صاحب اس غزل کو اپنی

بتاتے ہیں، اور سفر بھوپال میں جناب وصل ہی غزل مرحوم سحر کے جزوِ کلام کی حیثیت سے سُن آئے ہیں جس کی وجہ سے تنقیحی سوالات ہوئے تھے - میں جناب صفدر کا دیرینہ نیازمند اور اُنکی مشقِ سخن کا معترف ہوں، سحر کی کہنہ مشقی اور مقامی ہر دلعزیزی و کثرتِ تلامذہ سے بھی آگاہ ہوں، پوری غزل کے توارد کی عمر بھر میں یہ پہلی مثال مجھے ملی ہے، ورنہ دو دو، چار چار شعر تو ہر مہینے کسی نہ کسی رسالہ میں مشاہیر قدیم کے جدید کہنے والوں کے نام کے ساتھ دیکھنے میں آجاتے ہیں، ماہ گذشتہ کے رسالہ اُردوئے معلے دہلی میں مولوی محمد اسمعیل مصنف کتب درسی کا مشہور شعر۔

ہم کرتے ہیں عادت کی غلامانہ اطاعت		اصلاح پذیر اسلئے عادت نہیں ہوتی

کسی ثاقب دہلوی کی غزل کے اشعار میں شایع ہوا ہے، ساتھ کے دو اور شعر بھی مشتبہ ہیں۔ اس سے پہلے رسالۂ مذکور کی ایک غزل "جبیں کا، حسیں کا" والی زمین میں حضرت شوق قدوائی مرحوم کی مشہور غزل کا یہ شعر بہ اندک تغیر موجود تھا۔

روزن کریں نالے مرے تو کیوں وہ خفا ہوں		مر رہ ہوا جاتا ہے ہوا دار اُنھیں کا

صرف ردیف بدلدی گئی ہے۔ شوق صاحب بھی خوب فرماتے ہیں

لب کیوں نہ ہوں باتوں میں طرفدار اُنھیں کے		پروردہ اُنھیں کے ہیں نمکخوار اُنھیں کے

اس سے تو ہمیں کاش وہ گھر ہی میں بُلالیں		کہلاتے ہیں یوں بھی پس دیوار اُنھیں کے

لطف یہ ہے کہ میں نے ایڈیٹر صاحب کو خط لکھکر اس طرف متوجہ بھی کیا تھا مگر اُنھوں نے التفات نہ فرمایا، بلکہ اس سلسلہ میں ایک صاحب سے ذکر آیا تو کہنے لگے کہ آپ تو مضمون نگار کے دو ایک اشعار ہی کو کہتے ہیں، رسالۂ مذکور کے "مدیر اعزازی" خود اکبر حیدری صاحب پر یہ الزام عائد کیا جا رہا ہے کہ اُنکے بقول خویش ایک کامیاب غزل ؎

شمع میں اک سوز تھا اک ساز پروانے میں تھا		کس کا عنوانِ محبت کس کے افسانے میں تھا

جو پہلے "پیمانہ" میں شایع ہوئی، اور پھر خاص طور پر اُردوئے معلے میں نقل کی گئی ہے لکھنؤ کے کسی خوش دماغ کی فکر کا نتیجہ ہے، اور کسی دوسری پوری غزل کے کوئی مالک صاحب دعویدار ہیں واللہ اعلم بحقیقۃ حال۔

اسی سفر لکھنؤ میں یہ معلوم ہوا تھا، کہ صفدر مرزاپوری اور کسی لکھنوی شاعر کے مابین ایک اور غزل بھی ما بہ النزاع ہے جو بہ یک وقت دو شاعروں (شاید اُناؤ اور لکھنؤ) میں اپنے اپنے نام سے ہر دو صاحبان نے پڑھی، اور اب اُس کا مجمع احباب میں چرچا ہے، گذشتہ سال کسی

بہزاد لکھنوی نے منشی نوبت رائے نظرؔ آں جہانی کا کلام زمانہ وغیرہ میں اپنے نام سے چھپوانا شروع کر دیا تھا، مگر راز جلد ہی افشا ہو گیا، اور یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔

"بہرِ خدا ہمیں بھی کہیں چھاپ دیجیے" کہنے والوں کی یہ کثرت دیکھکر میرے ایک کاسبِ زر، زمانہ شناس دوست کو خوب سوجھی، اپنے اشتہار میں فرماتے ہیں

"قدیم و جدید رنگ کی غزلیں، نظمیں، عمدہ فسانے، قصائد، قطعات، تاریخیں، غرضکہ تمام اقسام کلام آپ کے نام سے تصنیف کی جا سکتی ہیں، کتابیں لکھی جا سکتی ہیں، ناول تیار ہو سکتے ہیں،..... اور اب تک **ایک ہزار** غزلیں اور نظمیں وغیرہ لکھکر بھیجی گئیں"۔

اور نہایت شد و مد کے ساتھ جلی حروف میں اپنے زیرِ نگرانی شایع ہونیوالے رسالہ کے ٹائیٹل پر مسلسل سال بھر سے اس اعلانِ سخن فروشی کی اشاعت کر رہے ہیں، گمانِ غالب ہے، کامیابی ہوئی ہوگی، "دکان" ادبی و علمی شعبہ نے جو ملکی ضروریاتِ لطیف کی تکمیل کا بہترین ذریعہ ثابت ہوا ہے" کافی معاوضہ حاصل کیا ہوگا۔ صرف نقص ہے تو اس قدر کہ یہ سکھائے پھول دوبارہ نہیں چڑھتے، اور ایسے مصنوعی شاعروں کا بھانڈا کلام سناتے وقت پھوٹ جاتا ہے۔ زیادہ محتاط لوگ جو صرف اشاعتِ کلام پر اکتفا کرتے ہیں، اُنکو بھی "تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے"۔ بالخصوص نسوانی طبقہ اس سودے میں قطعاً خسارہ برداشت کر رہا ہے، اور کوئی غیر شاعرہ خواہ کتنا ہی "میں شاعرہ ہوں" کی تکرار کرے، لیکن اس کا حقیقی موضوعِ شعریت جمالِ پنہاں نہیں رہتا، اور نگاہیں پردہ زنگاری کے اندر پہونچے بغیر نہیں رہتیں، پھر بھی یہ فیشن ایبل دوکان اُن پرانی قسم کے شعر فروش وضعداروں سے بہتر طریقہ پیدا کر سکتی ہے، جن کے تقاضائے قیمت کی بھونڈی اور فرسودہ ترکیبیں" اصلاحِ سخن" کے ریویو، منجملہ الناظر ماہِ گذشتہ سے منظرِ عام پر آگئیں جیسا کہ ہیے ناظرین کو منشی امیر احمد صاحب علوی کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

اسی نمبر کے "نظر سے خوش گذرے" میں اڈیٹر صاحب نے اپنے کرم فرمائے دیرینہ قاضی غلام امیر صاحب بدایونی کے خط کا اقتباس دیکر مجھ سے خواہش فرمائی ہے کہ "[illegible] ان تو موصوف کے اندیشہ [illegible] وضاحت کیکے رفع کر دوں" قاضی صاحب مجھ سے [illegible] غیر ضروری مگر صحیح [illegible] اظہار فرماتے ہوئے میری غزل مطبوعہ جنوری نمبر کو" بلحا [illegible] ست مضامین [illegible] بلند درجہ" دیتے ہیں اور متوارد شعر کو "خاص تحسین" کا مستحق قرار دیکر با [illegible] سرِ بیل اڈیٹر صاحب سے تحریک کی ہے کہ "ارشد صاحب سے پوچھیے! ایسی حالت میں اسے توارد کہیں گے یا اس سے بڑھکر

بڑھ کر کچھ اور کہنا چاہیے ؟

موجودہ لیل و نہار میں جی تو یہی چاہتا ہے کہ اس "کچھ اور" میں قاضی صاحب نے جو مفہوم پنہاں رکھا ہے، اُسکا علی الاعلان اعتراف کرلیا جائے۔ لیکن میں قاضی صاحب کو فن شعر کا ماہر اور ایک ممتاز ادیب سمجھتا ہوں، گو صورت آشنا نہیں ہوں لیکن بحیثیت شاعر کے سنہ ۱۹۱۰ء سے واقف ہوں، جبکہ اُنھوں نے اپنی غزل

شور تھا وسعتِ دامانِ قیامت کا امیر[۵]
بڑھ کے دیکھا تو مرا چاک گریبان نکلا

بھوپال کے اُس مشہور مشاعرہ کے لیے بھیجی تھی، جسکو میں نے قیصر بھوپالی اور سرور بدایونی نے خاص اہتمام سے منعقد کیا تھا، اور بیرونی شعراء میر نیرنگ و ڈاکٹر اقبال وغیرہ نے مخصوص طور پر اُسکے لیے غزلیں کہی تھیں۔ پس میں قاضی صاحب کے ذوقِ سلیم پر اسکا انحصار رکھتا ہوں کہ زیر بحث شعر کیا غزل کے بقیہ اشعار کچھ بہت زیادہ بلند اور ممتاز ہے، اور کیا ایسی غزل جو بلحاظ بندش الفاظ و سلاستِ مضامین بلند درجہ رکھتی ہو، اُس کا کوئی شعر اگر "خاص تحسین" کا مستحق قرار پائے، تو کیا رفتارِ تخیل و طرزِ بیان کی یکرنگی بھی اُس میں سے مفقود ہو جاتی ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو قاضی صاحب کی سوءظنی اس حد تک نہ پہونچنا چاہیے تھی کہ دوسرا ہم مضمون شعر دیکھ کر بجائے توارد کے وہ "کچھ اور" کہنے کی خواہش اپنے قلب میں پیدا فرمالیتے۔ قاضی صاحب مولانا ظفر الملک کے کرمفرما ے دیرینہ ہیں، آغاز اجرائے یقیناً الناظر اُن کی خدمت میں جاتا ہے، میری معدودے چند نہیں بلکہ کثیر التعداد نظمیں الناظر میں چھپی ہیں، نہ بھی دیکھنا چاہا ہوگا تب بھی کافی طور پر میرا کلام اُنکے پیش نظر ہوتا رہا ہوگا، اور کچھ نہ کچھ رائے وہ میری نسبت رکھتے ہوں گے، اچھی یا بُری، لیکن یقیناً سارقِ سخن سمجھنے کے لیے کوئی مواد اُنھیں نہ ملا ہوگا، ورنہ موجودہ اندراج کی طرح پہلے بھی صفحات الناظر اُن کے لیے موجود تھے، ایسی صورت میں قاضی صاحب کی بدگمانی "ظن المومنین خیرا" کے تحت میں نہیں آتی، اور اُنھیں صحیح طور پر باور کرنا چاہیے، کہ یہ شعر کیا باعتبار الفاظ اور کیا باعتبار معانی تمام تر میرا ہے۔

اگر حافظ جلیل حسن صاحب کی غزل میں نے دیکھی ہوتی، تو ممکن تھا کہ اُنکے شعر کے مفہوم کو دماغ محفوظ کرلیتا، اور عرصۂ دراز کے بعد جب حافظہ سے اُنکے شعر کی ترتیب لفظی محو ہو جاتی تو فکر سخن کے

---

[۵] یہ شعر قاضی صاحب کا نہیں ہے، بلکہ بدایوں کے ایک دوسرے رئیس جناب امیر احمد صاحب امیر کا ہے جو آل انڈیا اُردو کانفرنس بدایوں کے سکرٹری تھے۔ ایڈیٹر

وقت یا یوں ہی اتفاقیہ طور پر اس شعر کا مضمون میرے طرزِ ادا میں صورتِ موزونی اختیار کر لیتا، اس صورت میں البتہ شعرِ جلیل میرے تنبہ کا باعث ہو سکتا تھا، خود بخود حافظہ سب کچھ یاد دلا دیتا۔ لیکن جب حقیقت یہ نہ ہو تو میں اپنے زادۂ طبع کو کیوں ضایع کروں۔ فطرت خود اس توارد کی مرتکب ہوتی رہتی ہے، اور مخلوقات میں بہت زیادہ مثالیں اسکی پائی جا چکی ہیں۔ مگر یہ ایک اصولی بحث تھی، ورنہ حقیقتاً یہ شعر مجھے کچھ زیادہ عزیز نہیں اور نہ اس قدر فرصت کہ میر و غالب کے کلام سے اساتذۂ سلف کے افکارِ عالیہ کا مقابلہ کر کے اپنی تائید میں ثبوتِ توارد فراہم کروں۔ اور "پیشہ ور شاعر" نہ ہونے کی وجہ سے اندیشہائے باطل کے عدم دفعیہ کی صورت میں میرا کوئی نقصان نہیں، میری نظمیات کا موضوع بیشتر میرے سوانحِ حیات ہیں یا پُر لطف اوقاتِ زندگی کے تاثرات، جو دلچسپی احباب کیلیے طبع ہوتے رہتے ہیں، دنیائے سخن میں اپنی شخصیتِ شعری کو نمایاں کرنا مقصود نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس بازار میں یہ متاعِ ارزان پہلے ہی بکثرت موجود ہے، اور میری جنس کاسد کسی ہنگامۂ مزید کا باعث نہیں ہو سکتی۔ پس میرا ذوقِ سخن میرے جذباتِ ذاتی کی تسکین کے لیے ہے اور بہ قول ایک سخنگوے کلکتہ۔۔

وہی کہتا ہوں دل جسکی مجھے تعلیم کرتا ہے نہیں ہے شاعری میری گزشت بیانِ دل

میرے ایک دوست نے جو مجھ سے کہیں زیادہ بہتر کہتے اور لکھتے ہیں، میری ایک محنت سے تیار کردہ مطول نظم کو محض مجھے ستانے کے لیے اپنے نام سے بغیر میرے علم کے شایع کرا دیا، مقصود مجھے برہم کرنا تھا، میں نے مسکرا دیا تو تردید لکھی، اُس کی اشاعت میں نے روک دی، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نظم لاوارث ہو کر رہ گئی۔ وہ ہر شخص سے صحیح واقعہ بیان کرتے رہتے ہیں، اور میں اُنکی تردید۔ اب وہ اس تکلیف میں مبتلا ہیں کہ غلط طور پر ایک چیز اُن سے منسوب ہو گئی، اور میں اُن سے اپنی اذیت دہی کے (صرف اقدام) کا انتقام لے رہا ہوں۔ لیکن جس طرح اُن کا ضمیر شاذی ہے، ہر شخص اتنا ذی حس نہیں ہوتا۔ ۱۹۲۵ء میں "بے ماں کی بچی" کے عنوان سے میری ایک نظم رسالہ الحجاب میں نکلی تھی، دو تین سال بعد ریاستِ میسور کی کسی شہرت طلب خیر النساء نے اُسے ... نام سے صرف عنوان بدل کر اخبار پھول میں شایع کرا دیا، ایک مناجات جو الناظر میں ... میرے مجموعۂ نظم "حسنِ تخیل" کے شروع میں درج ہے، رحیم النساء کی طرف ... لاہور میں نکل چکی ہے، پروفیسر نیچ رام صاحب ایم اے نے گزشتہ سال مجھ سے ... لیے لکھی گئی تھیں، طلب فرمائیں، میں نے بھیج دیں، ایک نظم کے متعلق اُنھوں نے پوچھا کہ یہ واحد یار خاں صاحب کے

نام سے فلاں رسالہ میں کیوں چھپی ہے، میں اس کا کیا جواب دیتا، آگرہ کے رسالہ "عزیز" کے لیے وہ نظم لکھی گئی تھی اور اُسی میں چھپی بھی تھی۔ سب سے زیادہ مزیدار واقعہ ۱۹۱۶ء میں سیر بمبئی سے واپسی کے وقت پیش آیا۔ حیدرآباد سے آنے والے ایک یوسف حسین صاحب عزم منماڈ جنکشن پر میرے رفیقِ سفر ہوئے۔ مبادیاتِ تصادم کے بعد شعراء کے رسم قدیم کے مطابق سننے سنانے کا سلسلہ چلا، فرمانے لگے، مطلع عرض ہے

اعتبارِ زندگانی کچھ نہیں   کچھ نہیں دنیائے فانی کچھ نہیں

میں نے کہا، سبحان اللہ یہ تو آپ کی مشہور غزل ہے جو مجھے بھی حفظ ہے

صبحِ پیری ہنس رہی ہے آڑ میں   منتظرِ شام جوانی کچھ نہیں
بول کچھ تو اے لبِ گورِ غریب   یہ زبانِ بے زبانی کچھ نہیں

ٹوک کر بولے، آپ نے کہاں سنی،

رسالہ العصر لکھنؤ میں کسی تھانوی نے اِس مقطع کے ساتھ اپنے نام سے چھپوائی تھی

ہستیِ بے مدعا ارشد ہوں میں   شعر کے میرے معانی کچھ نہیں

مجھ سے یہ جواب سُن کر بیساختہ فرمایا، یہ مقطع ہرگز میرا نہیں ہے۔ میں نے کہا جبھی تو حیرت بھی ہے۔ آپ نے کیا فرمایا تھا؟ اس پر وہ کچھ پریشان سے ہوگئے، اور بمشکل بولے 'اسوقت ذہن میں نہیں رہا۔ مگر صاحب سچ یہ ہے کہ لوگ بھی غضب کرتے ہیں۔

اب مجھ سے ضبط نہ ہوا، اور ہنسی آنی شروع ہو گئی، جس پر وہ کھسیانے ہوگئے۔ اور بات ٹال کر کہنے لگے، معاف کیجیے گا، جناب کا اسم گرامی؟ میں نے کہا ارشد تھانوی۔

اُف۔ ناظرین سمجھ گئے ہونگے کہ "عزم" صاحب کی شدتِ ندامت سے کیا کیفیت ہوئی ہوگی مگر واقعہ یہ نہیں، اُنھوں نے جو کچھ کہا، میں ہرگز اُس کا متوقع نہ تھا۔ بولے، اچھا تو آپ ہی نے میری غزل اپنے نام سے چھپوائی ہے۔

کاش دوسرے مسافر ہمارے ہم ذوق ہوتے، وہ اس گفتگو کو سنکر میری اُسوقت کی حالت کا صحیح اندازہ کرسکتے تھے۔ مگر ذرا سے تامل کے بعد راز میری سمجھ میں آگیا۔ غریب عزم نیک نیت تھا، اور ارتکاب سرقہ سے قطعاً بری۔ یقیناً اُس نے کسی دوست سے فرمائش غزل کی، قیاس کہتا ہے، وہ اِن سے زیادہ طباع تھے، العصر سے غزل نقل کرکے حضرت کو دیدی۔ اب سادہ لوح شاعر کو کونی قوت دادِ سخن سے محروم نہیں کرسکتی۔ اگر اُسی وقت میرے ذہن میں یہ مقولہ بھی آجاتا

کہ "شعر گفتن چہ ضرور" تو آج قاضی صاحب کے "حسنِ ظن" کی بدولت غالباً اس قدر قلم فرسائی کی نوبت نہ آتی -

امید ہے کہ سطور بالا اُس بیگانگی کے انسداد کا باعث بھی ہو جائیں گی، جو میری طویل خاموشی کی وجہ سے ناظرینِ الناظر کے دلوں میں پیدا ہو گئی ہے، اور جسکے ازالہ کی طرف برادر محترم مولانا ظفر الملک نے اپنے نوٹ کے آخر میں اشارہ فرمایا ہے

چہ خوش بود کہ بر آید بیک کرشمہ دو کار

ارشد تھانوی

جذباتِ اثر

لاؤں کہاں سے دیدۂ بینا کہیں جسے
تو خود ہی وہ نہیں ہے کہ تجھ سا کہیں جسے

ہر چند اب وہ دل ہے نہ طوفاں طرازیاں
قطرے میں گم ہے وسعتِ دریا کہیں جسے

حیرت نے بے نقاب کیا بزمِ ناز میں
وہ جلوہ رشکِ شعلۂ سینا کہیں جسے

کچھ آج سے نہیں ہوں میں ناکامِ آرزو
دل پہ ہے ایک داغ سویدا کہیں جسے

ٹپکا ہے یادِ عیش گذشتہ میں آنکھ سے
وہ اشک ناب ریزۂ مینا کہیں جسے

وہ دیکھنا کسی کا باندازِ دلبری
میرا سکوت نالۂ رسوا کہیں جسے

پھر گلفروشِ دیدۂ خونابہ بار ہے
اک نوبہار، جانِ تمنا کہیں جسے

افسونِ حسنِ دوست سے عالم میں چار سُو
چھایا ہوا ہے رنگ تماشا کہیں جسے

وجہِ خودی وسیلۂ ترکِ خودی بھی ہے
نیرنگِ ہست و بود کہ دُنیا کہیں جسے

بیتابیوں کی نذر ہوئی انتظار میں
وہ بیخودی کہ شوق کا پردا کہیں جسے

پہلو میں ایک دل ہے سو ویران اسقدر
اہلِ نظر بھی دیکھ کے صحرا کہیں جسے

رنگیں اسی سے دامنِ حسنِ دوام ہے
گو نقش بے ثبات ہے دُنیا کہیں جسے

بسمل گہِ نیاز میں وہ بھی گناہ ہے
اک ا [illegible] تمنا کہیں جسے

چھپتا ہے کب چھپائے سے درد
خاموش اس طرح ہو تماشا کہیں جسے

اثر۔ لکھنوی

شہیدِ صلیب

زرغوزہ، قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ۔ سب ایک ایک کر کے عیسائیوں کے پنجے میں جا چکے ایک بلنیسیہ والے البتہ ابھی لڑے جا رہے ہیں۔ مفتوحہ صوبوں میں مسلمانوں کی حالت دیکھ کر خون خشک ہوا جا رہا ہے۔ اور شکست ہے کہ ہر دم نزدیک تر آتی جا رہی ہے۔ کھلے میدان میں لڑنا دشوار ہوگیا تو بیچارے قلعہ میں بند ہوگئے۔ پھر بھی امان نہ ملی۔ عیسائی لشکر نے بڑھ کر شہر کا محاصرہ کر لیا اور سرنگ لگانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ دن بھر محاصرین سرنگ کھود کر اس میں بارود بھرتے اور رات بھر میں محصورین اندر سے ساری بارود نکال لیتے۔ جب یہ حالت دیکھی تو عیسائی جنرل نے آدھی رات کو بارود میں آگ لگوا دی۔ ایک دھماکا ہوا اور شہر پناہ میں ایک بڑا رخنہ ہوگیا۔ محاصرین کی ٹڈی دل فوج اس طرف بڑھی۔ بلنیسیہ کے حاکم سلیم نے اپنے چند جاں نثار ساتھیوں کے ساتھ موقع پر پہونچ کر اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہا مگر اس طوفان میں نہ ٹھہر سکے اور غلامی سے موت کے خطرے کو بہتر سمجھ کر دشمن کی فوج میں گھسے اور صفیں چیرتے ہوئے نکل گئے۔ باہر نکل کر دم لیا تو سلیم نے اپنے دوستوں سے کہا "میری جان اب خطرے میں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے ساتھ میرے رفقا بھی آفت میں پھنسیں۔ بہتر یہی ہے کہ آپ لوگ اب مجھے تنہا چھوڑ دیں"۔ ساتھیوں نے سلیم کی اس تجویز سے اختلاف کیا، مگر سلیم کے اصرار اور اپنی جان کے خوف سے انھیں جدا ہونا پڑا۔ اور علی الصباح سلیم اپنے دوستوں سے رخصت ہو کر بادلِ ناخواستہ بندر قرطاجنہ کو چل کھڑا ہوا۔

تمام دن پہاڑی علاقوں میں چلتے چلتے تھک گیا تھا۔ تاریکی کے ساتھ سردی بھی بڑھتی جاتی تھی۔ اور سلیم کے پاس اسلحہ اور بدن کے کپڑوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ سامنے کچھ روشنی دکھائی دے رہی تھی اور سلیم جلد جلد قدم اٹھا رہا تھا کہ شاید رات کو آرام کرنے کے لیے کوئی جھونپڑا مل جائے۔ درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ میں ہوتا ہوا نزدیک پہونچا تو دیکھا کہ دو سپاہی ایک تنگ غار کے دہانے پر الاؤ لگا رہے ہیں اور اسکے اندر کمزور اور گھبرائی ہوئی آواز میں کوئی چلا رہا ہے "رحم ..... رحم ..... میں مجبور ہوں ..... جلی ..... جلی ..... آہ ..... پانی ..... پانی!!"

سلیم کے جذبۂ ہمدردی نے جوش مارا۔ اس نے اپنی کمینگاہ سے طپنچہ سر کیا۔ ایک سپاہی تو وہیں ڈھیر ہوگیا۔ دوسرا چونک پڑا۔ ادھر دیکھا، ادھر دیکھا، اور کچھ آہٹ پاکر سلیم پر جھپٹا۔

سلیم نے بھی تلوار سونت لی اور چند منٹ کی سخت جنگ کے بعد اُسے بھی ناک پر سُلا دیا۔ اسکے بعد وہ غار کی طرف بڑھا۔ سُلگتی ہوئی لکڑیوں کو جلدی جلدی ہٹایا تو چاند کی روشنی میں دیکھا کہ ایک حسین لڑکی بیہوش پڑی ہے۔ بڑی مشکلوں سے اُسے باہر نکال کر گھاس پر سلایا۔ دوڑ کر پانی لایا، پلایا، منہ دھویا اور بیٹھ کر دامن سے پنکھا جھلنے لگا۔ بے حس و حرکت لڑکی کے گورے گورے گال لمبے لمبے سنہرے بال، خوبصورت کتابی چہرہ، سرخ پتلے ہونٹ، نازک جسم اور متناسب اعضا نے جادو کا سا اثر کیا، اُسکی آنکھیں اس حسن کی دیوی کی بلائیں لے رہی تھیں کہ لڑکی نے آنکھیں کھولیں، اور ایک نامحرم کی موجودگی سے جھجک کر اُٹھ بیٹھی۔

سلیم مبہوت بیٹھا ہوا تھا، اُسکی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سلسلۂ گفتگو کس طرح چھیڑے۔ تھوڑی دیر کی خموشی کے بعد وہ ہمت کر کے بولا "کیا میں پوچھ سکتا ہوں آپ کون ہیں اور اس مصیبت میں کیسے گرفتار ہوگئیں؟" لڑکی نے نگاہیں نیچی کیے ہوئے جواب دیا "مجھ بدنصیب کو زہرا کہتے ہیں۔ میرے والد عبد الرحمن غرناطہ میں تجارت کرتے ہیں۔ میں اپنی ماں کے ساتھ مراقش کو سیر کو گئی تھی، وہیں اُن کا انتقال ہوگیا۔ آج مہینوں سے والد صاحب کا کوئی خط ہے نہ پتہ۔ میں نے گھبرا کر گھر کا رخ کیا، تاب اندھیرے آگے بڑھی تھی کہ ان بے رحم سپاہیوں نے میرا پیچھا کیا۔ بھاگتے بھاگتے میں ادھر نکل آئی اور اپنی جان بچانے کے لیے اس غار میں چھپ گئی" اتنا کہا اور زار زار رونے لگی۔ سلیم نے بہت دلاسا دیا اور کہا "دل چھوٹا نہ کیجیے۔ خدا مددگار ہے۔ غرناطہ تک میں آپ کو پہونچا دوں گا، لیکن اب یہاں ٹھہرنا بہت خطرناک ہے۔ آئیے ہم اپنا لباس ان مردہ سپاہیوں سے بدل لیں اور فوراً روانہ ہو جائیں"۔

لباس بدل کر زہرا اور سلیم فوراً چل کھڑے ہوئے اور صبح ہوتے ہوتے غرناطہ پہونچ گئے۔ زہرا دوڑ کر باپ کے گلے لپٹ گئی۔ پھر سفر کی صعوبتیں بیان کیں۔ سلیم کا تعارف کرایا اور بڑے اصرار سے کچھ روز قیام کرنے پر مجبور کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ حکومت نے اسلامی زبان اور اسلامی رسوم کو جرم قرار دیدیا تھا۔ مسلمانوں کو قسم قسم کی اذیتیں پہونچائی جاتی تھیں۔ اُن پر طرح طرح کے مظالم توڑے جاتے تھے، ذرا سے بہانہ پر بڑی بڑی جائدادیں ضبط ہوتی تھیں۔ امن پسند رعیت　　تھی اور اُنکے
علمی خزانے شارع عام پر جلائے جاتے تھے۔ مسلمانوں نے بھی سمجھ لیا　　انکو مٹا دینا
چاہتے ہیں۔ بیچاروں نے دول عثمانیہ اور مراقش سے درخواست کی　　ہے۔ فرانس
اور انگلستان سے مدد چاہی، ایک لاکھ آدمیوں کی کمک فراہم کرنے کی امید دلائی　　پروٹسٹنٹ مذہب

اختیار کرنے کا وعدہ کیا، مگر سب فضول۔ آخر انھوں نے لڑ کر جان دیدینے کا تہیہ کر لیا تھا۔ خفیہ طور پر افریقہ سے ہتھیار منگا لیے تھے اور غدر کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔

زہرا کا جذبۂ احسانمندی محبت سے تبدیل ہو گیا۔ وہ سلیم کو دل سے چاہتی، اور اسکا ہر برتاؤ انتہائی محبت سے لبریز ہوتا۔ سلیم اُسی روز گھائل ہو چکا تھا، جب اُس نے زہرا کو موت کے غار سے نکالا تھا، اور اب تو وہ جدائی کے خیال ہی سے کانپ اُٹھتا تھا۔ محبت کی آگ دونوں طرف بھڑک رہی تھی۔ پیار کی نظریں چار ہوتی تھیں، مگر محبت نے الفاظ کا جامہ نہ پہنا۔ بزرگ باپ حسن وعشق کے کرشموں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ ایک دن اُس نے سلیم سے کہا "میری دلی خواہش ہے کہ زہرا کی جان بچانے کے صلہ میں اُسے آپ کے دامن سے وابستہ کر دوں"۔ سلیم نے شرما کر سر جھکا لیا۔

دوسری صبح کو عبدالرحمٰن نے قاضی کو بلوا کر خفیہ طور پر نکاح کی رسم ادا کرادی۔ شادی میں نہ نمائشی ساز وسامان تھا اور نہ بڑی بڑی دعوتیں۔ پھر بھی یہ چھوٹی سی دنیا بھی مسرت سے لبریز تھی۔ مگر افسوس یہ شادی شہاب گل کی طرح مختصر تھی۔ ابھی شام ہونے میں دو گھڑیاں باقی ہونگی کہ پولیس کے چند سپاہی عبدالرحمٰن کے مکان میں گھس آئے۔ دولہا، دولھن، اور اسکے بڑھے باپ کو گرفتار کر لیا۔ چند گھنٹوں کی دولھن دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے اپنے باپ کے پیچھے کھڑی زار زار رو رہی تھی۔ سلیم شیر کی طرح بپھر رہا تھا۔ غصے سے آنکھیں اور رخسارے سرخ ہو گئے تھے۔ عبدالرحمٰن نے سمجھا بجھا کر سلیم کے غصہ کو ٹھنڈا کیا۔ اور سب بلا مزاحمت سپاہیوں کے ساتھ ہو لیے۔

دوسرے دن عدالت مقدسہ میں مقدمہ پیش ہوا۔ جرم یہ تھا کہ عبدالرحمٰن نے قانون رائج الوقت کے خلاف اپنی لڑکی کی شادی میں اسلامی رسوم ادا کیے۔ عبدالرحمٰن نے بلاپس وپیش اقبال جرم کر لیا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اُس نے ایسا نہ کیا تو تیل میں بھیگے ہوئے کوڑے اور لوہے کی گرم گرم سلاخیں اُسے ایسا کہنے پر مجبور کر دینگے۔ اس راست گوئی کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا، یعنے تمام جائداد منقولہ وغیر منقولہ بحق کلیسا ضبط کر لی گئی۔

زہرا اپنے حسن کے لیے "نادرِ غرناطہ" کے نام سے مشہور تھی، اور اپنی نسوانی خوبیوں سے اہل غرناطہ کے دلوں میں گھر کر چکی تھی۔ اس کا باپ بھی غرناطہ کے بڑے امرا میں گنا جاتا تھا اور اپنی فیاضی اور ہمدردی کی وجہ سے ہر دلعزیز تھا۔ ایسے محبوب خاندان کو لُٹتے دیکھ کر مسلمانوں کے صبر کا پیمانہ چھلک اُٹھا۔ تھوڑی ہی دیر میں مسلمانوں کا ایک مسلح جتھا عیسائی قاضی پر حملہ آور ہوا۔ پولیس نے مدافعت کی مگر انکو ناکامی ہوئی۔ آخر ایک فوج نکی گئی کسکو آئی۔ کا پانسہ پلٹ گیا۔ مسلمان نقصان اُٹھاتے مگر

لڑنے سے باز نہ آتے۔ عیسائی جنرل نے جب یہ حال دیکھا تو مفتوحین کی سلامتی کے لیے شاہی معافی کا وعدہ سنایا۔ جان بچنے کی صورت نظر آئی تو بیچاروں نے ہتھیار رکھ دیے اور اپنے اپنے گھروں کا رُخ کیا۔

دوسرے ہی دن منادوں نے تمام مسلمانوں کو شہر کے بڑے کلیسا میں جمع ہونے کا حکم سُنایا۔ لوگ ڈرتے ڈرتے جمع ہوئے تو گورنر نے شاہ فلپ کی طرف سے سب کو جلاوطنی کا حکم سنایا۔ اور بیچاروں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر کے بندرگاہوں کو روانہ کر دیا۔ ناز و نعمت کے عادی، عیش و عشرت کے خوگر قیدیوں نے اپنے عالیشان محلات، خوبصورت باغات، اور بیش بہا مساجد کو بڑی حسرت سے خدا حافظ کہا۔ ضروریاتِ زندگی کا بوجھ سر پر لادا، ننھے ننھے بچوں کو گود میں لیا اور دو رویہ تماشائیوں کی قطاروں میں ہو کر اپنی اپنی منزلوں کو روانہ ہوئے۔

زہرا اور سلیم کا قافلہ اشبیلیہ پہونچا۔ رنج اور سفر کی صعوبتوں نے بڈھے باپ کو سفر ہی میں بیمار ڈال دیا تھا۔ منزل پر پہونچکر مسافر نے انتقال کیا۔ اللہ اللہ کیا مصیبت تھی کہ بیچاری زہرا عزیز باپ کی میت پر رونے بھی نہ پائی۔ لاش کو ایک غریب بوڑھے کے سپرد کیا اور قافلہ کے ساتھ ہو لیے۔ بندرگاہ پر محافظین نے قافلہ کو کپتان کے سپرد کیا۔ جہاز پر بیٹھے تو مایوس مسلمانوں میں جان آ گئی۔ شکرانہ کی نمازیں پڑھیں، خوشی کے ترانے گائے، گویا اپنے چھ سو برس کے پرانے وطن کو چھوڑنے کا اُنھیں ذرا بھی قلق نہ تھا۔

اس ہنگامۂ مسرت میں جہاز نے لنگر اُٹھایا اور ابھی ساحل نظر سے اوجھل بھی نہیں ہوا تھا کہ عیسائی کپتان نے زہرا کو بلوا بھیجا۔ زہرا بلا خوف وہاں چلی گئی۔ کپتان نے اِدھر اُدھر کی گفتگو کے بعد اُس سے کہا "تم اب بھی غرناطہ کی مہ جبینوں کی ملکہ بن سکتی ہو، تم اب بھی اپنے وطن میں رہ سکتی ہو، اور تمھاری ساری جائداد تمھیں واپس مل سکتی ہے، اگر تم میرے ساتھ شادی کر لو۔" زہرا نے فوراً جواب دیا "میری شادی بلنسیہ کے بہادر جنرل سلیم کے ساتھ ہو چکی ہے، اور عیش و عشرت اور مال و دولت کے خواب مجھے اُس سے جدا نہیں کر سکتے۔" کپتان خفا ہو کر بولا "تمھیں میرے
ساتھ شادی کرنی پڑے گی۔ اگر تم اپنی ضد سے باز نہ آؤگی تو جہا   اُسے "بہادر سلیم" کو
بندر کی پولیس کے حوالہ کر دوں گا۔" زہرا نے تیوری چڑھا کر جو   مجھ سے شادی
نہ کروں گی۔" کپتان لال پیلا ہو کر بولا "میں تجھے مجبور کر دوں   پکڑ کر کمرے کے
باہر چلا گیا۔

زہرا سمجھ گئی کہ اب سلیم کی خیر نہیں، وہ سجدہ میں گری اور رو رو کر دعا مانگنے لگی "مولا، تو حاضر و ناظر ہے۔ تو جانتا ہے کہ ہم بے گناہ ہیں، تو دیکھتا ہے کہ ہم ستائے جاتے ہیں، ہماری مدد کر۔ آہ! ظالموں نے ہمارا سکھ چین لیا، مال و دولت چھینا، ہمیں وطن سے بے وطن کیا۔ اب جان کے درپے ہیں! خدایا! اب ہماری عزت پر حملہ کرتے ہیں! کاش اس جہاز کے ٹکڑے ٹکڑے اُڑ جاتے قبل اسکے کہ یہ پھر ساحل ہسپانیہ پر لنگر انداز ہوتا۔ کاش یہ موذی کپتان سمندر کے خوفناک جانوروں کی خوراک بنجاتا، قبل اسکے کہ سلیم کی موت کا خیال اس کمینے کپتان کی صحبت اختیار کرنے کے لیے مجھے مجبور کرتا۔ میرے مالک! تو بیکسوں کا مددگار ہے، کمزوروں کی عزت کا پاسدار ہے، اپنے حبیبؐ کے صدقہ میں غریب زہرا کی دعا قبول کر"

ابھی دعا ختم نہ ہوئی تھی کہ سلیم گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ زہرا نے سجدہ سے سر اُٹھایا اور دَوڑ کر اُسکے گلے سے لپٹ گئی۔ سلیم نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا "کپتان نے ملاحوں کو حکم دیا کہ جہاز واپس لے چلیں۔ ہم لوگوں نے اُسے اس حرکت سے باز رکھنا چاہا۔ اس میں لڑائی ہوئی۔ بے ناخدا کا جہاز ایک چٹان سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا" یہ گفتگو کرتا ہوا زہرا کو تختہ پر نکال لایا۔ تمام مسافر حیران و پریشان اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ بچوں اور عورتوں کے رونے اور بلکنے سے اور بھی قیامت بپا تھی۔ بہت جلد جہاز نے ایک طرف کروٹ لی اور نہنگِ آب نے اس لقمہ کو اپنے خوفناک منہ میں رکھ لیا!

جہاز ڈوبنے کے بعد سطح آب ذرا برابر ہوئی تو سلیم اور زہرا مستول کے ایک ٹکڑے سے لٹکے، تند موجوں کا مقابلہ کرتے دکھائی دیے۔ دیکھتے دیکھتے ایک موج کا تھپیڑا لگا اور زہرا کا ہاتھ چھوٹ گیا۔ سلیم اپنی جان سے عزیز بیوی کو بچانے کے لیے لپکا۔ مگر زہرا مایوسی کے عالم میں سلیم سے کچھ ایسا لپٹ گئی کہ اُس کے ہاتھ پاؤں رُک گئے۔ اور ساحل کے قریب آکر یہ مظلوم جوڑا خوفناک تھپیڑوں کی نذر ہوگیا۔ آج تک دونوں عاشق کلیسائی مظالم کی پہونچ سے دُور، سمندر کی تہ میں دوش بدوش میٹھی نیند سو رہے ہیں، اور بحرِ روم کی موجیں دن رات اُن کے مدفن پر سرد آہیں بھرتی ہیں۔

سید

قیصر باغ

بحیثیت ایک سیاح کے اگر آپ لکھنؤ میں کسی قدیم عمارت کو سب سے زیادہ پسند فرمائیں گے تو وہ قیصر باغ ہوگا۔ جانِ عالم پیا آخری تاجدار اودھ کے مکمل ذوق و ندرتِ خیال کا بہترین نمونہ یہ عمارت ہے۔ اس عمارت کے بہت کم تاریخی حالات میسر آئے۔ ۱۸۵۰ء میں تعمیر ہوئی۔ اس میں متعدد بےنظیر عمارات کے علاوہ زائد از ایک ہزار محلات شاہی کے قیام کے لیے مکانات بنے ہوئے تھے۔ تکمیل کے بعد اس باغ میں ایک قسم کے مخصوص اجتماع ہوا کرتے تھے۔ ایک مقررہ دن سب لوگ صندلی رنگ کے لباس میں شریک ہوکر اپنے تعیش و لطف صحبت کا ثبوت دیتے۔ سلطنت کا چراغ جب "چراغِ سحری" کی حد تک پہونچ گیا اور طوائف الملوکی کی شان ہر چہار جانب پیدا ہوگئی اسکی سب سے بڑی وجہ حضرت اختر (شاہِ اودھ) کی طبیعت کا وہ رنگیلا انقلاب تھا جسکو بہ اصطلاحِ عام "عشرت پسندی" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اسی زمانہ میں اس عظیم الشان باغ میں "مثنوی دریائے عشق" کے ذریعہ تھیٹر کھیلے جاتے جس میں بسا اوقات خود بادشاہ سلامت بھی ایکٹ کرتے اور اپنے حوارئین سے خوب خوب کمال فن کی داد چاہتے۔ غرضکہ شاہانہ اُلوالعزمیاں ہر چیز سے آشکارا تھیں۔

عمارت کی تعمیر میں ڈیڑھ کروڑ روپیہ صرف ہوا۔ پوری عمارت اعلیٰ کمال معماری کا بہترین نمونہ تھی۔ قیصر کا خاص حصہ مربع مستطیل و منع کے احاطہ سے تعلق رکھتا تھا۔ گرد کی عمارت میں اتنی بڑی گنجائش تھی کہ ایک ہزار محلات بافراغت رہ سکیں۔ ہر عمارت میں ایک جداگانہ پائین باغ تھا، اور وسط صحن میں سب سے زیادہ پُر تکلف چمن بندی کے علاوہ صدہا قسم کے خوشنما فوارے اور متعدد خوشنما نہریں تھیں [illegible] میں سے ایک سنگ مرمر کی نہر مع اپنے خوبصورت و عجیب پُل کے ابتک موجودہ کونسل ہال کے سامنے قیصر باغ کی گذشتہ شان و شوکت کی یاد دلا رہی ہے۔ ہر روش پر مرمری مورتیں، بُرجیاں اور دوسری خوبصورت صناعیوں [illegible] نصب تھے۔ تمام وسیع عمارت قسم قسم کے اسباب تعیش سے بہترین اصولوں پر آراستہ [illegible] قیصر باغ میں وہ اگلی سی شان نہیں مگر اس گئے گذرے عالم پر بھی وہ عمارت [illegible] ہے۔ گو اس سے ہم اگلی شان و شوکت کا کسی طور سے بھی اندازہ نہیں لگا سکتے [illegible] ... بولرد کے مربع مستطیل پر

حاوی ہے وہ "تعلقداران اودھ" کو دیدگئی ہے جنھوں نے بعض حصوں کو اپنے رہنے کے مکانات قرار دے لیا ہے۔ بقیہ حصے بغیر چھت کی عالیشان دیواریں اور خوبصورت کھنڈر نظر آتے ہیں۔ جن سے زمانہ کے نشیب و فراز کا ایک عبرتناک سبق ملتا ہے!

بڑے بڑے عالیشان محراب دار پھاٹک اپنے بھاری بھاری تانبے کے طلاکار دروازوں کے ساتھ جن پر دریائی پریاں اور شاہ اودھ کا معرکہ بنا ہوا ہے، ابتک قائم ہیں۔ جب بیلی گارد تک پہونچنے کے لیے غدر میں لڑائی ہوئی ہے تو قیصر باغ وہ مقام تھا جسپر انگریزی فوج کو قبضہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، اسکی تمام عمارتیں باغیوں سے بھری ہوئی تھیں، جو مال غنیمت لالاکر وہاں جمع کر چکے تھے انگریزی فوج نے داخلہ پر باغیوں کو سنگینوں سے قتل کرنے کے علاوہ تمام مال غنیمت کو اپنا بنا لیا۔ شمالی پھاٹک جسکے نیچے بدنصیب قیدی" سرمونٹ اسٹوارٹ جیکسن" اور دیگر انگریز نہایت بیدردانہ طور پر قتل کیے گئے تھے، اُس میں سے ہوکر اگر جائیے، تو آپ کو "شاہی جلوخانہ" کے ٹوٹے پھوٹے کھنڈرات دکھلائی دینگے یہ وہ مقام ہے جہاں شاہی جلوس آکر صف بندی کرتا تھا۔ اور اسی جگہ سے سواری نکلا کرتی تھی اسکے داہنی طرف دوسری محراب میں جائیے، تو "چینی باغ" نظر کے سامنے آئیگا۔ اس باغ کی خصوصیت تھی کہ اس میں جس قدر بھی سامان تھا سب چینی کا نظر آتا تھا۔ ایک اور محراب جسکے گرد سبز دریائی پریاں ہیں، وہ راستہ حضرت گنج کو لیجاتا ہے۔ یہ باغ خاص بادشاہ کے نام سے منسوب تھا۔ اسکے داہنی طرف "چاندی والی بارہ دری" مشہور و نفیس عمارت تھی، جسکے سقف وستون سب چاندی کے پتروں سے منڈھے ہوئے تھے۔ یہ تمام چاندی ۱۸۵۷ء کے غدر میں تلف ہوئی۔

غرضکہ یہ ہیں اس مٹی ہوئی تاریخی عمارت کے مختصر حالات۔ آہ! کبھی یہ عمارت گہوارۂ عیش و عشرت اور سرمایۂ راحت و آرام تھی کسی کے جوش، ولولہ اور شوق کا مکمل نمونہ تھی، اور آج اُسکی کیا حالت ہے! کاش اودھ کے نامور تعلقہ دار جن کو کچھ بھی اپنے اسلاف کی یادگاروں کی قدر ہے وہ اس عظیم الشان تاریخی عمارت کی طرف پوری توجہ سے کام لیں، ورنہ اگر یہی لاپروائی اور عدم توجہ رہی تو وہ دن دُور نہیں کہ یہاں ایک ویرانہ عبرتناک کا منظر آنکھوں کو نظر آئے اور آنے والی نسلیں ہماری غفلت پر آنسو بہائیں۔ خدا ایسا وقت نہ لائے جسکے خیال اور تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

مسعود الرحمٰن ندوی

بارگاہِ سخن

یہ بارگاہِ شعر ہے، جھکتے ہیں سر یہاں
داغِ جگر سے ہوتی ہے پیدا نظر یہاں

چومی ہے نخوتوں نے یہ خاکِ فتادگی
ڈالی ہے رفعتوں نے فلک کی سپر یہاں

اللہ رے علوئے مراتب، زہے شرف
قدموں پہ کائنات کا رہتا ہے سر یہاں

اس راستہ کی شمع ہے جبریل کا نفس
بجھ جاتا ہے ہوا سے چراغِ خضر یہاں

ہر شے ہے اپنی صورتِ اصلی میں جلوہ ریز
ہے ساز و برگِ دہر، برنگِ دگر یہاں

پڑتی ہے ضوء جبینِ طلوع و غروب پر
کھلتا ہے رنگِ عارضِ شام و سحر یہاں

اس کشورِ خیال کی اللہ ری عافیت
شاہوں سے فاقہ مست ہیں آسودہ تر یہاں

فرماں روا دلوں پہ ہے گلبانگِ بیخودی
یعنی حدیثِ عقل نہیں معتبر یہاں

ہر گوشۂ بساط پہ تاروں کی چھاؤں میں
کرتے ہیں رقص زہرہ وش و سیمبر یہاں

پڑتی ہے آ کے قلب پہ حسنِ ازل کی ضرب
آئینہ توڑ دیتا ہے، آئینہ گر یہاں

اس جلوۂ لطیف کی رخشندگی نہ پوچھ
بجھتے ہوئے چراغ ہیں شمس و قمر یہاں

اللہ رے سرود، کہ اجزائے کائنات
ہر زیر و بم پہ ہوتے ہیں زیر و زبر یہاں

چلتی ہے بادِ جنبشِ کمال اس دیار میں
آتا ہے گھر کے ابرِ متاعِ ہنر یہاں

اس دائرے میں منصبِ کام و دہن ہے اور
زہراب میں ہے لذتِ شہد و شکر یہاں

ہاتھوں پہ خلد سے طبقِ زر لیے ہوئے
قدسی ادب سے آتے ہیں شام و سحر یہاں

باطل، فسانۂ کرۂ ارض و دورِ چرخ
یہ دائرے ہیں حلقۂ بیرونِ در یہاں

رنگِ شفق سے ہوتے ہیں تعمیر سقف و بام
گلبرگِ تر سے بنتے ہیں دیوار و در یہاں

پروانہ معرفت کا ہے دل کی شکستگی
پیغمبر [illegible] ہے داغِ جگر یہاں

ہے کس خیالِ خام میں یہ وازِ علم و فضل
ہر [illegible] صد بال و پر یہاں

اڑتا ہے سوئے عرشِ بریں شب کو مرغِ دل
ہو [illegible] تیں بسر یہاں

ہر سنگ میں ہے خندۂ اصنامِ آذری
ہر خار [illegible] ہو گلہائے تر یہاں

ہر ذرۂ حقیر، بعبد ناز دلبری رکھتا ہے آفتاب کے زانو پہ سر یہاں
کیا پوچھتا ہے جوشؔ تصور کے معجزے
ہوتی ہے ہر "خیال" سے پیدا "نظر" یہاں
جوشؔ، ملیح آبادی

رباعیاتِ رواںؔ

(حُسن و عشق)

جب حُسن سے فیضیاب ہو جاتا ہے
دل خوگرِ پیچ و تاب ہو جاتا ہے
اپنی ہستی کو بھول جاتا ہے بشر
ایسا کچھ انقلاب ہو جاتا ہے

ختمِ غمِ روزگار کر دیتا ہیں
یہ دَورِ خزاں بہار کر دیتا ہیں
کوئی مقصودِ آرزو ہی نہ ملا
جس پہ دل و جاں نثار کر دیتا ہیں

اس سے بہتر کہ بادۂ کوثر دے
اک مست نگاہ عاشقوں پہ کر دے
اے مطلعِ حُسن، اے بیاضِ خورشید!
پیمانۂ دل میں نورِ الفت بھر دے

ملنا کس کام کا اگر دل نہ ملے
کیا لطف سفر سے ہو، جو منزل نہ ملے
وسطِ دریا میں غرق ہونا بہتر
اس سے، کہ قریب آ کے ساحل نہ ملے

سُن، اے دامن بچا کے جانے والے
کیا کہتے ہیں اشکِ خوں بہانے والے
کس طرح ہو جمع خاطرِ خستہ دلاں
اے چاکِ جگر پہ مسکرانے والے

جب نفس پہ فتحیاب ہو جاتا ہے
انساں عظمت مآب ہو جاتا ہے
اُف، عشق کی سوزشِ دروں کی تاثیر
ہر داغِ دل آفتاب ہو جاتا ہے'

رواںؔ، ایم اے' ال ال بی'

سفر حجاز کی مختصر روداد

نویں منزل

حسن سکندر نے وعدہ کیا تھا کہ علی الصباح اونٹ آجائیں گے تاکہ ٹھنڈے ٹھنڈے روانہ ہو جائیں اور منا میں پہونچکر مسجد خیف میں پانچ وقت کی مسنون نماز ادا کر سکیں، لیکن اونٹوں کے آنے میں بہت دیر ہوئی اور ظہر پڑھکر روانگی ہو سکی۔ چونکہ راستہ زیادہ فراخ نہیں بلکہ مکۂ معظمہ کے بازاروں میں اور بھی تنگ ہے، اور بکثرت اونٹ منا کی طرف جا رہے تھے اسلیے اونٹ جابجا رُکتے بھی تھے اور چلتے بھی نسبتًا آہستہ آہستہ تھے۔ منا کچھ زیادہ دُور نہیں ہے۔ ہماری جائے قیام سے دو ڈھائی کوس کا فاصلہ ہوگا مگر تقریبًا نصف راستہ شہر کے اندر ہے اسوجہ سے منزل کسی قدر دیر میں طے ہوئی اور جب ہم منا میں پہونچے تو عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ مسجد کی چاردیواری سے بالکل متصل ایک احاطہ میں ہمارے اونٹ ٹھہرائے گئے۔ جلدی جلدی شقدف اُتار کر اور سامان رکھکر نماز کے لیے مسجد خیف میں گئے۔ مسجد کا صحن اور نیز کعبۂ شریف کے رخ پر جو دو درجہ کا دالان ہے سب کی زمین کچی ہے۔ اور چونکہ بعض حجاج نے وہیں قیام کرنا پسند کیا اور جابجا کھانا پکایا تھا اس لیے مسجد کی حالت ایک کارواں سرائے کے مانند ہو گئی تھی اور صحن کہیں بھی صاف ستھرا نہ تھا۔ بہرحال اپنی اپنی جانماز بچھاکر نماز ادا کر لی گئی۔ نماز سے فارغ ہو کر پیٹ کی فکر پڑی۔ منا میں دورویہ پختہ بازار بنا ہوا ہے۔ جس میں دوکانیں بھی ہیں اور بعض حصوں میں لوگ ٹھہرتے بھی ہیں۔ جس وقت ہم پہونچے ہیں اُسوقت بازار زائد رونق پر اگرچہ نہ تھا پھر بھی روٹی گوشت کی متعدد دوکانیں موجود تھیں۔ گرم گرم تنوری روٹیاں لیکر میں اور حاجی شبراتی، جو مکۂ معظمہ سے منا تک پیدل آئے تھے، شکم سیر ہوئے۔

برادر عزیز انور علی سلمہٗ کی ران میں ایک گلٹی نکل آئی تھی انکو سخت تکلیف تھی اور وہ ساتھ کی مستورات کی کوئی خدمت نہ کر سکتے تھے، انکو اپنے اونٹ پر بٹھالیا تھا کہ اُنھیں میرے ساتھ آرام مل سکے۔ مغرب بعض دوسرے حجاج سے مشورہ کرنے کے بعد حسن سکندر سے کہا کہ رات ہی کو عرفات کے لیے روانگی ہو جائے

کیونکہ دیر میں پہونچنے کی وجہ سے مسجد خیف میں پانچ نمازوں کے پڑھنے کا وقت نہیں رہا تھا۔ سب لوگوں نے اس رائے کو پسند کیا اور نماز عشا سے فراغت پاتے ہی کوچ کر دیا۔ حجی صاحبہ وغیرہ کو سوار کرانے اور اُن کا سامان قرینے سے بندھوانے کی خدمت چونکہ میرے متعلق ہوگئی تھی اسلیے ہمارے اونٹ ذرا رُکے رہے اور جب عورتیں سوار ہو چکیں تو سب سے آخر میں میں بھی اپنے شغدف میں جا کر لیٹ رہا۔ دن بھر میں کافی خستگی ہوگئی تھی اسلیے باوجودیکہ شب ماہتی مجھے قوافل حجاج یا منا سے عرفات تک کی منزل کا نظارہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ جلد ہی آنکھ لگ گئی اور جب نماز فجر کے اول وقت میدان عرفات میں نہ پہنچ گئے آنکھ نہ کھلی۔ ہمارے اونٹ اُس پہاڑی سے تقریبًا چند فرلانگ کے فاصلہ پر رُکے جسکا نام جبل رحمت بتایا گیا اور جہاں امام خطبہ پڑھتا ہے۔ قریب ہی بازار بسا ہوا تھا جہاں تمام ضروری سامان خورونوش ملتا تھا۔ نہر زبیدہ جو مکۂ معظمہ میں ہے وہی منا اور عرفات میں بھی ہے۔ لیکہ یہاں شاید کھلی ہوئی ہے جس میں اکثر لوگوں نے جا کر غسل بھی کیا۔

میر عبد العزیز صاحب کو مکۂ معظمہ ہی میں پیچش کی کچھ خلش ہوگئی تھی۔ یہاں تک آتے آتے اور زیادتی ہوگئی اور وہ چلنے پھرنے سے معذور ہوگئے۔ بازار میں جا کر کھانا کھایا اور پھر اپنے شغدفوں میں آکے بیٹھ رہے۔ دھوپ بہت سخت تھی، اوسپر تیز لو چل رہی تھی اور احرام کی وجہ سے نہ سر ڈھک سکتے تھے نہ سینہ کا تحفظ ممکن تھا۔ اس لیے عافیت اسی میں معلوم ہوئی کہ شغدفوں میں پڑے رہیں۔

نماز ظہر کے بعد امام مع شریف صاحب کے مسجد نمرہ سے جو مزدلفہ کے قریب ہے ظہر اور عصر کی نماز ساتھ ادا کرکے اس پہاڑی پر جو جبل عرفات کے پائین میں واقع ہے آتے ہیں اور وہیں اونٹ پر سوار ہو کر امام خطبہ پڑھتا ہے۔ حجاج میں سے جو لوگ اتنی ہمت رکھتے تھے کہ دھوپ اور لو کی تاب لا سکیں وہ پہلے ہی سے جا کر اس پہاڑی پر بیٹھ گئے تھے۔ فاصلہ سے لوگوں کی صورت تو نہ دکھائی دیتی تھی مگر احرام کی سفیدی اور چھتریوں کی سیاہی ضرور نظر آتی تھی۔ مسجد نمرہ میں نماز ادا ہوتے وقت یا ہو چکنے کے وقت توپوں کے چھوٹنے کی آواز آئی جس کے بعد ہی حسن سکندر کے سالہ یوسف اور اُنکے چھوٹے بھائی نے اپنے حاجیوں کو حج کی مبارکباد دینا اور اُن سے نذرانے وصول کرنا شروع کر دیے۔ عصر کے وقت تک امام صاحب اُس پہاڑی پر پہونچ گئے۔ اور اُنکے پہونچتے ہی پہاڑی کے لوگوں میں ایک عام جنبش معلوم ہوئی۔ گویا لوگ اپنی جگہوں پر کھڑے ہوگئے۔ یا امام سے قریب ہونے کے لیے بڑھے۔ ہم لوگوں نے پہاڑی کا رخ کرکے زمین پر چٹائی بچھائی اور وہیں بیٹھ گئے۔ یہ معلوم ہو گیا تھا کہ جس وقت امام خطبہ پڑھتا ہے اور لبیک اللھم لبیک پڑھتا ہے تو جو لوگ پہاڑی پر ہوتے ہیں وہ

حاجیوں کی اطلاع کے لیے اپنے اپنے رومال ہلاتے ہیں۔ چنانچہ جب رومال ہلنے لگے تو ہم لوگوں نے بھی خوب ذوق و شوق سے لبیک پڑھی۔ جیسے جیسے آفتاب ڈھلتا گیا پہاڑی زیادہ صاف نظر آنے لگی مگر مورتیں اب بھی نظر نہ آتی تھیں۔ یوں تو ظہر اور عصر کے درمیان ہی قوافل کی واپسی شروع ہو گئی تھی مگر جب خطبہ تمام ہو گیا اور لوگ پہاڑی سے اُترے تو عام طور پر کوچ کی تیاری ہونے لگی۔ عرفات کے وسیع میدان میں جہاں صبح کو چاروں طرف خیمے، چھولداریاں اور شغدف نظر آ رہے تھے اس وقت سوائے اونٹوں کی آوازوں یا شغدفوں سمیت اونٹوں کی قطاروں کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ہمارے جمالوں نے بھی عصر کے بعد ہی سے حی۔ حی (چلو چلو) کا ہنگامہ بپا کر دیا تھا۔ مگر میں نے کہا کہ جب تک آفتاب غروب نہ ہو جائے میں یہیں رہوں گا۔ جمالوں کی اُس وقت کی بیتابی اور بار بار روانگی کے لیے کہنا نہایت ناگوار معلوم ہوا۔ حالانکہ وہی وقت خضوع و خشوع کے ساتھ دعائیں مانگنے کا تھا جب جمالوں نے بہت تنگ کیا تو میں نے کہہ کہ اور لوگ سوار ہو کر چلیں میں پیدل چلا آؤں گا، اور اپنا آہنی بیگ اُتار کے اپنے پاس رکھ لیا۔ اور غروب آفتاب تک برابر مصروف دعا خوانی رہا۔ اور جب آفتاب بالکل غروب ہو گیا تب وہاں سے اُٹھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک جمال نے جو میرے پاس ٹھہر گیا تھا اونٹوں تک پہونچا دیا اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوا میں شغدف میں سوار ہو گیا۔ جبل عرفات سے مزدلفہ تک کوئی ڈیڑھ کوس کا فاصلہ ہو گا۔ اور راستہ اتنا وسیع و عریض ہے کہ چار چار پانچ پانچ قطاریں اونٹوں کی ساتھ ہی چلتی ہیں۔ جن کی وجہ سے اس قدر گرد اُڑتی ہے کہ بمشکل راستہ میں کچھ سجھائی دیتا ہے۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں بازار آ گیا جو لالٹینوں اور چراغوں کی کثرت سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ یہ بازار مسجد نمرہ کے قریب سے شروع ہوا تھا اور شاید یہ میلوں تک چلا گیا تھا۔ مگر دوکانیں عموماً ایک ہی سمت میں یعنے مسجد کے جانب تھیں۔ ہمارے اونٹ مزدلفہ میں ایک مقام پر اُتار دیے گئے۔ رات کے وقت اسکا اندازہ نہیں ہو سکا کہ مسجد نمرہ سے کتنے فاصلہ پر تھے۔ البتہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اسکے مقابل کے سمت میں پڑاؤ ہے۔ نماز عشا پڑھنے کے بعد اسی مقام پر کنکریاں چُنی گئیں۔ اسکے بعد اگرچہ رات بہت ہو چکی تھی اور اس کا بھی اندیشہ تھا کہ رات کی تاریکی میں کہیں راستہ نہ بھول جاؤں، مگر ہمت کر کے میں بازار گیا اور وہاں کھانا کھا کر چائے پی اور کچھ مٹھا ... ہ کے لیے لیتا آیا۔ حاجی شبراتی صاحب چونکہ پیدل تھے اس لیے ہمارے ساتھ ... سے واپسی میں اپنے مقام تک پہونچنے میں کافی وقت ہوئی۔ اس لیے کہ ہر جانب ... یں تھیں۔ چاندنی رات تھی۔ اس لیے شغدفوں کے ساتھ عموماً روشنی نہ تھی۔ زیادہ سے ... ہر قافلہ میں ایک روشنی تھی۔

شغدفوں کی یکسانیت کے باعث امتیاز مشکل تھا۔ بہرحال کئی جگہ ٹھوکریں کھا کر بالآخر ایک بار اپنے شغدفوں تک رسائی ہوگئی۔ شغدفوں کے آگے ہمنے بچھونا پہلے ہی بچھا لیا تھا۔ انوار سلمہٗ سوگئے تھے اس لیے انکو جگانا مناسب نہ معلوم ہوا اور جو کچھ کھانے کا سامان خریدا گیا تھا شغدف میں رکھکر میں بھی سو رہا۔ نماز فجر کے وقت اُٹھے اور نماز سے فارغ بھی نہ ہوئے تھے کہ جمال آگئے اور جلدی جلدی شغدف کسے گئے اور آفتاب نکلتے نکلتے منا کی جانب روانہ ہوگئے۔ اسوقت بھی اونٹوں کی کثیر تعداد کے چلنے سے گرد بہت اُڑ رہی تھی، پھر بھی آفتاب کی تیز روشنی میں راستہ اور گردوپیش کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ اب بازار کا کہیں نام و نشان نہ نظر آتا تھا۔ کہیں کہیں دوکانوں کا سامان اُٹھ نہیں چکا تھا تو وہاں کچھ آثار رات کے بازار کے معلوم ہوتے تھے۔ دونوں جانب کچھ فاصلہ پر پہاڑی سلسلے تھے۔ بائیں جانب مگر ہمارے اونٹوں کے پیچھے مسجد نمرہ دکھائی دیتی تھی۔ مجھے اس مسجد میں نہ جاسکنے کا افسوس رہا۔ کوئی دو گھنٹے میں قافلہ پھر منا پہونچ گیا۔ اور اپنے مقام پر پہونچنے سے پہلے ہی ہم نے دیکھ لیا کہ راستہ ہی میں ایک جگہ مذبح ہے جہاں قربانیاں کی جاتی ہیں۔ اور دوسری جانب ایک چبوترہ پر شریف صاحب اور اُنکے ساتھیوں کے خیمے ڈیرے لگے ہوئے ہیں۔ جس احاطہ میں پہلے قیام تھا اب بھی ہمارے شغدف وہیں اُتارے گئے۔ سامان خورونوش ساتھ موجود تھا اس لیے اونٹ پر بیٹھے ہی بیٹھے ہم لوگوں نے کھانا کھا لیا تھا۔ شغدف رکھنے کے بعد پہلی فکر یہ ہوئی کہ جمرۃ العقبیٰ کے کنکریاں مار آویں۔ چنانچہ ایک ایک دو دو کرکے سب ساتھی اس غرض سے گئے۔ منا کے بازار کی سڑک کے درمیان میں دو جمرے ہیں اور مکہ معظمہ کی جانب جاتے ہوئے سرے پر داہنی سمت میں ایک جمرہ ہے جنکی صورت ایک بھدی لاٹ کی سی ہے۔ لاٹ کوئی قد آدم بلند ہوگی انکے گرد ذرا اونچی مُنڈیر کے تھالے سے بنے ہوئے ہیں جن میں کنکریاں گرتی ہیں۔ جو کنکریاں مزدلفہ میں چُنی تھیں اُنہی سے یہاں جمرہ کو مارا۔ مجمع بہت ہوتا ہے اس وجہ سے بازار میں چلتے وقت بھی کندھے سے کندھا چھلتا ہے اور جہاں جمرہ ہے وہاں تو ٹھٹ کے ٹھٹ لگے رہتے ہیں اور بغیر دھکم دھکا کے رمی جمار انجام نہیں پا سکتی۔ عورتوں اور ضعیفوں کیلیے یہ مرحلہ کافی دشوار ہے۔ رمی جمار سے فراغت پائی تو دھوپ کافی تیز ہو چلی تھی اسلیے تھوڑی دیر آرام کیا اور تازہ دم ہوکر قربانی کے لیے مذبحہ کی جانب روانہ ہوئے۔ چونکہ سب ساتھیوں کی طرف سے قربانی کرنے کی خدمت میرے متعلق تھی، اسلیے تقریباً چالیس راسیں خریدکر ذبح کرنا پڑیں۔ ہمراہیوں میں سے دو تین آدمی میرے ساتھ تھے جنکی مدد سے جانور خریدے گئے۔ مذبح جس مقام پر ہے وہاں بڑے بڑے گڈھے اس غرض سے کھُدے ہوئے

ہیں کہ قربانی کے بعد کھالیں اور اوجھڑی وغیرہ اُن میں ڈال دیں - مگر اسکی پابندی کم کی جاتی ہے بلکہ زیادہ تر ہوتا یہ ہے کہ اُس سے ملحقہ وسیع میدان میں جہاں دور تک بکری، بھیڑ، دُنبوں اور گایوں وغیرہ کے جھنڈ کھڑے ہوتے ہیں - لوگ جانور خرید کرکے وہیں ذبح کردیتے ہیں اور غریب عربوں کی کثیر تعداد جو وہاں موجود رہتی ہے اور ہر قربانی کرنے والے کو گھیرے رہتی ہے، ذبح شدہ جانور دیدیا جاتا ہے - چنانچہ ہم نے بھی یہی کیا کہ سوائے دو دُنبوں کے جنکا گوشت ساتھ لیجانا منظور تھا باقی کُل راسوں کو ذبح کرکے وہیں تقسیم کردیا - جانوروں کی قیمت اگرچہ کسی قدر زیادہ دینا پڑی لیکن مجھے تو اُس میدان میں اُنکی اس قدر کثیر تعداد میں فراہم ہو جانے پر تعجب معلوم ہوتا تھا - میں تین چار روپیہ سے لیکر گیارہ گیارہ بارہ بارہ روپیہ تک کی مختلف مدارج کی بکریاں، بھیڑیں اور دُنبے خریدے گئے اور تقریباً تین چار گھنٹے میں قربانی کے مرحلہ سے فراغت پائی - نماز ظہر کے وقت وہیں پانی لیکر وضو کیا گیا اور نماز ادا کی گئی - جو عرب چھوکرے ذبح ہونے کے بعد اسیں مانگ لیتے تھے، اُنکے پاس عموماً چھریاں موجود تھیں اور اُنھیں چھریوں سے جانور ذبح کیے گئے - بعض وقت یہ چھوکرے کسی جانور کو پسند کرکے چاہتے تھے کہ اُنکو دیا جائے - اور ایک جانور کے کئی کئی گاہک ہوتے تھے تو دشواری پیش آتی تھی - کیونکہ وہ آپس میں بھی لڑنے لگتے تھے اور ذبح کرنے والے سے بھی اُلجھ جاتے تھے بلکہ کبھی کبھی چھین جھپٹ کرنے لگتے تھے - چنانچہ ایک بار اسی چھین جھپٹ میں ایک چھوکرے کے ہاتھ میں چھری لگ گئی اور خون نکل آیا - اب کیا تھا وہ میرے اُبھر گیا اور اصرار کرنے لگا کہ مجھے کچھ بخشش دو نہیں تو تم کو پکڑوا دونگا - میں نے ہرچند سمجھایا مگر نہ مانا - اور بالآخر ایک مسلح عرب کو جو غالباً فوجی تھا بُلا لایا - وہ مجکو اپنے ہمراہ ایک راوٹی میں لیگیا جو مذبح سے بالکل ہی قریب تھی اور جس میں پولیس کے کچھ لوگ بیٹھے تھے - ایک پولیس افسر نے اُسکا بیان سنکر مجھسے کہا کہ اس لڑکے کو کچھ بخشش دیدو - میں نے بھی یہ دیکھکر کہ بہت سا وقت فضول ضائع ہو چکا ہے اور اگر اب بھی تامل کرونگا تو ممکن ہے کہ اور وقت رائیگاں جائے، اُس لڑکے کو چونی دیکر اپنی جان چھڑائی -

جن جانوروں کو بنواکر گوشت اپنے ہمراہ لیجانا تھا اُنکی قربانی سب سے آخر میں مذبح میں کی گئی اور ایک ایک روپیہ دیکر قصاب سے گوشت بنوایا - اُس نے م لاش نکالدی اور جانور ہمارے حوالہ کردیا - گوشت کے بنانے کی وہاں کس دو تین روپئے دیے جاتے تو شاید بنا دیتا -

گوشت لیکر چلے تو ایک پولیس والے نے پھر روکا اور دوسری بار افسرِ پولیس کے یہاں

پہنچتی ہوئی۔ مگر اب کی کچھ دینا نہیں پڑا۔ بلکہ یہ دریافت کرکے کہ گوشت کہاں جائے گا چھوڑ دیے گئے۔ عصر کی نماز میں نے اسی افسر کی راؤٹی کے ایک جانب ادا کی اور اپنے مقام پر پہونچکر فوراً سر منڈایا۔

مغرب سے کچھ پہلے کھانے کی فکر میں بازار گئے۔ اتفاق سے اُسی وقت شریف صاحب کی سواری مکہ معظمہ کی طرف جا رہی تھی۔ تھوڑے سے سوار آگے اور تھوڑے سے پیچھے تھے۔ بیچ میں ایک فٹن پر شریف صاحب سوار تھے، جنکے پیچھے ایک شخص خوشنما چھتر لگائے ہوئے تھا۔ دوسرے دن سنا کہ آگے بڑھ کر کسی مقام پر یہ چھتر گر گیا۔ اور لوگوں نے اسکو فال بد قرار دیکر یہ نتیجہ نکالا کہ شریف کا نیر اقبال عنقریب غروب ہونے والا ہے۔

رات کو خستگی کے باعث نیند بہت آئی۔ صبح کی نماز بھی قضا ہوئی۔ نماز ادا کرکے حاجی برہان الدین، حاجی نذیر حسین اور حاجی سلیمان صاحبان تاجران لکھنؤ کی معیت میں طواف کعبہ کے لیے روانہ ہوا۔ گدھے کرایہ پر بہت ملتے ہیں اور کرایہ بھی زیادہ نہیں۔ آمد و رفت کے لیے صرف ایک روپیہ دینا پڑا۔ مکہ معظمہ کے حدود میں داخل ہوئے تو ایک مقام پر ستانے کے لیے ٹھہرے۔ ساتھیوں نے ناشتہ اور میں نے کھانا کھایا۔ حرم شریف میں حاضر ہوکر باطمینان تمام طواف کیا، زمزم پیا اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کی۔

شہر میں عام طور پر سناٹا تھا۔ نہ راہگیر چلتے تھے نہ دوکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں کوئی دوکان کھانے یا قہوہ کی کھلی ملتی تھی۔ طواف و سعی سے فراغت پاکر اُس گھر میں آیا جو مکہ معظمہ میں کرایہ لیا گیا تھا۔ کپڑے بدلے۔ کچھ دیر آرام کرکے چاروں آدمی منا واپس گئے۔ منا کا بازار حج کے بعد خوب رونق پر ہوتا ہے۔ کھانے پینے کی تمام اشیا کے سوا ہر قسم کی چیزیں اس بازار میں فروخت ہوتی تھیں۔ شام کو تو راستہ چلنا دشوار تھا۔ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ عصر کے بعد سے پہلے تینوں جمروں پر رمی کی پھر مغرب تک مذبح کے میدان میں قربانی کرتا رہا۔ دُنبہ جو ایک دن قبل ذبح کیا گیا تھا اُسی کا گوشت آج کھایا گیا۔ بہت لذیذ تھا۔ دوسرے دن سویرے ہی سے روانگی کی فکر شروع ہوگئی تھی۔ کیونکہ مستورات اور ساتھی مریضوں کو طواف زیارت کرنا تھا میں نے ایک قربانی تیسرے دن کے لیے باقی رکھی تھی لہذا سویرے ہی مذبح میں جاکر ایک عمدہ دنبہ مول لیا، قربانی کی اور گوشت بنواکر ساتھ لایا۔ چونکہ تیسرے دن بھی رمی کرنا ہوتی ہے۔ اس لیے طے پایا کہ جو لوگ مریض ہیں وہ رمی کرکے جائے قیام پر واپس نہ آئیں بلکہ بازار کے سرے پر مل جائیں۔ اور وہیں اپنے اپنے

شغدفوں میں سوار ہوں - اس خیال سے جو لوگ رمی کرکے واپس آگئے تھے اُنکے ہمراہ خالی اونٹ روانہ کردیے گئے - اور اُنکو ہدایت کی گئی کہ بازار کے سرے پر ٹھہر جائیں - مریضوں کو روانہ کرکے میں بھی روانہ ہوا - اور رمی کرکے اور اپنے ساتھیوں کو بٹھا کر شغدف پر سوار ہوگیا -

چونکہ اُس دن کثرت سے حجاج مکہ معظمہ واپس جارہے تھے اس لیے راستہ بہت دشوار گذار تھا - اور باوجودیکہ ظہر سے بہت قبل ہم روانہ ہوسکے تھے مگر کہیں عصر کے وقت مکہ معظمہ پہونچے - حرم شریف کے پاس پہونچتے ہی اونٹ روک کر آنو رسلمہٗ کو طواف وزیارت کے لیے اُتار دیا اور میں سامان کے ہمراہ گھر آیا

تنقید

عربی طب

اس مختصر رسالہ میں حکیم خواجہ شمس الدین صاحب نے عربوں کی طب پر ایک مبسوط بحث کی ہے - عربوں کی طب کیا تھی اُس نے کیا کیا مدارج طے کیے اور طب جدید اُس سے کیونکر پیدا ہوئی؟ علمی تاریخی نظر سے یہ چھوٹا سا رسالہ بہت ہی دلچسپ ہے - اسکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں س طب کے ظہور سے قبل بیماریوں کے علاج کا کیا طریقہ تھا - اشتری اور بابلی طب کا رد ج کہاں تھا - یونانی طب کا کہاں دَور دورہ تھا - ویدک کہاں چھائی ہوئی تھی - جڑی بوٹیوں کا علاج کہاں کیا جاتا تھا - اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں ولادت مسیح سے قبل طب کے قدم جم چکے تھے اور علم جراحی بھی کافی ترقی کرچکا تھا - غرضکہ اس قسم کے ارتقائی مدارج کا ذکر بہت شرح و بسط سے کیا گیا ہے جس میں کافی تحقیق و تدقیق سے کام لیا گیا ہے - لیکن ہم کو حکیم صاحب سے ایک شکایت بھی ہے کہ اُنھوں نے انگریزی الفاظ بہت صفائی سے استعمال کیے ہیں کہ اگر وہ نہ ہوتے تو بہت بہتر ہوتا - بہرحال رسالہ اس "لغزش" کے باوجود بھی دلچسپ ہے - طباعت وکتابت بھی دیدہ زیب - قیمت ۲ر مصنف سے مل سکتی ہے -

طب کی تعلیمی زبان

اس رسالہ کے مولف جناب مولانا پروفیسر تکمیل الطب لکھنؤ ہیں - اس مختصر رسالہ میں مو گیا ہے کہ طب کی تعلیم عربی زبان میں ہونا چاہیے - مولانا نے رسالہ کو بہت دلچسپ پیرایہ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے

مگر ہم اس رائے سے متفق نہیں ہیں کہ محض عربی زبان میں طب کی تعلیم ہونا چاہیے۔ ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ اس بحث پر کبھی مستقل طور سے اپنی رائے کا اظہار کریں گے۔ بہر حال رسالہ بحیثیت مجموعی بہت ہی دلچسپ ہے۔ مصنف سے جھوائی ٹولہ کے پتہ پر بقیمت ۶ر مل سکتی ہے۔ (م۔ا۔ ش)

تاریخ دریاباد مؤلفہ منشی برج بھوکھن لال محب۔ قیمت فی جلد ۱۲ غالباً مؤلف سے مل سکتی ہے۔

محب صاحب فرماتے ہیں "عرصہ سے میرا ارادہ تھا کہ کچھ اپنے وطن مالوفہ کی خدمت کروں چنانچہ ۱۱ سال کی مسلسل اور جان توڑ کوششوں کے بعد" دریاباد کی تاریخ مرتب کی ہے۔ محب صاحب کی حب وطن اگرچہ قابل داد ہے تاہم وطن کے معنی کو اس قدر محدود کردینا کچھ زیادہ مفید نہیں۔ اگر مؤلف صاحب ۱۱ سال ہندوستان کی خدمت میں صرف کرتے تو آج مورخین کی صف اول میں ہوتے۔ دریاباد کی تاریخ ہونے کی حیثیت سے بھی کتاب کچھ زیادہ قابل قدر نہیں ہے۔ بجائے اسکے کہ دریاباد پر ملک کے اہم سیاسی واقعات اور حادثات کے آثار اور اُن کے اسباب پر غور کرتے مولف نے دریاباد کے بہت سے خاندانوں کے خاص خاص افراد کی ایک فرہنگ بنا دی ہے۔ اسے بجائے تاریخ کے کتاب رجال کہنا زیادہ مناسب ہے اور اس حیثیت سے یہ کتاب کچھ اہمیت رکھتی ہے۔

صبح وطن مصنف پنڈت برج نرائن چکبست، پتہ: انڈین پریس الہ آباد۔ صفحات ۱۰۸۔ چکبست مرحوم کا مجموعۂ کلام اس سے پیشتر بھی شایع ہوچکا ہے۔ مگر اس ایڈیشن میں مزید نظموں کا اضافہ کردیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ پنڈت جی کی حیات ہی میں مرتب ہو چکا تھا، اس لیے مصنف کے حالات بہت مختصر رہ گئے ہیں۔ شروع میں ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو کے قلم سے ایک دلچسپ مقدمہ ہے۔ "نذرانۂ روح" کے عنوان سے مصنف نے "سودائے طبیعت" کو اپنے شفیق اُستاد پنڈت بشن نرائن در کی روح سے معنون کیا ہے۔

جو شعرا اُردو شاعری کو ارتقاء قوم اور تہذیب اخلاق کا آلہ بنانا چاہتے ہیں اُن میں چکبست سب سے آگے ہیں۔ حب وطن، تاریخی کارنامے، فطرت کے مناظر، یہی اُنکی شاعری کے محرک اور موضوع ہیں۔ مسلسل نظموں کے علاوہ غزلوں پر بھی یہی رنگ چڑھا ہوا ہے۔ اسکے ساتھ ہی انکی نظمیں ہندی تلمیحات سے بھی پُر ہیں۔ ہندو مسلم تمدنی اتحاد کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو۔

گوتم نے آبرو دی اس معبد کہن کو　　　سرمد نے اس زمیں پہ صدقے کیا وطن کو

اکبر نے جامِ الفت بخشا اس انجمن کو سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو
سب سُور بیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا اُنکی ہڈیاں ہیں

چکبست سچے شاعر تھے۔ نام و نمود کی اُنکو ہوس نہ تھی۔ یہاں تک کہ غزلوں میں تخلص بھی نہ رکھا۔ وہ مر گئے، مگر اُنکا کلام غیر فانی ہے۔ انکی زندگی کا سب سے اہم کارنامہ "رامائن کا ایک سین" ہے جسے پڑھ کر بے اختیار منہ سے نکل جاتا ہے "اگر چکبست نے صرف رامائن کا ترجمہ کر دیا ہوتا تو یقیناً انھیں تلسی داس اور ہومر کی صف میں جگہ دیجاتی۔

طباعت و کتابت اچھی ہے، مگر بعض جگہ املا کی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ انڈین پریس سے اس قسم کی غلطیاں ناقابل معافی ہیں۔

شاہان مالوہ مؤلف مولوی امیر احمد علوی۔ پتہ انوار المطابع لکھنؤ۔ صفحات ۵۹ اقیمت عہ

ہندوستان میں ہندو مسلم تہذیب کی بنانے والی دہلی اور آگرہ کی مغل اور پٹھان سلطنتیں نہ تھیں، بلکہ وہ چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں تھیں جو ہر کمزور بادشاہ کے زمانہ میں پیدا ہو جاتی تھیں۔ اور سو دو سو برس کی زندگی کے بعد پھر سلطنت دہلی میں ضم ہو جاتی تھیں اسلامی تمدن انھیں کے ہاتھوں ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پہونچا۔ اس حیثیت سے یہ ریاستیں اتنی اہم ہیں کہ تاریخ کا طالب علم کبھی ان سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ امیر احمد صاحب نے شاہانِ مالوہ کے حالات لکھ کر قوم پر بڑا احسان کیا ہے۔ اُنکے طرز تحریر کا کیا کہنا، قابل رشک ہے۔ اور کتاب شروع سے آخر تک دلچسپی کے ساتھ پڑھنے کے لائق ہے۔ البتہ بعض امور نظر انداز ہوگئے ہیں دیباچہ میں ضمنی طور پر چند سطروں میں مالوہ کی جغرافی حالت ختم کردی ہے۔ حالانکہ اس پر ایک پوری فصل کی ضرورت تھی، تاکہ پڑھنے والے فتح و شکست کے اسباب اور علوم و فنون کی ترقی کے وجوہ کو اچھی طرح سمجھ سکتے۔ دوسری بہت بڑی خامی یہ ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پیشتر مالوہ کی تاریخ سے نامناسب لاپروائی برتی گئی ہے۔ بغیر اُسکے شاہان مالوہ کی عظمت کی قدر کرنا مشکل ہے۔

اسکے علاوہ اس کتاب میں مالوہ کی تہذیب و تمدن کا کوئی نقشہ ۔۔ حالانکہ مالوہ
علوم و فنون کا مخزن تھا۔ بالخصوص فن تعمیر اور موسیقی کے لیے تا تھا۔ ان مباحث
پر مفصل بحث کی ضرورت تھی۔ ایک اور کمی یہ رہ گئی کہ بانہبادر ا ستان بغیر تاریخی
تنقید کے شاملِ کتاب کرلی گئی ہے۔ ان مباحث پر مواد بہت مشکل سے ملتا ہے لیکن اس دشواری کو

قصد تالیف سے پیشتر سوچ لینا چاہیے تھا امید ہے کہ مولوی امیر احمد صاحب اسکے بعد کسی دوسری خود مختار اسلامی ریاست کی طرف متوجہ ہوں گے۔

انقلاب فرانس مترجمہ مولانا عبد الرزاق ندوی۔ پتہ: صدیق بکڈپو، لکھنؤ۔ صفحات ۱۹۲ قیمت عہ

مولانا عبد الرزاق ندوی انقلابی خیالات کے آدمی ہیں، اسلیے ہر وہ چیز جو پبلک کو انقلاب کی طرف مائل کرے، ملک کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یہی خیال اس کتاب کے ترجمہ کا بھی محرک ہوا ہوگا۔ افسانہ کی حیثیت سے اسکا پایہ کچھ بلند نہیں ہے۔ "ایڈیٹر پیام والجامعہ" کو انقلابی خیالات کی اشاعت کے لیے اس سے بہتر افسانے مل سکتے تھے۔ کہیں سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ ترجمہ کس زبان سے کیا گیا ہے، غالباً عربی ترجمہ کو اُردو کا لباس پہنایا گیا ہے۔ بہرحال زبان میں "ترجمہ پن" نہیں پایا جاتا۔ اس کتاب کے مطالعہ کا اتنا فائدہ ضرور ہوگا کہ اُردو داں طبقہ میں اس عظیم الشان انقلاب کے حالات پڑھنے کا شوق پیدا ہو جائے گا۔ اور یہی مقصود ہے۔ لکھائی چھپائی بہت معمولی ہے۔ سرورق کو کتاب کے اشتہارسے مزین کرنے کا طریقہ ذوقِ لطیف پر گراں گذرتا ہے اگر حضرات ناشرین اس سے باز آتے تو اچھا ہوتا۔

بُدھ اور اس کا مت مترجم پنڈت شیو نرائن شمیم لاہوری۔ صفحات ۲۲۴۔ قیمت صرف مطالعہ۔ مؤلف سے مل سکتی ہے۔

بُدھ مبلغ دھرم پال جی کے ارشاد کے مطابق شمیم صاحب نے یہ کتاب ایک امریکی بودھ سٹراس کی تصنیف "بدھ اور اُس کا مت" سے ترجمہ کیا تھا۔ یہ اُسی کتاب کا دوسرا اڈیشن ہے۔ اس کتاب میں مہاتما بدھ کی زندگی، اُن کا مذہب، اُنکے اخلاق اور سنگھا (آرڈر) کے متعلق مختصر بحث کی گئی ہے۔ اخیر میں بدھ دھرم کی حمایت کے عنوان سے چند اعتراضوں کا جواب دیا ہے۔ زبان سلیس و با محاورہ ہے مگر انگریزی الفاظ کہیں کہیں بلا ضرورت بھی استعمال ہوے ہیں۔

جا بجا مصنف نے اس بات کا دعوے کیا ہے کہ بُدھ مت انتہائی رواداری کے ساتھ بغیر ایک قطرہ خون بہائے شایع ہوا۔ اسکولی کتابوں میں بھی یہی پڑھایا جاتا ہے مگر حال میں محکمۂ آثار قدیمہ نے سندھ میں کچھ ہندو دیوتاؤں کے مجسمے دریافت کیے ہیں جو باہم لڑتے لڑتے ہیں۔ محققین کا خیال ہے کہ یہ تمھیر مسلمانوں کی آمد سے بہت پیشتر کے ہیں غالباً پرجوش بودھ مبلغین

کے ہاتھوں نے یہ بت شکنی کی ہوگی اس لیے کہ اُس زمانہ میں بودھ بھی بتوں کی پوجا نہیں کرتے تھے۔

ایک جگہ مسٹر اسٹراس فرماتے ہیں "قدیم بدھ مت بوجہ برہمنوں کی مخالفت اور محمدیوں کے تشدد کے مفقود ہوگیا۔"

یہ سچ ہے کہ کسی زمانے میں ایران بلکہ عراق میں بھی بدھ مذہب پھیلا ہوا تھا، مگر جس وقت اسلام کا آفتاب عرب میں طلوع ہوا ہے زرتشتیوں اور برہمنوں نے اسکو قریب قریب مٹا دیا تھا، مگر عرب اور ایران کے لوگوں نے ہندو مذہب اور بدھ مت کی مشابہت کی بنا پر ہندوؤں کو اکثر بودھ اور اُنکے دیوتاؤں کو بُدھ (بُت) کے نام سے یاد کیا۔ اسی بنا پر یورپین مورخین کو یہ غلط فہمی پیدا ہوئی۔ اور باوجود شافی تردید کے اب بھی اسکی صحت نہیں ہوئی۔

اصل کتاب سے زیادہ دلچسپ وہ ضمیمہ ہے جس میں تسنیم صاحب نے بدھ مذہب کے متعلق بہت سے قیمتی معلومات اکٹھا کردیے ہیں۔ مذہبی حیثیت کے علاوہ تاریخی نقطۂ نظر سے بھی یہ معلومات بہت اہم ہیں۔ بُدھ کی پیدائش کا زمانہ، (اُس زمانہ کا) ہندو فلسفہ، کاسیا، نالندا، بودھی غار، اور وجوہاتِ زوال خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔

سیرتِ حضرت جعفر طیارؓ مؤلفہ مولوی ابو محمد امام الدین صاحب رام نگری۔ صفحات ۴۴۔ مؤلف سے ۶ر میں مل سکتی ہے۔

مسلمانوں کا مذہبی لٹریچر بیشتر عربی اور فارسی میں ہے اس وجہ سے مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد اُس سے استفادہ نہیں کرسکتی۔ مذہب سے ہماری بیگانگی کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے۔ لہذا ہر وہ کوشش جو حدیث و فقہ، تاریخ و رجال کی مستند کتابوں کو اردو لباس پہنانے کی کیجائے مستحسن ہے۔ زیر نظر کتاب اسی قسم کی ایک کوشش ہے، مولوی امام الدین صاحب رام نگری نائب مدیر رسالہ فلاح دارین (بنارس) نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ابن عم حضرت جعفر طیارؓ کی سیرت لکھکر قوم کی خدمت انجام دی ہے۔ زبان پاکیزہ، طرز بیان دلچسپ اور ترتیب واقعات صحیح ہے۔ شروع میں خواجہ حسن نظامی ... مختصر دیباچہ یا تعارف اور اسکے بعد مولف کا دیباچہ ایک ورق میں ہے۔ آخر میں سید شاہ محمد ... تقریظ ہے۔ افسوس ہے لہ ااکابر اسلام کے سوانح معمولی طباعت اور معمولی کاغذ پر شا ... ن بد مذاقی کی کی دلیل ہے۔

(سید)

پچھلے مہینے کے رسالے

دلگداز اگست کے دلگداز میں مولانا عبدالحلیم شرر نے "سلطان عالم، واجد علی شاہ" کے متعلق ایک مختصر مگر مفید مضمون شائع کیا۔ انکا بیان چشم دید ہے، اسلیے تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ لکھنؤ میں ابھی ایسے بزرگ ہیں جنکی مدد سے سلطان عالم کے متعلق بہت سا صحیح تاریخی مواد اکٹھا ہو سکتا ہے اور ان بیشمار اغلاط کی صحت ہو سکتی ہے جو تاریخ کے نام سے رائج ہیں۔ شرر صاحب فرماتے ہیں :-

"خود میرے والد بزرگوار کا واقعہ ہے کہ وہ ذوالفقار الدولہ بہادر کی پیشی میں خوشنویس تھے۔ بادشاہ کو ایک دن خبر لگی کہ اسد باغ میں مالیوں کے جتنے اسم ہیں، ان میں سے تھوڑوں ہی پر مالی مقرر ہیں۔ باقی فرضی نام ہیں۔ تنخواہ فرضی آدمی دکھا کے لے لیجاتی ہے۔ نہایت برہمی کے ساتھ محل برآمد ہوئے اور والد کو حکم دیا کہ برآورد لاؤ۔ اور ساتھ ہی باغ مذکور کے تمام مالیوں کو حاضری کا حکم ہوا۔ جب سب جمع ہو گئے تو ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور والد سے فرمایا" دیکھو خدا کو حاضر و ناظر جان کر سچ سچ پڑھنا۔ برآورد سے اسد باغ کے مالیوں کی فہرست نکال کے ایک ایک کا نام پکارو"۔ اور مالیوں کو حکم ہوا کہ جسکا نام پکارا جائے سامنے آ کے دوسری طرف چلا جائے۔ برآورد ان دنوں کسی کتاب یا رجسٹر کی صورت میں نہ ہوتی بلکہ مکتوب کی طرح بیسیوں بند نیچے اوپر جڑے ہوتے۔ والد اسد باغ کی برآورد نکال رہے تھے کہ ہوا کا تیز جھونکا آیا، اور اسکے بند ہاتھ سے چھوٹ کر اڑنے لگے۔ والد انکے روکنے کے لیے بیٹھ گئے اور برآورد کو سمیٹ کر مرتب کر لیا۔ جب وہ مرتب ہو گئی تو بادشاہ نے انکی طرف دیکھ کر فرمایا" سنو۔ بادشاہوں کے سامنے بیٹھتے نہیں ہیں"۔ وہ کھڑے ہو کر ادب آموزی کا آداب بجا لائے، اور جائزہ ہونے لگا۔

کثرتِ ممتوعات کے متعلق فرماتے ہیں :-

"بیشک ممتوعات کی کثرت تھی، اور بادشاہ پر جو فرد قرارداد جرم لگائی گئی ہے اس میں سب سے زیادہ سنگین جرم یہی تصور کیا جاتا ہے۔ اس پر کوئی شرعی جرم تو آ ہی نہیں سکتا، اسلیے کہ بادشاہ مذہب شیعہ اثنا عشری کے پیرو تھے، لہذا انکے اعتقاد میں متعہ بغیر کسی حد اور قید کے شرعاً جائز ہے ...... اب رہا یہ کہ اخلاقی اور تمدنی حیثیت سے بادشاہ کو اتنی عورتوں سے متعہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اسکی حالت یہ ہے کہ بادشاہ نہایت ہی محتاط اور پرہیزگار تھے اور مٹیا برج کی زندگی میں انھیں ایک گھڑی کے لیے بھی گوارا نہ تھا کہ کسی نامحرم عورت پر انکی نظر پڑے۔ مگر شاہی محل تھا جس میں پیش خدمتوں، محلداروں، مغلانیوں اور مکاندارنیوں، یہاں تک کہ بہشتنوں اور خاکروبوں کے ایک گروہ کثیر کے موجود رہنے کی ضرورت تھی۔ ممتوعات میں چند ہی تھیں جن کے ساتھ خلوت گاہ میں داخل کرنے کی غرض سے متعہ کیا گیا ہو۔ سب کی سب خدمتگارنیاں تھیں۔ لیکن چونکہ متعہ ہو جاتا، لہذا جائز تھا کہ ان میں سے کوئی پسند آئے تو خلوت میں بلا لی جائے۔

طریقہ یہ تھا کہ عام ممتوعات کو بیگم کے لقب کے ساتھ اچھے دلکش خطاب عطا ہو جاتے اور انکا شمار بیگمات میں ہو جاتا۔ اگر ان میں سے کوئی حاملہ ہو جاتی تو وہ بیگمات کے زمرے سے ترقی کر کے محلات عالیات میں شامل

ہو جاتی ۔ بیگم ہونے تک انکی تنخواہیں بہت تھوڑی اور خدمتگارنیوں کی سی ہوتیں جو کپڑوں کے علاوہ ماہانہ پیسے
سے دس بیس روپئے تک پاتیں ۔ محلات کے زمرہ میں شامل ہوتے ہی انکی تنخواہ سو دو سو روپیہ ہو جاتی ، رہنے کو
جداگانہ محلسرا ملتی اور انکی ڈیوڑھیوں پر خدام اور پہرہ کے سپاہی مقرر ہو جاتے ۔

اشہ زمانہ میں حکیم شمش الدین احمد لکھنوی "صنعت و رعایت" کے متعلق تحریر فرماتے ہیں :-

"شعرائے لکھنؤ کی روش خاص یہ رہی کہ لطفِ زبان و محاورہ کے ساتھ مضمون میں شوخی ، رنگینی اور
دلفریبی ہو - خیالات میں ایسی دقت و پیچیدگی نہ ہو جو بار دماغ ہو جائے اور سلاست زبان کو برباد کر دے ،
اشعار میں موقع موقع سے روزمرہ صرف کیا جائے استعارات اور تشبیہیں بکثرت مگر قریب الماخذ ہوں ، کلام تعقید سے
محفوظ رہے ، الفاظ معانی اور مطالب میں تناسب اور رعایت کا ہر قدم پر لحاظ رہے ، صحتِ زبان و محاورہ کا
خیال کہیں پر چھوٹنے نہ پائے ...... دہلی نے اس صنعت کو اختیار کرنے کی ایک حد قرار دی ہے اور وہ اس سے
آگے تجاوز نہیں کرتے اور حقیقت یہ ہے کہ تناسب اور رعایت کی خوبی یہ ہے کہ اس میں تکلف اور آورد نہ ہو
اور بلا ضرورت اور بے موقع کھینچ تان کر ایک لفظ کے لیے اسکے تمام مناسب الفاظ لاکر اکٹھا نہ کر دیے جائیں"
آگے چل کر یوں فیصلہ کرتے ہیں :-

شاعری کے دو جزو ہیں تخیل اور زبان - بلحاظ اول اہل دہلی کو فضیلت حاصل ہے اور بلحاظ ثانی اہل لکھنؤ
کو تفوق ہے - صنعت ، رعایت اور تناسب بلا شبہ ہر زبان کے لیے نہایت عمدہ اور ضروری چیز ہے - اس سے
کلام پر لطف اور بامزہ ہو جاتا ہے - اس سے گریز کرنا کلام کو روکھا پھیکا اور بےمزہ بنا دے گا - اور اس کا
حد اعتدال سے تجاوز کر جانا اسکو مہمل کر دیگا - یہ کہنا کہ لکھنؤ والوں کے یہاں الفاظ ہی الفاظ ہیں ، تخیل اور مضمون
خاک نہیں ، اسی طرح غلط ہے جس طرح یہ کہا جائے کہ اہل دہلی کو زبان اور محاورہ کا شعور نہیں - دونوں کا
اپنا اپنا طرز ہے - ایک دوسرے کو الزام نہیں دے سکتا - ہماری زبان اور ہماری شاعری دونوں کی
ممنون احسان ہیں اور ہمیشہ رہیں گی"

ارف کے اگست نمبر میں مولوی ضیاء احمد صاحب ایم اے کا ایک مضمون "ارتقاء ادب فارسی عہد اکبری میں"
شایع ہوا ہے - اس اہم بحث کے لیے یہ مضمون بہت مختصر اور تشنہ ہے - ونسنٹ اسمتھ نے اس
عہد کی فارسی ادبیات کو پانچ عنوانوں میں تقسیم کیا ہے (تراجم ، تواریخ ، خطوط ، کلام نظم ، کتب مذہبی اور فنی تصانیف)
اور ہر عنوان ایک طویل بحث چاہتا ہے - ہمیں امید ہے کہ لایق مضمون نگار معارف کے آیندہ نمبروں میں اسکی تلافی فرمائینگے -
البتہ ذیل کا اقتباس دلچسپی سے پڑھا جائے گا :-

غور کرو اکبر کا دربار کیا تھا ایک اچھی خاصی اکاڈیمی تھا ! جس میں ہر فن کے ہمسٹ کر
جمع ہو گئے تھے - جب تک فن تاریخ دنیا میں موجود ہے ، کوئی مورخ اسلامی ہند انداز
نہیں کر سکتا - کیا یہ ممکن ہے کہ زمانہ کی گردش سے شیخ مبارک ناگوری جیسے متبحر دل
فیضی اور ابوالفضل کے کارنامے شیخ عبدالحق محدث دہلوی رئیس اہل سنت کی تصانیف میری جیسے
امام تفسیر و حدیث و تلمیذ شیخ ابن حجر مکی کی تحریرات یا مشہور فلسفی میر فتح اللہ شیرازی اور زبردست
متکلم قاضی نظام الدین بدخشی اور شیعہ مجتہد قاضی نوراللہ شوستری صاحب مجالس المومنین وغیرہم کی تصنیفات

صفحۂ تاریخ سے محو ہو جائیں یا مخدوم الملک ملا عبد اللہ سلطانپوری صدر الصدور شیخ عبد النبی سید محمد میر عدل اور ملا عبد القادر بدایونی جیسے اساطین فضل و کمال کی یاد دلوں سے مٹ جائے۔ انھیں بھی جانے دو کیا یہ قرین قیاس ہے کہ زمانہ فیضی، غزالی، عرفی، نظیری، ثنائی، شیری میلی کی ترانہ ریزیاں اور خوشنوائیاں جنہوں نے دہلی اور آگرہ کے گلزاروں کو گلستان شیراز و اصفہان کا جواب بنا دیا تھا یکسر بھول جائے گا؟

تلک آثارنا تدل علینا فانظروا بعدنا الی الآثار

نگار سید محی الدین صاحب قادری زور بی اے نے نگار میں غالب کی ذہنیت پر ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا ہے۔ زور صاحب کو ادبی تنقید کا صحیح مذاق اور تنقید کو دلچسپ بنانے کا اچھا ملکہ ہے۔ زیر بحث مضمون کے حصے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ ایک جگہ مشرق اور مغرب کے فن تنقید میں اس طرح تفریق فرماتے ہیں:

"یورپ میں جب کسی شاعر کے کلام پر تنقید کی جاتی ہے تو اُسکا ایک بڑا جزو یہ سوال بھی ہوتا ہے کہ زیر بحث شاعر کی ذہنیت اور بیانات کس دبستان سے تعلق رکھتے ہیں؟ کیا وہ ورڈسورتھ کی طرح کائنات اور انسان کی فطرت پر گہری نظر ڈالتا ہے، یا ٹینی سن کی طرح اپنے ہی زمانے کے معتقدات اور اپنے ہی ملک و قوم کے توہمات کی ترجمانی کرتا ہے۔ یا براؤننگ کی طرح فلسفۂ حیات کے بنیادی اصولوں اور رجائیت کے عالمگیر پہلوؤں کا گہرا مطالعہ کرتا ہے۔ یا میتھو آرنلڈ کی طرح اپنے ماحول کی بدعنوانیوں سے بیزار ہوکر صدائے احتجاج بلند کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسکے برعکس جب اُردو کے کسی شاعر پر تنقیدی نظر ڈالی جاتی ہے تو اکثر یہی دیکھا جاتا ہے کہ آیا وہ ناسخ کے اسلوب بیان کی تقلید کرتا ہے یا آتش کے طرز ادا کی پیروی ...... غرض اُردو کی تمام شاعری صرف اسلوب ہی پر منحصر رہتی ہے۔"

ہمایوں بشیر احمد صاحب نے ہمایوں میں "اسلام کا اثر مغربی تہذیب پر" کے عنوان سے ایک دلچسپ و پر از معلومات مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے۔ ایک جگہ اسپین کی اسلامی حکومت کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں۔ انصاف کیجیے کہ جدید نظریۂ حکومت کس حد تک مسلمانوں کا مرہون منت ہے:

"عربوں کا ہسپانیہ میں داخل ہونا اور ایک باقاعدہ حکومت کا قائم کر لینا بذات خود ایک انقلاب عظیم تھا شخصی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور ہر شخص کو بیش بہا آزادی کے حقوق دیے گئے۔ تمام عہدے ہر کہ ومہ کے لیے خواہ وہ کسی مذہب کا کیوں نہ ہو ممکن الحصول سمجھے گئے۔ غلاموں کو آزادی اور یہودیوں کو برابری کا رتبہ ملا۔ ڈوزی کہتا ہے کہ "ملک میں ایک عجیب و غریب انقلاب آگیا۔ یہاں تک کہ شروع میں تو پادری بھی مطمئن تھے۔" وضع قوانین کے لیے ایک دیوان یا قانونی مجلس قائم کی گئی اور قانون، مسلمان، عیسائی، یہودی، دہریے، سب کو ایک نظر سے دیکھنے لگا۔

اموی خلفا کے زمانہ میں اور اُنکے بعد بھی ہسپانیہ کی حکومت متعدد شعبوں میں تقسیم کی گئی۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ یورپین قوموں نے تقسیم حکومت کے بعض اصول اُن سے اخذ کیے۔ بلکہ سید امیر علی کا بیان ہے کہ یہ تقسیم بعض حیثیتوں میں آج کل کی حکومت کی ترتیب سے بڑھ چڑھ کر تھی۔

مرکزی حکومت صوبوں اور شہروں کی حکومت کے جزئیات میں دخل نہ دیتی تھی اور نسق خراج کے مناسب طور پر تقسیم کر لینے پر اکتفا کرتی تھی۔ شہر بلکہ چھوٹے چھوٹے قصبے آپ اپنی حکومت کے امانت دار تھے اور بڑے

شہروں میں تو مجالس شوریٰ بھی ہوتی تھیں۔ فوج میں کام کرنا عربوں اور بربریوں کے لیے ضروری تھا اور خوف و خطرہ کے اوقات میں جبریہ بھرتی سے بھی کام لیا جاتا تھا۔"

اسی رسالہ میں کسی "کاررار" صاحب نے "سلیمیات" کے عنوان سے مولانا سلیم کی مجوزہ اصلاح رسم الخط کی روشنی میں پچاس سال بعد کی اُردو کا نمونہ پیش کیا ہے:

"ایک حساب داں جج کی فہانت عجیب وغریب تھی۔ ایک مرتبہ اُسکے پاس مقدمہ آگیا۔ ہال دریافت پر کہا گیا کہ دو شخص بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک کے پاس تین روٹیاں تھیں، دوسرے کے پاس پانچ، اتنے میں ایک تیسرا جو مسافر معلوم ہوتا تھا آموجود ہوا۔ دونوں نے دعوت دی اور تینوں نے مل کر ناشتہ فرمایا مسافر چلتے وقت آٹھ درہم دے گیا۔ جسکے متعلق جھگڑا شروع ہوا۔ پہلے نے تجویز کی کہ درہم آدھے آدھے بانٹ لیے جائیں۔ لیکن دوسرے نے کہا کہ روٹیوں کا لحاظ کرتے ہوئے پہلے کو تین درہم ملیں اور دوسرے کو پانچ۔"

جامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں جامعہ میں "ہندوستان کی معیشت زرعی" کے عنوان سے ایک سلسلہ مضامین شایع فرمارہے ہیں۔ اگست نمبر میں "عطاء دیوانی" کے بعد کی حالت پر روشنی ڈالی ہے۔ ہر محب وطن ہندوستانی کے لیے ایسے مضامین کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ ذیل کا اقتباس پڑھکر اندازہ ہوگا:

"کمپنی کو حقوق دیوانی کیا ملے، سونے کی کان ہاتھ آگئی۔ اور ان تاجروں نے اس سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔ ہندوستان سے جو مال خرید کر باہر بھیجا جاتا تھا اُس کی قیمت کوئی ساڑھے تین لاکھ پونڈ ہوتی تھی، حکم ہوا کہ ۵ لاکھ پونڈ کا مال خریدا جائے۔ شرکت نے طے کیا کہ سارا مال دیوانی کی آمدنی سے خریدا جائے۔ بنگال کی جمعیتہ منتخبہ دسمبر ۱۷۶۶ء کے ایک خط میں لکھتی ہے کہ "جہاں دوسری قومیں اپنا اسباب تجارت فراہم کرنے کے لیے بڑی بڑی شرح سود پر قرض لے رہی ہیں وہاں ہم اپنے وطن کو ایک عظیم الشان مالگذاری کی بچت اجناس کی شکل میں بھیجتے ہیں جو قوم کے لیے اور کمپنی کے لیے خالص منافع کہا جا سکتا ہے۔" لکھنے والے اگر منصف مزاج ہوتے تو اتنا اور لکھتے کہ" اور ایک بدنصیب قوم کے لیے خالص نقصان۔"

ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:-

"کمپنی کے تجارتی اغراض کے لیے تو روپیہ کی ضرورت تھی ہی اور اسکے لیے مالگذاری کا مطالبہ بڑھانا لازمی رہی تھا۔ مزید براں کمپنی کے عہدہ داروں کے ذاتی اغراض بھی اس اضافہ کی حمایت میں تھے۔ کیونکہ وصولیابی کے مصارف نکال دینے کے بعد جو خالص مالگذاری بچتی تھی اُس میں سے ½۲ فیصدی کے حساب سے ملازمین کمپنی کو بٹہ ملتا تھا۔ بٹہ کے متعلق یہاں تک پتہ چلتا ہے کہ اُس میں سے ۳۱ فی صدی گورنر کو دیے جاتے تھے۔ نائب صدر کونسل کو ½۴ فی صدی بقیہ ارکان مجلس منتخبہ کو ½۳ فی صدی بقیہ ارکان کونسل کو ½۱ فی صدی رزیڈنٹ مقیم دربار کو ½۲ فی صدی وغیرہ۔ آقا اور ملازمین کے اغراض جب اس طرح مشترک تھے تو پھر بھلا حصول مقصد میں کیوں نہ کامیابی ہوتی۔"

نگار مولوی صبغۃ اللہ صاحب شہید فرنگی محلی نے "اکبر کی شاعری" پر ... میں پڑھا تھا۔ مرقعے نے اُسے تمام وکمال شایع کیا ہے۔ اسلوب

نمونہ مسلم اکاڈمی
نے اکبر کے پیغام کی

تلاش اور اس کی تحلیل نفسی نے اس مضمون کو اور بھی قابل قدر بنا دیا ہے۔ "جناب شیخ" کے عنوان سے تحریر فرماتے ہیں:

"ایشیا کے دیگر شاعروں کی طرح ہمارے حضرت اکبر بھی شیخ سے سخت ناخوش ہیں۔ لیکن اسلیے نہیں کہ وہ شراب کی مذمت کرتا ہے، ساغر و مینا کا دشمن اور شاہد پرستی کا مخالف ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ انبیا کی اس وراثت سے محروم ہے جو اسکو اسکے علم سند دعوی ہے اور اس لیے کہ ابھی سند ہدایت پر بیٹھ کر ارشاد و تبلیغ کرنے کے بدلے جدید اثرات سے متاثر ہوتا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:

نہیں اب شیخ صاحب کی وہ عادت　　　وضو کی اور مناجات سحر کی
مگر ہاں چائے پی کر حسب دستور　　　تلاوت کرتے ہیں وہ پائنیر کی

ایک جگہ شیخ کی بیکار ضرورت گوشہ نشینی اور زمرۂ کفر سے غفلت برتنے کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں

شیخ تثلیث کی تردید تو کرتے نہیں کچھ　　　گھر میں بیٹھے ہوئے والتیں پڑھا کرتے ہیں

عام ظاہری حالت کا یہ خاکہ ہے

شیخ کی وہ بیج نہیں وہ شیخ کی داڑھی نہیں　　　دوستی مذہب سے ہے پر اس قدر گاڑھی نہیں

اخلاقی پستی اور دنائت کا یہ عالم ہے

خلاف شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں　　　مگر اندھیرے اجالے میں چوکتا بھی نہیں

شیخ کی زن پرستی کی طرف یوں اشارہ ہے

شیخ صاحب کو نہیں شاعر و نکی باتیں سے کام　　　حسن کی قید نہیں بس ہے مسمات سے کام

دوسرے شعر میں شیخ کی زن مریدی کے ساتھ اس امر کی طرف بھی لطیف اشارہ فرماتے ہیں کہ انگریزی تعلیم یافتہ جماعت اور علماء کے درمیان جو خلیج مغائرت حائل ہو گئی ہے اسکو بہت جلد پٹ جانا چاہیے، اور یہ جماعت جو سب سے زیادہ علمائے امت کی توجہ کی محتاج ہے انکی طرف علماء کا جلد متوجہ نہ ہونا ملک و قوم کی بڑی بدبختی ہے۔

شیخ جی گھر سے نہ نکلے اور مجھ سے کہدیا　　　آپ بی۔ اے پاس ہیں اور بندہ بی بی پاس ہے

علمائے ملت جس طرح کو لہو کے بیل بنے رہتے ہیں اور سیاسیات حاضرہ اور دنیا کے موجودہ تغیرات سے بیخبر رہتے ہیں، لیکن اسکے ساتھ اپنے قدیم اصول و وضع پر جو انکی متعصبانہ ضد ہے اور تکفیر و تفسیق امت اور سب و شتم میں یہ لوگ جس قدر آزاد ہیں اسکا فوٹو یہ ہے

حال دنیا سے بیخبر ہیں آپ　　　گو تقدس مآب و شاب ہیں
شیخ جی پر یہ قول صادق ہے　　　چاہ زمزم کے آپ مینڈک ہیں

رسید کتب

۱۔ بادہ ناب - میر ولی اللہ وکیل ایبٹ آباد قیمت ۸ر
۲۔ یاد رسول - خان بہادر مرزا سلطان احمد ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لاہور ۲ر
۳۔ غازۂ روح - پنڈت برج موہن لال عاشق لکھنوی ۸ر
۴۔ میلاد النبی - سید نذیر علی وکیل بارہ بنکی ۲ر
۵۔ تحفہ [illegible] - واصف بنارسی ۸ر
۶۔ [illegible] - سید اولاد حسین شاعر لکھنوی ۸ر

اُردو رسائل کے خاص مضامین

(اگست سنہ ۱۹۲۶ء)

دلگداز - لکھنؤ

(۱) سلطان عالم واجد علی شاہ

زمانہ - کانپور

(۱) صنعت و رعایت
(۲) کربلا (ڈراما)

معارف - اعظم گڈھ

(۱) مستدرک حاکم کا مطبوعہ نسخہ
(۲) فقہ اسلامی کے مذاہب اربعہ
(۳) ارتقائے ادب فارسی عہد اکبر میں

نگار - بھوپال

(۱) غالب کی ذہنیت
(۲) فنون لطیفہ اور اسلام
(۳) ہندوستان کی صنعتی پستی کے اسباب

. . . .

ہمایوں - لاہور

(۱) اسلام کا اثر مغربی تہذیب پر
(۲) رہائی (افسانہ)
(۳) فلسفۂ علم الحیات
(۴) سرگوشیاں

جامعہ - دہلی

(۱) انسان کامل
(۲) ہندوستان کی معیشت زوجی

نیرنگ خیال - لاہور

(۱) میر انیس کی شاعری پر ایک نظر
(۲) آخری ملاقات (افسانہ)

مرقع - لکھنؤ

(۱) تحقیقات امیر
(۲) اکبر کی ...

بسم اللہ

فہرست مضامین بابت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۶ء

نمبر ۴ — جلد ۳۱

نئی کتابیں

فرامین سلاطین

(از مولوی بشیر الدین احمد دہلوی)

اس میں خلجی، سور، مغل، عادل شاہی اور برطانوی بادشاہوں کے ۱۸۰ نادر فرامین جمع کیے گئے ہیں۔ چھ فرمانوں کے عکسی فوٹو اور جناب مصنف اور نظام دکن کی تصویریں بھی شامل کتاب ہیں۔ فرمانوں کے پلیٹ دیکھ کر ناظرین گویا اصلی فرامین دیکھ لیں گے تاریخ کے طلباء کیلیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے قیمت غیر مجلد ہے

آثر دکن

(از مولوی سید علی اصغر بلگرامی ناظم آثار قدیمہ حیدرآباد دکن)

اس کتاب میں حیدرآباد و مضافات بلدہ کی ۴۰ عمارات اور دیگر آثار قدیمہ کے تاریخی حالات بہت محنت جانفشانی سے جمع کیے گئے ہیں اور کتاب کے بیچ بیچ میں ۵۰ عمارات اور انکے کتبوں کے عکسی فوٹو بھی شامل کر دیے گئے ہیں تاریخی اہمیت کے علاوہ یہ کتاب عام شائقین کے لیے بھی بہت دلچسپ، اور حیدرآباد کی سیر کرنے والوں کے لیے ناگزیر ہے۔ قیمت صہ

تفسیر سورۂ اخلاص

(از مولوی غلام ربانی صاحب بی اے نائب مدیر زمیندار)

حضرت امام ابن تیمیہؒ کی لاجواب تفسیر آج نایاب ہے۔ سورۂ اخلاص کی تفسیر حاصل کر کے اسکا ترجمہ شایع کر دیا گیا ہے، اس میں صداقت اسلام کے تمام اصولوں پر شرح و بسط سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ قدامت مادہ تولد مسیح کے متعلق نصاریٰ کے عقائد اور مخالفین اسلام کی دوسری باطل تاویلوں کا نہایت شافی جواب ہے۔ قیمت عہ

کتاب التقدیر

یہ کتاب علامہ ابن قیم کی مشہور کتاب شفاء العلیل کا سلیس اور عام فہم ترجمہ ہے۔ جس میں مسئلۂ قضاء و قدر پر قرآن و حدیث سے نہایت مدلل اور دلآویز بحث کی گئی ہے۔ مسئلہ تقدیر میں آجکل جو غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے اُس کیلیے یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی۔ ہر مسلمان کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

قیمت ۱۲ار

سبد گل

از مولوی سید اولاد حسین شاعر لکھنوی - یہ کتاب ظفرنامہ، ہمارا وطن، ... تاروں بھری رات، برسات، جمال شاعر، نورجہاں، محبت، دوشیزہ کوہسار، میدان ریف کے عنوان ... ان کا دلچسپ مجموعہ ہے - قومی اور اخلاقی نظموں کے قدردان جلد طلب فرمائیں۔ قیمت ... ناظر بک ایجنسی لکھنو

واسطہ تہذیب ظاہری ہوا کرتی ہے اور تہذیب ظاہری احکام شرع کی پابندی سے حاصل ہوتی ہے اسلیے اُسنے مقصد اول یعنی تہذیب باطنی کے بلاواسطہ حصول کیلیے آخر عمر میں تدوین احکام شرع ظاہری کو منزوری سمجھا اور تمام کوششوں کو چھوڑکر اسی ایک دُھن میں آخر تک لگا رہا اور اپنے پیچھے ایک ایسی شرع چھوڑ گیا ہے جو اس کے علوے مرتبت اور اعلیٰ مدارج ذہنی و روحانی کی طرف دلالت کرتی ہے۔

اگر قرآن پاک کے اس ارشاد پر استدلال کیا جائے کہ لِکُلِّ قَومٍ ہاد ہر قوم میں ایک نہ ایک ہدایت کرنے والا آیا ہے، تو ممکن ہے کہ سقراط اپنے زمانہ اور ملک کا پیغمبر ہو۔ جو آوازکہ ہر وقت اُسکے ساتھ رہا کرتی تھی وہ اور اس خیال کو تقویت دیتی ہے۔ اور اگر یہ صحیح ہے تو افلاطون اُسکا شاگرد رشید و خلیفۂ برحق تھا جسنے ایسے علوم کا نشر و اعلا کیا جنکا سرچشمہ نبوت میں نظر آتا ہے۔

واللہ اعلم بالصواب۔

حامد علیخاں

افکار تازہ

(جانشین جلال جناب منشی انور حسین آرزو لکھنوی)

مرنے پہ آہِ گرم کا بازار سرد تھا　　　یارب یہ تھا نفس کا تعلق کہ درد تھا

مجھ سے وفا نہ آپ سے چھوٹی کشیدگی　　　یہ خاکسار آپ کے دامن کی گرد تھا

پروانۂ جمال رُخ ہو شاں رہا　　　پابندِ شوق بھی عجب آزاد مرد تھا

کروٹ بھی جب بدل نہ سکا ناتوان ہجر　　　پھر اور کس مرض کی دوا دل کا درد تھا

بسمل اسے ادا نے اُسے ناز نے کیا　　　جوہر تو ایک جا تھے اثر فرد فرد تھا

دل جلوہ حبیب سے تھا لعلِ شبچراغ　　　ظاہر میں جل رہا تھا حقیقت میں سرد تھا

آرام جاں تو ہیں مگر ایذا رساں بھی ہیں　　　بیٹھے تھے وہ جدھر اُسی پہلو میں درد تھا

اک وقت میں تھے سوز جدائی کے دو اثر　　　شعلہ بنا ہوا تھا نفس جسم سرد تھا

نازک مزاجیوں سے تری رقتِ التفات　　　گو خون بڑھ رہا تھا مگر رنگ زرد تھا

تاثیرِ شوقِ قتل یہ مجھ سخت جاں کی تھی　　　پہلے سے دست و بازوِ قاتل میں درد تھا

آیولینتھی

چوتھا منظر

[ٹرسٹان - جیو فری - اور آیولینتھی]

[آیولینتھی نابینا ہے مگر اُسکے حرکات و سکنات سے اس امر کا اظہار نہیں ہوتا - وہ بلا تکلف چلتی پھرتی ہے کبھی کبھی جیسے سننے کو ٹھہر جاتی ہے اور اُسوقت اپنے ہاتھ آگے بڑھاتی ہے گویا ٹٹولتی ہے اور صرف اسی سے اُسکے آنکھوں سے معذور ہونے کا انکشاف ہوتا ہے - اُسکی آنکھیں کھُلی رہتی ہیں، مگر بسا اوقات زمین کی طرف جھکی ہوئی، اُنکو جنبش بھی کم ہوتی ہے]

آیولینتھی (دروازہ پر) مارتھا! برٹرانڈ!

ٹرسٹان - ارے یہ تو وہی ہے

آیولینتھی - یقیناً میں نے کسی کی آواز سُنی - (آگے بڑھ کر) کون ہے؟

ٹرسٹان - ایک اجنبی جو معافی کا خواستگار ہے، کیونکہ وہ بلا اجازت داخل ہوا اور آپ کے آرام اور اس جگہ کے پُرامن سکوت میں خلل ڈالا -

آیولینتھی - مجھے اپنا ہاتھ دو - تم پہلے یہاں کبھی نہیں آئے ہو نہ میں تمھاری آواز پہچانتی ہوں - راستہ میں برٹرانڈ یا مارتھا نہیں ملے؟

ٹرسٹان - مجھسے کسی سے گفتگو نہیں ہوئی - میں یہاں اتفاقیہ پہونچ گیا -

جیوفری (علیحدہ ٹرسٹان سے) یہ جو برٹرانڈ کون ہے؟

آیولینتھی (سنکر) یہ تمھارے ساتھ کون ہے؟

ٹرسٹان - یہ میرے دوست ہیں، جو نائٹ اور ٹروبیڈور ہیں، اور یہاں سے قریب ہی رہتے ہیں -

آیولینتھی - میں تم دونوں کا خیر مقدم کرتی ہوں کیا تم میرے ساتھ اندر نہیں چلوگے، وہاں باہر سے زیادہ خنکی و تازگی ہے -

جیوفری (جلدی سے) آپ کی عنایت - لیکن ہم یہیں ٹھہرے رہیں گے - (علیحدہ ٹرسٹان سے) میرے نزدیک اسی میں خیریت ہے -

آیولینتھی (جو ابھی تک ٹرسٹان کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہے) تمھارا ہاتھ گرم ہے اور مجھے نبض کی حرکت محسوس ہو رہی ہے - کیا راستہ میں گرمی نے تمھیں تکلیف پہونچائی - پیاس تو نہیں لگی ہے؟ ٹھہرو - میں تمھارے لیے جام شراب لاؤں -

(مکان کے اندر چلی جاتی ہے)

ٹرسٹان - کس قدر خوبصورت ہے - اور ہر خط و خال سے کس قدر خلق و نرم دلی کا اظہار ہوتا ہے - اور اسکی شہر [illegible]

جیوفری [illegible] عجیب و غریب ہے جو دل پہ [illegible] ل گر مضبوط زنجیروں میں جکڑ لینی [illegible] یں خلق شک نہیں کہ وہ

بڑی عالی نسب ہے، لیکن احتیاط شرط ہے۔ پیارے ٹرسٹان، وہ شراب لائے تو پینا نہیں۔

ٹرسٹان - میں اُسکے ہاتھ سے اجل تک بطیب خاطر پینے کو تیار ہوں، آپ شراب کو کہتے ہیں۔

آیو لینیتھی (ایک صراحی اور پیالہ لیکر آتی ہے) یہ شراب میرے والد ہمیشہ پیتے ہیں۔ یہ بہت تیز ہے اور میں نہیں پی سکتی۔ لیکن تم ضرور چکھو! (پیالہ بھر کر ٹرسٹان کو پیش کرتی ہے)

ٹرسٹان (پیالہ لیکر اور پیتے ہوئے) اے نازنیں خاتون، میں آپ کا جامِ صحت پیتا ہوں!

آیو لینیتھی - اب یہ پیالہ اپنے دوست کو دیدو اگر وہ پینا چاہیں - میں تمھارے لیے میوہ لینے جاتی ہوں - خرمے اور انگور یا اور جو تم کہو (پھل توڑ کر ایک ٹوکری میں رکھتی جاتی ہے جو اُس نے میز پر سے اُٹھالی ہے)

ٹرسٹان (شراب کا پیالہ جیوفری کو دیتا ہے) لو جیوفری پیو -

جیوفری - تمھیں اس شراب میں کوئی غیرمعمولی بات تو نہیں معلوم ہوئی - مثلاً سُستی ...... غش ......

ٹرسٹان - بس پی جاؤ - ڈرو نہیں -

جیوفری - تو یہ ہے شراب؟ (پی جاتا ہے) اہا ہا! اصلی سیلوائسی - اس سے بہتر شراب تو بادشاہ رنجی بھی نہ پیتا ہوگا (پھر پیتا ہے) اوہو ہو! کیا عمدہ شراب ہے جہاں ایسی حیات جاوید بخشنے والی شراب ملے بھوتوں کا گذر نہیں ہو سکتا -

آیو لینیتھی (واپس آتی ہے) لو یہ پھل کھاؤ - میں انھیں میز پر رکھے دیتی ہوں -

جیوفری - اے خوبصورت خاتون آپ نے ہماری ایسی ضیافت کی ہے اور ایسی نایاب و خوش ذائقہ شراب پلائی ہے کہ ہمیں کوئی شبہ نہیں رہا کہ ہمارا میزبان ایک امیر اور شریف خاندان کا رُکن ہے - حسن اور شراب، شاعری و موسیقی کے انجم رہبر ہیں - اب آپ میرے الفاظ کو سنیے میں نے فی البدیہہ ایک گیت نظم کیا ہے جو ہماری اطاعت اور احسانمندی کا ترجمان ہوگا - (اپنے ستار پر گاتا ہے)

ہم جانتے ہیں کہ عقاب ہے جب وہ ہوا میں
بڑے بڑے چکر کاٹتا ہے اور غرور کے ساتھ اونچے
بادلوں میں اُڑتا ہے -
ہم جانتے ہیں کہ بلبل ہے جب موسم بہار کی
شبنم آلود راتوں میں اُسکے دلربا نغمے اُبلتے ہیں -
شجاعت و ہنرمندی اور اعتدال نفس سے
ایک بہادر شخص تمام عالم کے دلوں پر اپنی عظمت
کا سکہ جما دیتا ہے -
خوش آہنگ ساز پر گا کر مطرب اپنے کمال
موسیقی کا ثبوت دیتا ہے - محلوں اور باغوں میں
اُسکی عزت کی جاتی ہے -

(دُھن بدل کر)

لیکن جب شریف اور خوشدل مرد اور عورتیں

کے درمیان وہ اپنا ستار چھیڑتا ہے اور اپنے سُریلے اور دلکش گیتوں کی تعریف کا امیدوار ہوتا ہے۔ جب نوعمر و قبول صورت لڑکے جام شراب سب کے سامنے پیش کرکے مطرب کے خیر مقدم کا اعلان کرتے ہیں تو شراب کے ذائقے سے وہ اندازہ کرلیتا ہے کہ ایک شریف خاندان کے سایۂ عاطفت میں ہے۔

آیو لینتھی۔ یہ بہت اچھا گیت ہے اور اس سے تمھاری بلند اور غیر معمولی صلاحیتِ شعر کا اندازہ ہوتا ہے۔

ٹرسٹان۔ میرا دوست پرووانس کے نوجوان ٹروبیڈوروں میں مشہور ہے۔

آیو لینتھی (ٹرسٹان سے) کیا تمھیں بھی نظم و موسیقی میں دخل ہے؟

ٹرسٹان۔ میں ایک مبتدی ہوں، لیکن آپ کی نوازش مجھے ہمت دلاتی ہے کہ میں بھی گاؤں۔ میری نیت سے میرے الفاظ کو پرکھیے۔ (پہلے ستار بجاتا اور پھر گاتا ہے)

شہر کے شور و غل سے پریشان ہوکر میں نے پہاڑوں کا قصد کیا۔ تھکا ماندہ اور مضمحل تھا، دفعتہً ایک وادی نظر آئی جس پہ آفتاب اپنی شعاعیں نچھاور کر رہا تھا، اور جہاں مختلف اقسام کے پھولوں سے مرصع کاری کی گئی تھی۔ یہاں سکون کامل تھا، کسی طائر کا نغمہ تک میرے کانوں کو تکلیف نہیں دیتا تھا، انسان کی آواز یا اور کوئی صدا نہیں آتی تھی۔ اس جادو کی وادی میں ہر چیز پر ایک طلسمی نیند چھائی ہوئی تھی۔ ایک دروازہ کھلا اور ایک نورانی صورت نے ستارے کی طرح میری متحیر آنکھوں کو پرضیا کردیا۔ اے نازنین تو مجھے ایک گلاب کی کلی معلوم ہوئی جس پر شبنم کے قطرے ہوں اور کسی جادوگر نے نیند کو مسلط کردیا ہو۔ تیرے ساتھ گرد و پیش کی ہر شئے پہ سکوت طاری تھا۔ بادِ نسیم تیرے موتی سے رخساروں کا خواب دیکھتی تھی۔ آتشدان کی آگ دھیمی اور نرم جلتی تھی۔ کھجور کے درخت نیند میں گھلتے ہوئے تھے اور اُنکے سر جھکے جاتے تھے۔

ہر چیز میں صرف تیرے سبب سے زندگی ہے اور سب تیری تابع ہیں۔ اور جب تو آرام کرتی ہے تو وہ بھی آنکھیں بند کرلیتی ہیں۔

تو جاگی اور ہوا میں، باغ میں، پھولوں میں ایک روح دوڑ گئی۔ گویا سورج کی کرن نے اُنھیں نیند سے جگا دیا۔

اے تو کہ گلاب کا ایک نازک پھول ہے میرے ناقص گیت کو جو میری سچی اور دلی اطاعت کا مؤید ہے قبول کر، کیونکہ تیرے حسن نے اس کو موزوں کیا۔

آیو لینتھی (تھوڑے سکوت کے بعد جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ سوچ رہی ہے) مجھے اپنا ستار دو! (ستار پر گاتی ہے)

۱۔ تیری عزت کرتی ہوں
کیونکہ کا مسکن اور رقص و

موسیقی کا مخزن ہے۔ جس سے مجھے خاموشی و حیرت کے ساتھ مسرت ہوئی۔

تیرے گیت میں ایسا اثر ہے کہ ہوا بھی دم بخود ہو کر سن رہی ہے۔ اور پھول خاموش کان لگائے ہوئے ہیں۔ تیرے ساز کا نغمہ سننے کو انھوں نے اپنی معطر سانس روک لی ہے۔ شام کے وقت اس وادی کی گھنی جھاڑیوں میں آوارہ بجبے خانماں عندلیب اگر نوا سنج ہوتی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ میرے ستار میں بھی وہی نغمے گونجیں جو اسکی آواز میں ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ میرے گانے میں بھی اسکی طرح روح کے اپنے بازوؤں پر اڑا لیجانے کی قوت پیدا ہو جائے۔ اے اجنبیو! تم نے یہ گانا کہاں سیکھا؟ کیا اسکا مولد وہاں ہے جہاں مشتاق آرزوئیں اور تمنائیں اور ٹھنڈی سانسیں شام کی خواب آلود خاموشی کے ساتھ آہستہ آہستہ ابھرتی ہیں۔

بتاؤ کیا ہوا ے لطیف کے ساکنوں نے تمھیں گانا سکھایا ہے کہ تمھاری موسیقی میں جادو کا اثر اور روانی ہے۔ تمھارے گیتوں نے میرے خیالات کو خوشی سے چمکا دیا ہے۔ میں تمھارا شکریہ ادا کرتی ہوں۔

جیوفری۔ کس قدر بلند شاعری ہے!

ٹرسٹان (آپولینیقی سے)۔ آپ نے ہمارے گیت کو بلبل سے تشبیہ دی ہے۔ کاش میں ان پرندوں میں سب سے زیادہ حقیر اور چھوٹا ہوتا جو اپنے آشیانے اس محل کے قریب بناتے ہیں تاکہ ہمیشہ اُن روح پرور نغموں کو سن سکتا آپ جن کی مالک ہیں۔

جیوفری۔ اے شریف خاتون! مجھے ایک سوال پوچھنے کی اجازت دیجیے جو بار بار میری زبان تک آتا ہے۔ آپ اس جگہ تمام دنیا سے علحدہ رہتی ہیں اور یہ وہ انس کے تمام شریف مردوں اور عورتوں میں سے کسی کو بھی آپ کے غیر معمولی کمالات کا علم نہیں ہے۔ وہ کون سا رک خاندان ہے آپ جسکی فرد ہیں اور آپ کے والد کون ہیں؟

آپولینیقی۔ ہائیں تم میرے والد سے واقف نہیں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے۔ کیونکہ یہاں کبھی کوئی ایسا شخص نہیں آیا جو اُن سے آگاہ نہ ہو۔

جیوفری۔ مجھے اُن کا نام بتایئے۔

آپولینیقی۔ سب لوگ انھیں ریباڈ کہتے ہیں۔

جیوفری۔ ریباڈ! ریباڈ! وہ کوئی نائٹ ہیں؟

آپولینیقی۔ نائٹ!

جیوفری۔ ایسا ہی۔ کیا وہ خود زرہ پہنتے ہیں اور سنہری مہمیزیں لگاتے ہیں۔ اُنکا مشغلہ کیا ہے؟

آپولینیقی۔ یہ تو میں نے کبھی دریافت نہیں کیا۔

جیوفری۔ تو آپ یہاں بند کیوں ہیں؟

آپولینیقی (استعجاب سے) بند!

جیوفری۔ جی ہاں مقید اور تنہا!

آپولینیقی۔ میں تنہا تو نہیں ہوں۔ تم غلطی کرتے ہو۔

جیوفری - تاہم یہاں کوئی نظر نہیں آتا -
آیولینتھی - یہ سچ کہتے ہو کہ اسوقت یہاں کوئی نہیں ہے - میں نہیں سمجھ سکتی کہ سبب کیا ہے، ورنہ میں کبھی تنہا نہیں رہتی - لیکن انتظار کرو میں برانڈ کو بُلاتی ہوں - وہ بھی خوش ہوگا کہ تم یہاں آئے -
(مکان کے اندر چلی جاتی ہے)
جیوفری - اب معلوم ہو جائے گا کہ اس وادی کا مالک کون ہے - تاہم میں اس خیال کو دُور نہیں کرسکتا کہ یہاں کوئی تاریک بھید ضرور ہے اور اس وادی کا مالک پسند نہیں کریگا کہ ہم اُس کی چھان بین کریں - تم نے دیکھا ہوگا کہ اُس دروازہ کی تیاری میں کس قدر ہوشیاری سے کام لیا گیا؛ وہ کائی اور پتھروں اور شاخوں میں چھپا ہوا ہے بند ہونے پر اُس میں اور چٹان میں کوئی فرق نہیں رہتا - میری صلاح مانو تو دروازہ کے قریب ٹھہرو جب تک کوئی آئے میں منتظر رہوں گا، پھر فوراً درہ کوہ کی طرف روانہ ہوجاؤں گا اور دروازہ کو تمہارے بھاگنے کے لیے کھلا چھوڑ دوں گا - تمہارے ساتھی شاید مل جائیں - ممکن ہے کوئی واقعہ پیش آئے - میں اُنھیں لیکر فوراً پہونچ جاؤں گا - ٹرسٹان سنتے ہو؟
ٹرسٹان - ہاں ہاں جاؤ -
جیوفری - کیا تمہارا دل گرفتار ہو گیا اُس نوجوان دوشیزہ کا جادو چل گیا؟
ٹرسٹان - نہیں، مگر میرا دم اُلجھتا ہے، اور تیر کے حواس منتشر ہیں - مجھے یقین ہوتا ہے کہ یہی پُرسکون وادی وہ مقام ہے جسکا میں عمر بھر جویا رہا ہوں - آخر کار یہاں میرا بچپن اور فلک سیر غرور تسکین پا لے گا -
جیوفری (سنجیدگی سے) مگر عزیزمن یہ نہ بھول جانا کہ بادشاہ آرتھی تمہارا منتظر ہے -
ٹرسٹان - میں بادشاہ آرتھی اور اُسکے منصوبوں کی پرواہ نہیں کرتا - کیا ایک صوبہ کے لیے جو قانوناً اور استحقاقاً میرا ہے اور بزور شمشیر حاصل کیا گیا ہے میں اپنی آزادی کو خیرباد کہہ دوں گا اور اپنی قسمت کو اُس کی لڑکی سے وابستہ کر دوں گا - لڑکی بھی وہ جس کو میں جانتا نہیں جسکو کسی نے کبھی دیکھا نہیں - جبکہ میں —— "
جیوفری - تم ہذیاں بک رہے ہو - مگر یہ دورہ جلد ختم ہو جائے گا - اسوقت تم پر جادو کا اثر ہے - اس جذبہ کو جو تپ محرقہ سے بدتر ہے دبائے رکھو -
ٹرسٹان - اگر یہ ممکن ہوتا تو بیشک میں سمجھتا کہ جادو ہے -
جیوفری - خاموش! خاموش! کوئی آرہا ہے -
(آیولینتھی واپس آتی ہے)
آیولینتھ جیو وہاں موجود ہو؟
س مکان کے مالک

آیولینتھی ۔ افسوس وہ سب چلے گئے میں نے
پکارا مگر کوئی نہیں آیا ۔ وہ مجھے چھوڑ گئے ۔
ٹرسٹان ۔ لیکن وہ پھر آئیں گے ۔
آیولینتھی ۔ ہاں تم سچ کہتے ہو ۔ غالباً وہ
انگوروں کی تاک کی طرف گئے ہیں ۔ میں بھی
بعض اوقات وہاں جاتی ہوں ۔ اور اگر نہیں جاتی
تو کوئی نہ کوئی میرے پاس موجود رہتا ہے ۔
جیوفری (ٹرسٹان سے) تم یہاں ٹھہرو گے ؟
ٹرسٹان ۔ بیشک
جیوفری ۔ بہتر ۔ میں دروازہ کی نگرانی کرتا ہوں ۔
(آیولینتھی کو گردن کے اشارہ سے سلام کرتا
اور باہر چلا جاتا ہے ۔ آیولینتھی سلام کا جواب
نہیں دیتی)
آیولینتھی (سنتی ہے) کیا تمہارے دوست جاتے ہیں ؟
ٹرسٹان ۔ وہ ابھی واپس آئیں گے ۔ میں آپ
سے معافی کا خواستگار ہوں اور اپنی خطا کی
تلافی کرنا چاہتا ہوں ۔ مگر آہ آپ ناراض نہ ہوجئیگا ۔
جب آپ سو رہی تھیں تو میں نے آپ کے سینہ
سے یہ زیور اُٹھا لیا تھا تاکہ یادگار کے طور پر اپنے
پاس رکھوں ۔ وہ حاضر ہے ۔
آیولینتھی ۔ کہاں کہاں ؟ (ٹرسٹان وہ طلسمی
نقش اُسے واپس دیتا ہے) زیور اور میرا !
ٹرسٹان ۔ ہاں میرا خیال تو یہی ہے ۔
آیولینتھی ۔ میرا نہیں ہے مگر میں آمارتھا سے
پوچھونگی ۔ (نقش کو میز پر رکھ دیتی ہے)

ٹرسٹان ۔ کیا میں اُمید کروں کہ آپ براہ کرم اسکے بدلے ان
شرمانے والے گلاب کے پھولوں میں سے مجھے
ایک پھول توڑ دینگی ۔ ان میں ایسی رعنائی ہے
کہ کوئی پھول مقابلہ نہیں کرسکتا ۔ یہ معلوم ہوتا ہے
کہ آپ کا چہرہ اُتار لیا ہے ۔
آیولینتھی ۔ گلاب کا پھول ؟ بیشک خوشی سے ۔
(ایک سفید گلاب کا پھول توڑ کر دیتی ہے)
ٹرسٹان ۔ لیکن یہ تو سفید ہے ۔ مجھے وہ سُرخ
گلاب کا پھول دیجیے جو آپ کی طرح خوبصورت ہو ۔
آیولینتھی ۔ تمہارا کیا مطلب ہے ۔ سرخ گلاب ؟
ٹرسٹان (ہاتھ سے بتاکر) اِن میں سے ۔
آیولینتھی ۔ تم خود لے لو ۔
ٹرسٹان ۔ نہیں ! یہی رہنے دیجیے جو آپ نے
انتخاب کیا ہے اور جسے آپ کے نازک ہاتھوں
نے توڑا ہے لیکن میں سچے دل سے آپ کی پسند کی
تعریف کرتا ہوں ۔ کیونکہ یہ سفید گلاب جسکے حلقہ
میں موہوم و مرتعش پیازی رنگ محصور ہے اس
خوشنما باغ کی خواب نما خوبصورتی کا مرقع ہے ۔
ایک گلاب مجھے اور دیجیے مگر وہ بھی سفید ہو
تاکہ ان دونوں کو اپنا طرۂ دستار بناؤں ۔ اور
ہمیشہ اُنھیں آپ کا مخصوص رنگ قرار دوں ۔
آیولینتھی (ایک سرخ پھول توڑ کر دیتی ہے) لو !
تمہارا یہی مطلب تھا نا ؟
ٹرسٹان (چونک کر) میں نے آپ سے سفید
گلاب مانگا تھا ۔

آیولنیتھی - پھر؟ اور یہ ؟
ٹرسٹان (علیحدہ) یہ کیا خیال میرے دل میں آیا۔
(بلند آواز سے) اچھا بتائیے (دونوں گلاب کے
پھولوں کو بلند کرتا ہے اور ان میں ایک اور
گلاب شامل کرتا ہے جو خود اُس نے توڑا) میرے
ہاتھ میں گلاب کے کئے پھول ہیں ؟
آیولنیتھی (ہاتھ پھیلاتی ہے) مجھے دیدو تو بتادوں۔
ٹرسٹان - نہیں - بغیر چھوئے ہوئے بتائیے -
آیولنیتھی - یوں کس طرح بتا سکتی ہوں -
ٹرسٹان (علیحدہ) افسوس! افسوس! وہ نابینا
ہے (بلند مگر لڑکھڑاتی ہوئی آواز سے) مجھے
یقین ہے کہ آپ جانتی ہیں -
آیولنیتھی - نہیں تم غلطی کرتے ہو - اگر میں جاننا
چاہتی ہوں کہ کسی چیز کی شکل کیا ہے یا تعداد میں
کتنی ہے تو میں اسے پہلے چھوتی ہوں - کیا اب بھی
تمھاری سمجھ میں نہیں آتا -
ٹرسٹان (گھبراکر) ہاں بیشک - آپ کا کہنا
درست ہے - تاہم بعض اوقات ------
آیولنیتھی - ہاں ہاں بعض اوقات - بولو! بولو!
ٹرسٹان - میں خیال کرتا ہوں کہ ..... کہ
..... بعض چیزیں ایسی ہیں جن کی تمیز صرف رنگ
سے ہوتی ہے جیسے مختلف اقسام کے پھول اور
کپڑے -
آیولنیتھی - اس سے تمھارا مطلب انکے خواص
و افعال سے ہے - کیوں ؟

ٹرسٹان - نہیں بالکل یہ تو نہیں -
آیولنیتھی - تو پھر کیا پھولوں کی شناخت اس قدر
مشکل ہے - کیا گلاب گول اور نرم اور نازک نہیں
ہوتا - گول جس طرح ہلکی ہوا اور نرم و نازک جس طرح
گرمی کی شام - کیا موگرا گلاب کا ایسا ہوتا ہے.
نہیں، اُسکی خوشبو سے چکراتا ہے جس طرح اُس
شراب سے جو میں نے تم کو دی - اور پھر کیتکی -
کیا اُسکی خاردار پتیاں نہیں چبھتیں جس طرح
برف باری کے وقت ہوا -
ٹرسٹان (علیحدہ) سخت حیرت ہے! (بلند
آواز سے) کیا کسی نے آپ کو نہیں بتایا کہ انسان
چیزوں کو اگرچہ فاصلہ پر ہوں نگاہ کے ذریعہ سے
پہچان سکتا ہے ؟
آیولنیتھی - فاصلہ! ہاں! اُسکی آواز سے
میں پہچان لیتی ہوں کہ ننھی چڑیا چھت پر بیٹھی ہوئی
ہے اور اسی طرح تمام آدمیوں کو اُنکی آواز سے -
وہ تازہ دم گھوڑا جس پر میں سوار ہوتی ہوں میں
اُسکو دور ہی سے اُس کے سموں کی آواز اور
ہنہنانے سے پہچان لیتی ہوں - لیکن نظر؟ یہ تو
مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں - یہ کون آدمی ہے ؟
کیا اس میں بڑی کاریگری صرف کیجاتی ہے یا کوئی
معمولی اوزار ہے - میں اس نظر کو نہیں جانتی -
کیا تم [illegible] یہ کس طرح اور کس لیے
استع [illegible]
ٹرسٹا [illegible] ے خدا یہ تر! اس کو

شان وگمان بھی نہیں کہ وہ نابینا ہے!

آیولنیتھی (تھوڑے توقف کے بعد) تم کہاں سے آئے ہو - تم نے بہت سی ایسی لفظیں استعمال کیں، جنکا سمجھنا میرے لیے ناممکن ہے اور تمھاری گفتگو کی طرز بھی نئی اور عجیب ہے - بتاؤ کیا وہ وادی جہاں تم رہتے ہو یہاں سے بالکل مختلف ہے - اگر تم قیام کر سکتے ہو تو یہاں قیام کرو اور وہ باتیں مجھے سکھاؤ جو میں نہیں جانتی

ٹرسٹان - اے مہربان دنیادل خاتون - میں آپ کو وہ باتیں نہیں سکھا سکتا جنکی آپ کو احتیاج ہے۔

آیولنیتھی - میرا دل کہتا ہے کہ اگر تم چاہو تو بتا سکتے ہو - لوگ کہتے ہیں کہ میں بے کہی نہیں ہوں اور ہر بات جلد سیکھ لیتی ہوں - بہت لوگ جو یہاں آئے انھوں نے کوئی نہ کوئی بات مجھے ضرور سکھائی تم امتحان تو کرو - تمھارا لہجہ نرم اور شریفانہ ہے کیا جب میں تم سے التجا کرونگی تو تم انکار کروگے؟ بولو! میں پوری توجہ سے سننے کو تیار رہوں -

ٹرسٹان - افسوس! اس امر میں توجہ سے کوئی نتیجہ نہ ہوگا - لیکن ایک بات مجھے بتائیے - یہ تو آپ کو معلوم ہو گا کہ آپ کے خوبصورت جسم کا کوئی حصہ بیکار اور بلا کسی مقصد کے نہیں بنایا گیا ہاتھ اور انگلیاں چیزوں کو چھونے اور اٹھانے کے لیے، پاؤں چلنے کے لیے تاکہ جہاں آپ چاہیں پہونچ جائیں - کان سننے کے لیے، زبان گفتگو کا سرچشمہ ہے -

آیولنیتھی - ہاں ان سب باتوں پر میں نے غور کیا ہے - مہربانی کرکے اور بتاؤ -

ٹرسٹان - پھر یہ بتائیے کہ قادر مطلق نے آپکو آنکھیں کس واسطے دیں - یہ دو ستارے کس لیے ہیں جو اس قدر حیرت انگیز طریقہ سے چمکتے ہیں کہ دن کی معمولی روشنی کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اپنے پاس نہیں آنے دیتے -

آیولنیتھی (اپنی آنکھوں کو چھوتی اور کچھ دیر غور کرتی ہے) تم پوچھتے ہو ان کا مقصد کیا ہے - تم کس طرح پوچھ سکتے ہو - میں نے انکے متعلق کبھی غور نہیں کیا - میری آنکھیں! میری آنکھیں! محسوس کرنا تو آسان ہے - شام کے وقت جب جب میں تھک جاتی ہوں تو میرے پپوٹے نیند سے بھاری ہو جاتے ہیں اور پھر وہاں سے نیند میرے تمام جسم میں پھیل جاتی ہے - میری آنکھیں بڑی کام کی ہیں - کیا تمھیں تجربہ نہیں کہ تمھاری آنکھیں کیا کیا ضرورتیں پوری کرتی ہیں - ایکدن میں گلاب کی قلم لگا رہی تھی، ایک چھوٹے سانپ نے تیزی سے آکر میری انگلی میں کاٹ کھایا! ... کی تکلیف سے میں رونے لگی - ایک مرتبہ میں کئی دن تک اداس رہی کیونکہ میرے والد کو کوئی ضرورت پیش آگئی اور وہ نہیں آئے پھر جب وہ آئے تو مارے خوشی کے میرے آنسو نکل پڑے - اور اس طرح میرے دل کو جو ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا تھا آرام ملا -

پھر بھی تم دریافت کرتے ہو کہ خدائے کریم نے آنکھیں کس واسطے دی ہیں - جب میں تھک جاتی ہوں تو انھیں کے ذریعہ سے راحت ملتی ہے انھیں کے ذریعہ سے میرے رنج والم کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے اور انھیں کے ذریعہ سے میری خوشی وجد میں منتقل ہوتی ہے

ٹرسٹان - میری خطا معاف کیجیے - میرا سوال حماقت تھا - آپ کی روح میں ایسی تابندگی پنہاں ہے کہ آپکو اُس روشنی کی ضرورت نہیں جو آنکھوں کے ذریعہ سے مہیا ہوتی ہے - کیا میں یہ خیال کروں کہ آپ کسی ایسی نسل سے ہیں جس میں ہم لوگوں کے علاوہ اور قوتیں بھی ودیعت ہیں - آپ یہاں تنہا زندگی بسر کرتی ہیں - یہ وادی بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جادو کے ذریعہ سے وجود میں لایا گیا - کیا آپ زنگار مشرق سے یہاں آئی ہیں - لیکن اگر آپ اُن لوگوں میں سے ہیں جو دھرتی کو اپنی ماتا کہتے ہیں اگر آپ پر بھی دنیا کی ناپائدار خوشیوں کا اثر ہوتا ہے تو ایک سپاہی کی پرستارانہ محبت قبول کیجیے، اور اُسکا عہد سُنیے - کوئی عورت چاہے وہ کتنی ہی عالی مرتبہ کیوں نہ ہو آپ کے نقش کو اُسکی روح سے نہیں مٹا سکتی -

آیولینتھی (تھوڑے سکوت کے بعد) تمھارے الفاظ میں عجیب غریب طاقت ہے - مجھے بتاؤ کہ تم نے یہ ہنر کس سے سیکھا کہ ان لفظوں کے ذریعہ سے، جو میری سمجھ میں اچھی طرح نہیں آتیں میرے دل کو مسخر کرلیا - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں ایک راستہ سے جو دیکھا ہوا نہیں ہے تنہا گذر رہی ہوں - پھر بھی جو کچھ تم نے کہا اُس نے دل کو موہ لیا - یہ کوئی آسمانی پیغام ہے - آہ اور باتیں کرو - لیکن نہیں خاموش رہو - مجھے دل میں اُن باتوں کو دوہرانے دو جو تم نے کہی ہیں - اُنھوں نے ایذا اور خوشی کو میرے دل میں متحد کردیا! (جیوفری گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے)

جیوفری - فاصلہ پر آدمی ادھر آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں - ہمیں نہ بھولنا چاہیے کہ ہم یہاں یکہ و تنہا ہیں -

ٹرسٹان - (آیولینتھی سے) اے شریف خاتون اب میں رخصت ہوتا ہوں -

آیولینتھی - آہ نہیں! نہیں! تم کہاں جاتے ہو؟

ٹرسٹان - میں دوبارہ آؤنگا اور بہت جلد - آج ہی آؤں گا - لیکن آپ مجھے پہچانیں گی کس طرح -

آیولینتھی - تمھارے لہجہ سے - کسی کی آواز تمھاری ایسی نہیں ہے - میں نے کوئی آواز کوئی گیت ایسا نہیں سُنا جس میں اتنی موسیقیت ہو، جو ایسی سُریلی اور شیریں ہو اور جو دل پر اس طرح قابو کرنے اور جو اس قدر لے دار اور پُرلطف ہو - تم اطمینان رکھو کہ میں مجمع میں بھی تمھاری آواز پہچان لوں گی -

ٹرسٹان - دوبارہ ملاقات ہونے تک رخصت!

آیولینتھی - رخصت [illegible] رخصت! اگر تم دوبارہ آؤگے اور جلد - تم [illegible] منتظر رہونگی -

ٹرسٹان [illegible] ہاتھ کو بوسہ دیتا ہے)

آپ مطمئن رہیے [illegible] - میرا دل اصرار

کرتا ہے کہ دوبارہ آؤں - اگرچہ میں جاتا ہوں مگر اپنے خیالات کا بڑا حصہ یہیں چھوڑے جاتا ہوں اور جو کچھ زندگی باقی ہے یہیں ختم کرنے کو تیار اب ہوں - رخصت! (چوردروازہ سے جیوفری کے بعد باہر نکل جاتا ہے)

آیونیتھی - سنو وہ اُن پہاڑیوں سے گذر رہا ہے جہاں اجنبی قدموں کی آواز اکثر سنائی دیتی ہے - وہ تیزی سے گذر رہا ہے - آہ خاموش! خاموش! اب پاؤں کی چاپ نہیں سنائی دیتی - ہاں پھر سنائی دی! کیا دراصل وہ واپس آئے گا، یا دوسرے مہمانوں کی طرح وہ بھی ایک مرتبہ آکر پھر نہیں آئے گا - آہ مگر نہیں! نہیں! کیا اُس نے وعدہ نہیں کیا؟ کیا اُس نے قسم نہیں کھائی کہ آج ہی واپس آئیگا - اوس گرنا شروع ہوگئی - شام قریب ہے - آہ! آج کسی طرح نہیں آسکتا - شاید کل آئے گا لیکن یہ جگہ لمبی بنجر سونی معلوم ہوتی ہے! (باقی)

اختر - لکھنوی

غزل

از منشی ممتاز علی آہ، تلمیذ منشی امیر احمد امیر مینائی

دولت جو کھو چکے ہیں اُسکو تو رو رہے ہیں — باقی جو رہ گئی ہے اُسکو بھی کھو رہے ہیں
ایسے کہاں کے منصف کب مجکو رو رہے ہیں — وہ داغِ خونِ ناحق اشکوں سے دھو رہے ہیں
دریائے غم میں یارب جو آشنا بنے تھے — منجدھار میں وہی اب کشتی ڈبو رہے ہیں
باتیں بہت بناکر سب ہو گئے کنارے — وہ بھی کھسک نہ جائیں جو ایک دو رہے ہیں
رحم آئے کس کو ہم پر کون اُنسے جاکے جھگڑے — دربار رس ہیں جتنے صاحب کے ہو رہے ہیں
ظاہر میں ہیں مسیحا باطن میں سچّے قاتل — سہلا کے سر کو دل میں نشتر چبھو رہے ہیں
اس پر نظر نہیں کچھ کیا حال ہے اب اپنا — اتنا سبق پڑھا ہے ماضی کو رو رہے ہیں
سورج نکل رہا ہے کچھ روشنی ہے پھیلی — دنیا تو جاگ اُٹھی ہم اب بھی سو رہے ہیں
مژدہ تمھیں غلامو ہے دعوتِ غلامی — صاحب کے خانساماں جوتے بھگو رہے ہیں
امریکہ اور یورپ اپنے جہاز بھرلیں — ایسوں ہی کے لیے تو ہم جوت بو رہے ہیں
مرحوم قوم کی پھر ہوتی ہے آہ برسی — ق — آیا ہے پھر دسمبر اجلاس ہو رہے ہیں
پھر پہلی جنوری کو تم جاکے دیکھ لینا — پھر سال بھر کی کرکے نیت وہ سو رہے ہیں

شیخ محمد ملتانی ثم بیدری قدس سرہ العزیز

گنجینۂ اسرار توحید، خزینۂ نکاتِ تجرید و تفرید، والیِ ملکِ ولایت، ہادیِ راہِ ہدایت، متجلی تجلیاتِ رحمانی، ابوالفتح شمس الدین شیخ محمد قادری ملتانی، رحمۃ اللہ علیہ، جنوبی ہند کے اکابر مشائخ قادریہ میں سے تھے۔ آپ کا مزار مبارک، محمد آباد بیدر (ریاست حیدرآباد) میں ہے اور ملتانی بادشاہ کے لقب سے مشہور ہیں۔ آپ کے والد ماجد کی ولادت ملتان میں ہوئی اور وہیں سے یہ خاندان ہجرت کرکے بیدر آیا تھا۔ اس لئے آپ ملتانی کہلاتے ہیں۔ آں حضرتؒ کا سلسلہ نسب معدن الجواہر میں یہ لکھا ہے:۔

شیخ محمدؒ بن شیخ ابراہیم بن شیخ فتح اللہؒ بن شیخ ابی بکرؒ بن شیخ فخر الدینؒ بن شیخ بدر الدینؒ بن اسبیلار (سپہ سالار؟) فخر الدینؒ بن اسبیلار بدر الدینؒ بن اسبیلار شاہ میناؒ بن شاہ الغوریؒ بن سلطان شہاب الدین غوری الغزنوی رحمۃ اللہ علیہم۔

آپ کے والد اپنے نسب کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ میں ربیع الاسمٰعیلی ہوں۔ یعنے قبیلۂ ربیع کی طرف منسوب کرتے جو معد بن عدنان اور اسی سلسلہ میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں تھا۔ حضرت سرورِ کائنات علیہ الف الف تحیۃ والصلوٰۃ کے شجرۂ نسب میں اس سلسلہ کی کل کڑیاں مذکور ہیں۔ آپ کے جدِ امجد شیخ فتح اللہ اور والد ماجد شیخ ابراہیم قدس سرہ سلطان علاء الدین بہمنی ابن سلطان احمد شاہ ولی البہمنی کے زمانہ میں ملتان سے بیدر تشریف لائے۔ شیخ فتح اللہ ضعیف اور مسن تھے، چند روز میں اُن کا انتقال ہوگیا۔ شیخ ابراہیمؒ بڑے پرہیزگار اور اپنے زمانہ کے علامہ تھے۔ بادشاہ سے ملنے کی آپ نے کوشش کی۔ رشید حریرا ایک عالم مقرب سلطانی تھا۔ اُس نے پہلے وعدہ کیا لیکن آپ کی قابلیت سے اندیشہ کرکے ٹال گیا۔ خدا کی قدرت کہ جامع مسجد میں ایک جمعہ کو بادشاہ سے خود بخود ملاقات ہوگئی۔ آپ نے چودہ علوم میں ایک کتاب تصنیف فرمائی تھی جس کا نام بادشاہ کے نام پر علائی رکھا تھا وہ نذر گزرانی بادشاہ خود عالم تھا، یہ [illegible] دیکھ کر [illegible] ہوگیا اور [illegible] آپ ہی خطبہ پڑھا یا کریں اور اگلے جمعہ کو نیا خطبہ تصنیف کرکے پڑھیے [illegible] لوگ نماز کے لیے

آ ہی رہے ہیں، کافی وقت ہے میں ابھی نیا خطبہ لکھ کر پڑھتا ہوں۔ بادشاہ کو تعجب ہوا اور آپ کو اجازت دی اور جب خطبہ پڑھا تو بہت خوش ہوا اور چھ موضع بطور انعام جاگیر عطا فرمائے۔ بادشاہ کی اس قدر دانی علوم کی وجہ سے آپ بیدر ہی میں رہ گئے۔ اُسکے انتقال کے بعد جب سلطان ہمایوں تخت نشیں ہوا تو چونکہ وہ ظالم تھا، آپ نے اُسکے پاس آنا جانا ترک کر دیا۔ پھر جب ۸۶۵ھ میں سلطان محمد شاہ بہمنی تخت نشیں ہوا تو آپ کو اپنی تعلیم کے لیے طلب کیا۔ اور قاضی شہر مقرر کیا۔ آپ نے اس عہدہ کو باکراہ قبول فرمایا مگر پہلے اٹھارہ شرطیں منظور کرالیں۔ جن میں سے ایک یہ تھی کہ اگر آپ بھی گو بادشاہ ہیں، شرع کے خلاف کرینگے تو حدود شرع کی پابندی لازمی ہوگی۔ بادشاہ نے ان شرطوں کو قبول کر لیا اور آپ ایک عرصہ تک قاضی شہر رہے۔

شیخ ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ایک صاحبزادے تولد ہوئے جن کا نام احمد تھا۔ سنِ رشد کو پہونچنے کے بعد اُن کا انتقال ہوگیا۔ اُنکا مزار موضع کنجر کہ بزرگ واقع بٹنچروہ میں ہے۔ بیٹے کے انتقال کا باپ کو بہت صدمہ تھا۔ اسی رنج و غم کے زمانہ میں آپ نے روح پر فتوح حضرت غوث الثقلینؓ کی طرف توجہ فرمائی۔ وہاں سے یہ اشارہ ہوا کہ تمہارے ایک لڑکا صاحب اسرار پیدا ہوگا جسکا نام ہمارے جد کے نام پر ہوگا۔ چنانچہ شیخ ابراہیمؒ کے گھر میں حمل کے آثار نمایاں ہوئے اور شیخ محمدؒ تولد ہوئے

آفریں باد بر چنیں پدرے — کہ ازو زاد ایں چنیں پسرے

آپ کی ولادت گاہ شہر بیدر ہے جو اس زمانہ میں اعظم البلدان محمد آباد بیدر کہلاتا تھا معدن الجواہر میں ہے کہ آپ کی ولادت باسعادت کے تیسرے سال ہمایوں شاہ ظالم کی وفات ہوئی۔ ہمایوں ۵ شوال ۸۶۵ھ کو مرا ہے، اس لحاظ سے آپ کی ولادت ۸۶۲ھ میں ہوئی چنانچہ آپ کی پیدایش کا یہی سنہ قرار پایا، اور "شمس جہاں تاب" (۸۶۲) تاریخ ہوئی۔ واقعی آپ شمس جہانتاب ہی تھے۔ جسکے طلوع ہونے سے اس دہر ظلمانی کی بہت کچھ تاریکی مٹ گئی۔

ابھی آپ کمسن ہی تھے کہ والد ماجد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ آپ فرماتے ہیں کہ "میں ابھی بچہ ہی تھا اور کچھ نہیں جانتا تھا کہ والد ماجد نے عالم جاودانی کا قصد فرمایا۔ علمائے شہر اور مشائخان صاحب نظر میں سے کسی بزرگ نے میری طرف نظر ہدایت نہ فرمائی"۔ اسی اثنا میں حضرت شیخ المشائخ شیخ حسن جمیلی القادریؒ کا بنگالہ کی طرف سے یہاں آنا ہوا۔ حضرت شیخ چھوٹے

بہتوں اور سوار و پیادوں کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ شہر بیدر کی ایک مسجد میں جو فصیل کے باہر تھی اور مسجد ملک مشرف کے نام سے مشہور تھی مقیم ہوئے اور شیخ محمدؒ کو خود طلب فرما کر بہ اشارت حضرت غوث الثقلینؓ مرید فرمایا۔

شیخ محمدؒ اپنے پیر کی صحبت میں بہت عرصہ تک رہے اور انعام گوناگوں سے فیضیاب ہوتے رہے حتیٰ کہ شیخ حسنؒ کی مراجعت کا وقت آگیا اور آپ رخصت فرمائے بنگالہ ہوئے لیکن شیخ محمدؒ کو اس وقت تک خرقۂ خلافت و اجازت مطلقہ عطا نہ فرمائی جب تک کہ آپ کمالات ظاہری و باطنی سے بدرجۂ اتم بہرہ ور اور عمر کی آخری منزلوں کے قریب نہ پہونچ گئے۔

آپ کو حضرت غوث الثقلین قطب ربانی غوث الصمدانیؓ سے نسبت اویسی اور براہ راست حصول فیض و نعمت کا شرف حاصل تھا اور حضرت بندگی مخدوم شیخ بہاء الدین انصاری القادری دہلوی ثم دولت آبادی سے بھی جن کا مزار مبارک اب بھی دولت آباد ضلع اورنگ آباد دکن میں مرجع خاص و عام ہے اور جو سلسلۂ قادریہ کے مشائخ عظام میں سے ہیں خرقۂ خلافت اور اجازت مطلقہ حاصل تھی۔ حضرت شیخ بہاء الدینؒ اس زمانہ میں شادی آباد مشہور بہ مانڈو میں تھے وہیں سے آپ نے اشارت مبارک حضرت پیر دستگیر پیران پیرؓ اجازت نامہ اور خرقۂ خلافت روانہ فرمایا۔ آپ کا طریقہ تھا ترک دنیا، ذکر اسم الٰہی کبھی تو جہر طور پر اور کبھی پوشیدہ طریق پر اور کبھی نظر معرفت الٰہی، اور رات دن مراقبۂ توحید میں مستغرق رہنا اور سلطنت پروردگار کی ظاہری و باطنی نعمتوں کی شکر گزاری کرنا۔ کبھی کبھی آپ پر حالت تواجد طاری ہوتی۔ ایک مرتبہ کا واقعہ آپ کے صاحبزادہ شیخ بدر الدینؒ فرماتے ہیں کہ ہم سب نہایت ادب سے آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ قلب مبارک پر آفتاب محبت طالع ہونا شروع ہوا اور حالت وجد و سماع ظاہر ہونے لگی حتیٰ کہ ہم لوگ بھی اس نسیم اشتیاق سے مست ہو گئے۔ آپ اسی حالت وجد میں الفاظ جل جلالہ زبان مبارک سے ادا فرماتے اور جس طرف متوجہ ہوتے سجدہ کرتے۔ تھوڑی دیر تک یہ بیخبری کی حالت رہی اسکے بعد رفع ہو گئی۔ ایک دوسری مرتبہ آپ سو رہے تھے کہ ہر بن موسے اللہ اللہ کی آواز نکلنی شروع ہو گئی۔ اور خدیجۂ محترمہ جو قریب ہی تھیں گھبرا گئیں

حضرت مشرف القلوب تھے اور دوسروں کے دلوں [illegible] ں کے خواب
منکشف ہو جاتے اور آپ انھیں بیان فرمایا کرتے [illegible] ہی کی ایک
کامل ذات ایسی تھی جس سے انوار قادریہ اور فیوض سبحانیہ [illegible] ں کو نصیب ہوا کرتی

تھیں۔ حضرت مخدوم شیخ بہاء الدین القادری الانصاری الدولت آبادی کے دو خلیفۂ اجل مشہور تھے۔ ایک حضرت شیخ محمد ابراہیم القادری قدس سرہ العزیز، دوسرے شیخ جلال الدین قادری البرہان پوری۔ ان دونوں کی ذات بابرکات سے پروردگار عالم نے خطۂ دکن کو گلزار فرمایا تھا اور سلسلۂ قادری کی ترقی کا باعث بنایا تھا۔ شیخ جمال بہتری کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک میدان میں تمام اولیا حاضر ہیں۔ ان میں شیخ جلال برہان پوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ صف راستین میں ایستادہ ہیں مگر شیخ محمدؒ کہیں نہیں۔ پھر آگے چلا تو یہ دیکھتا ہوں کہ جناب پیران پیر قدس سرہ العزیز کی گود میں سر رکھے ایک تخت پہ آپ آرام فرما ہیں اور ارشاد ہوتا ہے کہ انھیں ہم نے بلاد دکن پر مسلط کیا ہے۔ یہی شیخ جلال برہان پوری ایک مرتبہ آپ کے پاس سید تشریف لے گئے۔ اور چند روز پاس رہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت کو غرقاً باللہ و حرقاً فی محبۃ اللہ اور مالک حالات و صاحب کشف و کرامت پایا۔ شیخ ایوب تلواری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت شیخی شیخ محمدؒ قدس سرہ العزیز اپنے زمانہ کے خاتم ولایت تھے۔ دنیا و مزخرفات دنیا کی طرف آپ کی طبیعت کسی نہج پر مائل نہ تھی۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ جب تک جان میں جان ہے میں اور وہ دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ آپ کی طبیعت کا تعلق نہ دنیا سے تھا اور نہ عقبیٰ سے۔ صرف اپنے مولا کے دلدادہ و شیفتہ تھے۔

شیخ ابراہیم عرف مخدوم جی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جو آپ کے صاحبزادے تھے روایت کرتے ہیں حضرت والدی شیخ محمدؒ قادری قدس سرہ العزیز میرے کسی کام کے سلسلہ میں گلبرگہ شریف تشریف لیگئے۔ اثنائے قیام گلبرگہ میں حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ کے مزار مبارک کی زیارت کے لیے تشریف لیگئے۔ لیکن گنبد کے دروازہ کے اندر ابھی ایک ہی پیر ڈالا تھا کہ واپس نکال لیا اور لوٹ آئے اور وہاں سے حضرت سید یداللہ حسینیؒ کے مزار پر تشریف لے گئے اور زیارت فرمائی۔ آپ سے میں نے حضرت بندہ نوازؒ کے مزار پاک سے بغیر زیارت واپس ہونے کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ حضرت مزار میں تشریف فرما نہیں تھے اور اپنے رب کی طرف تشریف لیگئے تھے۔ سید یداللہ حسینیؒ موجود تھے۔ انکی روح پرفتوح قبر سے ظاہر ہو کر مجھ سے ملی اور میں ان سے ملاقات ہی کر رہا تھا کہ حضرت سیدی میراں محی الدین عبد القادر جیلانیؒ کی روح پاک نے ظاہر ہو کر مجھے اپنی طرف بلایا اور میں ادھر چلا گیا۔

اس دوران میں خاندان بہمنی کا زوال شروع ہوا، اور بریدیوں کا زمانہ آیا بہمنیوں کے

طعام کی بو تک نہیں آتی تھی۔ ہم حضرتؒ کو رجوع کراتے اور حضرت تسلی و تشفی فرماتے حتیٰ کہ پروردگار نے اپنا فضل و کرم فرمایا۔

اُس زمانہ میں ایک شیخ خانخاناں تھے، اُنھوں نے حضرت بندہ نواز گیسودرازؒ کی کتاب سمرالاسرار پر ایک مرتبہ بہت سے اعتراضات فرمائے اور شیخ ابوالحسنؒ سے جو انکی اولاد میں تھے کہا کہ یا تو انھیں شرع شریف کے موافق بیان کرو ورنہ اپنے جد پر کفر کا فتوےٰ دو۔ شیخ ابوالحسنؒ نے عاجز آکر اس قضیہ کو حضرت شیخ محمد قادریؒ کی خدمت میں پیش کیا۔ چنانچہ آپ نے اُن تمام اعتراضات کی از روئے شرع ایسی توجیہ و توضیح فرمائی کہ سب ساکت و صامت رہ گئے۔ آپ کے تبحر علمی اور تصرف باطنی کا یہ ایک شمہ تھا۔

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ ذات نبوی صلعم اور مولائے کائنات حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہٗ اور جناب غوث الثقلین سیدنا عبدالقادر جیلانی یہ تینوں گو ظاہرا الگ الگ ذاتیں ہیں مگر باطناً ایک ہیں۔ خبردار ان میں فرق نہ کرنا ؎

فرزند خلعت حیات ثانی است   گفتم غلط عین زندگانی است

حضرت غوث الثقلین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا شعر ہے کہ ؎

فما مرنی من النسیم بنفحة   خلیلیة علیتة احمدیة

آں حضرت کا وجود باجود حضرت سرور انبیا صلعم کی خلقت مبارک سے خمیر ہوا ہے، اسی لیے ذاتِ نبوی صلعم سے جناب کو محبت تامہ حاصل تھی۔ پس تینوں بزرگوں کو ایک ہی سمجھنا چاہیے۔ یہ الگ الگ نہیں ہیں

۹۳۵ھ جمادی الثانی میں جب بہادر شاہ والی گجرات نے بھی دکن کا قصد کیا تھا، اس وقت آپ علیل تھے لیکن شفا ہوگئی۔ دوبارہ اسی سال رمضان المبارک میں پھر علالت لاحق ہوئی اور یہ شعر اکثر زبان مبارک پر رہتا تھا ؎

ما بفلک بودہ ایم یار ملک بودہ ایم   باز ہما نجا رویم منزلِ ما کبریاست

لوگوں نے یہ حال دیکھ کر اضطراب ظاہر کیا آپ نے فرمایا کہ "دوس... ارمی خواہد مرا ہم از غایت اشتیاقِ دیدار طاقت انتظار نماندہ" اسکے بعد وصیت و نص... براہیم عرف مخدوم جی کو جو آپ ہی کے طور و طریقوں پر چلا کرتے تھے صاحب سجادہ... نے عرض کی کہ حضور کے طریقہ پر چلنا اور استقامت برتنا مجھے دشوار ہے۔ آپ نے ... طریق باطن پر تھیں قدرت

نہیں ہے تو ظاہری طریقہ ہی پر مستقیم رہو انشاءاللہ تعالیٰ احوال باطنی کی بھی توفیق عطا ہوگی۔ پھر ستائیسویں تاریخ ماہ رمضان المبارک کو یہ وصیت نامہ تحریر فرماکر اس پر ثابت قدم رہنے کی تاکید فرمائی:

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ الحمد للہ الذی خلقنا وخلق احبابنا ومریدنا وخلفائنا والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا ونبینا محمد الهادی صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم۔ امابعد فان الوصیۃ ثابتۃ بدلیل عقلی ونقلی وفعلی ہذا اقول علیکم ان تحذوا بالکتاب والسنۃ ثم باقوال الصحابۃ ومتابعۃ طریقۃ حضرت شیخنا سلطان الاولیاء درۃ البیضا قطب الوجود سیف اللہ الموجود امام المتصرفین رئیس المحبوبین شیخ الثقلین سر اللہ سید السادات سید محی الدین ابی محمد السید عبدالقادر حسنی الحسینی الجعفری الجیلانی رضی اللہ عنہ وارضاہ فی الاقوال والاحوال۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ ہر طرح کی تعریف کا وہی سزاوار ہے جس نے ہمیں اور ہمارے احباب ہمارے مریدین اور ہمارے خلفاء کو پیدا کیا۔ اور درود و سلام ہو جیو ہمارے سردار و نبی محمد پر (صلی اللہ علیہ وسلم) جنہوں نے ہمیں سیدھی راہ بتائی۔ امابعد چونکہ وصیت کرنا عقلی نقلی فعلی تینوں دلیلوں سے ثابت ہے اسلیے میں تم سے کہتا ہوں کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلعم کی پابندی کرنا۔ انکے بعد صحابہ اور انکے تابعین کے اقوال۔ پھر ہمارے شیخ حضرت سلطان الاولیاء درۃ البیضا قطب جو سیف اللہ الموجود امام المتصرفین رئیس المحبوبین شیخ الثقلین سر اللہ سید سادات سید محی الدین ابی محمدؒ عبدالقادر حسنی الحسینی وجعفری الجیلانی کے طریقہ پر اقوال واحوال دونوں میں عمل کرنا رضی اللہ عنہ وارضہ

اس وصیت کے بعد یہ زبانی ارشاد فرمایا کہ فقراء کی خدمت کرو، جادۂ شریعت پر قائم رہو، خدا کی یاد کرو اور اُسکی محبت وعشق وعرفان حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہو اور سوائے حق تعالیٰ کے کسی دوسرے کو اپنا مقصود ومطلوب نہ بناؤ اور سوائے خدائے تعالیٰ کے دل میں کوئی وہم وغم مت لاؤ۔ مردار دنیا پر نظر مت ڈالو اور باطن کو طمع کی آلودگی سے پاک وصاف رکھو جس طرح مشائخ قادریہ نے معہود ومقرر کردیا ہے اسی اسلوب وطریقہ پر عشق وعرفان کی راہ میں گامزن رہو۔ آپس میں موافقت واتفاق رکھو۔ تم میں سے ہر ایک اپنی ماں کی خوشنودی کا طلبگار رہے اور اُنکی خوشنودی ورضا کو میری خوشنودی اور رضا جانے۔ فقراء مسافرین اور سادات کی خدمت کرنا لازم جانو۔ کسی کا دل نہ دُکھاؤ۔ اور حسن خلق، تواضع وقناعت وتوکل کو اپنا طریقہ بناؤ اور خدائے عزوجل کے ساتھ اخلاص کا اور اُسکی مخلوق کے ساتھ مروت کا معاملہ رکھو۔ دین کے کام میں سب بھائی متفق رہیں۔ پنج وقتہ نماز جماعت کے ساتھ ادا کریں اور ہمارے شیخ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ملفوظات پر عمل کریں۔ کسی قسم کا تردد نہ کریں۔

حصول دنیا کی کوشش نہ کریں اور دونوں جہان کے مہمات میں خدائے عزوجل پر توکل واعتماد رکھیں۔

پھر آپ نے ارشاد فرمایا حضرت شیخ ابراہیم مخدوم جی میرے سجادہ پر بیٹھیں اور شیخ بدرالدین اسی طرح خانقاہ کا انتظام کریں جس طرح اب تک کرتے آئے ہیں۔

آپ نے خلافت قادریہ اور اجازت مطلقہ حسب ذیل مریدوں کو عطا فرمائی تھی:۔ شیخ ابراہیم عرف مخدوم جی۔ شیخ اسمٰعیل۔ شیخ اسحٰق۔ شیخ بدرالدین۔ میاں خدا بخش۔ مرزا موسیٰ۔ شیخ احمد۔ قاضی محمد محتسب۔ میاں حسین (بشرطیکہ یہ صاحب جادۂ شریعت پر مستقیم رہیں اور سرکاری نوکری ترک کردیں) سید نعیم اللہ۔ سید حمید رشہدی۔ شیخ عبدالکریم۔ شیخ عبداللہ عرب۔ شیخ نظام ہتنوری۔ شیخ عبداللہ بجنوری۔ شیخ جنید جونپوری۔ میاں راجی محمد گجراتی۔ شیخ یوسف بیجاپوری۔ شیخ بڈہا اودگیری۔ میاں سید علاءالدین۔ سلطان شاہ۔ شیخ گھوڑ ساکن کارنجہ۔ میاں فخو ساکن تلوارہ۔ میاں حسان کوہیری۔

آپ کی طبیعت رمضان شریف کے پورے مہینہ علیل رہی۔ حتیٰ کہ عید کا دن آیا۔ آپنے ہر ایک کو عید منانے کا حکم فرمایا اور آپ خود تمام اشیاء سے فراغت حاصل کرکے ذکر الٰہی میں مشغول ہوگئے، اور مکاشفہ ومشاہدہ الٰہی کے بحر میں مستغرق ہوگئے اور اسی عالم استغراق میں بتاریخ یکم شوال ۹۳۵ھ نداء غیبی یا ایتہا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ کو لبیک کہا اور عمر کی ۶۳ منزلیں طے کرکے اس عالم آب وگل سے عالم قدس کی طرف سدھارے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ؎

بجستم سال تاریخ وفاتش   معلم معرفت در اہل عرفاں
ندا آمد بوے الگشت واصل   محمد شاہ ملتانی نست کامل
۹۳۵ھ

آپ شہر بیدر میں اپنے والد ماجد شیخ ابراہیم قدس سرہٗ کے بائیں جانب دفن ہوئے۔ آپکا مزار اب تک مرجع خاص وعام اور فیض بخش عوام ہے۔

آپ کے پانچ صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں تھیں۔ صاحبزادوں کے نام یہ ہیں: شیخ ابراہیم عرف مخدوم جی۔ شیخ اسمٰعیل۔ شیخ اسحٰق۔ شیخ بدرالدین اور شیخ فخرالدین۔ صاحبزادیوں کے نام یہ ہیں:۔ بی بی مریم۔ بی بی عائشہ۔ یہ دونوں حضرت کی ز.. [illegible] ..ات فرمائیں تیسری صاحبزادی بواجی کہلاتی تھیں اور چوتھی بی بی اللہ دینی تھیں [illegible] بن سید محمد بن جعفر بندہ نواز گیسودرازؒ سے ہوئی تھی۔ انکی بہت اولاد ہوئی

آپ کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ سید محمد جونپوری جو اپ [illegible] ہدیِ موعود کہا کہتے

سے تھے اور جنکے ماننے والے اب بھی حیدرآباد دکن میں بہت ہیں، محمد آباد سید تشریف لائے اور شہر کے باہر قیام فرمایا اور آپ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی لیکن آپ نے اجازت نہیں دی۔ پھر جب اُنھوں نے اصرار کیا تو اپنے چاروں لڑکوں کو اجازت دیدی کہ جا کر انسے ملاقات کریں۔ سید صاحب موصوف نے بہت تپاک سے صاحبزادوں کا استقبال کیا۔ تھوڑی دیر تک گفتگو رہی اسکے بعد رخصت ہوکر صاحبزادے واپس ہوئے۔ شیخ نورالدین فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت والد ماجد قدس سرہ العزیز سے پوچھا کہ حضور یہ صاحب اپنے آپ کو مہدی موعود کہتے ہیں۔ یہ سنکر حضرت نے کسی قدر تامل فرمایا اسکے بعد ارشاد کیا کہ جس طرح قطبیت اور غوثیت کے منازل و مقامات سلوک میں ہیں، مہدیت بھی ایک مقام ہے جس پر جناب سید صاحب فائز ہیں۔ جب اس مقام کی حالت کا غلبہ ہوتا ہے اور سکر پیدا ہوتا ہے تو اپنے آپ کو مہدی موعود کہنے لگتے ہیں۔

آپ انتہادرجہ کے پابند شرع شریف اور متبع سنت نبوی صلعم تھے۔ اور کسی امر میں اُسکے خلاف عمل نہیں کرتے تھے۔ لوگوں کو درویشانہ طریق پر مُرید کرتے تھے اور جس میں استعداد دیکھتے خرقۂ خلافتِ قادریہ سے ممتاز فرماتے تھے۔ آپ کا سلوک سلفِ صالحین کا سا تھا۔ جناب بڑے پیر صاحب قدس سرہ کے ملفوظات اکثر ملاحظہ میں رکھتے اور اُن پر عمل پیرا ہوا کرتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ یہ ملفوظ جامع سلوک مبتدی و متوسط و منتہی ہیں اور بالکل کافی ہیں۔ فقرا اور ضعفاء سے ہمدردی کرتے اور اُن سے بڑی نرمی اور مہربانی سے ملا کرتے تھے۔ آپ کسی کا سوال رد نہیں فرماتے تھے اور جو کچھ پاس ہوتا عطا فرماتے۔ اپنے پیران عظام روح اللہ تعالیٰ ارواحھم کا عرس کیا کرتے تھے۔ خود سماع سنتے اور وجد لایا کرتے تھے۔ اکثر شب جاگتے رہتے۔ صائم الدہر اور قائم اللیل تھے۔ آپ کے روزہ کی خبر کسی کو نہیں ہوتی حتیٰ کہ اہل خانہ اور ملازمین وغیرہ تک ناواقف رہتے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے نماز معکوس بھی پڑھی ہے۔ جب سوتے تو ہاتھ میں تسبیح ہوتی اور ذکر کرتے کرتے آرام فرماتے تھے۔ آپ نے کبھی کوئی جاگیر یا انعام دار اضی قبول نہیں فرمائی لیکن جو نذریں اور فتوح کہ مریدان و معتقدان با اخلاص لاتے محض اُنکی دلجوئی کے خیال سے لے لیا کرتے تھے اور سب کا سب اُسی روز فقرا کو تقسیم فرمادیتے رات تک کوئی شے باقی نہیں رہتی۔ کسی دنیا دار کی تعظیم نہ کرتے اور ملوک و سلاطین کے پاس آمدورفت نہ رکھتے تھے۔ اگر کوئی دنیا دار آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو اُسے نصیحتیں فرماتے اور دنیا کی مذمت کرتے۔ آپ پنجوقتہ نماز با جماعت مسجد میں گزارتے اور اکثر اوقات مسجد ہی میں رہتے جب مکان تشریف لاتے تو حجرۂ مبارک میں مشغول بحق رہا کرتے تھے۔

آپ دُبلے پتلے - رنگ مائل بہ سُرخی اور اوسط قد کے تھے - چہرۂ مبارک منور نظر آتا تھا- زبان بہت فصیح تھی - اپنے زمانہ کے بڑے زبردست عالم تھے اور آپ کے بشرۂ مبارک سے ایک ہیبت عظیم نظر آتی تھی جو کوئی آپ پر نظر ڈالتا رعب سے آنکھیں نیچی کر لیتا تھا -

آپ سے بکثرت خوارق عادات ظہور میں آئے ہیں. کتاب معدن الجواہر مرتبہ شاید قاضی محمد اعظم قاضی سرکار مدک کی تالیف ہے اور سنہ ۱۳۲۰ھ میں مطبع گلزار دکن حیدرآباد دکن میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی بکثرت آپ کے خوارق مذکور ہیں -

آپ کے مزار مبارک کو کاتب حروف نے دیکھا ہے - نہایت اچھی حالت میں ہے لیکن ایک مرتبہ کسی زمانہ میں اُسے شہید کر دیا گیا تھا - چنانچہ آپ کے ایک مرید شیخ شہر اللہؒ فرماتے ہیں کہ یہ خبر سنکر میں بہت متردد و متفکر تھا اسی رنج میں ایک روز بیٹھا ہوا تھا کہ عالم مراقبہ میں آپ کی زیارت ہوئی میں نے سُنا کہ آپ فرما رہے ہیں کہ تم اس ذری سی بات کے لیے کیوں پریشان ہو - محب و محبوب میں حالات واقع ہوتے رہتے ہیں اور ہر ساعت میں ایک نئی صفت اور ہر لحظہ میں ایک نیا منظر نظر آتا ہے محب و محبوب کے حالات میں غیر کو دخل نہیں ہے - کبھی ایسا ہوتا ہے اور کبھی ویسا - کبھی درست کرتے ہیں اور کبھی شکست کرتے ہیں -

اے زخیال ما بروں در تو خیال کے رسد
با صفتِ تو عقل را لافِ کمال کے رسد

گر ہمہ مردم و ملک خاک شوند بر درت
دامن عزت ترا گردِ زوال کے رسد

ہست ز تشنگاہ دل جلوۂ قرب روز و شب
لیک بجلوۂ چناں چشم خیال کے رسد

کنگر کبریائے تو ہست فراز لا مکاں
طائرِ ادراں ہوا جز بپر و بال کے رسد

زاں چمنے کہ لبلبش او رج قدس نمی سزد
گلخنیانِ خاک را بوئے وصال کے رسد

بر در بے نیازیت صد چو حسین کربلا
تشنہ بماند و درگذر تا بہ زلال کے رسد

آیت رحمت از حرم ہست برائے حاجیاں
خسرو بت پرست را جز خد و خال کے رسد

محمد معشوق حسین خاں

مکتوب امیر

النّاظر نمبر ۳ جلد ۱۲ میں میں نے ارشد صاحب تھانوی کا "بیان واقعہ" پڑھا۔ مجھے افسوس ہے کہ تھانوی صاحب کو ایک مختصر استفسار کے جواب میں اسقدر طویل و عریض مضمون لکھنے کی تکلیف برداشت کرنا پڑی اپنے سوانح شاعری اور تو ارد کے امکانات و تجربات کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ارشد صاحب نے میں نے ناواقفیت کا اظہار بھی ضرورۃً کیا تھا جسکو وہ صحیح اور غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ اگر مجھے اُنکی خدمت میں نیاز حاصل ہوتا تو میں براہ راست بغیر آپ کے توسط کے اُن سے التماس کرنے کی جرأت کرتا۔ فاضل تھانوی کا میرے دوست اور ہم عمر و ہموطن، امیر احمد صاحب امیر کے شعر کو میرا شعر سمجھ لینا کچھ زیادہ قابل تعجب نہیں ہے اکثر حضرات کو ایسا دھوکا ہو جاتا ہے۔

جناب میرے دیرینہ مراسم کی بنا پر ارشد صاحب نے یہ یقین فرمالیا ہے کہ میں ۱۷ سال سے متواتر النّاظر کے قارئین میں شامل ہوں اور اسلیے ارشد صاحب سے اور اُنکے کلام سے میرا متعارف ہونا اغلب ہے۔ فاضل مضمون نگار کا یہ قیاس بھی کچھ بیجا نہیں ہے۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ شروع میں النّاظر میرے پاس آتا تھا پھر ایک طویل مدت تک چند حالات کی وجہ سے میں النّاظر کو نہیں دیکھ سکا۔ دو تین سال سے النّاظر کو پڑھنے کا اب پھر موقع ملا ہے۔

میں نے اپنے خط میں ارشد صاحب کے کلام کی تحسین کرتے ہوئے یہ عرض کیا تھا "اسے توارد کہیں گے یا اس سے بڑھ کر کچھ کہنا چاہیے"۔ توارد سے بڑھ کر القا کا بھی درجہ ہے، ارشد صاحب کو خود ظنّوا المومنین خیراً پر عمل کرنا چاہیے اور انصاف سے بھی کام لینا چاہیے۔ جب اُنکے عزیز بھائی شوکت تھانوی کی نظر میں بھی یہ توارد کھٹکتا ہوا معلوم ہوا اور اُنھوں نے بھی سفارش کی کہ ارشد صاحب اپنی بیاض سے اس شعر کو حذف فرمادیں، تو میں بھی اس استفسار پر ملامت کے قابل نہیں ہوں حقیقت میں توارد معجزات سخن میں سے ہے۔ لیکن عملدرآمد یہ ہے کہ جسکا ذہن مضمون حاصل کرنے میں پیشدستی کرتا ہے دوسرا شاعر اس مضمون کو اُسی کے حق میں چھوڑ دیتا ہے۔ ارشد صاحب اگر اپنی فکر مابعد سے دست بردار ہونا نہیں چاہتے، تو چشم مار وشن دل ما شاد۔ مجھے کوئی اصرار نہیں ہے۔ صفدر صاحب اور سحر صاحب کی ساری غزل کا توارد ایک معمہ ہے۔ جسکو میرا ذہن اب تک بھی نہیں حل کر سکا ہے۔

بہر حال میں نے اپنے خط میں ارشد صاحب کی لطافت کلام کا اعتراف کرتے ہوئے اگر اس توارد پر اظہار تعجب کیا تھا تو اس کے معنی قریب یہ نہیں ہو سکتے کہ میں انھیں سرقہ کا ملزم سمجھتا ہوں۔ امید ہے کہ ارشد صاحب بھی میرے الفاظ کے وہی معنی لیں گے جو میرا اصلی مقصود ہیں۔

نفیر آمیر بدایونی

دیوان قائم چاندپوری کا ایک صفحہ

ذیل کی دو غزلوں کی روانی و سلاست سے قائم کے مرتبۂ شاعری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے پہلی غزل کا تیسرا اور دوسری کا چوتھا شعر کس قدر بیاختہ، نرم، اور پُرکیف ہے! جلیل قدوائی

کون چاہے ہے بتاں تم سے مدارا کے تئیں
پر تنک نرم کرو اس دلِ خارا کے تئیں

اُس میں تیرے لبِ میگوں کی کہاں کیفیت
ہم نے دیکھا ہے مئے لعل دوبارا کے تئیں

دیکھ بے وجہ نہ کھو دل کو ہمارے کہ ضرور
آئینہ چاہیے خوبان خود آرا کے تئیں!

دینداری کا ہوں میں شیخ کی بندہ جس نے
دی جلا کفر یہودی و نصارا کے تئیں

بو سے اُس زلف کی مانوس ہے اپنا تو دماغ
لیکے ہم آگ دیں کیا عنبر سارا کے تئیں

ہے جو کچھ ہوش تو کر دیدۂ عبرت سے نگاہ
دیکھ کر حالت اسکندر و دارا کے تئیں

قائم اُس بزم میں تھا کون کہ جس نے نہ پیا
شربتِ مرگ کے اس جامِ گوارا کے تئیں

شکوہ اغیار سے نے یار کی بیزاری سے
جو ہوا ہم پہ سو اس دل کی گرفتاری سے

ہر قدم کوئے بتاں کار گہِ مینا ہے
دیکھیو بچ کے، سنبھالے ہوئے ہشیاری سے

رو کے پوچھا میں میسر ہو ترا کیونکہ وصال
ہنس کے کہنے لگا "طالع کی مددگاری سے"

شور تجھ حسن کا گر عالم علوی میں نہیں
مہر و مہ جھانکے ہیں کیوں پردۂ زنگاری سے!

غافل اُس لب سے بمقدور مدارا ولی تر
گھر اک [illegible] کا جلا ہے اسی چنگاری سے

ہائے ری لپٹیں تری زلفوں کی سبحان اللہ
[illegible] کس نافۂ تاتاری سے

دار سے کا ہے کو منصور نے دیکھا وہ رنج
[illegible]ن ہے ناداری سے

ہائے قائم نہ تری آنکھ پسیجی اک دن
ابر رو [illegible] ہ ا خوف سیہ کاری سے

خُلقِ حسنؓ

ایک دن راہ میں تشریف لیے جاتے تھے — سبطِ اکبرؓ جگر و جانِ رسولِ معصوم
ابنِ زہراؑ و علیؓ روحِ نبیِ عربی — محوِ ذاتِ احدی خاص خدائے قیوم
خلق اِس طرح تھی اُس نورِ مجسم کے قریں — شمع کے گرد ہو جس طرح پتنگوں کا ہجوم
ساتھ میں کہتے ہوئے جاتے تھے خدامِ ادب — مانگنے والو چلو وا ہے درِ فیضِ عموم
جد پیمبر سا ملا ان کو پدر حیدرؓ سا — فرش سے عرش تلک اس گھر کی سخاوت کی ہے دھوم
یہی دلوائیں گے خالق سے نعیمِ ابدی — یہی پلوائیں گے جنت میں رحیقِ مختوم
آنکھیں روشن ہوئی جاتی ہیں زہے نورِ جمال — راہ گلشن بنی جاتی ہے زہے فیضِ قدوم
اسی انداز سے جاتی تھی سواری سرِ راہ — کہ بڑھا مجمعِ حضار سے اک دشمنِ شوم
جس کا سر نشۂ ایماں کے اثر سے خالی — جس کا دل عترتِ احمدؐ کی ولا سے محروم
شان میں شیرِ الٰہی کے وہ روباہ منش — لبِ گستاخ پہ لایا کلماتِ مذموم
دیکھی ظالم کی جو تہذیب سے بیگانہ وشی — غیظ میں آ گئے انصارِ امامِ مظلوم
روک کر سب کو یہ اُس شخص سے فرمانے لگے — وارثِ خلقِ نبی خاصۂ ربِ قیوم
شدتِ رنج سے قائم نہیں شاید ترے ہوش — ورنہ وہ شانِ علیؓ اور یہ کلامِ مذموم
تجھکو کھانے کی ضرورت ہے تو حاضر ہے فقیر — پھیرتے ہم نہیں کافر کو بھی در سے محروم
کہ اگر راحلہ و زاد کی حاجت ہے تجھے — دوں ابھی مرکبِ مخصوص و کفافِ مرسوم
حق دلاؤں تجھے غاصب سے اگر ہے مجبور — یا عوض لوں ترا ظالم سے اگر ہے مظلوم
دیکھ کر خلقِ حسنؓ کو وہ ہوا حلقہ بگوش — عرض خدمت میں یہ کی از پسِ آدابِ رسوم
اے تری رائے رزیں مہبطِ انوار و حکم — اے ترا قلب امیں مخزنِ اسرار و علوم
دشمنوں سے یہ مراعات زہے جوشِ عطا — منکروں سے یہ مدارات زہے فیضِ عموم
بالیقیں آلِ محمدؐ کا یہی ہے دستور — لاجرم شانِ امامت کا یہی ہے مفہوم

زہر کھانے میں دیا سبطِ نبی کو کئی بار — اثر اس کا نہ ہوا آپ کو لیکن معلوم

آخری بار دیا آب میں سمِ قاتل
اشقیا نے نہ کیا خوف خدائے قیوم

منہ تک آنے لگے کٹ کٹ کے جگر کے ٹکڑے
تن سے آنے لگا رُک رُک کے نفس تا حلقوم

ہوگئی آلِ محمدؐ میں قیامت برپا
مچ گئی عترتِ اطہار میں فریاد کی دھوم

پھول کمھلا گیا تاراج ہوا صحنِ چمن
چاند گہنا گیا بے نور ہوئی چشمِ نجوم

سُن کے بیت الشرف خاص سے فریادِ حرم
آئے روتے ہوئے بالیں پہ حسینؑ مغموم

عرض کی آکے برادر سے کہ اے سرورِ دیں
قاتلِ شوم کا ہو نام تو آخر معلوم

گرچہ حبدہ سے بجا طور پہ بدظن تھے مگر
غایتِ حلم سے بولے یہ امامِ مسموم

اس گھرانے میں طریقہ نہیں غمازی کا
کب روا ہے جو کروں گھر میں کسی کو موسوم

ہے گماں راست جو میرا تو نہیں فکر کی جا
اُس سے خود لیگا عوض خالقِ حی و قیوم

ورنہ کیوں ہو کوئی بے جرم گرفتارِ بلا
یہ نہیں شیوۂ اولادِ نبی معصوم

ضیا ایم اے

غزل

یہ کہتے ہیں آہِ رسا کرنے والے
نہیں تیر اپنے خطا کرنے والے

سمجھ بوجھ کر او جفا کرنے والے
کہاں پھر ملیں گے دفا کرنے والے

مرے یا جیے کوئی بیمارِ الفت
سلامت رہو تم دوا کرنے والے

نہ لاتے دمِ مرگ بالیں پہ اُن کو
خدا جانے ہمدم ہیں کیا کرنے والے

ادھر آ کلیجے سے تجھ کو لگا لوں
مرے دردِ دل کو سوا کرنے والے

کبھی آکے بتخانے کی سیر کرلیں
حرم میں تلاشِ خدا کرنے والے

ستم ابتدا ہیں کیے انتہا کے
ہم ابتدا انتہا کرنے والے

دوا سے بھی ناآشنا مجھ کو کر دے
مجھے درد سے آشنا کرنے والے

خدا کی خدائی سے باہر نہیں ہیں
دریت [illegible] اکرنے والے

میں قربان دردِ محبت پہ
کوئی اور ہونگے دوا کرے

باسط بسوانی

تنقیدیں

تاریخ السلف

مؤلفہ مولوی عبدالباری معنی، مطبوعہ عزیزی پریس آگرہ، کتابت طباعت، کاغذ اور سرورق دیدہ زیب ہے۔ اس کتاب میں معنی صاحب نے حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے تذکروں پر بڑی محنت اور جانفشانی سے ایک آزاد مورخ کی طرح تنقید کی ہے، آپ کے سوانح کی بعض تاریخوں کی صحت فرمائی ہے، اور آپ کے ملفوظات کے متعلق مختلف روایات میں باہم تطبیق یا ترجیح کی کوشش کی ہے۔ شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالباری مرحوم کے قلم سے دو دیباچے ہیں۔ "قول فیصل" کے عنوان سے حضرت خواجہ کے بہت مختصر حالات اور "اسلاف کرام" کے تحت میں اُن کے آستانہ نشینوں کے کچھ حالات بھی آگئے ہیں۔

"جہت ترتیب" کے تحت میں "واہمہ پرست معاندین کے توہمات باطلہ اور جارحانہ طریقۂ عمل" کو وجہ تالیف بتایا ہے۔ اسی باب میں اپنا نقطۂ نگاہ تحریر فرماتے ہیں کہ "ہماری یہ تالیف منصفین سے خراج تحسین حاصل کرنے سے پیشتر حاسدین کے ملامت وطعن کا نشانہ بنے گی۔ مگر ہم اس سے مستغنی ہیں۔ اس لیے کہ دنیا کا عام دستور ہے:۔ مہ نور می فشاند وسگ بانگ می زند اسی طرح خاتمۂ کتاب پر "نافہم اور غلط بیں نکتہ چینوں" کو بھی ایک چیلنج دیا گیا ہے۔ یہ وجہ تالیف، یہ نقطۂ نگاہ اور یہ چیلنج ایک خاک نشین آستانۂ عالیہ کو کہاں تک زیب دیتا ہے، اس کا تصفیہ ارباب بصیرت بخوبی کر سکتے ہیں۔

سیدالعارفین پر تنقید فرماتے ہوئے لکھتے ہیں "متفق علیہ یہ مسئلہ ہے کہ ۵۶۱ھ میں حضرت غوث پاکؒ نے عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف قدم رنجہ فرمایا" اور اسی بنا پر سیرالعارفین کی ولادت کی تاریخ کی تغلیط کی گئی ہے، مگر "قول فیصل" میں خود جناب مؤلف نے تاریخ وصال ۶۳۲ھ قرار دیا ہے۔ تذکرہ نویسوں ہی سے نہیں مؤرخوں سے بھی کبھی کبھی اس قسم کی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ اس سے قطع نظر تنقیدی حیثیت سے کتاب بہت بلند ہے۔ دنیائے اُردو حضرت سلطان الہند کی مفصل روئداد کے لیے بے چینی سے منتظر ہے۔

روئداد اُردو

مرتبہ مسٹر رشید احمد صدیقی (علیگ) سکرٹری انجمن اُردوئے معلی مسلم یونیورسٹی، علیگڈھ۔ انجمن اردوئے معلی (مسلم یونیورسٹی) نے اُردو کی اہمیت، توسیع اور اشاعت کے متعلق چند ضروری استفسارات شایع کیے تھے۔ بعض ہمدردان اُردو نے جو جوابات ارسال کیے اُنکی ایک رپورٹ "روئداد اُردو" کے نام سے مسلم یونیورسٹی جوبلی کے موقع پر قوم کے سامنے پیش کی گئی تھی۔ اس روئداد میں اُردو کی ترقی کے لیے ایک سے ایک اہم اور قابل قدر تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ کاش انجمن اردوے معلے اُن میں سے ایک بھی انجام دے سکتی! علیگڈھ کے پُرجوش نوجوانو! سنو، اکبر کہتا ہے:

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں، سید کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں

بچوں کا قاعدہ

مرتبہ مولوی سجاد مرزا ایم اے (کینٹب) صدر مہتمم تعلیمات صوبہ گلبرگہ۔ پتہ: دی حیدرآباد بکڈپو، چادرگھاٹ، حیدرآباد دکن۔ قیمت ۴؍

مولوی سجاد مرزا صاحب نے اس قاعدہ کو کنڈر گارٹن کے اصول پر مرتب کیا ہے، اور بچوں کی نفسیات کے مطابق قاعدہ پڑھانے کے طریقہ میں بہت کچھ اصلاح کردی ہے۔ شروع میں "عرض" کے عنوان سے اُن جدید اصول تعلیم کی تشریح کی گئی ہے جن کو پیش نظر رکھکر یہ قاعدہ مرتب کیا گیا ہے۔ بچوں کو کتاب اور پڑھنے لکھنے سے دلچسپی پیدا کرادینا ابتدائی تعلیم کا سب سے اہم مقصد ہے، اسکے لیے یہ کتاب نہایت موزوں ہے جس میں بچے کو رٹانے اور رٹانے سے پرہیز کرنا سکھایا گیا ہے۔ تحریر جلی اور کاغذ اعلیٰ ہے، کہ پڑھنے میں آنکھ اور دماغ پر ذرا بھی زور نہ پڑے۔ پوری کتاب میں ۵۸ تصاویر ہیں جن سے لڑکوں کو بہت دلچسپی ہوگی۔ اور سرورق کی رنگینی نے تو کتاب کو بالکل کھلونا بنا دیا ہے۔ آخر میں حالی کی ایک آسان حمد ہے جسے بچے بہت خوشی سے حفظ کرلیں گے۔ غرضکہ ہر حیثیت سے یہ قاعدہ دوسرے جدید قاعدوں پر فوقیت رکھتا ہے، اور اس قابل ہے کہ اسکو ہر مدرسہ میں رواج دیا جائے۔

فطرت اطفال | مترجمہٗ مولوی حامد حسن صاحب قادری اڈیٹر اخبار سعید (کانپور) حجم ۶۴ صفحے قیمت ۸ؔ/ ملنے کا پتہ:۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علیگڈھ۔

یہ کتاب "دی سائنٹفک ٹرننگ آف چیلڈرن" مصنفہٗ کرسچین ڈی لارسن کا اُردو ترجمہ ہے۔ اس میں بچوں کی تربیت کے لیے بہت آسان اور قابل عمل اصول اور انکی نفسیات پر عام فہم بحث کی گئی ہے۔ بچوں کی امزجہ، رجحانات طبعی، تربیت، تخیل، احساسات لطیفہ، ملکۂ نقالی، تاثرات فطری، اور تعمیر سیرت کے سات عنوانوں پر کتاب کو تقسیم کیا گیا ہے اور آخر میں انگریزی مصطلحات اور اُنکے اُردو ترجمے بھی شامل کردیے گئے ہیں۔ زبان سلیس اور پاکیزہ ہے۔

مطلع الانوار | مصنفہٗ حضرت امیر خسرو دہلوی، مولفہٗ مولوی محمد مقتدیٰ خاں شروانی۔ حجم ۲۳۶ صفحے، کاغذ اور لکھائی چھپائی اچھی ہے۔ قیمت قسم اول عہ، دوم ۓ، سوم ۓ

عرصہ ہوا مسلم یونیورسٹی علیگڈھ نے حضرت امیر خسرو دہلوی کا کلام جمع اور شائع کرنے کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ اس غرض سے اُنکی کتابوں کی ایک فہرست تیار کرائی گئی اور مسودوں کی تلاش ہونے لگی۔ اس فہرست میں سے کئی کتابیں شایع کی جاچکی ہیں۔ زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ تاریخ اور ادب کے طلباء اس خدمت کے لیے مسلم یونیورسٹی کے ممنون رہیں گے۔ شروع میں چھیاسٹھ صفحے کا مقدمہ ہے، جس میں مولف نے مثنوی اور اُسکے عنوانوں کا تعارف کرایا ہے۔ اگر خسرو کی شاعری اور اُنکے سوانح حیات پر بحث نہیں کی گئی تو چنداں حرج نہیں۔ اس سے پیشتر کی مثنویوں کے ساتھ ان مباحث پر بہت کافی مواد شایع ہوچکا ہے۔ مگر چونکہ یہ مثنوی "نظامی گنجوی کی مثنوی مخزن الاسرار" کے جواب میں تھی لہذا ان دونوں کا موازنہ ضروری تھا۔ ایک اور اہم فروگذاشت یہ ہوئی ہے کہ مختلف نسخوں کا مقابلہ نہیں کیا گیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے یہاں ابھی تک تصنیف و تالیف کا صحیح ذوق نہیں پیدا ہوا ہے ورنہ شروانی صاحب اس اہم فرض کو آسانی [illegible] دیتے۔

نیچیر محبت | مصنفہٗ مولوی محمد سلیمان واصف بنارسی عہ، ملنے کا پتہ: ہریسن روڈ۔ کلکتہ۔

جناب واصف کے اس تاریخی افسانہ میں یہ دکھانے کی کوشش [illegible] پانسو ہندوؤں کے لشکر [illegible] کاٹ کر نکل سکتا ہے اور دس مسلمان ہزار دو ہزار ہندوؤں کو شکست [illegible] دیں۔ اہل عقیدت معاف

فرمائیں) ایسی ہی غلط فہمیاں ہماری معکوس ترقی کی ذمہ دار ہیں۔ اس وقت تو اہل ملک کو ایسے لٹریچر کی ضرورت تھی جو زخمی دلوں پر مرہم کا کام کرتا۔

سیرت نگاری کی حیثیت سے یہ ناول بہت معمولی ہے۔ فسانہ کا احصل یہ ہے کہ اسلامی فوج کا ایک افسر حسن، سادھو کے بھیس میں پرتھوی راج کی فوجی نقل و حرکت کا پتہ لگانے جاتا ہے اور وہیں راجکماری پاربتی پر عاشق ہو کر عرصہ تک مقیم رہتا ہے۔ کون یقین کرے گا کہ جس فوج کے افسر ایسے غیر ذمہ دار ہوں وہ ایک جرار ہندو لشکر کو فاش شکست دیگی۔ تاریخی غلطیاں بھی ہیں۔ نمونہ کے لیے آٹھویں باب کی پہلی سطر ملاحظہ ہو "پاربتی خیمہ کے وسط میں ایک کوچ پر پڑی کروٹیں بدل رہی ہے" کہاں ہندوستان کا ہندو عہد اور کہاں کوچ پر کروٹیں بدلنا! زبان پر کہیں کہیں اُردو شاعری کا تاریک سایہ پڑا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں "فوجوں کے رعب سے دریا کا پانی تھر تھر آتا ہے۔ آسمان کا عکس متزلزل نظر آرہا ہے۔۔۔" پہلا باب سیدھی سادھی تاریخ ہے جسکو اصل پلاٹ سے کچھ سروکار نہیں۔ ناظرین کو یہ خشک حصہ مجبوراً پڑھنا پڑتا ہے۔ واصف صاحب نہایت آسانی سے اس باب کو نظر انداز کر سکتے تھے۔

میلاد حبیب مولفہ مولوی حبیب حسین صاحب رودلوی۔ حجم ۱۲۸ صفحے۔ قیمت ۸ ر پتہ: سجاد حسین عبد الرزاق تاجران، نواب بازار، قصبہ رودلی (بارہ بنکی)

میلاد حبیب یا تذکرہ رحمۃ للعالمین حصہ اول میلاد شریف کی محفلوں میں پڑھنے کے لیے لکھا گیا ہے۔ پہلے ۷۸ صفحوں میں نماز، روزہ، زکوۃ، حج، حقوق العباد، احکام خدا، اقوال رسول، سرود، دو عالم میدان عمل ہیں کے عنوانوں سے سات لکچر ہیں۔ پھر نظام المشائخ سے "معجزات سرور انام" نقل کر لیا ہے اور آخر میں ذکر ولادت شریف ہے۔ اس بے ڈھنگی ترتیب کے علاوہ نفس مضمون بھی قابل شکایت ہے۔ محفل میلاد وعظ و نصیحت کے لیے نہیں۔ اسکی غایت اصلی یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم کے سوانح زندگی اس طرح بیان کیے جائیں کہ سامعین کو اپنی روزمرہ زندگی میں اُنکی تابعیت و تقلید کا شوق پیدا ہو۔ طباعت و کتابت معمولی ہے اور سرورق پر عین وسط میں کتاب کا اشتہار ہے۔

ماں بچہ کی نگہداشت مولفہ مولوی محمد ظفر ایم اے ایل ایل بی وکیل گوڑگانوہ۔ مطبوعہ قیصر ہند پریس دہلی۔ حجم چھوٹی تقطیع کے ۶۲ صفحے۔ قیمت ۶ر

جناب مولف نے ایک ننھے بچہ کے انتقال کی یاد میں یہ رسالہ مجسٹریٹ ضلع کی نذر کیا ہے۔ یہ ایک قابل غور بات ہے کہ نئی تہذیب کے زیر اثر ہندوستان کی مائیں قدیم خانگی علاج اور اصول تیمارداری سب روز بروز بھولتی جاتی ہیں۔ لیکن جس رفتار سے پُرانی چیزیں متروک ہو رہی ہیں اُس رفتار سے صحت اور تیمارداری کے جدید اصول نہیں سکھائے جاتے۔ یہی جہالت بچوں اور ماؤں کی عبرتناک شرح اموات کی ذمہ دار ہے۔ مولوی محمد ظفر نے اسی جہالت کو رفع کرنے کے لیے یہ عام فہم رسالہ لکھا ہے جسمیں اسباب اموات، شیر خوار بچوں کی حفاظت، زچہ کی داشت اور دودھ سے متعلق مفید معلومات درج ہیں۔ ان معلومات کے ماخذ کا پتہ نہیں۔ غالباً کسی انگریزی رسالہ کا ترجمہ ہوگا۔ بہرحال کتاب بہت مفید ہے اور ہر گھر میں موجود ہونی چاہیے۔

سید

پچھلے مہینے کے رسالے

اُردو

انجمن اُردو لکھنؤ کی سالانہ کانفرنس منعقدہ سنہ ۳۴ء میں مولوی مسعود حسن ایم اے لکچرار لکھنؤ یونیورسٹی نے "اُردو شاعری پر اعتراض کی نظر اور تحقیق کی نگاہ" کے عنوان سے ایک محققانہ مضمون پڑھا تھا جو رسالہ اُردو کے پچھلے نمبر میں شائع ہوا ہے (جولائی کا پرچہ ستمبر میں آیا ہے اس لیے اسے ہم تاخیر سے پیش کر رہے ہیں)۔

اُردو شاعری میں ایک عاشق کے کئی رقیب ہوتے ہیں، اور معشوق، عاشق سے زیادہ اُس کے رقیبوں پر مائل رہتا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا اعتراض تھا۔ پروفیسر مسعود حسن اس کا جواب دیتے ہیں:-

غزل میں سرگذشت عشق کا بیان عاشق کی زبان سے ہوتا ہے۔ شرح اسکی یہ ہے کہ خود عاشق ہی کی نگاہ ہے جو رقیب پیدا کرلیتی ہے۔ وہ معشوق کو محبت کے دائرہ کا مرکز سمجھتا ہے۔ اُسکے نزدیک ساری دنیا کو اُس پر فریفتہ ہونا ہی چاہیے۔ اور نفس انسانی کا خاصہ ہے کہ ادھر کوئی خیال دل میں جما، اُدھر قدم قدم پر اُسکے ثبوت ملنے لگے۔ معشوق کسی سے یا کوئی معشوق سے ہنسکے بولدیا اور عاشق نے اُسے اپنا رقیب سمجھ لیا۔ پھر رشک اور بدگمانی جو عشق کی ایک منزل کے لوازمات ہیں، عاشق کی قوت متخیلہ کو متحرک کر دیتی ہے اور خیالوں کا سلسلہ اسے نہ معلوم کہاں سے کہاں پہونچا دیتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ میں نے تو معشوق کو فلاں شخص سے صرف معمولی بات چیت کرتے ہوئے یا ہنستے بولتے ہوئے دیکھا ہے، مگر ان دونوں میں نہ معلوم کتنی بے تکلفی ہوگی، نہ معلوم کتنی محبت ہوگی، نہ معلوم کیا کیا راز و نیاز کی باتیں ہوتی ہونگی، جنسے میں بالکل محروم ہوں، اور ایک اسی شخص پر کیا منحصر ہے، نہ معلوم ایسے خوش نصیب کتنے اور ہونگے جنسے معشوق ایسی ہی رسم و راہ رکھتا ہوگا۔

.... عشق کی پُر اسرار کیفیتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جس سے بے انتہا محبت ہوتی ہے اُسی سے ملتے ہوئے ایک حجاب سا ہوتا ہے۔ خود عاشق تو اس بیباکی کے ساتھ معشوق سے مل نہیں سکتا جس طرح دوسروں سے ملتا ہے۔ مگر جب وہ معشوق کو اپنے سے زیادہ دوسروں سے بے تکلف دیکھتا ہے، تو بدگمانی اُسکے کان میں کہہ دیتی ہے کہ معشوق کو تجھ سے اتنی محبت نہیں جتنی اوروں سے ہے۔ مگر ہو سکتا ہے کہ حقیقت بالکل برعکس ہو۔

ایک اور اہم اعتراض یہ ہے کہ اُردو کی عشقیہ شاعری میں معشوق ہمیشہ طبقۂ ذکور سے ہوتا ہے۔ یہ بات خلاف فطرت بھی ہے اور مخرب اخلاق بھی۔ اسکے متعلق مولوی مسعود حسن صاحب :

"ہمارے شاعروں نے ایشیائی حیا کے تقاضے سے معشوق کے ... پردہ ڈالدی ہے

کہ دیکھنے والے اُسے پہچان نہ لیں۔ یہ رازداری اکثر اس حد ... لینا کیا یہ

سمجھنا بھی دشوار ہے کہ معشوق جنس ذکور سے ہے یا جنس اناث ... یا معشوق کے لیے

مذکر فعل لانا معشوق کے مرد ہونے کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔ اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ غزل کے جن شعروں میں معشوق کا طبقۂ نسواں سے ہونا مسلم ہے اُن میں بھی معشوق کے لیے مذکر ہی فعل یا صفت وغیرہ لائے ہیں۔ مثلاً

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں ‌ ‌ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

یارب پڑی رہے مری میت اسی طرح ‌ ‌ بیٹھے رہیں وہ بال پریشاں کیے ہوئے

...... تیسری وجہ یہ ہے کہ غزل میں شاعر کسی خاص شخص کا عشق کسی مخصوص شخص کے ساتھ نہیں دکھاتا۔ وہ مجرد جذبۂ عشق کی تصویریں کھینچتا ہے۔ عشق کی دنیا کے واقعات بیان کرتا ہے۔ عاشق اور معشوق کی شخصیت یا جنسیت سے اُسے بحث نہیں ہوتی بلکہ انکے باہمی تعلقات سے۔ عاشق و معشوق کا بیان تو محض اسوجہ سے کرنا پڑتا ہے کہ بغیر انکے ذکر کے عشق کا بیان ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ اگر کوئی شخص یہ بتانا چاہتا ہو کہ سیاہی کسے کہتے ہیں تو لامحالہ اُسے کسی سیاہ چیز کی طرف اشارہ کرنا ہوگا۔"

معارف

اس نمبر میں پروفیسر ضیا احمد صاحب ایم اے نے "ارتقاے ادب فارسی" کے عنوان سے متاخرین کی خصوصیات پر بحث کی ہے اس کا اقتباس نمونۃً پیش کیا جاتا ہے:-

اب متاخرین کے دور میں تہذیب و تمدن میں ترقی ہوگئی تھی اور اسباب تعیش کی ہر طرف فراوانی تھی، اسوجہ سے انکی قوت تخیل نے اگلوں کی پامال روش پر چلنا اور پرانے اسلوب بیان کو برتنا پسند نہ کیا لامحالہ خیالی اور فرضی استعارات ایجاد کیے گئے اور بناء الفاسد علی الفاسد استعارہ در استعارہ سے کام لیا گیا اور اس طریقہ سے شاعری کی زمینوں میں مجاز کے گھوڑے دوڑنے لگے۔ یہ نیا انداز بیان لطیف ہونے کے ساتھ جبتک قریب الفہم رہا کچھ مضائقہ نہ تھا مگر عہد اکبری کے بعد مضمون آفرینوں کی ایک جماعت پیدا ہوئی جسنے شاعری کو گورکھ دھندا بنا دیا۔ شعر کی تعریف یہ کیجاتی تھی کہ نفس کو انبساط یا انقباض ہو لیکن جلال، اسیر، شوکت، بخاری، بیدل، وغیرہ کے کلام سے "طبیعت" کو تو ضرور انقباض ہوتا ہے باقی خیر صلاح۔ گویا اس دور کا کلام بجاے اسکے کہ قلب کی تفریح کا ذریعہ ہو دماغ کی مشق کا سامان بہم پہونچاتا ہے اور اس کی تہ کو پہونچنے کے لیے اُسی کد و کاوش کی ضرورت ہوتی ہے جو ایک مسئلہ ریاضی کے حل کرنے کے لیے درکار ہے۔ نظم پر موقوف نہیں بیدل وغیرہ کی نثر میں بھی یہی عالم نظر آتا ہے۔ خود فیضی و عرفی وغیرہ کے معاصر ظہوری کی تصنیف دیکھ جاؤ۔ تصنع اور اغلاق کے سوا کچھ نہ پاؤ گے۔ ہمیں ان باکمالوں کی خصوصیت یا اُنکے کمال سے انکار نہیں۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس روش خاص نے اس دور میں خاقانی جیسے تو بہت پیدا کر دیے مگر سعدی جیسا ایک بھی پیدا

نہ کیا۔ غرض یہ کہ اس طریقہ سے نفس مضمون واضح اور ذہن نشین ہونے کے عوض اور تاریک و مبہم ہو گیا اور تشبیہ جو محض مقصود بالغیر تھی مقصود بالذات بن گئی۔

زمانہ زمانہ کے ستمبر نمبر میں مسٹر علی عباس حسینی ایم۔ اے۔ نے "غالب کا مذہب" کے عنوان سے ایک ناقدانہ مضمون سپرد قلم فرمایا ہے۔ جس میں اُنھوں نے غالب کو مذہب اثنا عشری کا پیرو ثابت کیا ہے۔ مگر غالب کے مذہب سے متعلق اُسکے کلام اور خطوط میں متضاد شہادتیں ملتی ہیں۔ اگر اُنکی تردید بھی فرما دیتے تو بہتر تھا۔ ذیل کا اقتباس آپ کے ملاحظہ کے لیے پیش کیا جاتا ہے:۔

"مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو مسیلمہ کو نبوت خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو نومسلموں کو ابوالائمہ کا ہمسر مانتے ہیں، دوزخ اُن لوگوں کے لیے ہے ...... مقطع نبوت کا مطلع امامت، اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہیں ثم حسنؓ ثم حسینؓ اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام ......" اب اسکے بعد غالب مرحوم کی شیعیت میں شک ایک بیجا سی بات ہوگی۔ نہ کوئی ذی ہوش اس سے انکار کر سکتا ہے نہ اسکے ماننے میں پس و پیش۔ لیکن اسی کے ساتھ ہی میں یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ غالب کی سی بے تعصب ہستیاں آجکل کی مکدر دنیا میں بھی ہمارے لیے شمع ہدایت بن سکتی ہیں، بشرطیکہ ہم اُنکے نقش قدم پر گامزن ہونے کے لیے خود بھی تیار ہوں۔ اے کاش ہندوستان سے آپس کے تعلقات میں یہ سنی و شیعہ، ہندو و مسلمان، گورے اور کالے کی تفریق اُٹھ جاتی اور ہم ایک دوسرے کو بھائی سمجھنے لگتے اور اس طرح شیر و شکر ہوکر رہتے کہ ہر مذہب و ملت کا آدمی ہم کو اپنا ہی سمجھتا اور ہم کو اپنا کہنا باعث فخر و نمود جانتا!"

نگار ستمبر کے نگار میں محمد عبدالقادر سرور بی۔ اے کا ایک ماخوذ مضمون تنظیم تمدن پر شایع ہوا ہے ایسے پُر از معلومات مضامین اُردو رسالوں میں بہت کم نظر آتے ہیں۔ مذہبی علویت (Theocracy) کی برکات پر بحث کرتے ہوئے ایجاد تحریر کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"... تحریر پریشان کن اور غیر مفہوم اشکال اور اشاروں کے مراحل طے کرتی ہوئی آخری ہزار قبل مسیح کے شروع میں سادہ، آسان اور پڑھنے کے قابل شکلیں اختیار کرلیتی ہی یہ وہی زمانہ ہے جبکہ یونانیوں نے پرانے رسومات، عادات اور خرافات کے قیود کو توڑنا پھوڑنا شروع کر دیا تھا۔ یہ بات قابل یادداشت ہے کہ پرسی پولس کی چٹانوں کے کندہ کتبے جو ایک صدی قبل ماہرین آثار قدیمہ کے اُکسانے اور خط مثلث کے رازوں کو طشت از بام کرنے کا باعث ہوے۔ اس وسیع ترین مگر کم ترین تنظیم یافتہ [illegible] ات کے شہنشاہوں کی یادگاریں ہیں جن پر یونانیوں نے حیات قوم [illegible] ا۔ خط مثلث کی یہ تحقیق جو خط تصویری ہی کے اصول پر ہوئی اپنے [illegible] علاوہ اور کئی گتھیوں کے سلجھانے میں بیحد مفید ثابت ہوئی۔ ان محنت [illegible] خداداد

قابلیت سے کام لینے والوں کی اَن تھک کوششوں کا یہ صلہ ملا کہ قدیم واقعات کی توثیق اور جدید واقعات کے انکشاف سے گویا ایک "جہانِ دیگر" وجود پذیر ہوگیا جو آج عجائب خانہ لوور میں قوانین شاہ ہامورابی کی شکل میں محفوظ ہے۔ یہ دونوں خط اپنی تخلیق کے وقت بلحاظ حالت ایک جیسے تھے مگر رفتہ رفتہ تاریخی اختلافات کی وجہ سے جس تہذیب کے ماحول میں انھوں نے پرورش پائی، اُسکی مجسم مثال بنگئے۔ مصری تحریر نے اپنی بہت سی پیدائشی خصوصیات کو محفوظ رکھا اور مصریوں کی طرح اپنے پیدائشی وطن سے قدم باہر نکالنا گوارا نہیں کیا، لیکن خط مثلث وسیع ممالک میں منتشر ہوگیا۔ جن جن قوموں نے اُسکو اپنی گود میں لیا، اسکو اپنے طور پر پال پوس کر بڑا کیا اور یوں اس نوجوان نے اپنی جبلّی عادتیں کھودیں۔ حتیٰ کہ دو ہزار قبل مسیح ہی میں، جس وقت شاہ ہامورابی کی معاشرتی تعلیمات قلمبند کیجا رہی تھیں یہ تحریر آرمینیا، ایشیاے کوچک، اور خود مصر کے شمالی حدود تک پہونچ گئی تھی۔ مصر کے خط تصویر کی ایجاد اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ مصریوں میں نقشہ کشی کس حد تک ترقی کرچکی تھی! مصری خط ارتقاء کے مختلف مدارج میں مختلف شکلوں میں نمودار ہونے کی وجہ سے متاخرین کے لیے کسی قدر پریشان کن بنگیا ہے۔ پہلے تو مصری جس شے کے متعلق کچھ کہنا چاہتے اُسکی تصویر کھینچدیتے بعد میں یہ تغیر ہوا کہ مطلوبہ شے کا اظہار اُسکی فرضی تصویر کے ذریعہ کیا جانے لگا۔ آخر کار خاص خاص چیزوں کے لیے خاص خاص علامات مقرر کرلی گئیں اور یہی حروف کا کام دینے لگیں۔"

ہمایوں

میجر عطاء الرحمن بی اے نے ہمایوں کے ستمبر نمبر میں "موجودہ فنِ مصوری پر ایک نظر" کے عنوان سے جدید ہندی مصوری پر ایک مختصر مگر ناقدانہ مضمون لکھا ہے۔ آرٹ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس اقتباس کو غور سے ملاحظہ فرمائیں:۔

"زیادہ تعداد ہمارے جدید مصوروں کی ایسی ہے جو انسانی اعضاء کی بناوٹ اور تناسب (Anatomy) سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ مصور بننے سے قبل اُنھوں نے یہ ضروری علم حاصل نہیں کیا۔ اور اب ان نقائص کو جو اصل میں اُنکی ناقابلیت کی وجہ سے پیدا ہوگئے ہیں، انڈین آرٹ کی خصوصیات بنا کر اُسے بدنام کررہے ہیں۔ انسانی اعضاء تو علیحدہ رہے یوروپین مصور پھولوں، پودوں اور درختوں کی ٹہنیوں اور پتّوں کا مطالعہ کرتے ہیں، تاکہ مختلف اقسام کے پودوں میں جن مختلف طریقوں سے چھوٹی ٹہنیاں بڑی شاخوں میں سے نکلتی ہیں اُنھیں تصویر میں کما حقہٗ ادا کرسکیں، گویا وہ مصوری کے لیے علم نباتات کا بھی حاصل کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمارے مصور جس زمانہ یا قوم کے افراد کی تصویر بناتے ہیں اُنکے عادات واطوار، طریق زندگی، بلکہ لباس تک کی طرف بالکل توجہ نہیں

کرتے - جس طرح عموماً ہمارے تھیئٹروں میں ایکٹروں کے لیے ایک خاص قطع کا لباس مقرر کرلیا گیا ہے اور خواہ ڈرامہ کا محل وقوع چین ہو یا امریکہ، مصر قدیم کا واقعہ ہو، یا الف لیلہ کا قصہ یا شکسپیر کا ڈرامہ، رومۃ الکبرےٰ کا زمانہ ہو یا جارج پنجم کا، بادشاہ، اُمرا، فوج کے افسر، ہیرو ہیروئن، مذاقیہ اور اور قسم کے کیرکٹر اپنے اپنے پارٹ کے مطابق ہمیشہ وہی لباس پہنے ہوئے نظر آتے ہیں - یعنی جو لباس ایک دن خاقان پہنے ہوئے ہے، وہی دوسرے دن کنگ لیر کے بدن پر دیکھا جاسکتا ہے - اسی طرح بعض مصوروں نے اپنی تصاویر میں دکھانے کے لیے ایک خاص قسم کا لباس اختراع کرلیا ہے جیسا دنیا کے کسی ملک میں نہ کبھی پہنا گیا نہ آجکل پہنا جاتا ہے - اُنکی تصاویر فقط لباس سے پہچانی جاسکتی ہیں - مختلف اقوام کے خط و خال مختلف ہیں - تاتاری النسل، آریائی، افریقی، اور عربی اقوام کے چہروں اور بدن کی ساخت میں بیّن فرق ہے ..... اب اگر کسی قدیم یونانی دیوتا کے چہرے کے ساتھ بدن پر ہندوستانی یا ایرانی یا اختراعی لباس دکھایا جائے یا لیلیٰ کی تصویر دیکھنے سے یہ معلوم ہو کہ کسی جاپانی ماہ وش کو عربی لبادہ پہنا کر کھڑا کردیا ہے، اور بہادر ارجن پر ہلاکو خاں کے بیٹے کا شبہہ گذرے تو ان باتوں کو مذاق سلیم کہاں تک گوارا کرسکتا ہے - خواہ تصویر بذاتِ خود رنگ وغیرہ کے لحاظ سے کتنی بھی دلفریب کیوں نہ ہو - یورپ کے مصور ایک تصویر تیار کرنے کے لیے بعض اوقات دور دراز ممالک کا سفر اختیار کرتے ہیں تاکہ وہاں کے حالات کا اپنی آنکھ سے مشاہدہ کرسکیں، اور لائبریریوں سے پرانی کتب لیکر جس زمانہ کی تصویر بنانا مقصود ہوتا ہے اُسوقت کے لباس اور طرز معاشرت کی باریکیوں کے مطالعہ میں مہینوں کی کاوش صرف کردیتے ہیں -

جامعہ

دانتے اپنی نظم (Divine Comedy) "الروایۃ الالٰہیۃ" کے باعث دنیا کے سب سے بڑے شاعروں میں گنا جاتا تھا - یہ ایک طویل نظم ہے جس میں جنت اور دوزخ کے مناظر کی تصویر کھینچی گئی ہے - یہ تصویر اُس عہد کے مسیحی خیالات سے بالکل مختلف ہے - ایک مدت سے شارحین کو اُسکے ماخذ کی تلاش تھی مگر اب تک کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی - حال میں میڈرڈ یونیورسٹی کے عربی پروفیسر میگوئیل آسن نے اس کی تاویل کی ہے کہ یہ سب کا سب محی الدین عربی کی تصنیف اور دیگر اسلامی روایات سے ماخوذ ہے - عبد العلیم احراری صاحب نے اصل مضمون کا خلاصہ جامعہ میں شایع کرایا ہے - اس میں وہ تمام داخلی و خارجی دلائل آگئے ہیں جن کی بنا پر پادری موصوف نے یہ بے تعصبانہ دعوےٰ کیا ہے - ہمیں افسوس ہے کہ طوالت کے خوف سے ہم اُن دلائل کو ناظرین الناظر کی خدمت میں نہیں پیش کرسکتے - ذیل کا اقتباس البتہ حاضر ہے :-

"اگر یہ نظریہ کہ دانتے نے ابن عربی کا نقشہ اپنے ... ے مسترد بھی کردیا
جائے تو یہ بدیہی مشابہت یا تو ایک ناقابل حل معمہ ... لعقول معجزہ -
اب صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ کیا ... تا ان ہے کہ دانتے

کو اسلامی ادب سے واقفیت رہی ہو۔ اس مسئلہ پر تین قسم کی شہادتیں پیش کیجا سکتی ہیں۔
(۱) یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ عہد وسطیٰ میں مسیحی یورپ نے باہمی تعلقات کی بنا پر مسلمانوں کے مذہب، عقائد و رسم و رواج اور آخرت کے تصور کے متعلق کافی علم حاصل کر لیا تھا (۲) اسکا امکان ہے کہ دانتے نے بالواسطہ یا بلا واسطہ اسلامی ادب سے اپنی نظم کے لیے مواد حاصل کیا ہو (۳) اسکی شہادتیں۔ جو دہیں کہ وہ ادب اسلامی سے شوق رکھتا تھا اور اس کا اثر بھی اُس پر پڑا تھا۔ اسلام ان ممالک کی فتح کے بعد جو عرب کے متصل تھے بڑی سرعت کے ساتھ اندلس، جنوبی فرانس، اطالیہ اور سسلی میں پھیل گیا۔ جنگ کے زمانہ میں بھی دو قومیں بہت جلد ایک دوسرے سے واقف ہو جاتی ہیں اور یہاں تو ایک مدت تک اسلامی اور مسیحی تہذیبیں امن کے ایام میں دوش بدوش رہی ہیں۔ عرب تجار برابر روس اور شمالی یورپ میں جایا کرتے تھے اور کبھی کبھی تو فلینڈ، ڈنمارک، اور آئرلینڈ تک پہونچ جاتے تھے۔ اسکے علاوہ اندلس اور سسلی میں جو باہمی تعلقات تھے اُن کا پوچھنا ہی کیا۔"

قوس قزح

قوس قزح کے سالانہ نمبر میں سید وقار احمد صاحب بی لے ایل ایل بی نے "مثنوی اور میر تقی میر" پر ایک ناقدانہ بحث کی ہے اور آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے:

"میر صاحب کی مثنویات میں کوئی بات ایسی نہیں پائی جاتی جو اقتضائے حال کے موافق نہ ہو، اور نہ ان میں کوئی ایسی بات ہے جو دوسری بات کی تکذیب کرے۔ غرض جہاں تک فن کا تعلق ہے میر صاحب کی مثنویاں خوب ہیں، مگر ان میں قصہ پن نہیں ہے۔ اسلیے دوسرے مثنوی نگاروں سے انکا مقابلہ مشکل ہے۔ مگر باانہمہ ایک خاص حیثیت سے میر صاحب کا درجہ تمام مثنوی نگاروں میں بڑھا ہوا ہے اور وہ انکا اخلاقی پہلو ہے۔ میر صاحب کا درجہ غزل گوئی میں وہی ہے جو میر حسن کا مثنوی نگاروں میں ہے۔ مگر ہم میر حسن کے متعلق یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اُنھوں نے اخلاقی پہلو نظر انداز کر دیا۔ اُنھوں نے بدر منیر میں بادشاہ کو شرع کا پابند بتایا ہے مگر بینظیر اور بدر منیر کی ملاقات قبل از نکاح کرادی! اسکے برخلاف ہم میر صاحب کے یہاں ایسی باتیں نہیں پاتے۔"

اسی رسالہ میں "طلسمی کتبخانہ" کے عنوان سے محمد شاہ ولی تمینی بی لے نے قصہ کے پیرایہ میں ادبی سرقہ کا نقشہ کھینچا ہے۔ ایک منظر آپ کی دلچسپی کے لیے اخذ کیا جاتا ہے۔ تمینی صاحب کتبخانہ میں خواب دیکھ رہے ہیں:

"عوام الناس کے گروہ کے گروہ ادھر اُدھر گھوم رہے ہیں۔ جب وہ کسی کتاب کو ہاتھ لگاتے ہیں تو وہ عجیب فیشن کے لباس میں تبدیل ہو جاتی ہے اور وہ اسے پہن لیتے ہیں مگر ایک ہی قسم کا لباس زیب تن نہیں کرتے بلکہ کسی کی آستین، کسی کا دامن، کسی کا جبہ کسی کا عمامہ! اسی طرح فرد فرد ٹکڑوں سے اپنے جسم کو سجاتے ہیں، مگر اصلی چیتھڑے پھر بھی کہیں نہ کہیں ضرور نظر آجاتے ہیں...... اس علمی اور ادبی کارخانہ میں

اچانک ہر طرف سے چور چور کی صدائیں بلند ہوئیں ..... اُٹھائی گیرا ور مضامین کے چور مصنف اور موٗلف کتابیں بغلوں میں دبا بھاگنے لگے۔ مگر اصل مالکوں نے اُنکا تعاقب کیا اور سب کے کپڑے اُتار لیے اور اُن سب کو برہنہ تن کمرہ سے نکال دیا۔"

نظام المشائخ نظام المشائخ کے رسوّاں نمبر میں خواجہ حسن نظامی صاحب "جمال" کے عنوان سے پیغمبر اسلام کے بعض خصائل پر روشنی ڈالتے ہوے ہندوستان کی موجودہ افسوسناک حالت پر مندرجہ ذیل تبصرہ فرماتے ہیں۔

"ہندو مسلمان سکھ عیسائی پارسی یہودی، سب ہی ایک دوسرے کے بھائی ہیں، ایک صورت اور ایک قدرت کے انسان ہیں۔ سب کا پیدا ہونا ایک ہے سب کا جینا ایک طرح کا ہے اور سب کا مرنا بھی ایک قسم کا ہے۔ پھر کیوں باہمی کدورت میں مبتلا ہیں اور کیوں ایک دوسرے کی مخالفت پر کمر بستہ ہیں اور کیوں ایک دوسرے کی سچی اور اصلی بات کو سننا نہیں چاہتے؟

ہندوستان میں یہ سب تو لڑ رہے ہیں۔ ہاتھ سے، قلم سے، زبان سے، یہاں تک کہ انکے خیالات بھی اور انکے دل ودماغ بھی لڑ رہے ہیں، مگر کس بات کے لیے اور کس مقصد کے لیے لڑ رہے ہیں۔ اسکی خبر خود اُنکو بھی نہیں ہے اور یہ بالکل نہیں جانتے کہ اس لڑائی کو ایک دن موت آجائے گی اور عقل ایک دن ان سب کو ملا کر ایک کر دیگی۔ اُس دن یہ افسوس کریں گے کہ ہم کیوں لڑے، کس بات پر لڑے اور اس لڑائی میں ہم نے کیسی بے عقلی اور غیر انسانیت کی حرکتیں کیں۔"

سید

رسید کتب

۱۔ ادب العرب	مولوی زبید احمد ایم۔ اے	سے/
۲۔ خطوط شبلی	مولوی محمد امین زبیری و سید محمد یوسف قیصر	عہ/
۳۔ مآثر دکن	مولوی سید علی اصغر بلگرامی ناظم آثار قدیمہ	عہ/
۴۔ حقیقت اسلام	نواب سر امین جنگ کے، سی، آئی	عہ/
۵۔ رپورٹ	مسلم ایجوکیشنل کانفرنس	

اُردو رسائل کے خاص مضامین

ستمبر ۱۹۲۶ء

دلگداز - لکھنؤ

(۱) سلطان عالم واجد علی شاہ
(۲) عنقا

زمانہ - کانپور

(۱) غالب کا مذہب
(۲) قرۃ العین
(۳) کربلا (ڈراما)

معارف - اعظم گڈھ

(۱) امام غزالیؒ اور فلسفۂ اخلاق
(۲) روشنی کی عدم جسمیت
(۳) ارتقائے ادبیات فارسی

قوس قزح - لاہور (سالانہ نمبر)

(۱) سزائے موت
(۲) جودھا بائی
(۳) دلربا دھوکا (افسانہ)
(۴) طلسمی کتبخانہ (افسانہ)
(۵) مثنوی اور میر تقی میر
(۶) قندیل احمر کی ضیاء

اُردو - اورنگ آباد

(۱) اُردو شاعری پر اعتراض کی نظر اور تحقیق کی نگاہ
(۲) نوبل انعام
(۳) ادبی بات چیت

ہمایوں - لاہور

(۱) اسلام کا اثر مغربی تہذیب پر
(۲) موجودہ فن مصوری پر ایک نظر
(۳) انتقام (افسانہ)

نگار - بھوپال

(۱) غالب کی ذہنیت
(۲) حسین کا انجام (افسانہ)
(۳) تنظیم تمدن
(۴) لارڈ ورپن کا عہد حکومت

نیرنگ خیال - لاہور

(۱) انسان بندر کی اولاد نہیں
(۲) شاہان مغلیہ کے اوقات شبا روزی
(۳) اسٹیج
(۴) کوائف ترکی

نظرے خوش گذرے

۲۵-۲۶- ستمبر کو، حجاز کانفرنس کے نام سے جو جلسہ ہمارے شہر میں منعقد ہوا، وہ مہاراجہ صاحب محمود آباد و دیگر تعلقہ داران اودھ کی تمام کوششوں کے باوجود کامیاب نہ ہوسکا۔ اور بجائے اسکے کہ مسئلۂ حجاز میں مسلمانوں کے لیے کوئی متفقہ راہ عمل تجویز کیجاتی، افسوس ہے کہ مزید افتراق کی بنیاد پڑ گئی۔

اعلان کیا گیا تھا کہ اس کانفرنس کی حیثیت ایک ایسے اجتماع کی ہوگی جو مسلمانوں کی تمام بڑی بڑی جماعتوں کا نمایندہ ہو مگر شروع ہی سے طریق کار ایسا اختیار کیا گیا جس نے اس قسم کے اجتماع کو ناممکن بنا دیا۔ پہلی غلطی تو یہ ہوئی کہ داعیان جلسہ میں صرف ایک خیال کے لوگ رکھے گئے۔ حالانکہ جب ملک کے ہر گوشہ اور ہر طبقہ کے نمایندوں کو دعوت دینا منظور تھی تو سب سے پہلے یہی کوشش ہونا چاہیے تھی کہ دعوت دینے والوں میں ہر جماعت کے ممتاز افراد شریک ہوں تاکہ جن لوگوں کو دعوت جائے اُنکو اس بات پر پورا اعتماد ہوسکے کہ یہ جلسہ واقعی ہر طبقہ کے مسلمانوں کی رائے کا نمایندہ ہوگا۔ دوسری غلطی یہ ہوئی کہ دعوت نامہ میں بطور اصول موضوعہ یہ امر ظاہر کردیا گیا کہ حجاز سے نجدیوں کے اخراج کی تدابیر پر غور کرنا اس کانفرنس کا مدعا ہے —— گویا مسلمانوں کی تمام جماعتیں پہلے سے اسپر متحد تھیں اور صرف حصول مقصد کے لیے تعین راہ کی حاجت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ اس حماقت میں مبتلا نہ ہوے تھے اُنکے لیے اس جلسہ کی شرکت کا کوئی موقع ہی باقی نہ رہا۔ تیسری غلطی یہ کی گئی کہ دعوت ناموں کے بھیجنے میں بھی پوری تنگدلی اور تعصب کا اظہار کیا گیا۔ جن لوگوں کے متعلق معلوم تھا کہ مخالف رائے رکھتے ہیں اُنکو یا تو سرے سے دعوت ہی نہیں بھیجی گئی یا ایسے طریقہ پر بھیجی گئی کہ وہ شریک نہ ہوسکیں۔

انھیں سب فروگذاشتوں کا یہ نتیجہ تھا کہ باوجودیکہ ہفتوں پیشتر سے اخبارات میں کانفرنس کا غلغلہ مچ رہا تھا، جگہ جگہ وفود گئے اور کثیر التعداد خطوط [illegible] جاری ہوے لیکن نہ تو ہندستان کے مشاہیر میں سے معدودے چند کے سوا کسی نے [illegible] آیا اور نہ ملک کے کثیر التعداد کارکنوں ہی نے اُسکی شرکت گوارا کی جنکے بغیر [illegible] جامہ پہنانا قریب قریب ناممکن ہے۔ جو چند بندگان شکم مہاراجہ صاحب اور [illegible] کی رہنمائی کو اعلائے

کلمۃ الحق پر ترجیح دیتے ہیں وہ آنکھوں میں خاک ڈال کر مسلمانوں کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ حجاز کانفرنس ہر طرح کامیاب رہی۔ حالانکہ اگر اُن سے پوچھا جائے کہ بنگال کے سب سے بڑے اسلامی صوبہ سے محسن خاں کے سوا جو ضلع بارہ بنکی (اودھ) کے باشندے ہیں، کون سے قومی کارکن یا سردار اس کانفرنس میں شریک ہوئے یا پنجاب سے جو بنگال کے بعد مسلمانوں کی آبادی کے لحاظ سے دوسرا بڑا اسلامی صوبہ ہے، مشہور خدام الحرمین کارکن سید حبیب شاہ کے سوا کون صاحب ایسے آئے جو پنجاب کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے نمایندے کہے جا سکیں یا سرحد کے پُرجوش مسلمانوں کی نمایندگی کرنے والے کون حضرات شریکِ جلسہ ہوئے تو ایک نام بھی ایسا نہیں پیش کیا جا سکتا جو کسی وقعت کا سزاوار ہو۔ ان تینوں اسلامی صوبوں کے علاوہ مدراس، آسام، اڑیسا اور برار کا بھی کوئی نمایندہ نہ تھا۔ سندھ کے اسلامی صوبہ سے صرف ایک پیر مجدد صاحب تشریف لائے، اور صوبہ متوسط سے فرنگی محل کے ایک شاگرد مولوی حامد علی۔ خود بمبئی سے جہاں سے ایک شریف جلسہ کے صدر منتخب کیے گئے تھے باوجودیکہ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک مشہور مذہبی پیشوا کے حکم سے اس کانفرنس میں شریک ہوئے تھے، کوئی بڑی جماعت نہیں آئی۔ اور جو چند آدمی انکی ہمراہی میں آئے بھی وہ بدنصیبی سے ایسے نہیں جنکی شرکت کسی جلسہ کے لیے موجب افتخار ہو۔ صوبجات غیر کے چند اشخاص کے سوا جن میں بہار کے بعض حضرات بھی شامل تھے باقی تمام لوگ اسی صوبہ کے تھے۔ اور ان میں بھی اکثر و بیشتر وہی اصحاب تھے جو خدام الحرمین کے رکن ہیں یا جنھیں مہاراجہ صاحب محمودآباد کی ذاتی دوستی کا فخر حاصل ہے۔

ابھی کچھ بہت زیادہ مدت نہیں گذری جب سنہ ۱۹۱۹ء میں ایک اجتماع تقریبًا اسی قسم کا یہاں منعقد ہوا تھا جسکے اہتمام میں وقت و سرمایہ کی قلت کے ساتھ ساتھ ایک دشواری عظیم یعنی جناب مہاراجہ صاحب محمودآباد کی اس غایت سے پیدا ہوگئی تھی کہ دعوت نامہ پر دستخط کرنے کے بعد جبکہ وہ مطبوعہ طبع ہو چکے تھے کسی کا اشارہ پاکر جناب والاشان نے اپنا نام نامی دعوت دہندگان میں سے خارج کرا دیا اور منتظمین جلسہ کو مجبورًا آپ کی مالی اعانت قبول کرنے سے بھی دستکش ہونا پڑی۔ یہ وہی جلسہ تھا جس میں درحقیقت تحریکِ خلافت کی بنیاد رکھی گئی۔ اور ظاہر ہے کہ اس حیثیت کے جلسہ سے مہاراجہ صاحب ایسے نامور سیاسی لیڈر کو پہلو بچانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو دوسرے عافیت پسندوں اور حکومت پرستوں سے شرکت کی کیا توقع ہو سکتی تھی۔ جو لوگ اُس جلسہ میں شریک تھے یا جنھوں نے اخبارات میں اُس جلسہ کی رُوداد پڑھی وہ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ حجاز کانفرنس کو جہاں تک صوبجات ہند

کی مسلم آبادی کی نمایندگی کا تعلق ہے اُس اجتماع کے مقابلہ میں کیا نسبت رہی -

مقامی خدام الحرمین ارغن نے یہ اعلان کرکے بہت سے لوگوں کو مغالطہ میں ڈالدیا تھا کہ کانفرنس کے لیے تجاویز کا مسودہ جس مجلس میں ترتیب دیا جائیگا اُس میں مجلس خلافت، مسلم لیگ جمعیۃ العلماء، جمعیت تنظیم وغیرہ نصف درجن سے زائد قومی مجالس کے دو دو نمایندے لیے جائینگے اور اختتام جلسہ کے بعد بھی یہی ظاہر کیا گیا کہ مجلس مضامین میں ان قومی مجالس کے دو دو نمایندے شریک تھے - حالانکہ یہ واقعہ کے بالکل خلاف ہے - دوسری جماعتوں کا ذکر نہیں مگر کم سے کم ان چاروں مجلسوں نے تو اپنا کوئی نمایندہ نہیں بھیجا - اور حجاز کانفرنس کے طریق کار سے اختلاف اگر نہیں تو صریح بے اعتنائی کا ثبوت ان مجالس کی بے تعلقی سے بخوبی مل جاتا ہے -

ہرحال کسی نہ کسی نوع کا ایک اجتماع ضرور ہوگیا جس نے دو دن کی متعدد نشستوں میں ایک درجن سے زائد تجاویز مسلمانان ہند کے نامۂ اعمال میں اور اضافہ کردیں - اور غالباً عالیجناب مہاراجہ صاحب بہادر، کارفرمایان مجلس خدام الحرمین اور ہمارے مکرم و محترم جناب اڈیٹر صاحب ہمدم کو پوری دلی تشفی حاصل ہوگئی ہوگی کہ تینوں کی متحدہ اور منفردہ کوششوں نے بالآخر ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں کی طرف سے سلطان نجد و حجاز کے نام اعلان جنگ جاری کرادیا -

لیکن غالباً ان سب اصحاب کو یہ دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی ہوگی کہ ہزاروں روپے کے صرف کردینے اور اپنا اور دوسرے بہت سے لوگوں کا وقت عزیز رائیگاں کرنے کے بعد بھی مسلمانوں نے اُنکی رہنمائی کو قبول نہیں کیا - حجاز کانفرنس کی کارروائیوں پر جو تبصرہ اسلامی پریس میں ہو تا رہا ہے وہ یقیناً منتظمین کانفرنس کے لیے کچھ خوش آیند نہیں ہوسکتا - اور اگرچہ اخبارات کی اس روش عام کو دیکھتے ہوے قطعاً غیر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کانفرنس کی تجاویز پر کچھ لکھنے کی زحمت گوارا کی جائے، تاہم میں چاہتا ہوں کہ کم سے کم بانیان و کارکنان جلسہ کو اس بات پر دلی مبارکباد دوں کہ اُنھوں نے یہ اعلان کردیا کہ حجاز میں غیر مسلم مداخلت کسی طرح گوارا نہ کیجائیگی - اور اس طرح اُس فتنہ کا ایک بڑی حد تک سدباب ہوگیا جو ،، کے پاس ڈیپوٹیشن لیجانے کی تجویز سے پیدا ہونے والا تھا -

رہنمایان خلافت اور اڈیٹر ہمدم کے درمیان یہ امر ں تجویز کا سہرا کسکے باندھا جائے - محترم علی برادران اسے اپنی شرکت جلسہ کا حاصل ... تصور فرماتے ہیں، اور جالب صاحب لکھتے ہیں کہ کانفرنس کے ارباب حل و عقد یعنی فرنگی محل و قیصر باغ کے باہمت

بزرگوں کا یہ مسلمہ مسلک ہے جس کا جلسہ سے قبل اعلان کر دیا گیا تھا۔ ہم اس بارے میں تکلم بننے سے احتراز کریں گے، البتہ یہ عرض کرنے میں تامل نہیں کہ اس اعلان سے بھی پہلے وائسرائے کے پاس ڈیپوٹیشن لیجانے کی ایک تجویز کہیں قیصر باغ یا اُسکے نواح ہی میں منظور کی گئی تھی۔ اور ہمدم کے ذریعہ سے تمام ملک میں مشتہر ہوئی۔

حجاز کانفرنس کی حاصل تجویز یہ تھی کہ جب تک نجدیوں کا اخراج عمل میں نہ آئے حج ملتوی رکھا جائے تاکہ اقتصادی دشواریوں سے تنگ آکر سلطان ابن سعود حجاز کو چھوڑ کر اپنے ملک میں واپس چلے جائیں۔ اس تجویز کی نامعقولیت کے بارے میں غالبًا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ باخبر اور سنجیدہ طبقہ میں کوئی دو رائیں نہیں ہیں۔ کیونکہ جو اخبارات نجدیوں کے حامی و ہوا خواہ ہونے کے مجرم نہیں قرار دیے جا سکتے اور قبوں کی شکست سے بدل ناخوش ہیں اور برابر سال بھر سے اپنی رایوں کا اظہار کر رہے ہیں وہ بھی اس دانشمندی کی داد دینے کے لیے تیار نہیں۔ حتیٰ کہ مولانا محمد علی صاحب باوجود نجدیوں کے اخراج کے خواہشمند ہونے اور التوائے حج کو ایک قوی اقتصادی حربہ تصور فرمانے کے بھی اپنے اخبار میں اس تحریک کو قبل از وقت کہہ کر مردود قرار دیا۔ اور خلافت و مدینہ وغیرہ نے تو خوب ہی مضحکہ اُڑایا ہے۔

لیکن ہمارے خیال میں نہ صرف یہ تجویز قبل از وقت، خلاف مصلحت، غیر مؤثر اور بے سود محض ہے بلکہ سرتاپا ایک مذہبی فتنہ کہے جانے کی سزاوار ہے۔ ارکان اسلام کے متعلق گذشتہ پچاس ساٹھ سال کے اندر مصلحین امت کی اُس جماعت نے جو سچی عقلائے یورپ اور اُن کے مسلمان متبعین سے اسلام کی عظمت منوانا چاہتی ہے اور اس خیال سے ہر مذہبی حکم کو محدود عقل انسانی اور اُسکے وضع کردہ قوانین طبعی سے مطابقت دینا ضروری سمجھتی ہے، طرح طرح کی دنیاوی اور مادی منفعتیں منسوب کر دی ہیں۔ لیکن فریضۂ حج کو بطور ایک اقتصادی حربہ کے استعمال کرنے کا خیال بالکل جدید انکشاف ہے۔ جسکی کم سے کم ہم کسی نہج سے بھی تائید نہیں کر سکتے۔ کہا جاتا ہے کہ قرامطہ کے عہد میں لادینی فقہائے التوائے حج کا فتوے صادر کیا تھا۔ اُس فتوے کو اُس زمانہ کے لوگوں نے کس حد تک قبول کیا، یہ بالکل جداگانہ بحث ہے۔ لیکن کیا کوئی صاحب یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں کہ اُن فقہائے التوائے حج کا فتوے محض اس لیے دیا تھا کہ مسلمانوں کے لیے حج کرنا اُس عہد میں موجب نقصان مال و جان تھا، یا فتوے کی بنیاد اس خیال پر تھی کہ قرامطہ

فقر و فاقہ سے تنگ آکر ارض مقدس کو چھوڑ بھاگیں گے۔

ابھی تک اسی کا رونا تھا کہ مسلمانوں کی کثیر تعداد نے جن میں انگریزی خواں طبقہ اس لحاظ سے نمایاں حیثیت رکھتا ہے کہ اُسے جاہل کہنے کی جرأت نہیں کی جا سکتی اسلام کے چار اول ارکان نماز، روزہ، زکوٰۃ و حج سے تمتع اندوز ہونا چھوڑ دیا ہے اور اس سبب سے ساری برکتیں مسلمانوں سے اُٹھتی جاتی ہیں۔ اب جس فتنہ کا دروازہ ابن سعود نے کھولا ہے اُسکی بدولت قوی اندیشہ ہے کہ کچھ دنوں میں تعلیم یافتہ انگریزی خواں ہی نہیں بلکہ جاہل و ناخواندہ اشخاص تک سرے سے حج کی فرضیت ہی کے منکر ہو جائیں گے۔

جس طرح بڑے بڑے درخت چھوٹے چھوٹے بیجوں سے پیدا ہوتے ہیں اور عرصہ تک زمین کے اندر ایسے دبے رہتے ہیں کہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کلہ کب پھوٹے گا اور ننھا سا تخم درخت کی صورت اختیار کرلے گا۔ بعینہٖ اسی طرح انسانی خیالات کا نشو و نما ہوا کرتا ہے۔ آج ہمارے بعض بھائیوں نے التوائے حج کو بطور ایک اقتصادی حربہ کے استعمال کرنے کا تخم بویا ہے، ابھی لوگ اسے خلاف مصلحت، غیر موثر، ناقابل عمل اور قبل از وقت قرار دیتے ہیں، مگر مجھے تعجب نہ ہوگا اگر رفتہ رفتہ زمانہ کی عمر میں ترقی ہونے کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی نشو و نما پا جائے اور خدانخواستہ ایک وقت ایسا آجائے کہ حج کی صرف اقتصادی مصلحتیں لوگوں کو یاد رہ جائیں اور یہ امر ذہن سے بالکل نکل جائے کہ حج کا مقصود اصلی حجازیوں کی روٹیاں نہیں بلکہ اللہ جل شانہٗ کی اطاعت و عبادت ہے۔

جو لوگ استطاعت نہیں رکھتے یا سمجھتے ہیں کہ باوجود حجاز میں ازمنۂ سابقہ سے بہت زیادہ امن و امان ہونے کے آج کل بدامنی ہے اور اپنے مال و جان کی حفاظت کا یقین نہیں کر سکتے وہ شوق سے قصد حج ملتوی رکھیں مگر یہ کیا ضرور ہے کہ قبروں کی محبت و وہابیت و ملوکیت سے نفرت کی بنا پر مسلمانوں کو ایک فریضۂ دینی کی بجا آوری سے روکا جاتا ہے یا روکنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ مسلمانان ہند کی اکثریت نے اس تحریک کے ساتھ وہی سلوک کیا جس کی وہ سزاوار تھی۔ اور خداوند کریم سے دعا ہے کہ مسلمانوں کو عقل اور آزادی [illegible] نصیب ہو کہ وہ اپنے ہاتھوں اپنی بے آبروئی اور ننگ ہنسائی کرانے سے باز [illegible]

---

۲۰ اکتوبر ۱۹۲۶ء [illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بہترین غزل گو

الناظر جنوری ۱۹۲۶ء کے انعامی نوٹس مین کچھ ایسی دلکشی ہی کہ اُسنے مجھ ناکارہ کو بھی اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ اس عمر مین مقابلہ کا ذوق اور وہ بھی نوجوان انشاپردازون سے مجھ مین موجود نہین ہی۔ اور موجود نہ ہونا چاہیے۔ انعام حاصل کرنے کا لالچ بھی مجھ افسردہ دل کو میدان مقابلہ مین نہین لے جاسکتا تھا۔ اول تو اپنے دل و دماغ کو دیکھتے ہوئے مجھے یہ اُمید ہی نہین ہوسکتی کہ مین اِس میدان کو جیت سکونگا۔ اور اگر یہ واہمہ پیدا بھی ہوجاتا تو بھی اِس گرم موسم مین مشتہرہ رقم انعام میری توجہ کو اپنی طرف مائل نہین کرسکتی تھی لیکن آجکل دنیائے شاعری مین انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانون کی خودروی زبان اردو کو شدید نقصان پہونچارہی ہے اور مین مدت سے اسے محسوس کررہا ہون۔ ممکن ہی کہ غزل گوئی اور غزل سرائی پر میری ناچیز تنقید اُن حضرات کی رہنمائی کا باعث ہو۔ اسی خیال سے بہ حیثیت زبان اردو کے ایک ادنٰے خادم کے مین نے اس مضمون پر قلم اُٹھانیکی جرأت کی ہے۔

انعامی مضمون کا عنوان یہ ہی:-

عہد میر تقی میر کے بعد سے اسوقت تک غزل گوئی مین کون شاعر سب سے زیادہ کامیاب ہوا ہے۔ اسکے بعد مزید ہدایات اور شرایط لکھے گئے ہین۔

میر کے بعد سے اسوقت تک اردو شعرا کی تعداد لاکھون نہین تو ہزارون تک تو پہونچ چکی ہے تذکرہ نگار کا فرض ہے کہ وہ اُن سب شعرا کے کلام اور حالات سے مطلع ہو کر اپنی قوت فیصلہ کو کام مین لائے لیکن ایسی طویل اطلاعات کا بہم پہونچانا ہر شخص کے واسطے آسان نہین ہے اور کم سے کم مجھ ہیچمدان کی طاقت اور ہمت سے باہر ہے اسلیے مین حضرت میر کے عہد کے بعد ہی متصل عہد سے ایک شاعر کا انتخاب کرونگا جس نے اردو غزل گوئی مین کامیابی کا تمغۂ امتیاز حاصل کیا ہے اور رنگ تغزل کو کامیاب بنادیا ہے۔ اِس محترم شاعر کا مقابلہ بھی اُسی عہد کے ایک مشہور شاعر سے کیا جائیگا۔

ناقدین کرام مجھے معاف فرمائینگے کہ مین نے اپنی محدود معلومات کی وجہ سے اُنکے مضمون کے وسیع عنوان کو اپنے اوپر تنگ کر لیا ہے۔

اُردو شاعری اپنے دامن مین بہت سے اصناف سخن کو لیے ہوئے ہے منجملہ اُنکے غزل بھی ہے۔ غزل گوئی مین یہ آسانی ہے کہ ہر شعر مین جدا جدا مضمون ہوتا ہے بخلاف قصیدہ مثنوی اور قطعہ کے کہ ان مین ایک ہی مضمون کو ترتیب کے ساتھ اور سلسلہ کے ساتھ لکھنا ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی اسکے غزل مین یہ دشواری بھی ہے کہ ہر شعر مین یعنے دو مصرعون مین ایک مضمون کو کمال اور ختم کرنا پڑتا ہے۔ لغت مین غزل کے معنی ہین عورتون سے باتین کرنا۔ اصطلاحی معنی مین بھی لغوی معنی کی جھلک موجود ہے اور غزل کا مایۂ ناز عشق کے پاکیزہ خیالات ہین یعنے وصل و ہجر کی کشمکش، حسن و عشق کے معرکے، شمع و پروانہ کا معاملہ، گل و بلبل کا ماجرا، بہار و خزان کا تصادم، جفا و وفا کے واردات، گھر کا بن کرنا اور بن کو گھر بنانا ... کارنامے، لیلیٰ و شیرین کی بے اعتنائیان، کبھی مرنا اور کبھی جینا، کبھی ... اور متضاد خیالات ہین جن کو سامان غزل کہا جاتا ہے۔ اردو شا... فارسی شاعری کا

متبع کیا ہے۔ امیر خسرو یا ولی نے نظم اردو کی بنیاد قائم کی اور پھر میر و سودا نے اُس پر محل تعمیر کیا۔ سون، سین کی جگہ ست۔ ہمن کو کے بجائے ہمکو لکھے جانے لگے۔ لیکن پھر بھی مین نے کہا کے موقع پر مین کہا نظم کیا جاتا تھا۔ اِس زمانہ تک نظم اردو مین کافی اصلاح ہوچکی تھی، اور غزل کی شاعری کو چار چاند لگ چکے تھے فارسی اور بھاشا کا ایک معقول تناسب سے امتزاج ہوکر اردو زبان ایک مستقل حیثیت حاصل کر چکی تھی۔ اردو زبان اور اردو غزل نے اہل بصیرت کی نظر مین ایک وقیع اور رفیع درجہ حاصل کرلیا تھا۔ آخر موت وحیات کی کشمکش نے اردو زبان کو اِن محسنون کی سرپرستی سے محروم کردیا اور وہ اس نونہال کو دوسرون کے سپرد کرکے عالم فانی سے رخصت ہوگئے۔ میر جیسے قادر الکلام شاعر کی وفات کے بعد ملک ہند اور بالخصوص دہلی و لکھنؤ مین بہت سے باکمال نظم اردو اور غزل اردو کی خدمت مین مصروف رہے جرأت، مصحفی، انشا، ناسخ، آتش، مومن، ذوق، غالب کا نام آج تک اردو غزل کے ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے۔ فن شاعری اُسوقت ایک فن شریف خیال کیا جاتا تھا۔ اُمرا کی طرف سے اہل کمال کی قدر کی جاتی تھی۔ دربار دہلی اور سرکار لکھنؤ کی داد و دہش بھی بڑی حد تک ترقی زبان اردو مین مددگار رہی۔ اردو زبان کو اپنے محسنون کا شکریہ ادا کرتے وقت مرحوم دہلی اور لکھنؤ کو بھی فراموش نہ کرنا چاہیے۔

شیخ محمد رمضان ایک غریب چپراسی کو ۱۲۰۴ھ مین خداوند عالم نے ایک فرزند عطا فرمایا جسکا نام ابراہیم ہے۔ دنیا مین روزانہ سیکڑون ہزارون بچے پیدا ہوتے ہین۔ کس کو خبر تھی کہ یہ نومولود عید کا چاند بنکر اہل نظر کو اپنی طرف متوجہ کرے گا اور شاعری کے افق پر ماہ کامل ہوکر چمکیگا۔ اِسی محترم ہستی نے ملک الشعرا اور خاقانی ہند کے القاب سے دنیائے شاعری مین شہرت پائی۔ سودا اور میر کے بعد

غزل اردو کو بلند سے بلند درجہ پر پہونچا دیا۔ مشکل سے مشکل مضمون کو اِس آسانی
سے کہدیا کہ دشوار پسند طبیعتین آج تک حیران ہین۔ بندشون مین صفائی کا رنگ
دکھایا۔ مشکل اور سخت قوافی کو اِس خوبی سے اپنی جگہہ پر بٹھایا کہ تعقید بھی جو ایسے
قوافی کے نظم کرنے مین لابدی ہے بھلی معلوم ہونے لگی ضرب الامثال کو نظم کے
سانچہ مین ڈھال کر اپنے کمال کو ثابت کیا۔ فارسی ترکیبون سے بھی نظم اردو کو زینت دی
عشق و حسن، درد و محبت، تصوف، فلسفہ قدرت، موت و حیات وغیرہ کے مضامین سے
غزل کے چمن کو سجا کر دنیائے شاعری مین سیر و تفریح کا سامان مہیا کر دیا۔ اُس عہد کے
ارباب سخن نے قدر و منزلت کی اور آج تک منصف مزاج اعتراف کرتے ہین کہ
ملک الشعرا شیخ ابراہیم ذوق اقلیم سخن کا مالک اور غزل اردو کا بادشاہ ہے۔ اُس کے
کلام نے کبھی الفاظ کی مناسب نشست و برخاست سے سہل ممتنع کا درجہ حاصل
کر لیا ہی، کبھی مضامین کی ندرت سے محال کو ممکن کر دکھایا ہے۔ سودا اور میر کے بعد
یہی وہ زبردست شخصیت ہی جس نے نظم اردو مین کامیابی کا افتخار حاصل کر کے غزل
کی شاعری کو کامیاب بنا دیا ہی ان دعاوی کی دلائل و براہین خود اُسکا کلام پاکیزہ
ہی جو عنقریب ہدیۂ قارئین ہوگا۔ اِس نیک نیت اور باکمال شاعر کے خدمات نے شہرت
کے ساتھ شرف قبول بھی حاصل کیا اور اسوقت تک بھی دنیائے شاعری مین کثرت سے
اُس خرمن کے خوشہ چین زبان اردو کی خدمت کر رہے ہین۔ حاسدین اور متعصبین کبھی
اُسکو شیخ رمضان کا بیٹا کہکر اپنا دل ٹھنڈا کر لیتے ہین۔ کبھی خلیفہ یا شیخ جی کہکر مذاق
اُڑاتے ہین لیکن وہ سمجھ لین کہ خاک اُڑانے سے سورج کی روشنی فنا نہین ہو سکتی۔ ذوق
کے کمال کا آفتاب ایسے بادلون سے بے نور نہین ہو سکتا۔ عرب کے مشہور شاعر متنبی
کو بھی اہل حسد کے اِسی قسم کے طعن و تشنیع برداشت [illegible] تھے وہ کوفہ کے ایک
بھشتی کا لڑکا تھا۔ لیکن اسکی جوہر آفرین ط[illegible] سکو معراج کمال پر

پہونچایا۔ اسی طرح چپراسی کا لڑکا خلیفہ یا شیخ جی جو اردو شاعری کے واسطے مایۂ ناز ہے، خاقانی ہند ہو کر رہا۔ ذوق نے غزل گوئی مین جو درجہ حاصل کر لیا اُسکا کوئی اور مستحق نہین تھا۔ بقول مولانا آزاد مرحوم ذوق خاتم الشعرا بلکہ خاتم الشعرا ہی۔ قارئین کرام اب اُسکے کلام کے مختلف نمونے ملاحظہ فرمائین۔



(۱) ہوا یہ سینہ یکسر خارزار دشت غم میرا | کہ آیا ناخون آغشتہ ہو کر لب پہ دم میرا
(۲) رمیدہ سایۂ ہستی سے ہون وہ آہوئے وحشت | کہ ہی اک کوچۂ رم جادۂ دشت عدم میرا
(۳) وہ ہون مین گیسوئی موج محیط اعظم وحشت | کہ ہی ٹھیرے ہوئے رستے زمین کو پیچ و خم میرا
(۴) مری صورت کے معنی ہین نفخت فیہ من روحی | حدوث بے ثبات اثبات کرتا ہی قدم میرا
(۵) وہ ہون مین رہ نورد شوق میرے ساتھ جاتا ہی | برنگ سایۂ مُرغ ہوا نقش قدم میرا

ان اشعار مین مضامین کی ندرت اور صفائی کے علاوہ یہ بات بھی دیکھنے کے قابل ہی کہ فارسی ترکیبون کو کس خوبی کے ساتھ اردو نظم مین جگہ دی ہی۔ میرزا غالب کا بھی مطلع جو اسی زمین میں ہے ملاحظہ کے قابل ہی۔

نہو گا یک بیابان ماندگی سے ذوق کم میرا | حباب موجۂ رفتار ہے نقش قدم میرا

دیوان غالب کے شارحین اس شعر کے معنی مین بھی اختلاف کرتے ہین لیکن مطلب یہ ہی کہ یک بیاباں ماندگی (تھک کر رہ جانا) کی وجہ سے میرا ذوق دشت نوردی کم نہین ہوگا کیونکہ میرا نقش قدم حباب موجہ رفتار ہی۔ میرزا نے ایسے الفاظ مین اس مضمون کو ادا کیا ہے کہ ہر دماغ بآسانی اسکا لطف حاصل نہین کر سکتا۔ میرزا نے اپنے تھک جانیکے باوجود اپنے نقش قدم کو حباب موجۂ رفتار کہہ کر ذوق دشت نوردی کو قائم رکھا ہی۔ لیکن خاقانی ہند کا پانچواں شعر اس تخیل مین کسقدر مکمل ہی۔ اپنے شوق رہ نوردی کو عجیب صورت سے ثابت کیا ہے کہ میرا نقش قدم بھی برنگ سایہ

مرغ ہوا میرے ساتھ جاتا ہے۔زیادہ تیز روی مین پاؤن کے نشان زمین پر نہین بنتے ہین

لکھیے اُسے خط مین کہ ستم اُٹھ نہین سکتا ۔ پر ضعف سے ہاتھون مین قلم اُٹھ نہین سکتا
آتی ہے صدائے جرسِ ناقہ لیلے ۔ پر حیف کہ مجنون کا قدم اُٹھ نہین سکتا

مطلع کسقدر لطیف ہی ناتوانی کو کس انداز سے ثابت کیا ہی اور قادر الکلامی کی شان دکھائی ہے۔ دوسرا شعر جس کیفیت کو لیے ہوئے ہے وہ زبان سے ادا نہین ہوسکتی اس کا اندازہ صرف وہی دل کرسکتا ہی جو درد و عشق سے لبریز ہو ؎

حسرت پہ اُس مسافر بیکس کی روئیے ۔ جو تھک رہا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

اِس قافیہ پر شاہ نصیر کا بھی شعر ہے۔

ہر معرکۂ عشق مین آسان نہین دینا ۔ گاڑے ہے جہاں شمع قدم اُٹھ نہیں سکتا

شاہ صاحب نے قافیہ کو اچھا نبھایا ہے لیکن ذوق کا شعر جسقدر بلند ہی وہانتک شاہ صاحب کے فکر کی پرواز نہین ہوسکی۔

(۱) اس تپش کا بھی مزہ دل ہی کو حاصل ہوتا ۔ کاش میں عشق مین سرتا بقدم دل ہوتا
(۲) عین پیشانی اگر تیری نہوتی زنجیر ۔ نالہ دیوانہ تھا جو پا بہ سلاسل ہوتا
(۳) موت نے کردیا ناچار وگرنہ انسان ۔ ہی وہ خود بین کہ خدا کا بھی قائل ہوتا
(۴) آپ آئینۂ ہستی مین ہی تو اپنا حریف ۔ ورنہ یان کون تھا جو تیرے مقابل ہوتا

ہر شعر سامان غزل کی بھری پری دوکان ہی۔ سلاست بیان اور لطف زبان نے مضمون کی آب وتاب کو دوبالا کردیا ہے۔ مطلع مین عجیب قسم کی لطافت ہی جسکی تعریف نہیں ہوسکتی۔ میرزا غالب فرماتے ہین۔

میری قسمت مین غم گر اتنا تھا ۔ [illegible] لیے ہوتے

یہ شعر بھی اپنے اندر بہت کچھ تاثیر رکھتا ہے۔ [illegible] ری کثرت غم کی وجہ سے

چند دل مانگتا ہی۔ لیکن ذوق تپش عشق کا اہل صرف دل ہی کو سمجھتا ہی اور چاہتا ہی کہ ع
کاش مین عشق مین سرتا بقدم دل ہوتا۔ دونوکی تخیل مین ایک نازک فرق ہے اور جو
لوگ شاعری کا مذاق سلیم رکھتے ہین اُن کی توجہ کے قابل ہے۔

یہ حیات چند روزہ جو نہ سدراہ ہوتی   تو پھر ایک عرصہ گاہ عدم و وجود ہوتا

بندش کی لطافت اور مضمون کی بلندی جسقدر خراج تحسین وصول کرے
کم ہے۔

ساتھ آہ کے شب دلسے وہ پیکان نکل آیا   تھا کام تو مشکل مگر آسان نکل آیا
رات آہ مین یون سینہ سے اک شعلہ سا چمکا   مین نے تو یہ جانا دل سوزان نکل آیا

جس آسانی سے خاقانی ہند نے اِس مضمون کو ادا کیا ہے وہ اہل بصیرت کی
نظر مین ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے۔

پانی طبیب دیگا ہمین کیا بجھا ہوا   ہر دل ہی زندگی سے ہمارا بجھا ہوا
کہتے ہین آفتاب قیامت جسے سو وہ   نکلا چراغ داغ دل اپنا بجھا ہوا
پھر دل مین آہ سرد ہوئی میرے شعلہ ور   لو پھر بھڑک اُٹھا یہ فتیلا بجھا ہوا

متبذل ردیف کو خوش فکر شاعر نے کہانتک بلند کر دیا ہے۔

میں ہوں وہ خشت کس مدتسے اِس ویرانہ میں   برسوں مسجد میں رہا برسوں رہا بتخانہ میں
مستی و نا آشنائی، وحشت و بیگانگی   یا تری آنکھوں مین دیکھی یا ترے دیوانہ میں
ایک پتھر چومنے کو شیخ جی کعبہ گئے   ذوق ہر بت قابل بوسہ ہی اِس بتخانہ میں

ہر شعر حسن بندش سے ایک شاہد رعنا ہے جسکا کوئی خط و خال بے موقع نہین ہر

کہتے ہین مر جائیں گر چھوٹ جائین غم کے ہاتھ سے   پر تے غم سے ہمین مرنیکی بھی فرصت نہیں
ایک دل اور اسپہ اتنے بارِ غم۔ اللہ رے دل   اور اِس طاقت پہ ایسا کوئی بے طاقت نہیں

پہلے شعر مین عدم امکان مرگ کو کس خوبی سے بیان کیا ہے زبان تعریف سے

قاصر ہے مرزا غالب نے بھی اِسی تخیل کو نہایت لطافت سے بیان کیا ہے

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجیے   ہمنے چاہا تھا کہ مرجائین سو وہ بھی نہوا

لیکن ذوق غمِ عشق مین محرومی مرگ کو ایک دلیل کے ساتھ بیان

کرتا ہے ع بر ترے غم سے ہمین مرنے کی بھی فرصت نہیں۔

دوسرے شعر مین جو ندرت ہے یہ مرحوم خاقانی ہند کا حصہ تھا دوسرے شاعر نے

نہ ایسا کہا ہے نہ کہہ سکتا تھا

دیکھلے عشق مین جاں وامق و قیس و فرہاد   اور ابھی دیکھیے کس کس کی قضا ہے اس مین

اُس جفا کیش کے نامہ کو پڑھون کیا قاصد   جو کہ قسمت کا لکھا تھا سو لکھا ہے اسمین

جا پڑا پاؤں پہ قاتل کے تڑپ کر کشتہ   سرد ہونے پہ بھی گرمی وفا ہے اسمین

زبان کی سلاست اور بندش کی صفائی کا اگر لطیف مضامین کے واسطے جزو

لاینفک ہونا ضروری ہے تو ذوق کی سحر کلامی دیکھیے۔ اِس خصوص مین اُسکا کوئی ہمعصر

اُس سے بڑھ کر کیا اُسکے برابر بھی نہین ہے۔ تیسرے شعر مین گرمی وفا کو جس انداز سے

لکھا ہے اُسکی تعریف زبان سے ادا نہین ہوسکتی۔

عنقا کی طرح خلق سے عزلت گزیں ہوں میں   ہوں اسطرح جہاں میں کہ گویا نہیں ہوں میں

مین وہ نہیں کہ تم ہو کہیں اور کہیں ہوں میں   میں ہوں تمھارا سایہ جہاں تم۔ وہیں ہونیں

اُس در پہ شوق سجدہ سے فرش زمیں ہونیں   مانند سایہ سر سے قدم تک جبیں ہونیں

بلحاظ لطف بیان اور حسن بندش تینون مطلعے کسقدر مکمل ہین۔ اور قوافی کو ردیف

سے کس خوبی کے ساتھ چسپان کیا ہے۔

جنوں نے کچھ نہ چھوڑا آخر اپنے جیب داماں سے   نفو   ملا یا گریباں میں

جو لذت آشنائے مرگ ہوتا خضر۔ تو وہ بھی   نہ نہ   با آب حیواں میں

قادر الکلام شاعر مشکل سے مشکل مضمون کو بھی سہل   ین ادا کر سکتا ہے اور ایسے

ہی شعرا اہل نظر سے خراج تحسین وصول کرنیکا حق رکھتے ہیں

اُس سنگ آستان پہ جبین نیاز ہے　　وہ اپنی جا نمانہ ہر اورینا زسبے
خنجر کہین نہ یار کا بہ جائے ہو کے آب　　میرے گلے میں نالۂ آہن گداز ہے

مطلع مین تشبیہ کی ندرت اور شعر مین نالۂ آہن گداز ترکیب فارسی حد سے زیادہ دلکش اور لطیف ہین۔

ذوقؔ نہ دل رہا نہ جگر دونون جلکے خاک ہوئے　　رہا ہی سینہ مین کیا چشم خونفشا نکے لیے
اُمید ہو گئی ہمسایہ۔ ورنہ خانۂ یاس　　بہشت تھا ہمین آرام جاودانکے لیے
بیان درد محبت جو ہو تو کیونکر ہو　　زبان ہے دلکے لیے ہی نہ دل زبانکے لیے

مومنؔ خلاف وعدۂ فردا کی ہمکو تاب کہان　　اُمید یک شبہ ہی پاس جاودانکے لیے
لیا ہے دلکے عوض جان درقیب تو دون　　مین اور آپکی سوداگری زبانکے لیے
وہ لعل روح فزا سے کہان تلک بوسہ　　کہ جوہر کم ہی یہان شوق جانفشانکے لیے

غالبؔ بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہی　　رکھوں کچھ اپنی بھی مژگان خونفشانکے لیے
وہ زندہ ہم ہین کہ ہین روشناس خلق اے خضر　　نہ تم کہ چور بنے عمر جاودان کے لیے
زبانپہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا　　کہ میرے نطق نے بوسے مری زبانکے لیے

ایک ہی قافیون مین ذوقؔ، مومنؔ، غالبؔ کی فکر سخن سے انکی معجز نگار طبائع کی گلکاریون کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ذوقؔ نے جاودان کے قافیہ کو اس لطافت اور نظامت سے زمین شعر میں سرسبز کیا ہی کہ وہ ہمیشہ تروتازہ رہی گا۔

غالبؔ نے اِسی جاودان کے قافیہ کو ایک شوخ رنگ کے پالش سے بالکل نیا کرلیا ہے اور یہ غالبؔ ہی کا حصہ تھا۔ مومنؔ نے بھی وعدۂ فردا اور اُمید یک شبہ کا دام بچھا کر قافیہ جاودان کو پھانسنے کی بلیغ کوشش کی مگر قافیہ تڑپ رہا ہے۔ خوں فشاں کے قافیہ کو بھی ذوقؔ نے نہایت سلیس اور لطیف پیرایہ مین ردیف سے وابستہ کیا ہی۔ میرزا غالبؔ نے

اِس قافیہ کو ایک نئے انداز سے لکھکر شعر کا درجہ بہت بلند کر دیا ہی زبان کے قافیہ پر ذوق نے جس حُسن بندش سے کام لیا ہی اور جس آسانی سے بیان درد محبت مین اپنی معذوری کو ثابت کیا ہی وہ تحسین و آفرین سے مستغنی ہی مومن و غالب کے شعر اِس قافیہ مین بہت سُست ہین۔

پھنسے نہ حلقۂ گیسوئے تابدار مین دِل　　　بلا سے گرہو نوالہ دہان مار مین دل

سانپ کو گیسو سے اور حلقۂ گیسو کو دہان مار سے تشبیہ دی ہے اور اس طور پر ذوق مرحوم نے ایک مکمل مطلع بنا کر یہ ثابت کیا ہے کہ سانپ کے منھ مین دل کا دیدینا بہ نسبت اسکے کہ دل کو مبتلائے عشق کیا جائے بہتر ہی۔ میرزا غالب مرحوم نے بھی اس تخیل مین طبع آزمائی کی ہے۔

دہن شیرین جا بیٹھیے لیکن لے دل　　　نہ کھڑے ہو جیے خوبان دل آزار کے پاس

میرزا نے دہن شیر کے بالمقابل خوبان دل آزار دوسرے مصرعہ مین لکھا ہی تشبیہ نامانوس بھی ہے اور بھدی بھی ہے جس سے ذوق و غالب کا فرق نمایان ہو جاتا ہے۔

دیکھا دم نزع دل آرام کو　　　عید ہوئی ذوق و نے شام کو

خاقانی ہند نے نزع کے وقت کی ملاقات اور اُسکی مسرت کا نقشہ نہایت لطیف تشبیہ مین دکھایا ہے۔ بندش بھی ایسی صاف اور مضبوط ہی کہ نثر مین بھی اِس مضمون کو ادا کرنے مین کوئی لفظ اپنی جگہ سے ہٹایا نہین جاسکتا۔ میرزا غالب مرحوم نے بھی نزع کے وقت کی ملاقات کو ایک مقطع اور پھر ایک شعر مین نظم کیا ہی۔ قارئین کرام خود ذوق و غالب کے انداز بیان اور طرز ادا سے اندازہ فرما سکتے ہین کہ اردو غزل گوئی مین کون کس درجہ پر ہے۔

غالب۔ مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھین غالب　　　یار لائے مری بالین پہ اُسے پر کس وقت

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھین ہی ہَر　　　عاشق بیمار کے پاس

ذوق مرحوم کے کلام سے چند اشعار کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ جسمین کمل محاورات اور ضرب الامثال کو نظم کرکے غزل کی شاعری کو چار چاند لگائے ہین۔ میر علیہ الرحمۃ کے بعد کے شاعر کے کلام مین محاورات کی یہ خصوصی حالت نہین پائی جاتی۔ یہ کلام صحیح طور پر سہل ممتنع کہے جانیکا مستحق ہے۔ بندش اسقدر چست ہے کہ ایک لفظ بھی اپنی جگہ سے ہٹائے جانیکے قابل نہین ہے۔ زبان اسقدر لطیف ہے کہ دوسرے فصیح الفاظ مین ان مضامین کا ادا کیا جانا ممکن نہیں ہے۔ جو حضرات غزل اردو کا مذاق سلیم رکھتے ہیں وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ذوق کو غزل اردو سے اور غزل اردو کو ذوق سے کیسا گہرا تعلق ہے۔

مین ہجر میں مرنے کے قریں ہو ہی چکا تھا　　تم وقت پہ آ پہونچے نہیں ہو ہی چکا تھا
آنے سے مرے ٹھہر گئے آپ وگرنہ　　جانے کا ارادہ تو کہین ہو ہی چکا تھا
کیا گرم تپش ہوتا تڑپ کر ترے آگے　　میں سر دتہ خنجر کہیں ہو ہی چکا تھا

محفل میں شور قلقل مینائے مُل ہوا　　لا ساقیا پیالہ کہ توبہ کا قُل ہوا

شکر پردہ ہی میں اُس بت کو خدا نے رکھا　　ورنہ ایمان گیا ہی تھا خدا نے رکھا
تلخکامی کا رہا بعد فنا بھی یہ اثر　　استخوان کو مرے منھ پر نہ ہما نے رکھا

نہ کرتا ضبط مین نالہ تو پھر ایسا دھواں ہوتا　　کہ نیچے آسماں کے اک نیا اور آسماں ہوتا

گل اُس نگہ کے زخم رسیدوں میں مِل گیا　　یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مِل گیا

کیا کہہ کے کمر تا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا   کہہ جو تجھے کہنا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

آدمی ہو گر مکدّر کیا قصور ادراک کا   خاک کا پتلا ہے یہ۔ کچھ تو اثر ہو خاک کا

دلکی تپش سے زخم جگر کا رات جو ٹانکا ٹوٹ گیا   طائر جاں جو رشتہ بپا تھا فرصت پا کر چھوٹ گیا

چشم و نگہ کو تیرے بدنام کیوں کریگا   مرگ و قضا کو تیرا عاشق نہ ہے مریگا

کچھ راز نہاں دلکا عیاں ہو نہین سکتا   گونگے کا سا ہے خواب بیاں ہو نہیں سکتا

بادام دو جو بھیجے ہین بٹوے مین ڈالکر   ایما یہ ہے کہ بھیجدے آنکھین نکال کر
قاتل ہے کہ مزے سے نمک پاش زخم دل   بسمل ذرا تڑپ کے نمک کو حلال کر

صفحہ دہر پہ یک دل نہ ہوا ایک سے ایک   دل کے دو حرف ہین سو وہ بھی جدا ایک سے ایک

نہ ڈال آبلہ اے گرمی فغاں منہ میں   کہ چپکا بیٹھا ہوں بھر کے گھنگھنیاں منہ میں

سینۂ و دل پہ مرے زخم جگر ہنستے ہین   ہنسنے دو چارہ گرو۔ ہنستے ہی گھر بستے ہین

مر گئے پر بھی تغافل ہی رہا آنے مین   دیر ہے لیجانے مین

جس جگہ بیٹھے ہین با دیدۂ نم اُٹھے ہین — آج کس شخص کا مُنھ دیکھ کے ہم اُٹھے ہین

+

کہتے تھے آنے کو خاطر سے ہماری برسون — ہوئے برسون۔ نہوئی پر وہ تمھاری پرسُن

+

اشکباری مری مژگان کی ذرا دیکھین تو — کتنے پانی مین ہین فوارے ذرا دیکھین تو

+

بزم صنم مین حضرت دل ذکر کعبہ کیا — تھی جس چمن کی بات گئی اُس چمن کے ساتھ
گندم ہے سینہ چاک فراق بہشت مین — آدم کو کیا نہ ہوگی محبت وطن کے ساتھ

+

تو جان ہے ہماری اور جان ہر تو سب کچھ — ایمان کی کہین گے ایمان ہر تو سب کچھ

+

یہ اقامت ہمین پیغام سفر دیتی ہر — زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہر
زال دنیا ہے عجب طرح کی علامۂ دھر — مرد دیندار کو بھی دھر یہ کر دیتی ہر
فائدہ دے ترے بیمار کو کیا خاک دوا — اب تو اکسیر بھی دیجیے تو ضرر دیتی ہر

+

ساقیا عید ہے لا بادہ سے مینا بھر کے — کہ پیاسے ہین سے آشام مہینہ بھر کے

+

جو تھے مژگان پرخون سب وہ خار دلنشین نکلے — جنون یہ کیسے نشتر تھے کہ ٹوٹے وہ کہین نکلے
خدا دے دوربینی اور اِس چشم تصور کو — کہ لاکھون کام اِس سے دور کے نزدیک ہی نکلے

+

خط بڑھا کاکل بڑھی زلفین بڑھین گیسو بڑھے — حُسن کے سرکار مین جتنے بڑھے ہندو بڑھے

لیکن میری رائے مین آزاد مرحوم نے حضرت ذوق علیہ الرحمۃ کی بابت جو کچھ لکھا ہے وہ ذوق کے مرتبۂ شاعری سے بہت کم ہے۔ مولانا حسرت موہانی جو دیوان غالب کے شارح اور طرز غالب کے دلدادہ ہین اور غالب کو من حیث المجموع اُن کے سب ہمعصرون سے افضل بھی سمجھتے ہین حضرت ذوق کی بابت تسلیم فرماتے ہین کہ "غالب کے ہمعصرون مین اوستاد ذوق سب سے زیادہ محتاط ہین اور صرف اردو شاعری کے لحاظ سے ذوق کا درجہ غالب سے اور غالب کا مرتبہ مومن سے بلند ہی"

بہرحال۔ کل شئی یعرف باضدادہا کے اُصول پر نظر کرکے نہایت ضروری ہی کہ مین میرزا غالب کی اردو شاعری پر بھی تبصرہ کرون تاکہ اہل انصاف دیکھ لین کہ غالب مرحوم نے اردو غزل گوئی مین بعد میر کے کسقدر بلند درجہ حاصل کیا ہے اور ذوق کی غزل گوئی سے غالب کی غزل سرائی کو کیا نسبت ہی۔ مجھے میرزا سے کوئی عداوت نہین ہی بلکہ بحیثیت تبصرہ نگار کے میرزا کے معتقدین کو حقیقت حال سے مطلع کرنا چاہتا ہون اور اُمید کرتا ہون کہ وہ حضرات بھی ٹھنڈے دل سے غور فرمانے کی تکلیف گوارا کرینگے۔

میرزا غالب کی اُردو شاعری

میرزا غالب کو قدرت نے جدت طرز دماغ اور معنی آفرین طبیعت عطا فرمائی تھی۔ گو اُنھون نے اکتساب علوم مین وقت نہین گزارا۔ کسی کے شاگرد بھی نہین تھے۔ گھر کی الماریان کتابون سے خالی تھین۔ اِن باتون سے اُنکے کمال کی تنقیص نہین ہو سکتی بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ ملکۂ مضمون آفرینی بلاواسطہ قدرت کا نمونہ تھا۔ حقیقت مین میرزا غالب فارسی کا باکمال شاعر تھا زمانہ کی ضرورت نے اسے اردو کا بھی شاعر بنایا۔ دربار دہلی کی وظیفہ خواری کی وجہ سے یہ بغیر چارہ نہ تھا۔

میرزا نے نہایت بیدلی سے اِس خدمت کو انجام دیا۔ جسکی تفصیل آئندہ آئیگی۔ لیکن فیض سخن سے میرزا بھی محروم نہین رہے کبھی کبھی غزل اردو مین ایسا شعر بھی کہہ جاتے تھے جو بہ لحاظ ندرت دیوانوں کا جواب ہوتا تھا۔ مگر محض اس بناپر انکو اردو غزل کا کامیاب شاعر قرار نہین دیا جاسکتا۔

یادگار غالب صفحہ ۱۰۵ و ۱۰۶ پر خواجہ حالی مرحوم تحریر فرماتے ہین "میرزا نے ریختہ گوئی کو اپنا فن قرار نہین دیا تھا، بلکہ محض تفنن طبع کے طور پر کبھی اپنے دل کی اُمنگ سے کبھی دوستونکی فرمایش سے اور کبھی بادشاہ یا ولی عہد کے حکم کی تعمیل کے لیے ایک آدھ غزل لکھ لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے دیوان مین غزل کی صنف کے سوا کوئی صنف معتد بہ نہین پائی جاتی وہ منشی نبی بخش مرحوم کو ایک خط مین لکھتے ہین "بھائی صاحب تم غزل کی تعریف کرتے ہو اور مین شرماتا ہون۔ یہ غزلین کاہے کو ہین پیٹ پالنے کی باتین ہین۔ میرے فارسی کے وہ قصیدے جن پر مجھکو ناز ہے کوئی اُن کا لطف نہین اُٹھاتا۔ اب قدردانی اس بات پر منحصر ہے کہ گاہ گاہ حضرت ظل سبحانی فرما بیٹھتے ہین کہ بھئی تم بہت دن سے کوئی سوغات نہین لائے یعنے نیا ریختہ ناچار کبھی کبھی یہ اتفاق ہوتا ہے کہ کوئی غزل کہہ کر لیجاتا ہون"۔ اِس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کسقدر بیدلی سے میرزا اردو غزل لکھتے تھے اور اردو غزل گوئی کس حد تک بار خاطر تھی۔ میرزا اپنے ایک طویل فارسی قطعہ مین بھی خود اپنی اردو شاعری کے بابت اظہار رائے فرماتے ہین یہ دونون شعر زبان زد عام ہین۔

فارسی بین تا بہ بینی نقشہای رنگ رنگ ۔۔۔ بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من ست
راست می گویم من و از راست سر نتوان کشید ۔۔۔ ہر چہ در گفتار فخر تست آن ننگ من ست

میرزا کا غزل گوئی اردو مین کیا طرز تھا اور میر علیہ الرحمۃ کے بعد میرزا سب سے زیادہ کامیاب شاعر غزل اردو کا تھا یا نہین اِس بارہ مین خود میر کی پیشنگوئی سے بہت

کچھ مدد مل سکتی ہے۔

یادگار غالب صفحہ ۹۸ "خود میرزا کی زبانی سُنا گیا ہے کہ میر تقی نے جو میرزا کے ہموطن تھے اُنکے لڑکپن کے اشعار سُنکر یہ کہا تھا کہ اگر اِس لڑکے کو کوئی کامل اوستاد مل گیا اور اُسنے اس کو سیدھے راستہ پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگیگا"

یادگار غالب صفحہ ۱۰۱ پر خواجہ حالی مرحوم میر تقی کی پیشین گوئی کے دونون شقون کو میرزا غالب کے حق مین پورا ہونا تسلیم کرتے ہین لیکن خواجہ کی راے مین میرزا آخر مین غلط راستہ چھوڑکر صحیح المذاق دوستونکی روک ٹوک سے اور نکتہ چین ہمعصرون کی خوردہ گیری سے صحیح راستہ پر پڑ لیے تھے گویا خواجہ کی راے مین سامان مذکورہ میرزا کے واسطے اوستاد کامل تھا جسکی حضرت میر نے نصیحت کی تھی خواجہ صاحب مرحوم بسا اگرچہ فن مین کتنے ہی محتاط ہون لیکن میرزا کی شاگردی کے حقوق نے ان کے دل و دماغ پر ایک ایسا خفیہ غلبہ حاصل کر لیا تھا جسکی وجہ سے وہ دانستہ نہین تو نادانستگی سے ایک مغالطہ مین پڑ گئے اور جو راے ظاہر فرمائی ہے وہ صحت سے دور ہے اگر میر کی پیشین گوئی صحیح ہے تو اسکی کوئی شق بھی میرزا کے حق مین پوری نہین ہوئی اور میرزا کا کلام معنے کا منت کیش نہین ہو سکتا۔ میرزا نے کبھی اوستاد کامل کی تلاش نہین کی۔ میرزا اپنے ادعاے کمال کی وجہ سے یا ضد کی وجہ سے کبھی دوست دشمن کے مشورہ یا نکتہ چینی کی پروا نہ کرتے تھے ؎

نہ ستایش کی تمنا نہ صلہ کی پروا   گر نہین ہین مرے اشعار مین معنی نہ سہی

خواجہ کی یہ راے بھی صحیح نہین ہے کہ میرزا   نانہ مین اپنے طرز
قدیم کو چھوڑ دیا تھا۔ بلکہ میرزا کا سہل اور مشکل کلا   ہے ایسا کوئی
خاص زمانہ معین نہین کیا جا سکتا کہ میرزا نے اپنے   کے شکنجہ سے آزاد

فرماکر محض سہل گوئی پر قناعت کی ہو ۱۲۴۵ھ ہجری مین بقول مولانا آزاد میرزا نے بجائے اسد کے غالب تخلص کرلیا تھا لیکن جب اسد تخلص کرتے تھے اُس زمانہ کی اُن کی ایسی غزلیں موجود ہیں جن میں ثقیل اور وزنی الفاظ کا دخل نہیں ہے اور مطلب بھی اغلاق و اجمال کی دست برد سے محفوظ ہے۔ شاعرانہ حیثیت سے یہ اشعار دقیق ہوں یا نہوں لیکن معانی سے بیگانہ نہیں ہیں۔ میں صرف مطلع کا پہلا مصرعہ لکھ کر قارئین سے درخواست کرتا ہوں کہ دیوان غالب میں ان غزلوں کو ملاحظہ فرمالیں:۔

(۱) دوست غمخواری میں میری سعی فرمائینگے کیا	(۲) عرض نیاز عشق کے قابل نہین رہا
(۳) سرگشتگی مین عالم ہستی سے یاس ہے	(۴) چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے
(۵) رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے	(۶) عشق مجھکو نہین وحشت ہی سہی
(۷) دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے	(۸) دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی۔

اگر یہ کہا جائے کہ میرزا نے بحیثیت اسد کے ہی دشوار گوئی سے توبہ فرمالی تھی تو اُس زمانہ مین بھی جب میرزا صاحب غالب ہو چکے تھے ایسا کلام موجود ہے جو بعض لوگونکی رائے مین معانی کے لباس مین مستور ہونا نہین چاہتا۔ اسلیے یہ ماننا پڑیگا کہ میرزا مرحوم کا دماغ جب بے کیف ہوتا تھا تو جو کچھ فرماتے تھے وہ سادہ ضرور ہوتا تھا لیکن بے کیفی بھی ظاہر ہوتی تھی۔ اور جب میرزا کا دماغ کیف و سرور سے بے قابو ہوجاتا تھا تو شعر بھی ایسے نکلتے تھے جو مطالب و معانی کے ضرورت مند نہین ہوتے تھے اور اُس حالت مین میرزا کی بلند آفرین طبیعت جسقدر مضامین کے دریا بہاتی تھی اُن کا محدود الفاظ مین سما جانا ممکن نہ تھا۔

پھر دیکھیے انداز گل افشانی گفتار — رکھدے کوئی پیمانۂ و صہبا مرے آگے

یادگار غالب صفحہ ۱۰۲ ''میرزا نے ریختہ مین جو روش ابتدا مین اختیار کی تھی ظاہر ہے کہ وہ کسی طرح مقبول خاص و عام نہین ہوسکتی تھی''

یادگار غالب صفحہ ۱۰۳ "میرزا کے ابتدائی کلام کو مہمل و بے معنی کہو یا اُسکو اردو زبان کے دائرے سے خارج سمجھو مگر اسمین شک نہین کہ اس سے اُنکی غیر معمولی اپج کا خاطر خواہ سُراغ ملتا ہے"

یادگار غالب صفحہ ۱۸ "وہ اِس خیال سے کہ اُنکے کلام کی قدر کرنے والے بہت کم تھے۔ اکثر تنگ دل رہتے تھے...... ایک روز قلعہ سے سیدھے نواب مصطفےٰ خان کے مکان پر آئے اور کہنے لگے کہ آج حضور نے ہماری بڑی قدر دانی فرمائی۔ عید کی مبارکباد مین قصیدہ لکھ کر لے گیا تھا۔ جب مین قصیدہ پڑھ چکا تو ارشاد ہوا کہ میرزا تم پڑھتے بہت خوب ہو"

فی الحقیقت میرزا کو اردو غزل اور اردو شاعری کے ساتھ کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اگر میرزا کا یہ قصد ہوتا کہ وہ اردو زبان مین فارسی ترکیبونکے اضافہ سے زبان اردو کو وسعت دیں گے تو بھی میرزا مبارکباد کا مستحق تھا اگر میرزا چاہتا تو اپنی توجہ سے غزل اردو کو معراج کمال پر پہونچا سکتا تھا۔ لیکن میرزا نے فارسی شاعری کے جنون میں اردو شاعری سے شدید بیگانگی کا اظہار کیا۔ نثر اردو میں بھی کبھی کبھی اِس بے التفاتی کا ثبوت دیا جسکے نمونے آب حیات صفحہ ۸۳ ۸۴ پر آزاد مرحوم نے دیے ہین شلاً "منشی نبی بخش تمھارے خط نہ لکھنے کا گلہ رکھتے ہین" (گلہ دارند) "منشی نبی بخش کے ساتھ غزل خوانی کرنا اور ہم کو یاد نہ لانا" (یاد ننیاوردن) "جو آپ پر معلوم ہر دہ مجھپر مجہول نہے" (ہرچہ برشما منکشف است بر من مخفی نماند) یہ غنیمت تھا کہ اُس زمانہ میں میرزا کے ہمعصر میرزا کے کلام کو کوئی وقعت نہ دیتے تھے۔ اگر یہ ساری جماعت میرزا سے متفق الرائے ہو جاتی تو اردو زبان جو فارسی زبان سے نکلی تھی پھر فارسی زبان میں جذب ہو جاتی اور آج ادب اردو کا [illegible] باقی نہوتا۔

شروع بیسوین صدی عیسوی یا اِس [illegible] لیم یافتہ نوجوانونکی

قدردان نگاہیں دیوان غالب پر پڑنے لگیں دیوان غالب کا نصف حصہ اس قدر بلیغ یا ثقیل تھا کہ اگر اُسے معانی سے کوئی تعلق بھی ہو تو اسکا معلوم کرلینا دشوار تھا مولانا شوکت مرحوم میرٹھی نے شرح لکھی لیکن مولانا کا خود اپنا کلام اسقدر دقیق ہی کہ میرزا غالب ہی اسکی شرح لکھ سکتے ہین اسلیے مولانا کی شرح دیوان غالب پر خود ایک حاشیہ کی ضرورت تھی بہرحال اگر میرزا مرحوم کے اشعار مین معانی مستور ہیں تو وہ ابتک بھی زیر نقاب ہیں اور مولانا میرٹھی اُن کی پردہ دری نہ کرسکے۔ دوسرے نمبر پر علامہ طباطبائی نے دیوان غالب کی شرح لکھی گو بہ لحاظ سال تصنیف شرح کا تو دوسرا نمبر ہی لیکن بہ نظر فضل و کمال اور سن و سال کے شارحین کا پہلا نمبر ہے۔ علامہ موصوف نے تشنگان معانی کے سیراب کرنے کے واسطے اشعار کی تشریح بھی کی تنقید بھی کی۔ اور کہیں کہیں میرزا کے کلام مین اصلاح بھی کی۔ بعض موقع پر تعریض کے تبصرہ نگاری کا حق ادا کیا ہے۔ شاعری کے بہت سے نکات درج فرماکر شرح کو وزنی کردیا ہے۔ یہ امر کہ شرح کامیاب ثابت ہوئی یا نہیں بہت غور طلب ہی۔ علامہ کی شرح کی بابتہ مولانا نجو دموہانی کو بہت سے شکوک ہین۔ الناظر اور اودھ پنچ مین عرصہ تک یہ تذکرہ جاری رہا ہے۔ مولانا نجو د ایک نوجوان اور ہونہار ادیب ہین اُن کا ذوق سخن۔ تبحر علمی۔ اور وسعت معلومات دیکھ کر بے اختیار دل سے دُعا نکلتی ہے خدا اِس نوجوان کو عمر کثیر عطا فرماوے اور استقلال و ہمت کے ساتھ ادب اردو کی خدمت کرنے کی توفیق دے۔ مولانا نجو د موہانی بھی دیوان غالب کی ایک شرح تیار کرچکے ہین جو ابھی شایع نہین ہوئی ہے اور مولانا نے اُمید دلائی ہے کہ انھوں نے اپنی شرح میں اِس امر پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ مشکل اشعار کی تشریح مین علامہ طباطبائی کہانتک کامیاب ہوئے ہین اور انکی تعریض و تنقید کیا وقعت رکھتی ہی لیکن غالب مرحوم کے سہل کلام کی تشریح میں بھی عالیجناب علامہ طباطبائی نے ایسی بلند پردازی سے کام لیا ہے کہ الفاظ اور معانی میں زمین و آسمان کا فرق ہوگیا ہے مین چند نمونے پیش کرکے

علامہ موصوف سے التجا کرتا ہوں کہ اگر ممکن ہو تو نظر ثانی فرما کر شرح دیوان غالب کو اِس قابل کر دیں کہ وہ بجا طور پر علامہ کی ذات سے منسوب ہو سکے۔ اِس شرح کے بعد مولانا حسرت موہانی اور حضرت سہا نے شروح لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی ہی۔ ممکن ہو کہ دلدادگان کلام غالب اُن جملہ شروح سے ابتک مطمئن نہوئے ہوں لیکن کثرت تعداد شروح وشارحین سے ایک دلیل ترجیح کلام میرزا پر دستیاب ہوگئی ہے جسکو یہ لوگ کام مین لاتے ہیں میری رائے مین اردو غزل کا حُسن یہ ہے کہ سامع کے کانوں مین پہونچکر فوراً دل مین اُتر جائے۔ میرزا کا کلام نصف صدی سے زیادہ عرصہ ہوا کہ دماغوں مین چکر لگا رہا ہے اور ابھی قلوب اُس سے مطمئن اور مسرور نہین ہوئے ہیں۔ اِن حالات میں اُس انجمن ادب اردو کی صدارت جو میرؔ کی وفات کے بعد قائم ہوئی تھی میرزا غالب مرحوم کو پیش نہین کیجا سکتی۔ نہ میرزا غزل اردو کے کامیاب شاعر قرار پا سکتے ہیں۔

علامہ طباطبائی کے نکتہ رس ذہن نے عجیب معجز نمائی کی ہے میرزا کا سہل کلام بھی جسکو خواجہ حالی میرزا کے شاعری کا ماحصل قرار دیتے ہین تبدیلی معانی سے "مشکل کلام" کے مد مین داخل ہوا جاتا ہے۔ مین علامۂ شارح کے فضل و کمال کا احترام کرتے ہوئے چند نمونے پیش کرنے کی جرأت کرتا ہون جسکا وعدہ کیا تھا۔

میرزا غالب۔ پڑھتا ہوں مکتب غم دلمیں سبق ہنوز   لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

علامہ طباطبائی۔ غم وہ کیفیت نفسانی ہی جو مطلوب کے فوت ہو جانے پر پیدا ہو مطلب یہ ہو کہ مکتب غم میں میرا سبق یہ ہی کہ رفت گیا اور بود تھا یعنے زمانہ عیش کبھی تھا اور اب جاتا رہا۔

راقم۔ مین مکتب غم دلمین ابھی مبتدی ہوں او. رفت گیا۔ بود تھا۔ جس نے مکتبوں میں فارسی صرف کی پہلی کتاب صفو. ی اس کو اِس ابتدائی

سبق کا بخوبی اندازہ ہوگا۔

میرزا غالب: کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے — کرے جو پرتو خورشید عالم شبنمستان کا

علامہ طباطبائی۔ یعنی جسطرح آفتاب کے سامنے شبنم نہیں ٹھہر سکتی اُسی طرح تیرے مقابلہ کی تاب آئینہ نہیں لاسکتا۔ آئینہ خانہ کی تشبیہ شبنمستاں سے تشبیہ مرکب ہے۔

راقم۔ خورشید کے پرتو سے شبنم کا ہر قطرہ آفتاب کی طرح چمک اوٹھتا ہے۔ اسی طرح تیرے جلوہ نے آئینہ خانہ کا یہ نقشہ کردیا کہ ہر آئینہ شبنم کے ہر قطرہ کی طرح تیرے جلوہ سے منور ہوگیا یعنے ہر آئینہ مین تیرا پورا عکس نظر آنے لگا۔

میرزا غالب۔ آبرو کیا خاک اُس گل کی کہ گلشن میں نہیں — ہے گریباں ننگ پیراہن جو دامن میں نہیں

علامہ طباطبائی۔ گریباں دامن میں جب ہی ہوگا جب چاک ہو جائیگا اور چاک ہوکر گل سے مشابہت پیدا کریگا۔ اور دامن کو صحن گلشن بنادیگا۔

راقم۔ جب گریبان دامن سے جدا ہو جاتا ہے تو وہ ایک پھٹا ہوا چیتھڑا ننگ پیراہن خیال کیا جاتا ہے اسی طرح سے جن پھولوں کا چمن سے افتراق ہو جاتا ہے وہ بے آبرو ہو جاتے ہیں۔

میرزا غالب۔ ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو — تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

علامہ طباطبائی۔ یعنے تغافل تو ناآشنائی محض ہے یہ مجھے کیونکر گوارا ہو۔

راقم۔ یعنے تغافل کے معنی معذوری نہیں ہیں تو جبکہ ظلم بھی کرسکتا ہے لطف بھی کرسکتا ہے اگر لطف کرنے سے دریغ ہے تو ظلم ہی سہی کچھ تو ہو۔

میرزا غالب۔ حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو — کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو

علامہ طباطبائی۔ تنگ چشم ہونا حاسد کی صفات مین سے ہے۔ گرم تماشا ہو یعنے دنیا کو دیکھ۔ حاصل یہ کہ تجربہ کے بعد تجھے معلوم ہو جائیگا کہ حسد کرنا بیجا ہے۔ دنیا مین دولت کے لیے کوئی سبب نہین درکار ہے ہر جگہ یہی حال ہے۔

راقم۔ عالم کی سیر کرنا۔ حسد کا علاج تجویز کیا گیا ہے یعنے کثرت سیر و سفر سے مختلف حالتونکے لوگوں کو دیکھنے کا موقع ملیگا اور تنگ نظری رفع ہو جائیگی۔

میرزا غالب۔ وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں ۔ اپنی سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہو

علامہ طباطبائی۔ یعنے وارستگی اور آزادی اس کا نام نہیں ہے کہ بیگانگی و وحشت کا بہانہ کرلیا۔ اور ہم سمجھے کہ دنیا سے آزاد ہو گئے۔ ارے بیگانگی و وحشت بھی کر تو اپنے نفس سے کر نہ غیر سے۔

راقم۔ وارستگی کو بیگانگی کا حیلہ نہ بنانا چاہیے۔ یعنی آزاد مزاجی کا لازمہ بیگانگی نہیں ہے۔ خواہ کتنی ہی وحشت دامنگیر ہو لیکن دوست دشمن سے بیگانگی نہ برتنا چاہیے۔ یہ اصول باہمہ اور بے ہمہ کی تعلیم ہے۔

میرزا غالب۔ موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے ۔ تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

علامہ طباطبائی کہتے ہیں موت کی راہ کیوں نہ دیکھوں کہ وہ بغیر آئے نہیں رہے گی۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا کہ تم سے کہوں کہ تم نہ آؤ کہ پھر مجھسے بلاتے بھی نہ بن پڑے۔ یعنے آپ ہی آنے کو منع کروں تو پھر کس منھ سے بلاؤں۔ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ تمھارے نہ آنے سے موت کا آنا بہتر ہے

نوٹ:۔ اس شعر کی شرح میں مولانا حسرت موہانی نے بھی دماغ پر بہت زور دیا ہے گو مولانا کی شرح بھی اصل مطلب سے بہت دور ہے لیکن انکی ذہن کا دی بھی نظر انداز کرنیکے قابل نہیں ہے مولانا حسرت کی موشگافیاں بھی قارئین کے انفراح طبع کا باعث ہونگی۔ وہو ہذا۔

مولانا حسرت۔ مجھکو موت کی راہ نہ دیکھنا چاہیے کیونکہ وہ خواہ مخواہ آئے گی۔ علاوہ اس کے موت کی خواہش کرنے میں یہ بات بھی پیدا ہوتی ہے کہ نہ آؤ اور اگر ایسے خیال کا شبہ بھی میری نسبت ہوا تو میں پھر کبھی تم کو بلا۔ یعنے ایسا خیال رکھکر پھر کس منھ سے تمھیں بلاؤنگا۔

بسم اللہ

فہرست مضامین بابت ماہ نومبر سنہ ۱۹۲۶ء

جلد ۳۱ نمبر ۵

ظ

اخبار سچ

کا دوسرا سال بفضلہ ختم کے قریب ہے۔ ملک بھر کے اخبارات نے جس کثرت سے ہر ہفتہ اسکے مضامین نقل کیے ہیں پسندیدگی خواص کا کسقدر اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے۔ سنہ ۲۷ء کے جملہ نئے خریداروں کو ایک نہایت ہی مستند اور دلآویز میلاد شریف "نغمۂ حرم" ہدیۃً دیا جائے گا بشرطیکہ سالانہ چندہ ۳ روپے اور نغمۂ حرم کا محصول ڈاک ۱/ کل جملہ ۳/۱ بذریعہ منی آرڈر بھیجدیا جائے۔

مہتمم سچ۔ لکھنؤ

نئی کتابیں

ہملیٹ

دنیا کے سب سے بڑے ڈراما نویس شکسپیر کے شاہکار "ہملیٹ" کا سلیس و بامحاورہ اُردو ترجمہ، فاضل اہلِ قلم منشی امتیاز علی صاحب بی اے وکیل فیض آباد کے قلم سے۔ دیباچہ میں ڈراما اور اُس کی تاریخ پر فلسفیانہ بحث کی ہے اور خلاصہ قصہ اور اُس پر تنقید بھی شامل کر دی ہے۔ مزید ملاحظہ فرمائیے۔ قیمت عہر

چوروں کا کلب

آغا بہادر رضوی لکھنوی نے اس ناول میں تحیر خیز طریقہ پر اور نہایت دلکش انداز میں ایک پُراسرار قتل کے رازوں کا انکشاف، ایک حسین عیار کے حیرت انگیز کارنامے، پری جمال نازنینوں کے کرشمے، بوالہوسی کے راز و نیاز، برقی ایجاد کے جلوے، بامحاورہ اور سلیس اُردو زبان میں تحریر کیے ہیں۔ ہندوستانی زندگی کا یہ اوریجنل ناول اتنا دلچسپ ہے کہ ایک دفعہ شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کیے ہوئے اُٹھنا مشکل ہے۔ ٹائیٹل پیج ایک خوبصورت تصویر سے مزین ہے۔ قیمت صرف عمر

مسئلۂ حجاز

یعنی وفد خلافت ۱۹۲۶ء کی رپورٹ جس کا مجموعی حجم ۲۸۰ صفحے ہے اور جس میں آثار و مقابر وغیرہ کی ایک درجن سے زائد عکسی تصویریں ہیں۔ مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، مسٹر شعیب قریشی۔ قیمت عہ مجلد ۱۲/

حکایات الصالحین فی محاسن المحسنین

یہ کتاب روض الریاحین مولفہ امام یافعیؒ کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں مشہور صوفیا اور اولیاء کے اقوال و حکایات نہایت دلکش انداز میں اور بڑے اہتمام سے بیان کیے گئے ہیں۔ قصص صوفیائے کرام پر اس سے زیادہ مستند اور بہتر کتاب نہیں ہے۔ جھوٹی سچی کہانیوں کو چھوڑ کر اسے پڑھیے کہ رسول اللہ صلعم اور صلحاء سے محبت پیدا ہو۔ قیمت ۱۲/

ذکرِ حبیب

اس نام سے ملک محمد الدین ایڈیٹر رسالہ صوفی نے جناب سید غلام حیدر علی شاہؒ جلال پوری کے مفصل حالات، کرامات اور ملفوظات سلیس اردو اور دلکش انداز میں تحریر فرمائے ہیں۔ خواجہ صاحب کی شان میں ہندوستان کے مشہور شعرا کی بہت سی دلپسند نظمیں آخر میں شامل کر دی گئی ہیں۔ جلالپور کا عام نظارہ، مزار کی رنگین تصویر، شاہ صاحب کا عکس [illegible] اقبال کی لکھی ہوئی دستی [illegible] بھی کتاب میں شامل ہے [illegible] جلالپور کے قلم سے [illegible] ایک [illegible] ہے۔ قیمت ہے/

ملنے کا پتہ: الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۵ جلد ۱۳ — نومبر سنہ ۱۹۲۶ء

قرآن شریف

اور

حضرت عیسیٰؑ کا بے باپ پیدا ہونا

موقر "نگار" کے فاضل ایڈیٹر جناب نیاز فتح پوری نے نگار کے گذشتہ نمبر میں بذیل استفسارات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے متعلق ایک طویل مقالہ سپرد قلم کیا ہے، جو تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں فاضل مضمون نگار نے قرآن شریف سے حضرت مسیح کا بے باپ کے پیدا نہ ہونا ثابت کیا ہے۔ دوسرے حصہ میں آپ کے آسمان پر اٹھائے جانے کی تردید کی ہے اور آخر میں معجزات عیسوی سے انکار کیا گیا ہے ان تینوں مباحث میں پہلا مبحث اہم ہے۔ لہذا میں اس صحبت میں یہ ثابت کروں گا کہ قرآن شریف سے حضرت روح اللہ کا بے باپ ہی کے پیدا ہونا پایا جاتا ہے۔ چونکہ کلام اللہ کی صحت میں کسی مسلمان کو شک نہیں، اس لیے حدیث اور تاریخ کا حوالہ نہ دوں گا۔

قبل اسکے کہ میں اصل موضوع کی طرف توجہ کروں، کچھ بطریق مقدمہ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ خرق عادت اور معجزہ کا مسئلہ، بنو عباس کی پہلی صدی سے، جبکہ فلسفۂ یونانی کے عربی میں ترجمہ ہو جانے کے باعث مسلمانوں کی ذہنیات میں کچھ تغیر پیدا ہو گیا تھا، مختلف فیہ مبحث رہا ہے۔ طرفین افراط و تفریط

کے ہمیشہ شکار رہے۔ معتزلی خیال کے نام نہاد آزاد منش اصحاب جو عقل و معقولیت کے ضرورت سے زیادہ بندے بنے ہوئے ہیں خرق عادت کو یکدم محال و غیر ممکن خیال کرتے ہیں۔ دوسری طرف خوش عقیدہ مذہبی حضرات اس قدر مبالغہ کرتے ہیں کہ معجزہ شئے مضحکہ ہوگیا ہے۔ شروع سے اب تک جو کچھ اس مبحث پر لکھا گیا ہے اُس میں بہترین، سیرۃ النبی کے تیسرے حصہ کی بحث ہے، جو درحقیقت قول فیصل اور افراط و تفریط سے خالی ہے۔ اس میں خرق عادت و معجزہ کے امکان کو بدلائل ثابت کیا ہے۔ مگر ساتھ ہی اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ صحت روایت کا جس قدر زیادہ لحاظ کیا جائے گا معجزوں کی تعداد کم ہوتی جائیگی تاہم چند معجزات ایسے ضرور ہیں جو کلام پاک اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں اور جن سے کسی مسلمان کو انکار نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اُنکا انکار قرآن کے انکار کا مترادف ہوگا۔ ایک مسلمان کے نزدیک قرآن کے اخبار و احکام یقینی ہیں اور علوم جدیدہ کے مقرر کردہ اصول و نتائج محض قیاسی و تخمینی۔ اور یقین و تخمین میں بڑا فرق ہے۔

مولانا نیاز کی قابلیت سے یہ درحقیقت نہایت مستبعد ہے کہ وہ معجزہ کا انکار کریں۔ دس گیارہ برس ہوئے، رسالہ اُسوۂ حسنہ میں جو میرٹھ سے نکلتا تھا، اُنکا ایک طویل مضمون بعنوان معجزۂ شق القمر کئی قسطوں میں شایع ہوا تھا۔ جس میں نیاز صاحب نے نہایت قابلیت کے ساتھ اُن سب اعتراضات عقلیہ و نقلیہ کی جو معجزۂ انشقاق قمر پر وارد کیے جاتے ہیں، تردید کی تھی۔ اُس وقت مولانا کا اعتقاد تھا کہ قانون قدرت کی حقیقت معلوم کرنے کا ہمارا ذریعۂ علم یعنی استقرا ناقص ہے، اور اس استقراء ناقص کی بنا پر قانون قدرت کے متعلق کوئی قطعی و اذعانی حکم لگانا سخت غلطی و جسارت ہے۔ چنانچہ مولانا نے آٹھ مثالیں ایسی دی تھیں جن سے استقراء کی غلطی ثابت ہوتی تھی۔ اُنکے علاوہ اور بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن چونکہ اس صحبت میں میرا مقصود حضرت عیسیٰ کی ولادتِ بے پدر کو قرآن شریف سے ثابت کرنا ہے اسلیے فی الحال عقلیہ دلائل سے سروکار نہیں رکھتا۔ تعجب ہے کہ مولانا کی یہ مذہبی ذہنیت اس قدر جلد بدل گئی کہ مولانا اب اعتقاد بالمعجزہ کو اعجوبہ پرستی اور عقل و ہوش کی دشمنی سے تعبیر کرتے ہیں۔

مولانا اگرچہ بالفاظ صریح معجزہ کا انکار نہیں کرتے مگر اگر غ   حضرت عیسیٰ کی ولادت
بے پدر کی بابت انکو جو اختلاف ہے اُس کا منشا سوائے اسکے   س کے مقرر کردہ
قانون الٰہی کے خلاف کسی چیز کو، خواہ وہ قرآن شریف سے ثابت   ہے، قبول کرنا نہیں
چاہتے۔ قانون الٰہی کے خلاف جانا تو ہمارا ذہن بھی گوارا نہیں کرتا۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ قوانین قدرت

سے کون سے قوانین مراد ہیں۔ وہ جو درحقیقت اس عالم میں کام کر رہے ہیں اور جن پر اس عالم کا نظام قائم ہے، یا وہ جنکو چند انسانی ہستیوں کی محدود عقل نے اپنے زعم میں معلوم کر لیا ہے؟ کیا سب قوانینِ قدرت پورے طور پر کماہی معلوم و مشخص کر لیے گئے؟ کیا کوئی صاحب عقل سلیم اس کا جواب ایجاب میں دے سکتا ہے؟ سائنس نے حقائق عالم معلوم کرنے اور قوانین فطرت مشخص کرنے کا جو بیڑا اُٹھا یا ہے وہ اُس ضعیف چیونٹی کی ناچیز کوشش سے جو تمام کرۂ زمین کے چپہ چپہ پر سفر کر کے دنیا کا حال معلوم کرنا چاہتی ہے؛ زیادہ وقعت نہیں رکھتا کیا کوئی شخص دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ جو قوانین قدرت معلوم کر لیے گئے ہیں وہ یقینی اور حقیقی ہیں؟ کیا آپ کے پاس اسکی کوئی گارنٹی ہے کہ جس طرح تحقیقاتِ قدیمہ کو تفحصاتِ جدیدہ نے باطل کر دیا ہے اُسی طرح زمانہ آیندہ کی کاوش و جستجو موجودہ مسلّمات کو غلط ثابت نہ کر دیگی۔ مثال کے طور پر عرض ہے کہ نیوٹن کا مایۂ ناز قانون ثقل ارضی جس وثوق و یقین کی قوت کے ساتھ ایک عرصۂ دراز سے سائنس دانوں کے دماغوں پر مسلط ہیں، محتاج بیان نہیں لیکن آجکل اسی قانون کو متعدد علمبرداران تحقیق و تدقیق غلط ثابت کر رہے ہیں۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ علوم جدیدہ کے معلوم کردہ قوانین قدرت یقینی نہیں۔ اسکے برخلاف اگر کسی ذاتِ انسانی کو قانون قدرت کے بنانے والے خداوند حقیقی کا رازدار سمجھتے ہیں اور یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ جو کچھ اُسنے کہا، وہ خدا کی طرف سے کہا، تو اسکی خبر، اگرچہ ہمارے معلوم کردہ قوانین فطرت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، درحقیقت صحیح ہے اور قانون قدرت کے عین مطابق۔ مولانا نیاز: ممکن ہے بظاہر کسی معجزہ کو نہ مانتے ہوں، مگر مسلمان ہونے کی حیثیت سے کم از کم اس معجزہ کا ماننا ضروری ہے کہ قرآن کلام الٰہی ہے جو وحی کے ذریعہ آنحضرتؐ پر نازل ہوا، اور یہ کہ یہ کتاب نقص و عیب سے پاک اور ہر نقطۂ خیال سے بے نظیر اور لاجواب ہے، اور یہ کہ آنحضرتؐ خدا کے رسول اور آخری رسول ہیں۔ اگر مولانا کے یہ عقائد نہیں تب تو وہ مسلمان نہیں۔ اور اگر وہ انکے معتقد ہیں تو وہ ضمناً معجزہ کے بھی قائل ہیں۔ یہ تمام امور بظاہر خلاف فطرۃ ہیں۔ قانون فطرت کسی ایک یا چند واقعات کے ساتھ مخصوص نہیں ہو سکتا۔ کیا انسان پر وحی آنا، خدا سے بات کرنا وغیرہ وغیرہ باتیں اس زمانہ میں عام طور پر دیکھنے میں آتی ہیں؟ کیا ایسی کتاب ہو سکتی ہے جو قرآن سے بڑھ کر ہو۔ کیا کوئی اُمّیِ محض صرف الہام ربانی کی بدولت ایسی کتابِ نادر پیش کر سکتا ہے جس کا حقیقۃً دنیا میں جواب نہ ہو۔ کیا یہ خرق عادت و معجزہ نہ تھا۔ غرضکہ قرآن شریف کے نزول اور بعثت رسولؐ پر ایمان لانا ہی معجزہ کا قائل ہونا ہے۔ یعنی اصولاً معجزہ کا وجود مان لیا گیا۔ تو پھر یہ بحث رہ جاتی ہے کہ کون کون سے معجزے قرآن پاک اور احادیث صحیحہ

سے ثابت ہیں۔ اور یہ کچھ مشکل نہیں۔ اب میں حضرت عیسیٰ کا بے باپ پیدا ہونا قرآن سے ثابت کرتا ہوں۔ مگر پہلے ایک اور مقدمہ کے ذہن نشین کر لینے کی ضرورت ہے۔

آیات قرآنیہ کی تفسیر میں بہت کچھ اختلافات پیدا کر دیے گئے ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو قرآن پاک کے صحیح سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل اصول ہو سکتے ہیں:-

۱- قرآن عربی زبان میں ہے، اسلیے عربی لغت، عربی صرف و نحو اور عربی اسلوب بیان کا لحاظ رکھا جائے۔

(۲) ہمیشہ وہ معنی مراد لیے جائیں جو الفاظ ظاہر سے لغت و محاورہ کے مطابق مترشح ہوں۔ البتہ اگر کہیں اصول بلاغت کے مطابق مجازی معنی مراد ہیں تو پھر لغوی معنی مراد نہ لیے جائیں۔ مثلاً "ید اللہ" سے اللہ کا ہاتھ نہیں، بلکہ اُسکی قدرت مراد ہے۔

۳- قرآن شریف پیش کرنے والے یعنی جناب رسالتمآبؐ نے کیا معنے بتائے اور سامعین یعنے صحابۂ کرامؓ نے کیا مفہوم سمجھا، جسکا پتہ احادیث صحیحہ سے چلتا ہے؟

۴- جس طرح ہر کتاب کا ایک خاص طرز ہوا کرتا ہے۔ جس سے واقفیت بھی اُس کتاب کے سمجھنے میں کافی مدد دیتی ہے۔ اسی طرح قرآن شریف کا بھی ایک خاص اسلوب بیان ہے۔ جسکو آیاتِ قرآنیہ سمجھتے وقت نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

جو لوگ معجزات کے منکر ہیں اُن کا استدلال یہ ہوتا ہے کہ خرق عادت ومعجزہ خلاف قانون فطرت ہے اور اس لیے لغویات ہے اور قرآن شریف میں لغو باتیں نہیں ہیں کیونکہ وہ کلام الٰہی ہے۔ پس اگر کسی آیت یا آیات سے معجزہ کا وجود ثابت ہو تو یہ سمجھنا چاہیے کہ مفہوم سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ الہ آباد میں مولوی ابو الفضل صاحب نامی ایک بزرگ ہیں، جنکو اس میں کچھ شک نہیں، قرآن سے خاص دلچسپی ہے۔ یہ کئی زبانوں میں اسکا ترجمہ کر چکے ہیں۔ مگر آپ قرآن شریف کے سمجھنے میں یہی اصول پیش نظر رکھتے ہیں۔ اور جہاں جہاں عام عقائد کے مطابق معجزہ کا شائبہ ہوتا ہے وہاں علماے معتزلہ یا سر سید احمد کی تائید و تقلید میں یا اپنی ذاتی آزادانہ تحقیق کی بنا پر معجزات سے انکار کر جاتے ہیں۔ اور آیات سے حسب مرضی وہ معنی مراد لیتے ہیں جن سے معجزہ کا وجود قائم نہیں

میں ان لوگوں سے یہ کہتا ہوں کہ آپ کے طریقہ ا[illegible] قباحت یہ ہے کہ چونکہ آپ معجزہ کو لغو سمجھتے ہیں اس لیے آپ کو آیات کی تف[illegible] [illegible]ے اصول کے خلاف کرنی پڑتی ہے۔ ہم مسلمان تو آپ کے استدلال پر کم از کم یہی سمجھ کر خاموش ہو جائیں گے کہ آپ قرآن کو

کلام اللہ تو مانتے ہیں، لیکن غیر مسلم آپ کے دور از کار معنی کب مانے گا، وہ تو آپ کے خیال کے مطابق معجزہ کو لغو سمجھ کر قرآن کو بھی (نعوذ باللہ) لغو سمجھے گا کیونکہ اسے بہت سی آیات ایسی ملیں گی جن میں معجزہ کا ذکر ہوگا۔ پس غیر مسلم کو سمجھانے کے لیے آپ کو خرق عادت اور معجزہ کا امکان ثابت کرنا چاہیے، نہ کہ آیات کے معنی میں تصرف کریں۔ آیات کے معانی آپ کے تصرف سے بدل نہیں سکتے۔ خدا کا کلام قصائد بدر چاچ کی طرح چیستان نہیں ہے، نہ اس نے اظہار قابلیت کے لیے اسے نازل فرمایا۔ اسکا اصل نشا ہدایت عالم تھا۔ وہ درۂ نادرہ اور مقامات حریری کے طرز پر نہیں ہے کہ اوق اور مشکل ہو۔ نہ اس میں قصائد خاقانی کی طرح دور از کار اور پیچیدہ تشبیہات وتراکیب ہیں، اور نہ غالب کے بعض مشکل شعروں کے مانند ہے جنکے مفہوم معین کرنے کے لیے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا دیا جائے اور پھر بھی مبہم رہیں۔ خدا کا کلام ایسا سہل ہے کہ عرب ایسی اُمی و ناخواندہ قوم نے اُسے سنا اور مطلب سمجھ گئے۔ کلام کی خوبی صرف یہی ہے کہ بآسانی سمجھ میں آسکے۔ کلام الہٰی عرب کی زبان میں ہے اس لیے عربی اسلوب بیان اور عربی فصاحت وبلاغت کا معیار بدرجۂ اتم اس میں ملحوظ رہا ہے۔ تمام معانی ومطالب قرآن اول سے آخر تک نہایت واضح ہیں۔ ممکن ہے کہ کسی آیت کا مطلب ماسبق وما لحق سے علیحدہ وضاحت کے ساتھ سمجھ میں نہ آئے مگر دیگر آیات کی مدد اور نیز سیاق کلام سے یہ دشواری رفع ہو جاتی ہے۔

اس قدر گذارش کرنے کے بعد اصل مطلب کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

مولانا نیاز نے تاریخی حیثیت سے اس مسئلہ پر جو روشنی ڈالی ہے اُس سے قطع نظر کرکے اُنکے قرآنی استدلالات کو لیتا ہوں، کیونکہ یہ زیادہ اہم ہیں۔ اگر قرآن شریف سے حضرت عیسٰیؑ کا بے باپ کے پیدا ہونا ثابت ہو جائے، تو تاریخ کتنی معتبر کیوں نہ ہو، ناقابل التفات رہ جاتی ہے۔ قرآن پاک میں حضرت عیسٰی کا متعدد مقامات پر ذکر ہوا ہے، لیکن سورۂ مریم میں مفصل ذکر ہے۔ وہ آیتیں "واذکر فی الکتاب مریم" سے لیکر "کن فیکون" تک ہیں۔ میں اُن میں سے ایک ایک آیت بتاؤں گا کہ یہ تمام آیات کیا بحیثیت مجموعی اور کیا فرداً فرداً حضرت عیسٰی کی ولادت بے پدری کو ظاہر کرتی ہیں۔

واذکر فی الکتاب مریم اذ انتبذت من اھلھا مکانا شرقیا فاتخذت من دونھم حجابا۔ ذکر کر کتاب میں مریم کا، جب وہ علیحدہ ہوئی اپنے لوگوں سے ایک مشرقی مکان میں، پھر کرلیا انکی طرف سے پردہ۔ مکان شرقی سے مراد مکان کا شرقی حصہ ہے، جہاں حضرت مریم غسل کے لیے اپنے گھر والوں سے الگ

ہو گئی تھیں ۔ آیۂ فاتخذت من دونہم حجاباً سے یہی مفہوم ذہن میں تبادر ہوتا ہے، ورنہ پردہ کر لینے کی کچھ اہمیت باقی نہیں رہتی ۔ کل آیت کا یہ مطلب ہوا کہ جب آپ نہانے کی غرض سے اپنے کنبہ والوں سے علیٰحدہ ہو کر مشرقی حصۂ مکان میں چلی گئیں اور آپ نے اپنے گھر والوں سے پردہ کر لیا، تو جیسا کہ اگلی آیت سے ظاہر ہے، ایک فرشتہ انسان کی شکل میں نمودار ہوا ۔ مولانا نیاز فرماتے ہیں خواب میں ۔ خواب کے معنی کہاں سے پیدا ہوئے ؟ قرآن شریف کا اسلوب بیان ہے کہ جہاں کہیں خواب کا ذکر ہے وہاں لفظ منام وغیرہ ضرور بیان کر دیا گیا ہے ۔ چنانچہ حضرت خلیل اللہ و ذبیح اللہ کے ذکر، یا یوسف علیہ السلام کے قصہ میں لفظ منام موجود ہے ۔

فارسلنا الیہا روحنا فتمثل لہا بشراً سویاً ۔ پس ہم نے بھیجی اُسکی طرف اپنی روح جو ٹھیک ٹھیک انسان کی شکل میں اُنکو نظر آئی ۔

قالت انی اعوذ بالرحمٰن منک ان کنت تقیاً ۔ حضرت مریم تنہائی کے عالم میں اپنے اہل سے پس پردہ تھیں کہ اُنکو ایک اجنبی نظر آیا تو ڈر کر بولیں کہ اے شخص اگر تجھے کچھ خدا کا خوف ہے تو میں خدا کا واسطہ دیکر تجھ سے بچنا چاہتی ہوں ۔ یعنی خدا کے لیے میری عصمت و عفت پر حملہ نہ کر دینا ۔ ذرا غور کیجیے ۔ تنہائی، گھر والوں سے پسِ پردہ، اور ایک اجنبی شخص کا نمودار ہونا ۔ اور پھر حضرت مریمؑ کا یہ فرمانا کہ اگر تو پرہیزگار ہے تو خدا کا واسطہ دیکر میں بچنا چاہتی ہوں ۔ یہ سب واقعات کسقدر باہم مناسب اور ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں ۔ کیا ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت مریم غسل یا کسی ایسے ہی کام کے لیے گھر والوں سے الگ پس پردہ ہو گئی تھیں ۔ کیا یہ خواب کا واقعہ معلوم ہوتا ہے ؟

مولانا نیاز نے ان کنت تقیاً میں "اِن" کا ترجمہ "اگرچہ" سے کیا، جو صحیح نہیں ہے ۔ عربی "وان" کے معنی اگرچہ کے ہیں، نہ کہ "اِن" کے ۔ "اگرچہ" سے عبارت خبط ہو جاتی ہے ۔ ممکن ہے طباعت کی غلطی ہو ۔

قال انما انا رسول ربک لاھب لک غلاماً زکیاً ۔ اُس نے کہا کہ میں خدا کا بھیجا ہوا تیرے پاس آیا ہوں تاکہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا دوں ۔

مولانا نیاز ترجمہ فرماتے ہیں " خدا کا یہ پیام لیکر آ کہ پاکیزہ بیٹا دونگا" یعنی "لاھب" میں ضمیر متکلم خدا کے لیے ہے ۔ حالانکہ سیاق کا قائل یعنی روح کے لیے ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ فاعل حقیقی تو خدا ہی ہے، لیکن کی فاعلیت رسول کے ساتھ اس لیے متعلق کی گئی ہے کہ درحقیقت لڑکا دینے وہی آیا تھا ۔ جیسا کہ اُردو میں کہا جائے کہ میں

فلاں صاحب کا بھیجا ہوا ہوں کہ آپ کو پانچ روپئے دوں - یعنی فلاں صاحب کے حکم سے میں پانچ روپئے دینے آیا ہوں -

قالت انیّٰ یکون لی غلام ولم یمسسنی بشیر ولم اکُ بغیا - حضرت مریم نے کہا کہ میرے بیٹا کیونکر ہو سکتا ہے حالانکہ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں اور نہ میں بدکار ہوں - کیا یہ خواب کا ذکر ہے ؟ کوئی ایک قرینہ بھی خواب کے متعلق بتایا جا سکتا ہے ؟

قال کذٰلک قال ربک ہو علیّ ہیّن ولنجعلہ آیۃ للناس ورحمۃ منّا وکان امراً مقضیا - روح نے کہا کہ ایسا ہی ہوگا - تیرے رب نے کہا ہے کہ یہ (ولادت بے پدر) میرے لیے آسان ہے اور (علاوہ بریں) میں لوگوں کے لیے (اس پسر بے پدر کو اپنے قادر مطلق ہونے کی) نشانی اور اپنی طرف سے رحمت یعنے سرچشمہ ہدایت بناؤں گا اور یہ امر مقدر ہو چکا ہے، یعنی ہو کر رہے گا ٹل نہیں سکتا - یہاں لفظ کذٰلک قابل غور ہے - مولانا نیاز فرماتے ہیں کہ اسکے یہ معنی ہیں کہ ہاں تجھے آدمی چھوئے گا اور باقاعدہ حمل کے بعد لڑکا پیدا ہوگا - مگر یہ معنی بوجوہ غلط ہیں :-

(۱) قال کذٰلک انیّٰ یکون لی ولد کا جواب ہے - یعنی حضرت مریم نے فرمایا کہ میرے لڑکا کیونکر پیدا ہوگا حالانکہ مجھے کسی نے چھوا تک نہیں - اسکے جواب میں یہ کہنا کہ ایسا ہی ہوگا، ظاہر کرتا ہے کہ روح کی یہی مراد تھی کہ اللہ تعالیٰ بغیر مباشرت کے بیٹا دیگا - یہ معنی ذہن میں زیادہ تبادر ہوتے ہیں اور سیاق کلام کے مطابق ترین بجائے اسکے کہ یہ معنی لینا کہ پہلے تجھے انسان چھوئے گا اور پھر لڑکا ہوگا -

(۲) اسکے آگے کی آیت قال ربک ہو علیّ ہیّن - سے صاف ظاہر ہے کہ کسی امر مہتم بالشان یا کسی ایسے امر کے لیے جو بظاہر محال معلوم ہوتا ہے، خداوند عالم نے یہ فرمایا کہ میرے لیے یہ آسان ہے حضرت مریم کی شادی کوئی مشکل کام نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا کہ میرے لیے یہ آسان ہے کہ پہلے تیری شادی کراؤں گا اور پھر تیرا شوہر تجھے چھوئے گا تب لڑکا پیدا ہوگا - سیاق کلام سے یہ مطلب یہاں چسپاں ہی نہیں ہوتا - علاوہ بریں، یہ آیت بعینہا دو جگہ آئی ہے، ایک سورۂ آل عمران میں اور پھر سورۂ مریم میں - پہلے مقام پر 'کذٰلک' کے بعد یخلق ما یشاء اذا قضیٰ امراً فانما یقول لہٗ کن فیکون ہے اور دوسری جگہ ہو علیّ ہیّن ہے - دونوں جگہ صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ خدا کا نشا صرف یہی ہے کہ بے باپ کا لڑکا پیدا کرنا میرے لیے آسان ہے - میں جسکو چاہتا ہوں پیدا کرتا ہوں، اور جب کسی امر کا حکم دیتا ہوں تو کہتا ہوں کہ ہو، وہ ہو جاتا ہے - یعنی میری قدرت قواعد عادیہ کے ساتھ پابند نہیں - غرضکہ 'کذٰلک' کے بعد یخلق ما یشاء، الخ کا جملہ نشاء خداوندی کے ظاہر کرنے میں کسی قسم کا شک باقی نہیں چھوڑتا

اگر کذٰلک سے مراد، شادی ہوکر مباشرت سے حمل قرار پانا ہوتا تو قدرت خداوندی پر اس قدر زور دینے کا مناسب موقع نہ ہوتا ۔ علاوہ بریں کذٰلک حضرت زکریاؑ کے حق میں بھی ایسے ہی موقع پر مستعمل ہوا ہے ۔ جب خداوند تعالیٰ نے حضرت زکریاؑ کو لڑکے کی خوشخبری دی تو آپ نے فرمایا کہ اے رب کہاں سے ہوگا میرے لڑکا، حالانکہ میری عورت بانجھ ہے اور میں بوڑھا ہوگیا ہوں یہاں تک کہ اکڑ گیا (قال رب انّٰی یکون لی غلام وکانت امرأتی عاقراً وقد بلغتُ من الکبر عتیاً، قال کذٰلک قال ربک ہو علیّ ہین-) یہاں مولانا نیاز کذٰلک کی کیا تاویل کریں گے؟ کیا بانجھ عورت کے لڑکا پیدا ہونا، خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ شوہر بوڑھا پھونس ہوگیا ہو، خرق عادت نہیں ہے؟ حضرت مریم کے قصہ میں تو مولانا نیاز 'کذٰلک' کے یہ معنی بیان کرتے ہیں کہ تجھے آدمی چھوئے گا اور تیرے بچہ پیدا ہوگا۔ کیا اسی تاویل کے مطابق مولانا یہاں یہ معنی نکالیں گے کہ بڑھاپا جوانی سے بدل جائے گا اور تب بچہ پیدا ہوگا؟ اگر یہ معنی نکالتے ہیں تو بھی خرقِ عادت لازم آتا ہے ۔ غرضکہ قصۂ حضرت زکریا و قصۂ حضرت مریم کی باہمی مشابہت اس درجے کی ہے کہ لفظ 'کذٰلک' کے معنی میں کسی قسم کے شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی ۔

(۳) ولنجعلہ آیۃ بھی قابل غور ہے ۔ لفظ 'آیۃ' قرآن شریف میں آیات قرآنیہ کے علاوہ عام طور پر نشانی کے معنی میں مستعمل ہوا ہے اور نشانی بھی قدرتِ خداوندی کی ۔ قرآن شریف میں کئی موقعوں پر خداوند تعالیٰ نے اپنی قدرت کی باتیں بیان کرکے فرمایا کہ یہ عقلمندوں کے لیے کھلی نشانیاں ہیں۔ غرضکہ حضرت عیسیٰ آیۃ للناس اُسی وقت ہوسکتے تھے کہ اُنکی ولادت میں کوئی خاص اعجوبہ بات ہو، محض رسالت و نبوت آیۃ للناس نہیں ہوسکتی ۔ چنانچہ کسی اور نبی یا رسول کو قرآن میں آیۃ للناس نہیں کہا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معجزات (عصا، اور ید بیضا وغیرہ عنایت ہوئے تو اُنکے لیے کہا گیا ولقد اتینا موسیٰ تسع آیات بینٰت یعنی ہم نے دیں موسیٰ کو نو نشانیاں۔ غرضکہ ہو علیّ ہین، ولنجعلہ آیۃ للناس، اور لفظ کذٰلک ان سب سے مجموعی طور پر اور نیز جدا جدا صرف یہی مطلب نکلتا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے فرمایا کہ ولادتِ بے پدر میرے لیے آسان ہے ۔ اگر مولانا نیاز والے معنی مراد ہوتے تو اللہ تعالیٰ حضرت مریم کے اس ... کہ میرے لڑکا کیونکر پیدا ہوگا حالانکہ مجھے کسی نے چھوا تک نہیں، یوں فر... گا، یا اول ہم تمھاری شادی کرادیں گے ۔

---

(۴) اسکے علاوہ یہ آیت بھی پیش نظر رکھیے ان مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل آدم خلقہ من تراب

ثم قال لہٗ کُن فیکون - یعنی عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی سی ہے جسکو مٹی سے پیدا کیا۔ تم عیسےٰ کے بے باپ پیدا ہونے پر کیوں تعجب کرتے ہو۔ خدا نے تو آدمؑ کو بغیر ماں اور باپ کے مٹی سے پیدا کیا تھا۔

(۵) قرآن شریف میں حضرت عیسیٰؑ کی کنیت ابن مریم بیان کی گئی ہے۔ اس سے قطعی طور پر ثابت ہے کہ آپ بے باپ کے پیدا ہوئے تھے۔

ان سب باتوں کو پیش نظر رکھ کر اب آپ 'کذلک' کے معنوں پر غور کریں تو اسلوبِ بیاں اور سیاق کلام سب سے عیسیٰ کا بے باپ ہونا واضح ہو جائے گا۔

فحملتہ - پس حمل ٹھہرا مریم کو - سیاق کلام سے بھی ظاہر ہے کہ اُسی وقت حضرت مریم حاملہ ہو گئیں۔ کیونکہ روحِ خداوندی، مریم کو لڑکا دینے آئی تھی، اگر معاً حمل قرار نہ پاجاتا تو 'لاھب لک غلاماً زکیاً' غلط ٹھہرتا۔

مولانا نیازؔ فرماتے ہیں کہ کلام مجید میں قصہ یا واقعہ بیان کرنے کا یہ اسلوب ہے کہ غیر ضروری کڑیاں چھوڑ کر خاص خاص باتوں کا ذکر کر دیا جاتا ہے، تو بعض لوگ اس حقیقت کو نظرانداز کر کے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ جس طرح سے واقعات بیان ہوئے ہیں وہ سب مسلسل اور فوراً وقوع میں آئے۔ مولانا کا یہ خیال صحیح ہے، مگر اس کا اطلاق یہاں غلط ہے - کیونکہ سیاق کلام بتلا رہا ہے کہ روح خداوندی بشکل انسان متشکل ہو کر حضرت مریم کے پاس جبکہ وہ کسی ضرورت سے مکان شرقی میں اپنے گھر والوں سے پسِ پردہ تھیں، لڑکا دینے آئی - مریم نے کہا کہ میرے لڑکا کیونکر ہو سکتا ہے، مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں - تو روح نے جواب دیا کہ ولادت بے پدر خدا کے لیے آسان ہے اور یہ ہو کر رہیگا - اس صورت میں 'فحملتہ' کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ حضرت مریم معاً حاملہ ہو گئیں۔

فانتبذت بہ مکاناً قصیاً - فاجاءہ المخاض الیٰ جذع النخلۃ، قالت یلیتنی مِتُّ قبل ھٰذا و کنتُ نسیاً منسیاً - تو آپ دُور چلی گئیں - یہاں البتہ ضروری نہیں کہ حاملہ ہوتے ہی چلی گئیں۔ کیونکہ حمل کا احساس کچھ عرصہ کے بعد ہوتا ہے۔ جب اُنکو احساس ہوا تو آپ (بدنامی کے خیال سے) دُور چلی گئیں اور پھر دردِ زہ آپ کو ایک درختِ خُرما کے نیچے لے گیا - تو حضرت مریم فرمانے لگیں کہ کاش میں اس سے پہلے مر جاتی اور نسیاً منسیاً ہو جاتی۔

اول لفظ 'قصیاً' قابل لحاظ ہے - چونکہ بغیر مباشرت کے حمل رہ گیا تھا تو بدنامی کے خوف سے آپ دُور چلی گئیں تھیں۔ جیسا کہ عام قاعدہ ہے۔ پھر وضع حمل کے وقت حضرت مریم کا یہ فرمانا کہ کاش

میں مرجاتی اور نسیاً منسیاً ہو جاتی، قابلِ غور ہے۔ ذرا سیاق کلام کو پیش نظر رکھیے۔ بلا نکاح حمل ٹھہر جانا، حضرت مریم کا شرمندگی کی وجہ سے دُور چلا جانا، وضع حمل کا وقت آنا، اور پھر حضرت مریم کی یہ تمنا کس قدر فطرت انسانی کا سچا نقشہ ہے۔ اگر یہ حمل باقاعدہ شوہر کی مباشرت سے قرار پایا ہوتا تو پھر اس تمنا کی کیا ضرورت تھی؟ اگر یہ کہا جائے کہ دردِ زہ سے بیقرار ہو کر یہ خواہش کی ہو، تو میں عرض کروں گا کہ درد، دُکھ کے موقع پر انسان یہ تو کہتا ہے کہ کاش مجھے موت آ جائے اور اس تکلیف سے نجات پاؤں، یا کاش موت پہلے سے آجاتی اور یہ مصیبت مجھے برداشت نہ کرنی پڑتی۔ لیکن یہ نہیں کہے گا کہ نسیاً منسیاً ہو جاتا۔ یہ تمنا انسان اُسی وقت کرے گا جب کہ نام بد چھوڑنے کا احتمال ہو تاکہ مرنے کے بعد اُسے کوئی یاد تک نہ کرے۔ حضرت مریم کا خیال تھا کہ اگر میں اس حالت میں مرجاؤں گی تو بھی نام بد باقی رہے گا، لوگ میرا ذکر کریں گے اور میرے جسم میں تھوکیں گے۔ اس لیے آپ نے صرف مرنے ہی کی تمنا نہیں کی بلکہ نسیاً منسیاً ہونا بھی چاہا۔ تاکہ نہ کوئی یاد رکھے اور نہ بُرا بھلا کہے۔

فنادٰها من تحتها الا تحزنی قد جعل ربک تحتک سریا۔ وھزی الیک بجذع النخلة تساقط علیک رطباً جنیاً۔ فکلی واشربی وقری عینا، فاما ترین من البشر احداً فقولی انی نذرت للرحمٰن صوماً فلن اکلم الیوم انسیاً۔ اُسکو درخت کے نیچے سے آواز دی کہ رنج نہ کر، تیرے رب نے تیرے نیچے ایک چشمہ جاری کر دیا ہے، تو درخت خرما کو ہلا، وہ تجھ پر تر و تازہ پھل گرائے گا، اُسے کھا اور پانی پی اور اپنی آنکھ ٹھنڈی کر، پس اگر تو آدمی کو دیکھے تو کہہ دے (اشارہ سے) کہ میں نے خدا کے لیے ایک روزہ رکھا ہے اور میں آج کسی سے بات نہ کروں گی۔

لفظ 'تحزنی' قابلِ غور ہے چونکہ آپ کو اس حمل کا بیحد رنج تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ رنج نہ کر، یعنی بدنامی کا خیال نہ کر۔ دردِ زہ کی بیقراری کے لیے 'لا تحزنی' نہیں کہا جا سکتا۔ اسکے لیے تو یہ کہیں گے کہ ذرا تحمل و ضبط سے کام لے۔ خداوند تعالیٰ نے حضرت مریم کو 'لا تحزنی' فرما کر نہ صرف ہمت بندھا دی بلکہ ایسے سامان پیدا کر دیے جسکی وجہ سے قدرۃً حضرت مریم کی تسکین ہو گئی اور وہ سمجھ گئیں کہ یہ سب کچھ منجانب اللہ ہوا۔ درخت کے نیچے سے آواز کا آنا، پاؤں کے نیچے سے چشمہ کا جاری ہو جانا، اور خشک درخت خرما کا سبز ہو کر تازہ کھجوریں گرانا، اور حضرت بتلا دینا کہ اگر تم سے کوئی کچھ کہے تو خود خاموش رہنا اور بچہ کی طر [اعتراض کا یہ جواب یہ تمام واقعات] حضرت مریم کی تسلی و تشفی کے لیے کافی نہ تھے۔

فاتت بہ قومھا تحملہ۔ منجانب اللہ حضرت مریم کی اس قدر تسلی و تشفی ہو جانے کے بعد وہ اپنے

لڑکے کو گود میں لیکر اپنے لوگوں کے پاس آئیں

یہاں لفظ 'تحملہ' خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔ مولانا نیاز فرماتے ہیں کہ حضرت مریم جب عیسیٰ کو اپنی قوم کے پاس لائیں تو وہ جوان ہو چکے تھے، بچے نہ تھے۔ اور اس لیے 'تحملہ' کے معنی اُنکے نزدیک یہ ہیں کہ حضرت مریم اُنکو سواری میں بٹھا کر لائیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ لغتہً 'تحملہ' کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں، لیکن ذرا غور تو کیجیے کہ یہاں کون سے معنے مراد ہونگے 'گود میں اُٹھا کر' یا 'سواری میں بٹھا کر'؟ اگر دوسرے معنے مراد ہیں، تو اسکا ظاہر کرنا فضول تھا۔ فاتت بہ قومھا، کہ دینا کافی تھا۔ 'تحملہ' قصہ کی کون سی اہم کڑی ہے جسکو خداوند تعالی نے بیان کرنا ضروری سمجھا؟ یہ کہنا ایک بیکار سی بات ہے کہ ماں اپنے بیٹے کو سواری پر بٹھا کر لائی۔ خدا کا کلام ایسے حشو وزوائد اور فضول الفاظ سے پاک ہے۔ پھر یہ سوچیے کہ ماں، بیٹے کو سواری پر بٹھا کر لائی اور خود پیدل آئی۔ بیٹے نے کیونکر گوارا کیا کہ ماں پیدل آئے۔ اگر دونو سواری پر آئے تو 'تحملہ' کی کیا تخصیص۔ غرضکہ مولانا نیاز نے جو معنی بتائے ہیں وہ بالکل غلط ہیں اور اسلوب قرآن کے شایان شان نہیں۔ اسکے مقابلہ میں 'تحملہ' کے یہ معنی کہ وہ اُسکو گود میں اُٹھا کر لائیں، کس قدر مناسب حال ہے۔ یعنی جب حضرت عیسیٰ پیدا ہوے اور اللہ تعالی نے اُنکی ہر طرح تسلی وتشفی کر دی تو وہ گود میں اُٹھا کر قوم کے پاس لے گئیں۔

قالوا یا مریم لقد جئت شیئاً فریا۔ یا اُخت ہارون ما کان ابوک امرأ سوء وما کانت اُمک بغیا

لوگوں نے جو حضرت مریم کی گود میں بچہ دیکھا تو بولے کہ اے مریم یہ کیا شے عجیب لائی؟ یعنی نکاح بغیر یہ بچہ کیسا؟ اے ہارون کی بہن، نہ تیرا باپ خراب آدمی تھا اور نہ تیری ماں بدکار تھی۔

یہاں ایک ایک لفظ قابل غور ہے۔ ذرا دیکھیے کہ جب خاندان کی لڑکی بے باپ کا بچہ لیکر آئے گی تو قوم کس قدر مشتعل ہوگی؟ اور کیا کیا کچھ نہ کہے گی؟ ان خیالات وجذبات کو کس خوبی کے ساتھ ان مختصر سے الفاظ میں ادا کیا گیا ہے؟ قوم کہتی ہے کہ تو نے یہ کیا غضب کیا، نہ تیرا باپ بدچلن تھا نہ تیری ماں بدکار تھی، یہ بیٹا (نعوذ باللہ) حرام کا کہاں سے لے آئی؟

مولانا نے ان آیات کی اہمیت مطلقاً کچھ نہ بیان کی۔ اگر حضرت عیسیٰ بقول مولانا نیاز، باپ سے پیدا ہوے تھے اور اُس وقت یعنی جب مریم اُنکو قوم کے پاس لائیں، جوان اور پیغمبر تھے، تو سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت مریم سے ان سخت الفاظ میں مواخذہ کیوں کیا گیا۔ اگر اُنکو حضرت عیسیٰ کے مدعی نبوت ہونے کا مواخذہ اُن کی ماں سے کرنا تھا تو یہ کہتے کہ اے مریم تیرے ماں باپ بڑے ایماندار اور مذہب کے پابند تھے، یہ تیرا بیٹا کیونکر کافر ہو کر نبوت کا دعوے کرنے لگا۔ غرضکہ مواخذہ کے

الفاظ صاف بتلا رہے ہیں کہ حضرت مریم حضرت عیسیٰ کو بحالت شیر خوارگی لے گئیں تو قوم نے ولادتِ بے پدر کا مواخذہ کیا۔

فاشارت الیہ، قالوا کیف نکلم من کان فی المھد صبیا۔ حضرت مریم نے قوم کے مواخذہ کے جواب میں سابقہ تلقین الٰہی کے مطابق حضرت عیسیٰ کی طرف اشارہ کیا، تو اُن لوگوں نے کہا کہ گہوارے کے بچہ سے کیونکر گفتگو کریں؟

حضرت مریم نے زبان سے کچھ جواب نہیں دیا، کیونکہ آپ نے حسب تلقین الٰہی بات نہ کرنے کا روزہ رکھ لیا تھا۔ البتہ اشارہ کے ذریعہ سے قوم کو سمجھا دیا کہ میرا تو روزہ ہے نہ بول سکوں گی، خود اس لڑکے سے دریافت کرلو۔ تو وہ متعجب ہوکر بولے کہ ہم بچہ سے کیا گفتگو کریں۔

یہاں یہ شبہہ ہو سکتا ہے کہ خدا کی طرف سے تو حضرت مریم کو صرف اتنا تبلایا گیا تھا کہ اگر کوئی آدمی تجھ سے پوچھے تو تو کہدینا کہ آج میرا روزہ ہے، کسی سے بات نہ کروں گی، حضرت مریم نے بچہ کی طرف اشارہ کیسے کیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بہ قول مولانا نیاز، قرآن شریف کا اسلوب بیان یہ ہے کہ قصہ کی درمیانی غیر ضروری کڑیاں چھوڑ دی جاتی ہیں، تاکہ وہ خود بخود ذہن میں آجائیں۔ اس کلیہ کو یہاں پر استعمال کیجیے۔ خدا نے پہلی کڑی تو یہ بیان کردی کہ درخت خرما کے نیچے خدا نے حضرت مریم کی ہر طرح تسلی و تشفی کردی اچھی طرح بتا دیا کہ لوگوں سے کہدینا کہ میرا تو روزہ ہے میں کسی سے بات نہ کرونگی۔ آخری کڑی یہ بتادی کہ مواخذہ پر حضرت مریم نے عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ کردیا کہ میری طرف سے یہ جواب لیگا میرا تو روزہ ہے تو یہ بات خود بخود ذہن میں آجاتی ہے کہ خدا نے صرف اتنا ہی نہیں بتایا تھا کہ کہدینا میرا تو روزہ ہے۔ کیونکہ بات کرنیکا تو روزہ ہے، اور پھر خود ہی کہدینا کہ آج روزہ ہے، اجتماع ضدین ہے۔ خدا نے روزہ کی حالت میں اشارہ کے ذریعہ سے ما فی الضمیر ظاہر کردینے کی تدبیر بھی ضرور بتادی ہوگی۔ یعنی کہدیا گیا ہوگا کہ تم تو خاموش ہو جانا اور بچہ کی طرف اشارہ کردینا، لوگ مطلب سمجھ جائیں گے۔

کیف نکلم من کان فی المھد صبیا۔ خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔ لوگوں نے کہا کہ ہم بچہ سے کیا پوچھیں، تجھ سے پوچھتے ہیں، تو بتا۔ دیکھیے یہ معنی کس قدر مناسب حال ہیں۔ شروع سے آخر تک ایک ہی تلازمہ ہے اور ایک ہی نہج کا سیاق کلام، رتی بھر بھی فرق نہیں۔ مولانا نیاز فرماتے ہیں کہ اسکے یہ معنی ہیں کہ ہم اس سے کیا بات کریں جو گہوارے کا [illegible] ات ہوئی، ہر شخص خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو جائے، وہ بلحاظ زمانۂ گذشتہ، گہوارہ کا [illegible] ہنی کر تو خود حضرت مریم گہوارے کی بچی تھیں۔ یہاں لفظ کان کی وجہ سے شبہہ [illegible] ما کا صیغہ ہے جسکے معنی 'تھا' کے ہیں۔ یعنی من کان فی المھد صبیا کے یہ معنی ہوسے کہ جو ہو [illegible] میں تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کان 'ہے' کے معنوں میں بھی مستعمل ہوتا ہے۔ قرآن شریف میں ہے کان اللہ علیما حکیما جسکے معنے

یہ نہیں ہیں کہ اللہ علیم و حکیم تھا، بلکہ یہ ہیں کہ اللہ علیم و حکیم ہے۔ کان، کا یہ استعمال عام ہے۔

علاوہ بریں یہ قرآن کا کمال ہے کہ اکثر ایک آیت دوسری آیت کی تشریح و تفسیر کر دیتی ہے سورۂ آل عمران کی ایک آیت ہے حضرت عیسیٰ کے بارے میں ویکلم الناس فی المھد وکھلا یعنے وہ آدمیوں سے گفتگو کرتے تھے شیر خواری کے زمانہ میں بھی اور بڑے ہو کر بھی۔ اس آیت نے بالکل صاف کر دیا کہ حضرت مریم حضرت عیسیٰ کو شیر خواری میں قوم کے پاس لے گئی تھیں۔ کیونکہ آگے چل کر حضرت عیسےٰ کے شیر خواری میں تکلم کرنے کا ذکر آیا ہے۔

قال انی عبد اللہ آتانی الکتاب وجعلنی مبارکا این ماکنت واوصانی بالصلوٰۃ والزکوٰۃ ما دمت حیا وبرا بوالدتی ولم یجعلنی جبارا شقیا۔ حضرت عیسیٰ فوراً بول اُٹھے اور کہا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اللہ تعالیٰ ضرور مجھ پر کتاب نازل کرے گا اور مجھے نبی بنائے گا اور بنایا ہے اُس نے مجھے برکت والا، جہاں کہیں میں رہوں، اور مجھ کو ہدایت کی ہے نماز و روزہ کی جب تک میں زندہ رہوں اور بنایا ہے مجھے نیکی کرنے والا اپنی ماں کے ساتھ اور نہیں بنایا مجھ کو سرکش بدبخت۔

یہاں آتانی الکتاب و جعلنی نبیا قابل لحاظ ہے۔ اگرچہ یہ دونوں ماضی کے صیغے ہیں مگر مستقبل کے معنی میں ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ مجھ کو ضرور کتاب دے گا اور نبی بنائے گا۔ یقین و وثوق کے موقعہ پر عام طور پر ماضی کا صیغہ مستقبل کے مفہوم میں بولا جاتا ہے۔ اُردو میں بھی تو کہتے ہیں "لو چاد یے" حالانکہ ابھی چلے نہیں، چلنے کا ارادہ کیا ہے۔

اور پھر برا بوالدتی قابل غور ہے۔ اگر حضرت عیسیٰ کا باپ ہوتا تو کیا اُنکے ساتھ نیکی کرنے کا حکم نہ ہوتا۔ کیا قرآن شریف میں کسی اور موقع پر والدین کے درمیان تفریق کی گئی ہے۔ جہاں کہیں ماں باپ کی تعظیم و تکریم کا ذکر آیا ہے کیا وہاں لفظ والدین نہیں آیا ہے۔ اسی سورۂ مریم میں حضرت مریم سے پہلے حضرت یحییٰؑ کے قصہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وبرا بوالدیہ چونکہ یحییٰؑ ماں اور باپ دونوں سے پیدا ہوئے تھے اس لیے برا بوالدیہ فرمایا گیا، اور حضرت عیسیٰ بے باپ پیدا ہوئے تھے اس لیے برا بوالدتی صادق آیا۔

سورۂ مریم کی آیات کے مطالب آپ نے اول سے آخر تک خوب پڑھ لیے۔ اب ذرا اسلوبِ بیاں، سیاق کلام، طرز عبارت، انتخاب الفاظ، تسلسل مضمون، سب باتوں پر ازراہِ انصاف و بے تعصبی نظر غائر ڈال کر دیکھیے اور جو کچھ ہر آیت کے متعلق عرض کیا گیا ہے اُسکو غور و خوض سے پڑھ کر سوچیے کہ آیا ان آیات سے حضرت عیسیٰ کا بے باپ کے پیدا ہونا ثابت ہوتا ہے یا نہیں۔

اگر محض اس خیال کی بنا پر کہ انسان کا بے پدر پیدا ہونا خلاف قانون قدرت اور اس لیے لغو و محال ہے، آپ کا فیصلہ برعکس ہو تو پھر یوں سوچیے کہ کیا آپ ولادت بے پدر کے واقعہ کو ایک حقیقی واقعہ سمجھنا پسند فرمائیں گے یا کلام اللہ کے طرز عبارت کو بجائے ہدیٰ للمتقین ہونے کے غیر واضح، مذبذب بین المنین اور گمراہ کن سمجھنا گوارا کریں گے۔ کیونکہ ان آیات سے اگر ولادت بے پدر کی تردید پائی جاتی ہے، تو کم از کم ان آیات قرآنیہ کی بابت (نعوذ باللہ) یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ خود خداوند تعالیٰ کو حق کا چھپانا اور دنیا کو دھوکا دینا مقصود تھا کہ اول سے آخر تک ایسا سیاق کلام اختیار کیا کہ لفظ لفظ سے ولادت بے پدر کی تائید ہوتی ہے، مگر اصل منشا اُسکے خلاف۔ ہذا شئ عجیب۔ حضرت عیسیٰ کو جو ابن اللہ کہا جاتا تھا اُسکی وجہ یہ تھی کہ آپ بے باپ کے پیدا ہوے تھے۔ خداوند تعالیٰ نے اس عقیدہ کی بارہا تردید فرمائی۔ لیکن کس طرح؟ مذبذب بین المنین طریقہ سے۔ کیا خدا یہ نہیں کر سکتا تھا کہ اے لوگو جسے تم ابن اللہ خیال کرتے ہو وہ تو باقاعدہ اپنے انسانی باپ کے ماء مہین سے پیدا ہوا ہے۔ علاوہ بریں ان دو آیتوں پر غور کیجیے:

۱۔ المسیح ابن مریم رسول اللہ وکلمۃ القھا الی مریم وروح"

۲۔ والتی احصنت فرجہا فنفخنا فیہا من روحنا وجعلناہا وابنہا آیۃ للعالمین

دیکھیے ان دونوں آیتوں کے ایک ایک لفظ سے اُسی حقیقت کی جو سورۂ مریم کی آیات میں بیان ہوئی ہے کس قدر تائید ہوتی ہے۔ اور وہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت مریم میں خدا نے اپنی روح پھونکدی تو حضرت عیسیٰ بے باپ کے پیدا ہوگئے۔ اور اس لیے یہ دونوں ماں بیٹے دنیا کے لیے نشانی بنائے گئے کہ انکو دیکھ کر خدا کے قادر مطلق ہونے پر ایمان لائیں۔ حضرت عیسیٰ کو ابن مریم فرمایا جانا بھی خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔ مولانا نیاز کا یہ فرمانا کہ نفخ روح حضرت مریم ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر انسان کے ساتھ یہی واقعہ پیش آتا ہے، صحیح ہے۔ لیکن ہر انسان کی ولادت کا واقعہ ایسا تو نہیں ہوتا جیسا کہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش کا قرآن شریف میں بیان کیا گیا ہے۔

قرآن شریف کی کوئی آیت اس عقیدے کے خلاف پیش نہیں کی جا سکتی۔ مولانا نیاز نے بہت کچھ زور لگا کر ایک آیت تو وہ پیش کی جس سے حضرت عیسیٰ کا حضر ... ہونا پایا جاتا ہے۔

جناب نیاز فرماتے ہیں کہ اگر حضرت عیسیٰ کا کوئی باپ نہ مانا جا ... ہیمؑ کی آل میں کیونکر داخل ہو سکتے ہیں؟ اسکے جواب میں عرض ہے کہ کیا ما ... آل ابراہیم میں نہیں آسکتے؟ قرآن میں حضرت مریم کو بنت عمران کہا گیا ہے۔ ان کا آل عمران میں سے ہونا مولانا نیاز

تسلیم کرتے ہیں - غرضکہ جب حضرت مریم آل عمران سے ہیں تو آل ابراہیم سے بھی ہوئیں، کیونکہ آلِ عمران آل ابراہیم سے ہیں دو دلیل سے :-

دلیل اول - جس آیۂ قرآنی سے مولانا نیاز حضرت عیسیٰ کو حضرت ابراہیم کی آل میں ہونا قرار دیتے ہیں اُسی سے حضرت موسیٰ و ہارون کا بھی آل ابراہیم میں داخل ہونا پایا جاتا ہے : اور یہ دونوں بھائی، عمران کی اولاد سے تھے -

دلیل دوم - دوسری آیۂ قرآنی ہے : ان اللہ اصطفٰے آدم و نوحاً و آل ابراہیم و آل عمران علی العالمین - اس آیۂ میں جو ترتیب اختیار کی گئی ہے اُس سے ظاہر ہے کہ آل عمران آل ابراہیم ہیں، اور آل ابراہیم آل نوح میں اور آل نوح آل آدم میں مدغم ہیں -

مولانا نے حضرت عیسیٰ کی ولادت بے پدر کے خلاف دوسری آیت یہ پیش کی ہے : والتی احصنت فرجہا فنفخنا فیہا من روحنا وجعلناہا وابنہا آیۃً للعالمین - آپ کا استدلال ہے کہ محصنہ زنِ شوہردار کو کہتے ہیں - اور حضرت مریم کے لیے ' احصنت ' کا لفظ استعمال ہوا ہے - لہذا وہ زنِ شوہردار تھیں -

اس کا جواب یہ ہے کہ ' محصنہ ' صرف زنِ شوہردار ہی کو نہیں کہتے، بلکہ عفیفہ غیر منکوحہ عورت کو بھی کہتے ہیں - چنانچہ قرآن شریف کے پارۂ پنجم کے پہلے صفحہ میں یہ لفظ دونوں معنوں میں مستعمل ہوا ہے - والمحصنٰت من النساء سے تو شوہردار عورتیں مراد ہیں، لیکن آگے چل کر آیت ہے : ومن لم یستطع منکم طولاً ان ینکح المحصنٰت الخ میں محصنٰت سے مراد یقینی طور پر آزاد عورتیں ہیں - اگر شوہردار عورتوں سے مراد لی جائے گی تو اُن سے نکاح کیونکر ہو سکتا ہے ؟ علاوہ بریں لفظ ' محصنہ ' اسم مفعول کا صیغہ ہے - اور یہاں احصنت فرجہا میں حضرت مریم فاعل ہیں - یعنی اپنے شرمگاہ کی حفاظت کرنے والی - جس سے مراد اُنکا عفیفہ ہونا ہے -

مولانا نے صرف دو آیتیں اپنے خیال کی تائید میں پیش کیں - دونوں کا تشفی بخش جواب ہو گیا اب رہی ' کلمہ ' کی بحث - یہ مولانا کا محض ادعا ہے کہ قرآن شریف میں کسی جگہ اسکے معنی لفظ یا کلام کے نہیں لیے گئے - مولانا نے جس قدر آیات پیش کی ہیں اُن سب میں لفظ ' کلمہ ' کے معنی لفظ یا کلام ہی کے ہیں -

ان اللہ یبشرک بیحییٰ مصدقاً بکلمۃ من اللہ - میں ' کلمۃ اللہ ' سے مراد حضرت روح اللہ ہیں - چنانچہ دوسری آیت اسکی تشریح و تائید کرتی ہے - المسیح ابن مریم رسول اللہ و کلمتہ

القٰہا الیٰ مریم وروح منہ - دیکھیے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو کلمۃ اللہ بھی کہا ہے اور روح اللہ بھی - حضرت یحییٰ نے حضرت عیسیٰ کی تصدیق فرمائی تھی لہذا انکو مصدقاً بکلمۃ من اللہ کہا گیا -

لاتبدیل لکلمات اللہ سے اللہ کی باتیں مراد ہیں، یعنی جو کچھ اللہ تعالیٰ کہہ دیتا ہے یا کہہ چکا ہے وہ بدل نہیں سکتا -

قل لوکان البحر مداداً لکلمات ربی میں "مداد" کا لفظ صاف بتلا رہا ہے کہ کلمات کے کیا معنی ہیں -

غرضکہ حضرت عیسیٰ کے بارے میں جس قدر آیات نازل ہوتی ہیں اُن سب کو ایک جگہ جمع کرکے مقابلۃً و موازنۃً غور کیا جائے اور باہمی تناسب اور سیاق کلام کا پورا لحاظ رکھا جائے تو ایک ایک لفظ سے حضرت عیسیٰ کے بے باپ پیدا ہونے کی تائید ہوگی - ورنہ یہ ماننا پڑے گا کہ (نعوذ باللہ) خود خدا کو اخفاے حقیقت مقصود تھا - وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم -

زبید احمد

جب ذرا قیدِ تعیّن سے نظر آزاد کی — ہٹ کے اس دُنیا سے اِک دُنیا نئی آباد کی

کیا ہوا بدلی ہوئی ہے گلشنِ ایجاد کی — بھول جانے کو وہ بتلاتے ہیں صورت یاد کی

اے اجل اے آرزو میرے دلِ ناشاد کی — دل کی ہر دھڑکن کو خواہش ہے تری امداد کی

کچھ عجب رسمیں ہیں عشقِ خانماں برباد کی — داد لینی چاہتے ہیں مجھ سے وہ بیداد کی

حشر تک اب مجھ کو شاید ہو نہ یہ موقع نصیب — اے اجل تھم جا کہ صورت دیکھ لوں جلّاد کی

وحشتِ دل اک ذرا بڑھنے تو دے اے چارہ گر — رنگ لینا خونِ دل ہی میں قبا فصاد کی

حسن کی بیباکیوں نے آج وہ بھی کاٹ دی — داستانِ غم میں اک سرخی جو تھی فریاد کی

میری حالت دیکھ کر کچھ رحم اُن کو آگیا — موت سے حدّیں ملا دیں قیدِ بے میعاد کی

نازِ استغنا پہ اتنا اے وفا ناآشنا — ہر جفا ممنون منت ہے مری امداد کی

زندگی کہتے ہیں غم کو غم ہے اصل زندگی — تیری ... شرح اس رُوداد کی

اے وفا ناکام دل میں تیری باتوں کے نثار — پھر ... ت برباد کی

کس قدر مختار خوش ہے وہ اسیر — قید سے حالانکہ پابندی ہے خود صیاد کی

مختار بدایونی

فریبِ خیال

دس سال کا عرصہ گذرا جب میں جہاز پر ملازم تھا، میرے ہمراہ شاہد بھی اُسی جہاز پر ایک کیڈٹ کی حیثیت سے کام کرتا تھا، ہم دونوں لطیف الخیال اور نرم دل تھے، سمندر کی روح پرور اور نشاط افزا ہوائیں ہمارے قلوب میں زمانِ سابق کی یاد پیدا کرتی تھیں، پانی کی بھاری اونچی لہریں ہمارے ایام شباب کے اُس دریاے محبت کی مثال تھیں جو ہمارے سینوں میں کبھی اُبلا تھا۔ کبھی کبھی راتوں کو جب چاند اپنی روپہلی کرنوں سمیت سمندر کی سطح پر اپنی ننھی کشتی ہمارے جہاز کے ساتھ ساتھ کھیتا تھا اور تارے چُپ چاپ ہمارے جہاز کے ساتھ بہتے تھے اور ٹھنڈی، کسی دُور کی سرزمین سے آنے والی بھینی ہَوا ہمارے دل کے پردوں کو جہاز کے بادبانوں کی طرح پھیلاتی اور سمیٹتی تھی ہم اچھی اچھی باتیں کرکے راتیں ختم کرتے، رات کے اُس حصہ میں جب تمام مسافر غافل اور خاموش ہوجاتے اور پانی کے متصل تھپیڑوں یا انجن کی مسلسل سنسناہٹ کے سوا کوئی آواز فضا میں پیدا نہ ہوتی۔ ہمارے دھیمے لہجے اس سکوت کے پردے میں ایک سوراخ کرتے اور جیسے اس سوراخ سے ہَوا ایک دھیمی اور تیز سیٹی بجاتی ہوئی نکل جائے اسی طرح ہماری باتوں کی آواز ایک ہلکا راگ پیدا کرتی ہوئی فضا میں پھیل جاتی تھی۔

اسی طرح کی ایک رات تھی، ہمیں کام سے فرصت مل چکی تھی اور باتیں کرتے کرتے دو بجگئے تھے، مختلف موضوع پر ہم گفتگو کرچکے تھے مگر ہمارے دماغ تھکن سے خالی تھے اور آنکھوں میں ابھی نیند نہ آئی تھی، شاہد اپنی کُہنی کے بَل جہاز کے بالائی حصہ میں فرش پر میرے پاس پڑا تھا، میں لوہے کی سلاخوں سے لگا اُفق پر نظر جمائے تھا جو سکوت اور سکون کی سرزمین معلوم ہوتی تھی۔

"جس طرح سال میں مختلف موسم ہوتے ہیں اسی طرح حیاتِ عاشقہ میں بھی مختلف دَور ہوتے ہیں" میں نے کہا۔

"شاید تمہارا مطلب یہ ہے کہ محبت کبھی گھٹتی ہے کبھی بڑھتی ہے، کبھی ایک نازک تار سے ٹنگی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور کبھی جسم وجان، خیالات ومعتقدات، پوری دنیا پر حاوی ہوجانا چاہتی ہے۔" شاہد نے ادا کیا۔

"سال میں بہار و خزاں، گرمی و سردی وغیرہ کے موسم ہوتے ہیں" میں نے کہا "عشق کی زندگی میں بھی مایوسی و کامرانی، شبہہ و یقین، بیوفائی اور وفاداری کے دور ہوتے ہیں، کبھی معلوم ہوتا ہے کہ کامرانی و خوش بختی ہی محبت کا انجام ہے لیکن تھوڑے ہی دن بعد یہ عقیدہ باطل شروع ہوتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ مایوسی و بیدلی محبت کا نتیجہ کار ہے، ایسی حالت میں تمام پچھلے رنگین افسانے کمزور و مضمحل ہو کر ٹوٹ جاتے ہیں، ان میں یقین کا کوئی شائبہ نہیں رہتا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غم محبت ہی کی نہیں دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے"۔

"ہاں"، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمارے ہی احساسِ قلب یا تصورات ذہنی کا نتیجہ ہے" شاہ نے کہا "کسی خاص وقت میں ہمارے دل و دماغ پر ایسی مایوسی چھا جاتی ہے کہ واقعات کے تمام رخ بدلے ہوئے نظر آنے لگتے ہیں، واقعات میں بذات خود تبدیلی نہیں ہوتی، وہ اپنی جگہ پر ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے کہ پہلے تھے، یا اگر تبدیلی ہوتی ہے تو کم ہوتی ہے، ہم خود کسی خاص اثر کے ماتحت اس قدر بے دل ہو جاتے ہیں کہ تمام دنیا ہمیں بدلی ہوئی نظر آتی ہے، اُس اثر میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی ہے جس سے ہمارا ذہن متزلزل ہوتا ہے، اسے واضح کرنے کے لیے میں اپنی جوانی کی ایک کہانی کہوں"۔

اُس نے کہنا شروع کیا:

"یہ ۱۹۰۰ء کا قصہ ہے، اُس وقت میں بائیس برس کا تھا،

جس لڑکی سے مجھے محبت تھی اُس سے میں مایوس ہو چکا تھا، میرے والدین ایک سے زائد مرتبہ صاف الفاظ میں اپنے فیصلہ کا اعلان کر چکے تھے کہ وہ کبھی اُسکے ساتھ میری مناکحت قائم نہ کریں گے، اس فیصلہ کا میرا دل متحمل نہ ہو سکتا تھا، میری محبت وہ محبت نہ تھی جو آئے دن بدلی جاتی ہے، یہ وہ محبت تھی جس کا اندازہ کم ہو سکتا ہے، وہ محبت جو دنیا میں تنہا رہنا چاہتی ہے، جو تمام دنیا پر قدرت حاصل کرنا چاہتی ہے، میرے والدین میرے جنون کے اس ہمہ گیری سے ناواقف تھے، وہ سمجھتے تھے کہ میری محبت صرف اُن اشتعال آمیز جذبات پر مبنی ہے جو نوجوانوں میں عام طور پر پائے جاتے ہیں، وہ کسی دوسری جگہ میری شادی کرنا چاہتے [illegible] اکہ شادی میرے مرض کا علاج ہے، اور شادی میرے دل سے میری عزیزہ کو [illegible] دکامراں بنانے میں کامیاب ہوگی۔

محبت ہماری آنکھوں پر پردہ ڈال دیتی ہے، محبوب کے عیوب بھی ہمیں محاسن نظر آتے ہیں،

لیکن نجمہ اس کلیہ سے مستثنیٰ تھی، یہ نہیں کہ محبت نے میری آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تھا اسلیے نجمہ کے عیوب بھی میری نظر میں محاسن تھے بلکہ نجمہ فی الواقع اسقدر حسین، اسقدر مکمل و پاکباز تھی کہ میں اُسپر مٹتا تھا، نجمہ ایسی مکمل —— ہر صحیح معنی میں مکمل —— لڑکی تھی کہ اس سے زیادہ مکمل لڑکی کا تخیل دشوار ہے اور بس، اسی وجہ سے وہ میری رگ رگ میں، جوڑ جوڑ میں ایک زہر کی طرح چٹک گئی تھی، پیوست ہوگئی تھی، اُس سے رہائی ناممکن تھی، ہم دونوں ساتھ ساتھ کھیلے تھے میں صداقت کیوں نہ کہوں، وہ میری چچی کی لڑکی تھی، بچپن سے ایک گھر میں رہنا، ایک ساتھ پڑھنا، کھیلنا، گھومنا، پھرنا، سب ساتھ ساتھ ہوتا تھا، ابتدا ہی سے وہ ایک سنجیدہ قسم کی خاموش لڑکی تھی، وہ تمام گھر میں سب سے زیادہ مجھے چاہتی تھی، اپنی پریشانیاں، اپنی ذرا ذرا سی رازکی باتیں سُنا کر مجھ سے اپنی پریشانیوں کا علاج پوچھتی تھی، میں بھی اُسے اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا، اکثر تنہائی میں ہم دونوں گھنٹوں خاموش کھڑے ایک دوسرے کو دیکھا کرتے، کبھی مجھے اُس پر پیار آتا اور میں اُسکی پیشانی کے بوسے لیتا ..... آہ! کسے معلوم تھا کہ بچپن کا یہ سادہ کھیل جوانی میں ہمارے دلوں پر نقش محبت بن جائے گا جس کا مٹانا اس قدر آسان نہ ہوگا جتنا میرے والدین خیال کرتے تھے۔

میرے والدین چاہتے تھے کہ میں وہاں کا آنا جانا بھی ترک کردوں، اور آنا جانا ہی کیا وہاں کے تذکرے تک کبھی بھولے سے گھر میں نہ ہوتے، اور اگر اُن کا ذکر کوئی کرتا تو وہ بہت بڑا مجرم سمجھا جاتا، اُسے گھر بھر کی باتیں سننا ہوتیں، میری نجمہ اپنے والدین کے ساتھ اشرف آباد چلی گئی زمانہ کے ہاتھوں ہم جدا ہوگئے، زمانہ کو کس کی پروا ہے، ہمارے درمیان سیکڑوں میلوں کا فاصلہ تھا، ہم عرصہ تک ایک دوسرے سے نہ مل پاتے اور اگر چار پانچ سال بعد کبھی وہاں مجھے جانے کا اتفاق ہوتا، تو اب نجمہ کو میرے سامنے نہ لایا جاتا، آہ، قریب ہونے پر بھی اس قدر دوری، ان موانع کے باوجود ہم دونوں کی آگ بھڑکتی رہی اور ہم ایک دوسرے کو دیوانگی سے چاہتے رہے۔

میں سخت مصیبت میں تھا، میرے والدین اپنی ضد پر قائم تھے، اُن کا فیصلہ مایوس کن تھا، وہ میرے لیے پیام اجل تھا، میں ہمیشہ اپنا وقت علمی اور تفریحی مشاغل میں گذارتا تھا، مختلف قسم کے کھیلوں، شکار اور گھوڑے کی سواری میں شوق سے حصہ لیتا تھا، مگر اب مجھے ہر چیز سے نفرت سی ہوگئی تھی، مجھے تنہائی پسند تھی، تنہائی میں اپنی کتاب اپنے پہلو میں، سینے پر، یا آنکھوں کے سامنے رکھتا، کتاب ہی میری سہیلی تھی، کتاب میں میں محبت کے خواب دیکھتا، تمام علائق سے میں کنارہ کش ہوچکا تھا اندر جانا بھی میں نے کم کردیا، باہر اپنے کمرہ میں ہفتوں پڑا رہتا، مجھے اپنے والدین، اپنی بہنوں، اپنے

بھائیوں سے نفرت ہوگئی تھی، سب مجھے دشمن معلوم ہوتے تھے، ان میں سے کوئی میری خوشی کا خواہاں نہ تھا، سب مجھے تکلیف پہونچانا چاہتے تھے، کبھی کبھی کھانا کھانے اندر چلا جاتا اور بس گھر سے اسی قدر تعلق رہ گیا تھا، مجھے بھوک بھی کم لگتی، کبھی میں تین تین وقت کھانا نہ کھاتا، اور یہ تو کیسے کہوں کہ مجھے تکلیف نہ ہوتی لیکن ہاں اس فاقہ کشی سے مجھے روحانی تسکین ہوتی، مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے میں محبت کے لیے بڑی قربانی کر رہا ہوں، میں ہر وقت مغموم رہتا، میرے دل میں ایک عجیب افسردگی تھی جو میرے ماحول کو بھی متاثر کرتی تھی، دنیا مجھے تاریک نظر آتی تھی، میرے رفیق مجھے اپنے دشمن معلوم ہوتے تھے، گھر کاٹنے کو دوڑتا تھا، وحشت و پریشانی ہر طرف چھائی ہوئی معلوم ہوتی، میں نے گفتگو بھی کم کر دی، گھر میں اکثر میرے خوش کرنے کو شادی کے تذکرے ہوتے مگر مجھے وہاں کی ایک بات بھی بے عیب نہ معلوم ہوتی، جو بات مجھے خوش کرنے کو کی جاتی میں اُسے ایک سخت ترین دشمنی کی حرکت سمجھتا، اس ہر وقت کی کوفت نے، ہر وقت کی خاموشی، گرانی اور بددلی نے مجھے مایوس کر دیا، جسمانی سختیوں نے مجھے مضمحل کر دیا، مگر مجھے اپنی روح میں بالیدگی محسوس ہوتی، جب میں غم کی سختی سے بیزار ہو کر ایک آنسو بھی بہاتا مجھے ایسا معلوم ہوتا گویا میں نے کوئی بڑا کارِ ثواب کیا ہے، میرا دل اس قدر نازک، اس قدر رقیق ہو گیا تھا کہ بات بات پر جی اُمنڈنے لگتا، جیسے سینہ پر ایک گھٹا ہو جو نہ کھلتی ہے نہ برستی ہے اور اگر کبھی برستی بھی ہے تو صرف ایک یا دو بوند، جو میرے سینہ کے وزن کو، بوجھ کو، میری کلفت و مایوسی کو کچھ بڑھا ہی دیتی ہے، مجھے اس میں بھی ایک اطمینان، ایک سکون محسوس ہوتا، مجھے ایسا معلوم ہوتا گویا میں ہلکا ہو گیا ہوں، گویا قیدِ جسم سے آزاد ہو کر میں ہوا بن گیا ہوں، گویا میں اوپر اُٹھتا ہوں، اُڑتا ہوں، ایک صاف شفاف بادل، ایک مجسمۂ نور و اخلاص بنکر آسمانی بلندیوں پر جھولتا ہوں۔

میرے دل پر ایک بار تھا، جب تک میں گھر پر رہتا زندگی مجھے ایک بارِ عظیم معلوم ہوتی، اس مسلسل و متصل کوفت سے تنگ آ کر کبھی کبھی میں اشرف آباد ہو آتا، جہاں میری نجمہ رہتی تھی، جب تک وہاں رہتا، زندگی ایک مسلسل قہقہہ معلوم ہوتی، وہاں پہونچ کر حیات کا مصرف سمجھ میں آتا، اُن مختصر ایامِ قیام کو جو وہاں گذرتے میں حاصلِ زندگی ۔۔۔ اسی اُمید پر جیتا تھا کہ کبھی کبھی اس طرح نجمہ کو دیکھ سکوں گا۔

ایک روز کا واقعہ سناؤں جو دراصل اس تمام گفتگو کا ۔۔۔ ایک شام کو میرا رشتہ کا ایک بھائی مرتضیٰ مجھ سے ملنے آیا، یہ اشرف آباد سے آیا ۔۔۔ میں نے اُس سے

ایک غیر متعلق شخص کے طور پر نجمہ اور اُسکے گھر کی خیریت پوچھی، مرتضیٰ نے جب یہ کہا کہ سب نے مجھے بلایا ہے تو میرے دل پر ایک چوٹ لگی، میں نے مرتضیٰ کو رخصت کیا اور وہ اندر چلا گیا،

میں کھانا کھانے اندر گیا تو مرتضیٰ وہاں موجود تھا، چلتے وقت اُس نے مجھ سے محبوب منزل چلنے کو کہا، یہ میرے ایک عزیز کی کوٹھی تھی جہاں مرتضیٰ ٹھہرا تھا۔ میں نے اُس سے کچھ دیر بعد آنے کا وعدہ کیا، گھر میں ایک برہمی نمایاں تھی، اشرف آباد سے آنے والا شخص ہمیشہ گھر میں کچھ نہ کچھ برہمی پیدا کر دیتا تھا، تھوڑی دیر بعد ایک نوکر نے اطلاعاً آکر کہا کہ محبوب منزل میں اشرف آباد سے سواریاں آئی ہیں، ایک چھوٹا بچہ بھی اُنکے ہمراہ ہے، میں چونک پڑا، مجھے ایسی خوشی ہوئی کہ بھوک بالکل غائب ہوگئی، اور بے اختیار میری زبان سے نکلا "اختر ہوگا" یہ نجمہ کا چھوٹا بھائی تھا جو اپنی والدہ کے ساتھ سفر میں ہمیشہ رہتا تھا، سب کو یقین ہو گیا کہ نجمہ کی ماں آئی ہیں۔

گھر میں اس خبر نے تہلکہ برپا کر دیا، میری ماں نے چلانا شروع کیا:

"آخر کس لیے آئی ہیں؟ اپنے گھر تو میں کبھی نہ بلاؤں گی اور نہ اپنے لڑکے کو وہاں جانے دونگی، کیا تماشا ہے! ہم نے آج تک نہیں سنا کہ اُلٹے لڑکی والے شادی کا پیام دیں، اور یہ بھی سہی، آخر لڑکے سے کیا واسطہ؟ کیا ہم مر گئے ہیں؟ ہم سے باتیں کریں تو ہم اُنھیں جواب دیں، بچہ کیا جانے، وہ کچی لکڑی ہے، جدھر جھکاؤ جھک جائے گا..... اور شاہد! تجھ سے بھی کتنی مرتبہ منع کیا کہ وہاں نہ جا مگر تو کب سنتا ہے۔ کیا تجھے لڑکیاں کہیں اور نہ ملیں گی....."

میرے باپ نے برہم ہو کر کہنا شروع کیا:-

"اور یہ دیکھو کہ آج کل کے لڑکے کس قدر شریر ہیں، بھائی میں تو واقعی دنگ ہوں، ہمارے زمانہ میں بھلا ایسی باتیں کہاں تھیں، مرتضیٰ گھنٹوں یہاں بیٹھا رہا، مگر ذکر تک نہیں کیا کہ سواریاں آتی ہیں....."

ماں پھر بولیں:

"سب سکھائے گئے ہیں، شاہد سے ساتھ چلنے کو تو کہا مگر یہ نہ بتایا کہ کس نے بلایا ہے.... باہر کہہ چکا ہوگا، سب پکے ہیں، خوب بنے ہوئے ہیں، میں کہتی ہوں کہ شاہد اگر تو وہاں گیا تو خدا کی قسم مرتے وقت دودھ نہ بخشوں گی، وہاں کیا میٹھا ہے، تجھے اُس سے اچھی لڑکی نہ دلاؤں تب سہی....."

اور اس سلسلہ میں نجمہ کے خاندانی نقائص، اُسکے گھر کی بد انتظامیاں، خود اُسکے معائب، بدصورتی، بدتمیزی وغیرہ بالتفصیل گنائے گئے، ماں کہتے کہتے چپ ہو جاتیں تو باپ شروع کر دیتے، باپ

تھک جاتے تو ماں کی زبان چلنے لگتی،

مجھے سخت صدمہ ہوا، میں سب کچھ سن سکتا تھا مگر نجمہ کی بُرائی سننا میرے لیے ناقابل برداشت تھا، اس گفتگو سے مجھے اذیت ہوئی، میری تمام خوشی خاک میں مل گئی، سر سے پیر تک مجھے ایک طرح کی حرارت محسوس ہونے لگی، میرے سینہ پر ایک بوجھ سا چھا گیا اور قریب تھا کہ میرے آنسو میرے وارداتِ قلب کی تشریح شروع کر دیں لیکن میں نے ضبط کیا اور خاموش اُٹھ کر باہر چلا آیا، چلتے وقت سب نے کھانے کو پوچھا، یہ ایک ٹھیس تھی جس نے میرے کسی حد تک مندمل زخم سے خون جاری کر دیا، ایک آنسو میری پلک پہ سے ڈھلک کر میرے رخسار پہ آگیا، میں نے اپنی گردن پی ڈالی اور "مجھے اسوقت بھوک نہیں ہے" کہکر غالب کے اِن نشتروں سے اپنا سینہ چھلنی کرتا ہوا باہر چلا آیا:-

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

رات ہو چکی تھی، میرے کمرہ میں سبز رنگ کے گلوب سے نکل کر ٹھنڈی روشنی پھیل رہی تھی جو مجھے سخت ناگوار تھی، میں نے لیمپ کو دھیما کر دیا اور ایک برسوں کے مضمحل و نڈھال بیمار کی طرح اپنے بستر پر گر گیا، ایک گہرے سکوت میں پڑ کر آہستہ آہستہ کچھ سوچتے ہوئے اپنے دل میں اس مصرعہ کو میں دوہراتا رہا

اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو!

ایک تکلیف دہ دماغی تھکن مجھے محسوس ہونے لگی، مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میری زندگی کسی کمزور، کچے دھاگے سے زیادہ کمزور رشتہ سے منسلک دُور کہیں لٹک رہی ہے اور اس قسم کی ضرب جیسی کہ اُسوقت والدہ اور والد کی گفتگو سے اُس رشتہ میں لگی ہے اُسے توڑ دینے کو کافی ہوگی، میرا دَم گھُٹ رہا تھا، میری سانس اکھڑی اکھڑی معلوم ہو تی تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا گویا میں سمندر کی موجوں کے درمیان پے در پے تھپیڑے کھاتا

نجمہ کا گھر ایک دلآویز حُسن کا مرکز تھا، اُس نے ... ب حُسن کیا تھا، حُسن ایک وسیع و جامع لفظ ہے اس میں ہر طرح کا حُسن شامل ہے ... پ شیدہ ہیں، حُسن میں دوسرا درجہ نہیں ہے، یہ ایک مکمل خواب ہے، حسین عورت کبھی نامکمل نہ ہوگی، لوگ اکثر کہتے ہیں

کہ حُسن تمام عیوب کا پردہ پوش ہے، عورت معائب کی حامل ہو اور حسین ہو تو اُسکے معائب اندر پڑ جاتے ہیں، لیکن یہ غلط ہے، حُسن بذاتِ خود ایک کرشمہ ہے، ایک مقدس و برگزیدہ کرشمہ، ایک برکت، حُسن کبھی نامکمل نہ ہوگا، یہ ایک طاقت ہے جو سب کچھ سکھا دیتی ہے، یہ اپنے ہمراہ تمام محاسن لاتی ہے، جس عورت پر یہ طاقت یہ برکت چھا جاتی ہے اُسکے محاسن بھی پورے طور پر اُس میں جذب ہو جاتے ہیں، حُسن کی لطافت کثافت کو گوارا نہیں کر سکتی، جہاں حُسن ہے عیب کا گذر نہیں، یہ دو مختلف و متضاد چیزیں ہیں جن کا اجتماع نہیں ہوگا، یہ آگ اور پھونس ہیں، حُسن کی آگ ہر چیز کو جلا دیگی، حسن رہے گا یا عیب، دونوں ایک جگہ نہیں رہ سکتے،

مجھے اُس گھر کی ہر چیز سے محبت تھی، وہاں کا ذرہ ذرہ مجھے محظوظ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا، نجمہ سے، نجمہ کی ماں سے، اُسکے بھائی بہنوں سے، سب سے مجھے انتہائی شیفتگی تھی، شاید حُسن میں عمر کی بھی قید نہیں ہے ورنہ کیا وجہ تھی کہ اُسکی چھوٹی بہن میں جو صرف پانچ برس کی تھی، میں حُسن کے وہ تمام لوازم مہیا دیکھتا تھا جو ایک حسین جوان عورت میں ہوتے ہیں؟ ورنہ کیا وجہ تھی کہ میں نجمہ کی ماں میں بھی جو پانچ بچوں کی ماں تھی حُسن کی انتہائی دلفریب اور قابل احترام معزوریات پاتا تھا، جو خود نجمہ کو قابل پرستش بنانے کے لیے اُس میں موجود تھے؟ میں وہاں کسی سے اپنی حسب خواہش گفتگو نہ کر سکتا تھا، میں سب سے محبت کرتا تھا یا سب سے ڈرتا تھا، یا سب کا احترام کرتا تھا، میں آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکا، کہ وہ کیا چیز تھی جو مجھے وہاں پہونچ جانے کے بعد بات کرنے سے، نظر اُٹھانے سے، چلنے پھرنے سے، روکتی تھی، میری گفتگو ایسی نہ ہوتی جیسی معمولاً ہوا کرتی تھی، میری آنکھیں ادھر اُدھر دیکھنے میں اتنی آزاد نہ ہوتیں جتنی کہ پہلے تھیں، چلتے وقت میرے قدم اس قدر آزاد، ایسے بے پروا نہ اُٹھتے تھے جیسے میں اپنے یہاں اپنے دوستوں کے ہمراہ اُٹھاتا تھا، ایک شرم، ایک لحاظ، ایک عجیب قسم کی ناقابلِ بیان کیفیت کے زیر اثر میری ہر حرکت بدلی ہوئی ہوتی تھی، مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قدم قدم پر مجھے کوئی دیکھ رہا ہے، گویا میری ہر بات جانچی جاتی ہے، تولی جاتی ہے، گویا مجھے یہاں امتحان دینا ہے۔

اپنے بستر پر پڑے پڑے میں رات بھر کچھ سوچتا رہا، اپنی محبت کے پچھلے واقعات کو جو منتشر صورت میں اِدھر اُدھر پڑے تھے مربوط کرکے ایک سلسلہ میں گوندھتا رہا ایک ایک واقعہ میری نظر کے سامنے بہتا ہوا، تیرتا ہوا، چلا آتا، اور ہر واقعہ میں تازگی اور شگفتگی پیدا ہوتی، میں سمجھ رہا تھا، کہ آج وہ آئی ہے، اُسکا بھائی بھی آیا ہے، اُس کی ماں بھی آئی ہے، وہ ماں جو مجھ سے اس قدر

فریب خیال

وابستہ ہے جو مجھ پر اس قدر مہربان ہے، بیشک وہاں میرا انتظار ہو رہا ہوگا، لیکن مرتضٰی نے مجھ سے کہا کیوں نہیں؟ میں نے ایک ایک بات کریدکرید کر، چھان چھان کر پوچھی بھی، مگر اس نے اسکا ذکر نہ کیا، وہاں چلنے کو بھی مجھ سے کہا مگر اُنکی آمد کی خبر نہ دی، یہ کیوں؟ ممکن ہے اُنھوں نے منع کردیا ہو، مگر ممانعت کی وجہ؟ گھر میں ظاہر کرنے سے منع بھی کیا جاتا مگر مجھ سے پوشیدہ رکھے جانے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی، پھر مجھے خیال ہوا کہ شاید میرے گھر کی عدم توجہی و بے التفاتی نے انھیں بے پروا و بے نیاز بنا دیا ہے، اس خیال سے میرا دل بیٹھ گیا اور میری آنکھوں سے دو قطراتِ اشک ٹپک پڑے۔

پھر میں سوچنے لگا کہ پچھلی مرتبہ اشرف آباد میں مجھ سے کتنا خلوص برتا گیا، کیا یہ سب بے کار تھا؟ کیا اب تک، اتنے عرصۂ گذاشتہ تک کے تمام مراسم یوں ایک دم منقطع ہو جائیں گے؟ کیا میں نے اُنکے مراسم و تعلقات کے بابت جو رائے قائم کی وہ غلط تھی؟ اگر مجھ سے علیحدگی یا کشیدگی منظور تھی تو رفتہ رفتہ مجھے ان سرد مہریوں کا عادی بنایا گیا ہوتا، اس یکایک ستم کے پہاڑ سے تو میں چکنا چور ہو جاؤں گا، اور پھر مجھے جانے سے بھی روکا جاتا ہے، کیا واقعی وہ اسی شہر میں ہے؟ اسی شہر میں جہاں میں سڑ رہا ہوں؟ کیا وہ بھی اسی ہوا میں سانس لے رہی ہے جس میں اپنی سرد آہیں نکال کر میں اپنی زندگی گذار رہا ہوں؟

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا، میں کبھی مایوس ہوا کبھی بشاش، تمام رات میں نے ایک کرب و اضطراب کے عالم میں کاٹی، مجھے نیند کم آئی اور ہر دفعہ میری آنکھیں ایک لرزشِ خفی، ایک اختلاجِ قلب کے ساتھ کھُل گئیں، میں نے پریشان خواب دیکھے، مہیب صورتیں میرے گرد و پیش آتی رہیں، مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں اس رنجِ گراں کی تاب نہ لاسکوں گا، یہ کمزور و ناتواں جسم میرے لیے ایک زنداں تھا جسے توڑ کر میں وہاں پہونچنا چاہتا تھا جہاں روحیں ملتی ہیں، جہاں سے روحیں آتی ہیں، میں اس دنیا سے بیزار تھا، اس دن کے واقعہ نے میری روح میں ایک عجیب بے کیفی پیدا کردی تھی، میں تمام علائق سے کنارہ کش ہو جانا چاہتا تھا [illegible] بدلنے میں میرے جسم کی ہڈیاں ٹوٹتی تھیں، میرا بستر میرے لیے ایک مزار تھا، ا[illegible] تان، ایک تنگ مقبرہ، میں اپنے رنج کیلیے ایک وسیع دُنیا چاہتا تھا، ایک دوسرا [illegible] رنج کے لیے ناکافی تھا۔

دو دن اس طرح گذر گئے، میں اپنی عزیز تجربہ سے [illegible] بیٹھتے میری نگہبانی کیجاتی تھی، گویا میں نے کہیں سیند پھوڑی ہے، جسکے مواخذہ میں مجھے سزا بھگتنی پڑیگی، گھر میں سب

متفکر و پریشان تھے، میں نے مطلق نہ کھایا، فاقہ کشی کی انتہائی تکلیفیں برداشت کرتا رہا، اتنے دن میں صرف صبح کے وقت تازہ پانی پی لیتا تھا اور بس، میں نے طے کر لیا کہ جب تک اُسے دیکھ نہ لونگا میں کچھ نہ کھاؤں گا، اس پر میں اس قدر مُصر تھا کہ اپنی جان تک کا مجھے خوف نہ تھا، میری دماغی کیفیت یوں ہی کیا کم مضمحل تھی کہ اس پر یہ فاقہ کشی، میں بیحد ناتوان و حقیر ہو گیا، میرے جوڑ جوڑ سے جان نکلتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، ہر سانس پر آخری سانس کا گمان ہوتا تھا، میں نے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا، افسردگی و حقارت اُس پر برس رہی تھی، جیسے برسوں کا کوئی مریض ہو، میرے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا، اور میری آنکھیں بیٹھ گئی تھیں، ناتوانی چہرے پر چھائی ہوئی تھی، مگر اس افسردگی و ناتوانی میں مجھے نور سعادت کی ایک جھلک نظر آتی، جسم کے ہر حصہ میں مجھے کمزوری محسوس ہوتی، مگر میرے گوشۂ قلب میں ایک مسرت کی لہر، ایک اطمینان و یقین، آسودگی و بشاشت کی ناقابلِ بیان کیفیت مجھے محسوس ہوتی، وہ احساس جس سے میرے خون میں حرارت پیدا ہوتی تھی، جسکے سہارے میں زندگی بسر کرتا تھا۔

تیسرے دن دوپہر کو مجھے تار ملا، شام کی گاڑی سے میرے ایک دوست کی آمد تھی، انھیں لینے میں اسٹیشن گیا، اسٹیشن کے راستہ میں محبوب منزل تھی جہاں جانے کو مجھے منع کیا گیا تھا۔ مگر میں کیا وہاں نہ جاؤں گا؟ ...... نہیں، تمام دُنیا کی مرضی کے خلاف میں وہاں ضرور جاؤں گا۔ تاکہ کسی کی ایک اُچٹتی ہوئی نظر میرے تمام تکان کو دُور کر دے،

میں وہاں گیا، خستگی و بیچارگی کے باوجود میں انتہائی قوی اور مطمئن معلوم ہوتا تھا، میری تمام پریشانی میرے دل سے دور ہو گئی تھی، میں پھاٹک پر اپنی گاڑی سے اُترا، دروازہ پر میں نے ایک آٹھ برس کا لڑکا دیکھا، اختر؟ مگر نہیں، یہ کون ہے؟ یہ تو کوئی اور لڑکا تھا، مگر کوئی پوشیدہ قوت مجھے اطمینان دلاتی رہی، میں گھر کے اندر داخل ہوا، گھر میں خاموشی تھی، دالان میں میری وہ چچی تھیں جن کی یہ کوٹھی تھی، میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا، پاس کے کمرہ سے ایک معمر بہ قطع و بہ وضع خاتون نکلی، میں نے اس سے قبل شاید انھیں بچپن میں دیکھا ہو مگر اب بھول چکا تھا میں زیادہ تر باہر رہا تھا اور اب کچھ دنوں سے گھر کی سکونت اختیار کی تھی، میں اپنے عزیزوں سے بہت کم واقف تھا، میری چچی نے میرا تعارف کرایا، یہ خاتون اُنکی رشتہ کی ایک بہن تھیں، یہی اشرف آباد سے آئی تھیں، ان کا نام میں نے اکثر سنا تھا،

میرے پیارے دوست! آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ ٹریجڈی اپنے میں کتنے زبردست

مہلک اثرات پنہاں رکھتی تھی، میرا سر چکرانے لگا اور میں پاس کی ایک چوکی پہ سر کے بل گر پڑا، میرا سر پھٹ گیا تھا اور میں بیہوش ہو گیا تھا"۔

شاہد نے اپنی کہانی ختم کی تو ایک گہری ٹھنڈی سانس بھری، اسوقت تک نورِ صبح پھیلنے لگا تھا اور ہماری جدائی کا وقت قریب تھا، میں نے جلدی جلدی حوائجِ ضروری سے فراغت حاصل کرکے اپنے میلے کثیف کپڑے پہن لیے اور انجن میں کام کرنے چلا گیا۔

(علیگ)

کلام امیر

چارہ بیکار ہے اُس عشق کے دیوانے کا	زندگی جسکے یہاں نام ہے مرجانے کا
دوست غم کرتے ہیں ناحق مرے مرجانے کا	یہ بھی اک باب ہے اس زیست کے افسانے کا
ابتدا یہ ہے کہ نالوں سے بپا ہے محشر	دیکھیے حشر ہو کیا عشق کے دیوانے کا
اُب نہ آہوں میں وہ گرمی ہے نہ نالوں میں وہ زور	غالبًا حال کچھ اچھا نہیں دیوانے کا
تابِ گریہ نہیں آنکھوں کو تو خوں رو دیگا دل	کام شیشے سے نکل جائیگا پیمانے کا
کھا گیا مجھکو غمِ عشق کہ غمخوار تھا میں	کیا یہی حسنِ بدل تھا مرے غم کھانے کا
جب سے آباد ہوے وحشت و یاس و حرماں	دل کی بستی میں بھی کچھ لطف ہے ویرانے کا
کم نہ تھا سوزِ جنوں شمع میں پروانے سے	ہار [illegible] تر تھا پروانے کا

ننگِ پیری ہے یہ دیوانگی
شعر خوانی نہیں ہذیان ہے دیوانے کا

آمیر بدایونی

آیولینتھی

(سلسلۂ ماسبق)

پانچواں منظر

(پہلے آیولینتھی اور مارتھا اسکے بعد بادشاہ رینی اور ابن یحییٰ اور سب کے بعد ایلمرک آتے ہیں)

مارتھا (پشت مکان سے داخل ہوتی ہے اور آیولینتھی کو دیکھ کر جلد جلد قدم بڑھاتی ہے) میری بچی! ارے تم جاگیں کیونکر، اور یہاں کس طرح آئیں؟

آیولینتھی۔ مارتھا تم کہاں تھیں۔ میرے پاس آؤ۔

مارتھا۔ میں کھیت میں نوکروں کے ہمراہ تھی لیکن یہ تو بتاؤ کہ تھیں —— تمھیں جگایا کس نے؟

آیولینتھی۔ میں آپ ہی جاگی۔

مارتھا۔ کیسے۔ خود سے؟

آیولینتھی۔ اور طریقہ مجھے معلوم نہیں مگر سنو یہاں اجنبی مہمان آئے تھے۔

مارتھا۔ تم ٹھٹھولی کرتی ہو۔ کون لوگ تھے؟

آیولینتھی۔ وہ اجنبی جنھیں میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور جو پہلے یہاں کبھی نہیں آئے تھے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ تم موجود نہیں تھیں۔

مارتھا۔ بیٹی تم خواب دیکھ رہی ہو۔ وہ اجنبی! کہاں سے آئے کیونکر آئے۔ ممکن نہیں۔

آیولینتھی۔ کہاں سے آئے، میں نے یہ نہیں پوچھا کیونکہ تم نے مجھ سے اکثر تاکید کہا کہ جو مہمان آئیں اُنھیں سوالات کرکے پریشان نہ کرو۔

مارتھا۔ تو بیٹی وہ کون لوگ تھے؟

آیولینتھی۔ میں سچ کہتی ہوں کہ مجھے نہیں معلوم۔

مارتھا۔ کیا تم اُسوقت تنہا تھیں؟

آیولینتھی۔ میں نے تمھیں پکارا اگر تم نے جواب نہیں دیا۔

مارتھا (علیحدہ) اے خدا کیا یہ ممکن ہے (آواز بلند) ہاں بیٹی کہے جاؤ۔

آیولینتھی۔ مارتھا، اُن اجنبیوں کا ایسا کوئی شخص پہلے یہاں نہیں آیا۔ کم سے کم میری یہی رائے ہے وہ یقیناً کسی ایسی پُراسرار سرزمین سے آئے تھے جو یہاں سے مختلف ہے۔ ان کی گفتگو میں جوش تھا، اگرچہ آوازیں ہماری تمھاری طرح نرمی اور لہجہ لطف آمیز تھا۔

(بادشاہ رینی اور ابن یحییٰ اچانک داخل ہوتے ہیں اور کچھ فاصلہ پر ٹھٹک کر سننے لگتے ہیں)

اُس نے ایک گیت سے میرا خیر مقدم کیا مارتھا، وہ ایسا گیت تھا جس میں حیرت انگیز مختلف معانی تھے۔ وہ گیت آنسوؤں کو پھسلا کر میری آنکھوں میں لے آیا، اگرچہ میں مطلب اُدھورا ہی سمجھی۔

مارتھا (علیحدہ) اے خدا میں یہ کیا سُن رہی ہوں (آواز بلند) لیکن یہ تو بتاؤ کہ اُس نے کیا گفتگو کی؟

آیو لینیتھی ۔ اوہ! بہت کچھ! بہت کچھ!
جو میرے لیے نیا اور عجیب تھا ۔ اُسنے کہا،
لیکن افسوس میں سمجھ نہیں سکی ۔۔۔ اُس نے
کہا کہ ہم بہت سی چیزوں کو نگاہ کے ذریعہ سے
پہچان لیتے ہیں ۔

مارتھا ۔ اے خدا!

آیو لنیتھی ۔ مارتھا کیا تم بتا سکتی ہو کہ اس کا
مطلب کیا تھا؟

مارتھا (بادشاہ رینی اور ابن یحییٰ کو دیکھ لیتی ہے)
ارے بادشاہ سلامت!

رینی (آگے بڑھکر) میری بیٹی!

آیو لنیتھی (بادشاہ رینی کی گردن میں باہیں ڈالکر)
میرے اچھے اباجان آپ یہاں ہیں؟

رینی ۔ تمھارے اتالیق ابن یحییٰ بھی میرے ساتھ
آئے ہیں ۔

آیو لنیتھی ۔ وہ بھی ہیں! کہاں! میں آپ کا
بھی خیر مقدم کرتی ہوں ۔

(رینی مارتھا کو علحدہ لیجاتا ہے اور ابن
یحییٰ آیو لنیتھی سے باتیں کر رہا ہے)

رینی ۔ یہ کیا واقعہ پیش آیا؟

مارتھا ۔ اے خدا میں کیا جانوں ۔ مجھے بھروسا
تھا کہ جب تک وہ جگائی نہ جائے خود سے نہیں
جاگے گی، لہذا ہم لوگ کھیتوں کو چلے گئے ۔
اسوقت ۔ وہی کہتی ہے مجھے یقین نہیں کیونکہ
ممکن نہیں ۔ کوئی اجنبی یہاں آیا اور اُس سے
بات چیت کی ۔

رینی ۔ یہ میری ہی بوکھلاہٹ کا ثمرہ ہے ۔ میں
حکیم یحییٰ کے پیچھے گیا اور دروازہ کھلا چھوڑ دیا ۔
ہاں مارتھا، یہ اجنبی،

مارتھا ۔ وہ بہکی بہکی باتیں کرتی ہے مگر اتنا اندازہ
ضرور ہوتا ہے کہ اُس اجنبی نے اُس سے اُس کے
نابینا ہونے کا ذکر کیا ۔

رینی ۔ کیا ۔ آنکھوں سے معذور ہونے کا ۔ معلوم
ہوتا ہے کہ خدا کو یہی منظور ہے کہ وہ قبل از وقت
آگاہ ہو جائے ۔ جو اُسکی مرضی ۔
(ابن یحییٰ کو اشارہ سے بلاتا ہے)
ابن یحییٰ تم نے سُنا؟

ابن یحییٰ ۔ یہ اتفاق نہایت مسعود تھا ۔ ایک اجنبی
نے اسے بیدار کر دیا ۔ یہاں میز پر مجھے وہ نقش ملا ۔
تاہم جو کچھ اسے اپنی حالت کے متعلق معلوم ہوا
مبہم ہے ۔ اب اُسے سب حال پورا پورا بتادینا
چاہیے ۔

رینی ۔ یوں ہی سہی! (آیو لنیتھی کے پاس جاتا ہے)
میری پیاری بیٹی! جو کچھ میں کہوں اُسے غور سے
سنو ۔ یہ بات اب زیادہ عرصہ تک تم سے پوشیدہ
نہیں رکھی جا سکتی کہ تمھاری زندگی کا وہ لمحہ
آگیا [illegible] سے مقابلہ کرنا چاہیے ۔
کیا تم [illegible] سنو گی؟ کیا تم کو
اگر کوئی عیب [illegible] پہنچے جو تمھاری روح
کو زخمی کر دے، تم اُسے صبر و شکر کے ساتھ

برداشت کروگی۔
آیولینتھی۔ بابا جان کہیے آپ کے منہ سے سننے میں اسکی شدت بہت کچھ کم ہو جائے گی۔
ربنی۔ میں نہیں جانتا کہ اجنبی نے تم سے کیا کہا، لیکن میرا قیاس ہے کہ وہی کہا ہوگا جسکے پوشیدہ رکھنے میں ہم نے آج تک اتنی احتیاط کی کہ تمھاری روح میں ایک ایسی قوت کی کمی ہے جسکے بغیر تم اپنے گردوپیش کی چیزوں کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتیں اور یہ بینائی کی عدم موجودگی ہے۔
آیولینتھی۔ اُس نے بھی یہی کہا تھا مگر میں سمجھی نہیں تھی
ربنی۔ اچھا مجھ سے سنو۔ ایک ایسی شے ہے جسے انسان روشنی کہتے ہیں۔ ہوا اور طوفان کی طرح یہ بلندی سے ہم تک آتی ہے اور انکی طرح بے پناہ تیزی کے ساتھ جن چیزوں کو چھو لیتی ہے اُن میں ایک نئے معانی اور نئی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اکثر اسکے ساتھ گرمی بھی شامل ہوتی ہے۔ ہم تک یہ آنکھوں کے راستہ سے پہونچتی ہے اور جب ہمیں اُسکو دیکھنے کی قوت ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ عالم کیا ہے اور خدا نے اسے کیسا بنایا ہے اس طرح ہمیں اُسکے علم و قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اب تک جن باتوں کو تم نے بہت محنت سے سیکھا اور محض قیاس کیا اُن کو آنکھوں کے ذریعہ آسانی دیکھ اور پہچان سکتی ہو کہ اُنکی ضخامت کیا ہے اور شکل کیسی ہے (متاثر ہو کر) ابتدائے عمر میں تمھاری بصارت جاتی رہی اور تم اس خوبصورت دنیا اور نورانی سرزمین کو دیکھنے سے محروم ہو گئیں۔ باوجود امکانی کوشش کے اس نقصان کی معقول تلافی نہ ہو سکی۔ صرف اتنا ہوا کہ ہم نے تم کو اس کمی کے علم اور صدمہ سے محفوظ رکھا۔
آیولینتھی۔ بابا جان یہ الفاظ حیرت میں ڈالنے والے ہیں جنکا مفہوم میری سمجھ میں نہیں آتا۔ عالم! میں جانتی ہوں کہ دست قدرت نے اُسے بنایا۔ یہ بات مجھ سے کب چھپی ہوئی تھی۔ میں اپنے پروردگار کو بھی پہچانتی ہوں کیا یہ عالم اُسکی قدرت کا ثبوت نہیں ہے۔ کیا جنگل جھاڑنے والا طوفان اور نسیم کی ہلکی ہلکی سانس اور وہ گرمی جو ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ دنیا کی ایسی عمدہ ترتیب اور یہ صلاحیت کہ پودھے پھیلیں اور پھولیں پھلیں، تیز رو دھارے، بہتے ہوئے چشمے، چڑیوں کا سنگت میں گانا، کیا یہ سب اپنے عظیم پیدا کرنے والے کا اعلان نہیں کرتے۔ کیا آپ نے مجھے نہیں سکھایا کہ خدا نے دنیا میں کیسا اور کس لیے پیدا کیا ہے۔ آپ نے یہ تک تو کہا تھا کہ آیولینتھی تم خود اُسکی قدرت کا نمونہ ہو۔ میں جس طرف مڑتی ہوں فطرت کی طرف یا دوسرے لوگوں کی گفتگو کی طرف خود اپنی ہستی کی کی گہرائیوں میں اُن خیالات میں جو خیالات سے پیدا ہوتے ہیں اور جنکا سلسلہ نا تمنا ہی ہے اُن سب میں مجھے وہی آواز گونجتی سنائی دیتی ہے۔ اور یہ سب اُسکی عظمت کا بہ آواز بلند اقرار کرتے ہیں۔
ربنی۔ (ابن یحییٰ سے علیحدہ) آہ ابن یحییٰ ہم نے اس خوبصورت عقیدہ کو مسمار کر دیا۔

آیو لینیتھی - ایک بات بتائیے - مجھے اپنی آنکھوں کے ذریعہ سے اس دنیا کا علم حاصل کرنا چاہیے - اُس اجنبی نے بھی جو تھوڑی دیر پہلے یہاں آیا تھا اور جس کے عجیب وغریب الفاظ میرے دل پر نقش ہیں بصارت کا ذکر کیا تھا - ابا جان دیکھنے کے کیا معنی ہیں؟ کیا میں اُسکی آواز کو دیکھ سکتی ہوں جسنے میری روح میں خوشی والم کا طوفان ایک ساتھ برپا کر دیا؟ کیا میں ان آنکھوں سے بلبل کے چہچہوں کو دیکھ سکتی ہوں جنپر میں نے اکثر غور کیا ہے اور تصور کے ذریعہ سے بہت دور تک اسکا کھوج لگانے کی ناکام کوشش کی ہے؟ شاید اُسکا نغمہ ایک پھول ہے جسکی خوشبو کا تو مجھے علم ہے مگر میں اُس کی جڑ اور شاخوں اور پتیوں سے بیگانہ ہوں۔

رینی - آہ میری پیاری بیٹی - تیرا ہر سوال میری روح کو تڑپاتا ہے - میرے کلیجہ کے ٹکڑے - میرا انتظار اور اُس نیک ساعت کا انتظار کر جب کہ ہر بات جو اسوقت تیری سمجھ میں نہیں آتی خود بخود آشکار ہو جائے گی - لیکن یہ یاد رکھ کہ مجھے اُمید ہے اور اسی امید نے مجھے ابتک سنبھالا ہے کہ تیری بینائی تجھے دوبارہ عطا ہوگی - تیری آنکھیں کھلیں گی اور روشنی کی شعاعیں نہایت مسرت سے اُنکا استقبال کریں گی - کاش خدا ایسا کرے کہ ہمارا شریف دوست اور تیرا مہربان اتالیق ابن یحیٰی اپنی کوششوں میں کامیاب ہو اور وہ گھڑی آجائے جسکے واسطے وہ اپنے کمال کے زور پر تیاریاں کر رہا ہے - میرا دل کہتا ہے کہ وہ ساعت سعید بہت دُور نہیں ہے - میری پیاری بیٹی، تو ابن یحیٰی پر اعتماد کر اور اُسکے ساتھ مکان کے اندر جا - مارتھا تیرے ہمراہ ہوگی - پہلے تجھپر غنودگی طاری ہوگی اور اُسکے بعد .... اگر خدا کی مہربانی شامل حال رہی تو .... (جذبات سے مغلوب ہو کر خاموش ہو جاتا ہے)

آیو لینیتھی - ابا جان آپ کیسے ہیں - آپ کے ہاتھ میں رعشہ کیوں ہے - پیارے ابا جان آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ وہ مبارک وقت آگیا جسکا آپنے اس قدر بے چینی سے اتنی مدت تک انتظار کیا - کیا آپ کو یہ خوف ہے کہ مایوسی کا سامنا ہوگا - فرض کیجیے کہ ایسا بھی ہوا تو کیا اس حالت میں میں آپ کی بیٹی چہیتی بیٹی نہ رہوں گی - وہ بیٹی جو اس وجہ سے خوش ہے کہ آپ اُس سے محبت کرتے ہیں اور اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہے - جانے کی اجازت دیجیے -

رینی - آہ میری بیٹی! میری بیٹی!

آیو لینیتھی - ابا جان مطمئن رہیے - جس امر میں میرے دانا اور مہربان اتالیق نے اس قدر غور و فکر سے کام لیا ہے [illegible] کامیابی کی قطعی امید ہے - میں محسو [illegible] اس وقت بھی اُس غیر معمو [illegible] ہوں جسکو آپ روشنی سے [illegible] یا - میں محسوس کرتی ہوں کہ وہ قوت مجھ میں موجود ہے - آہ جس وقت

وہ حیرت دلانے والا اجنبی یہاں تھا،
میرے دل میں ایک ایسے جذبے نے جوش کھایا
جس سے میں پیشتر آگاہ نہیں تھی جو لفظ اُسکے
منہ سے نکلتا تھا اُسکی آواز بازگشت میری روح
میں گونجتی تھی اور اُس سے ایسے نئے نغمے بلند
ہوتے تھے جنکا وہم وگمان بھی نہیں تھا۔کیا آپ
نے نہیں کہا تھا کہ روشنی کی قوت بہت تیز گام
ہوتی ہے اور جس شے کو چھو لیتی ہے اُس میں
ایک نئی معنویت پیدا ہو جاتی ہے اور اس میں اکثر
حدت شامل ہوتی ہے ——— دل کی حرارت۔ابا جان
میں جانتی ہوں کہ روشنی کیا چیز ہے۔اگر آپنے
مجھ سے روشنی کی صحیح تعریف کی ہے تو کوئی مجھ
سے کہہ رہا ہے کہ آج مجھپر اُسکا ظہور ہوگا۔لیکن
ایک معاملہ میں آپ کی رے صحیح نہیں ہے آنکھیں
نہیں دیکھتیں بلکہ بصارت کی جگہ یہاں دل کے
قریب ہے۔یہاں اسکی شیریں یادگار قائم ہے۔
اور اُس نور کو منعکس کر رہی ہے جو میری روح
میں در آیا ہے۔بیتاب امیدوں کے ساتھ میں
اس روشنی سے ملنے جا رہی ہوں (مارتھا کے
ساتھ گھر کے اندر چلی جاتی ہے۔

رینی (ابن یحییٰ سے جو گھر کے اندر جانے والا ہے)
ابن یحییٰ ٹھہرو! کیا یہ راز کچھ تمھاری سمجھ میں آتا ہے
وہ اجنبی کہاں ہے جسنے اس طرح میری لڑکی کے
سکون قلب میں خلل ڈالا؟ اُسکے الفاظ جذبات
سے لبریز تھے۔اسکے کیا معنی ہیں۔تمھارا کیا خیال ہے؟

ابن یحییٰ۔ حضرت! عورتوں کا مزاج بخوبی کون
سمجھ سکتا ہے؟ اور اُس کی موجودہ حالت میری
تدابیر کے چنداں موافق نہیں معلوم ہوتی۔

رینی۔ صاف صاف کہو!

ابن یحییٰ۔ فرض کیجیے کہ اُسکے تمام خیالات کا
مرکز یہ اجنبی شخص ہے، وہی اُسکی طبیعت پر
قابو رکھتا ہے، لہذا مجھے بہت شک ہے کہ میرا
فن اپنا پورا اثر کرے گا اور کوئی مفید نتیجہ نکلے گا۔
لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ یہ دونوں قوتیں بجائے مخالف
ہونے کے متحد ہو جائیں اور ایک دوسرے کو
مدد پہونچائیں۔ اسی امید ضعیف پر اب دارومدار
ہے۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔

(گھر میں داخل ہوتا ہے)

رینی۔ خدا معلوم کون شخص آیا تھا۔ شاید برٹرانڈ
کو معلوم ہو۔ (المیرک چور دروازہ سے آتا ہے)
المیرک! تم یہاں!

المیرک۔ بندگان عالی کے واسطے ایک خط لایا ہوں۔

رینی۔ ٹرسٹان کے پاس سے؟ (مُہر توڑتا ہے)
اُسی کا خط ہے۔ یہ میں کیا پڑھ رہا ہوں، المیرک
یہاں آؤ! وہ ہمارے پاک معاہدہ کو توڑنا
چاہتا ہے۔

المیرک۔ معاہدہ سے روگردانی!

رینی (پڑھ کر) حیرت! سخت حیرت! وہ
اقرار کرتا ہے کہ وہ غلطی پر تھا۔ اور تلافی کی
شرائط کا انحصار مجھ پر کرتا ہے تاہم آیولینتھی

کے ساتھ شادی سے انکار ہے۔

ایلمرک۔ میں نے آجتک ایسی گستاخی نہیں دیکھی۔

رینی۔ آہ! ایلمرک۔ قسمت ہمیشہ میری مخالفت کرتی ہے۔ یہ ایک شگون بد ہے۔ خدا جانے کیا ہونے والا ہے۔ اس شادی سے مجھے نہ معلوم کیا کیا امیدیں تھیں اور اسی سے آیو لینیتھی کے حصول بینائی کی اُمید بھی وابستہ تھی۔ ایک اُمید تو منقطع ہوئی اور...... اور شاید تھوڑی دیر میں دوسری اُمیدکا بھی خون ہو جائے گا۔ لیکن میں ایسی احمقانہ یا محبانہ آہ وزاری سے اپنی ذلت نہیں کروں گا۔ وہی ہوگا جو خدائے تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ سے مقدر کر دیا ہے۔

یہ خط لایا کون تھا؟

ایلمرک۔ جیوفری کے ملازموں میں سے تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ٹرسٹان اُسکے یہاں مہمان ہے۔

رینی۔ جیوفری کے یہاں؟ ایسی صورت میں تو کچھ اُمید ہوتی ہے۔ شاید وہ ——— لیکن ——— یہ غل کیسا ہوا؟ یہ دروازہ میں تلواروں کی جھنکار کیسی ہے؟

ایلمرک (دروازہ کے پاس جاکر) وہ زبردستی داخل ہوگئے

رینی۔ زبردستی! کون بدمعاش ہیں؟

ایلمرک۔ ہمارے چند نفر سپاہی ———

رینی۔ تلوار کھینچ لو۔ وہ بغیر سزا پائے بادشاہ رینی کے منہ نہیں آسکتے (باقی)

اثر (لکھنوی)

جذباتِ اکبر

اندوہِ انتظار سے فرصت نہیں مجھے — یہ کس طرح کہوں کہ محبت نہیں مجھے
ہے باعثِ سکونِ طبیعت خیالِ دوست — احساسِ بیقراریِ فرقت نہیں مجھے
تیری طرف سے ظلم کی غایت نہیں رہی — یہ ا[illegible] کہ شکایت نہیں مجھے
ناکامیِ وفا مجھے برباد کر چکی — [illegible]رت نہیں مجھے
یا تیری جستجو میں اذیت کہیں نہیں — [illegible]ذیت نہیں مجھے
اکبر غلامِ عابدِ رنگیں طراز ہے — ہرگز غرورِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے

جلال الدین اکبر

ایشیا کا نشأۃ جدیدہ

جب ساری دنیا جہالت کی تاریکی میں مبتلا تھی تو ایشیا میں تہذیب کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ رفتہ رفتہ وہ آفتاب افقِ مغرب پر طلوع ہوا، علمی، مذہبی، اور سیاسی بیداری کی نسیم چلی اور سارے یورپ میں تہذیب کا اُجالا ہوگیا۔ مرورِ ایام کے ساتھ وہ آفتاب پھر ایشیا کی طرف بڑھ رہا ہے، اور یہاں روشنی اور حرارت کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ جن اسباب نے مغرب میں تمدن کی بنا ڈالی تھی وہی آج مشرق میں کارفرما ہیں۔

اس دَورِ جدید کی ابتدا یوں ہوئی کہ ۱۸۵۳ء میں امریکہ سے کموڈور پری کا بیڑہ وصیل کی تجارت کے لیے جاپان آیا۔ مغربی تمدن اور مغربی خیالات کے نمونے دیکھ کر جاپان چونک پڑا، غفلت سے بیدار ہوا، اور نئی روشنی کے استقبال کو بڑھا۔ تجارتی منفعت کی امید پر مغربی کمپنیوں نے تمام جزائرِ جاپان میں اپنا جال پھیلا دیا۔ جاپان نے تجارت اور حکومت کا پہلا سبق انھیں سے لیا، اور بہت جلد شاہ متسوہتو کو رائے عامہ کے مطابق حکومت کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس بادشاہ کے دَورِ حکومت میں جاپان نے اتنی ترقی کی کہ شاید کبھی کسی دوسری قوم نے نہ کی ہوگی۔ متسوہتو نے بیرونی ممالک سے تیس ہزار معلم، انجنیر، طبیب، جہاز راں، اور مشیرِ مملکت بلائے، جو تیس سال تک جاپان کی خدمت میں مصروف رہے۔ آخر جاپان نے اتنی قوت حاصل کرلی کہ ۱۹۰۵ء میں روس ایسی عظیم الشان سلطنت کو جنگ میں شکست دے دی۔

مُردہ مشرق کی رگوں میں یہ خبر خونِ زندگی بنکر دوڑی، اور سارے ایشیا میں ترقی اور آزادی کی جد و جہد شروع ہوگئی۔ چنانچہ اس واقعہ کے دوسرے ہی سال مغربی طاقتوں کے گڈے، شاہِ ایران نے اپنی رعایا کو حکومت مشروطہ کا فرمان عطا کیا، اور تیسرے سال سلطان عبد الحمید نے آزادیِ مطابع، جبری ابتدائی تعلیم، اور آئینی حکومت کا فرمان صادر فرمایا۔ ۱۹۱۲ء میں چینیوں نے حکومت کے خلاف بغاوت کی اور منچو خاندان کے نابالغ شہنشاہ کو جمہور کے حق میں دست بردار ہونے پر مجبور کر دیا۔ ۱۹۱۷ء میں اہل ہند نے ہوم رول کی تحریک بڑے زور و شور سے اُٹھائی، برٹش گورنمنٹ نے ہندوستان میں سُست رفتار مگر ترقی پذیر ذمہ دار حکومت قائم کرنے کا اعلان کیا جسکی پہلی قسط ۱۹۱۹ء میں مانٹیگ چیمسفورڈ کی مجوزہ اصلاحات کی صورت میں برطانوی پارلیمنٹ سے منظور ہوئی۔

اسی سال افغانستان نے بھی برطانوی اثر کا جُوا اُتار پھینکا - یہ سب اُسی جذبۂ وطن پرستی کے ہاتھوں انجام پایا اور پا رہا ہے جسے مغرب نے ایشیا کے گوشہ گوشہ میں پیدا کر دیا ہے -

ترقی کے لیے سب سے ضروری شے تعلیم کی عمومیت ہے - اس میں شک نہیں کہ ایشیا میں تعلیم ابھی عام نہیں ہے - لیکن اس شعبہ میں بھی ہماری ترقی کی رفتار کچھ بُری نہیں - جاپان و روس کی جنگ کے بعد ہی چین نے جدید نظام تعلیم اختیار کر لیا تھا، اور اسوقت وہاں نئے اسکول اور کالج اس رفتار سے قائم ہو رہے ہیں کہ اُنکے لیے کافی عمارتیں مہیا نہیں ہوتیں - اور مجبوراً مندروں کی عمارتیں اسکولوں کے مصرف میں لائی جا رہی ہیں - اسکے علاوہ تین ہزار چینی جاپان میں، ایک ہزار امریکہ میں، اور دو سو یورپ میں زیر تعلیم ہیں - جاپان کے پڑھانے والی عمر کے لڑکوں میں ۹۸ فی صدی تعلیم پا رہے ہیں - ہندوستان میں بھی جبری عام تعلیم کا مطالبہ ہے - زنانہ تعلیم کے لیے جلد جلد اسکول اور کالج قائم ہو رہے ہیں - دو چار لڑکیاں لڑکوں کے دوش بدوش یورپین یونیورسٹیوں میں بھی نظر آجاتی ہیں، اور ٹرکی میں تو خود وزیر تعلیمات ایک عورت ہے - ایشیائی طلبہ نہ صرف تعداد میں بلکہ علمیت میں بھی ترقی کر رہے ہیں - کتنے ہیں جن کی قابلیت کا خود مغربی اُستادوں نے لوہا مان لیا ہے، اور بہت سے تو یورپین اور امریکن یونیورسٹیوں میں درس دیتے ہیں - بڑی بات تو یہ ہے کہ جو طلبا اکتساب علم کے کے لیے ممالک یورپ کو جاتے ہیں وہ اپنے ساتھ اُن علمی جواہروں کے فوٹو، اُنکی نقلیں، اور اُن کی مطبوعہ کاپیاں اپنے ساتھ لاتے ہیں جنھیں یورپ ہماری غفلت کے زمانہ میں لوٹ لے گیا تھا - اور اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ ایشیا کے مطابع علوم و فنون کی اشاعت میں یورپین نشأۃ الثانیہ کے مطابع سے بہت آگے ہیں - صرف ہندوستان میں اسوقت تین ہزار پانچ سو اخبارات مختلف زبانوں میں شایع ہو رہے ہیں - شنگھائی کا صرف ایک مشنری مطبع دس کرور صفحات سالانہ شایع کرتا ہے - بیروت کے عربی مطابع نے سنہ ۱۹۱۴ء تک دس پدم صفحات شایع کیے تھے اور جاپان کی سالانہ مطبوعات انگلستان اور امریکہ کی سالانہ مطبوعات کے قریب ہو چکی ہیں -

اخلاقی ترقی اس سے بھی زیادہ نمایاں ہے - بیاسی لاکھ پونڈ کے نقصان کے باوجود افیون اور قمار بازی کے خلاف چین کا زبردست جہاد ایک عظیم الشان کارنامہ ہے، جسکی مثال مشکل سے ملیگی - ہندوستان میں عقد بیوگاں کے لیے جگہ جگہ … ہیں - بچپن کی شادی جدید تعلیم
کے اثر سے تقریباً بند ہو جانے والی ہے - جاپان … پابندی" قانوناً مسدود ہو گئیں
تمام ایشیا میں عورتوں کا رتبہ بلند ہو رہا ہے - پردہ … رہے، مگر پھر بھی بعض ملکوں نے

تو بالکل بے پردگی اختیار کر لی ہے، اور جہاں پردہ باقی ہے وہاں اندر ہی اندر آزادی کی حدود بڑھتی جاتی ہیں۔ زنانہ تعلیم اور اُسکے ساتھ ساتھ زنانہ تفریحی مشاغل بھی بڑھتے جاتے ہیں۔ یہ الزام ایک حد تک صحیح ہے کہ مغربی اثر نے تعلیم یافتہ جماعت کو بے دین بنا دیا ہے۔ مگر اس شکایت کو رفع کرنے کے لیے پُرانے مذاہب کو نئی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ چنانچہ چین میں طاؤزم، جاپان میں شنٹو، کوریا میں شامانی، ہندوستان میں آریہ سماجی اور برہمو سماجی مذاہب، اسی کوشش کا نتیجہ ہیں۔ ذات پات کی قید سے آزادی، بُت پرستی کی مخالفت، مذہبی آزاد خیالی ان مذاہب کی اہم خصوصیات ہیں

اقتصادی حیثیت سے ڈاک، ریل، تار، اور جہاز نے عہد فلاحی کا خاتمہ کر کے دَورِ صناعی کی ابتدا کی۔ اُنیسویں صدی کی دوسری ششماہی میں ہندوستان کی تجارت چوگنی، چین کی چھ گُنی اور جاپان کی سات گُنی ترقی کر گئی، اور موجودہ صدی میں اس سے بھی زیادہ ترقی ہو رہی ہے۔ چین میں دُنیا کی سب سے بڑی کوئلے کی کانیں دریافت ہوئی ہیں، جن میں امریکہ کی کانوں کا بیس گُنا کوئلہ موجود ہے۔ امریکہ اسٹیل کارپوریشن کو سن فرانسسکو میں، چین اور ہندوستان کا کوئلہ خاص فرانسسکو کے کوئلہ سے سستا پڑتا ہے۔ سَن، چاول اور چائے کی برآمد میں ہندوستان دنیا کے تمام ممالک سے آگے ہے۔ اور چمڑہ، گیہوں، اور روئی کی برآمد میں اُس کا دوسرا نمبر ہے۔ ہندوستان کا نظام آبپاشی دنیا میں بہترین مانا گیا ہے اور اسکی ۳۰ ہزار میل لمبی ریلوے ساری دنیا میں چوتھے نمبر پر ہے۔

مختصر یہ کہ پیدائش گاہِ تمدن، مادرِ مذاہب، گہوارۂ اقوام، ایشیا دنیا کی آدمی سے زیادہ آبادی کو گود میں لیے ترقی کے میدان میں گام زن ہے۔ اسکی مظلوم بچیاں اور غافل بچے بیدار ہو رہے ہیں۔ دنیا کا آباد ترین اور وسیع ترین خطہ یورپین نشاۃ ثانیہ کی برسوں کی راہ کو مہینوں میں طے کر رہا ہے۔ ایشیا کا یہ نشاۃ ثانیہ یورپ کے دَورِ ترقی سے زیادہ وسیع، زیادہ عمیق، اور زیادہ قوی ہے۔ اور یقین ہے کہ یورپین تہذیب سے زیادہ عظیم الشان تمدن کا بانی ہوگا۔

سید

مقدس ڈاکو

(۱)

مولانا محمد علی صاحب نے اپنے اخبار ہمدرد میں جسکی عنانِ ادارت اب عملاً بھی اُن ہی کے ہاتھ میں ہے خواجہ حسن نظامی دہلوی، خواہرزادہ حضرت محبوب الٰہیؒ، و فرزند دلبند حضرت مولا علی کرم اللہ وجہہٗ و نبیسۂ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و نبیرۂ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو حال ہی میں یہ نہایت ہی معنی خیز لقب عطا فرمایا ہے۔

اگست سنہ ۱۸ء میں جب مولانا ظفر علیخاں صاحب دوبارہ حیدرآباد میں بُلائے گئے اور حضور نظام کے لطف و اکرام سے سرفراز ہوے، تو جن لوگوں کو اُن سے اختلاف تھا، یا یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ جو لوگ اُن کو اس منزلت سے گرانا چاہتے تھے، اُنھوں نے حکومت ہند کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس سازش میں حیدرآباد کے کون کون لوگ شریک تھے، اس پر بحث کرنا یہاں مقصود نہیں ہے۔ البتہ دو اشخاص کے کارنامے اسوقت پبلک کے سامنے ہیں۔ شیخ ضیاء الحق صاحب ہاپوڑی نے جنکو خواجہ صاحب نے اب اپنے تبلیغی اخبار منادی میں "مہذب ڈاکو" کا لقب دیا ہے اور جنکی پمفلٹ بازی کبھی خاص شہرت رکھتی تھی خواجہ صاحب کو جو غالباً اُنکے پُرانے رفیق کار تھے، اپنے خاص ذرائع معلومات کی بنا پر یہ اطلاع بہم پہونچائی کہ ظفر علیخاں صاحب حضور نظام کو پان اسلامزم (ہمدردیِ اسلام) کا سبق پڑھا رہے ہیں، اور خواجہ صاحب نے چیف کمشنر دہلی کو جاکر باضابطہ اس حادثۂ عظیم کی خبر پہونچائی۔ چیف کمشنر صاحب نے حکومتِ پنجاب اور حکومت ہند کو اطلاع دی اور نتیجہ یہ نکلا کہ چند روز میں مولوی ظفر علیخاں صاحب کو مع اُنکے صاحبزادہ عزیزی اختر علیخاں کے حیدرآباد چھوڑنا پڑا۔ اور حضور نظام کے متعلق حکومتِ ہند کا جو رویّہ آج بتایا جاتا ہے، اگر اُس میں کوئی واقعیت ہے تو ایک انگریزی اخبار کے مطابق وہ پان اسلامزم بھی اُنکی فہرست الزامات میں داخل ہے جس کا سبق مہذب اور مقدس ڈاکوؤں کی شہادتوں کے بموجب ظفر علی خاں صاحب [illegible] ۔

خواجہ حسن نظامی صاحب سے ہمیں پہلی بار [illegible] [illegible] حل کرنے کا موقع ملا [illegible] تک خواجہ صاحب صرف ابن آدم تھے [illegible] [illegible] دلبند، نبیسہ و نبیرہ کی

خصوصیات کا اضافہ بعد میں ہوا ہے۔

الناظر کے اجراء کے بعد نظام المشائخ کے مدیر اعلیٰ اور حلقۃ المشائخ کے بانی کی حیثیت میں جب خواجہ صاحب نمودار ہوئے تو فروری کے الناظر میں نظرے خوش گذرے کے تحت حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا گیا :-

"لیکن باوجود اُس حسن عقیدت کے (صوفیائے کرام اور اُن کے روحانی مشن کے ساتھ، نہ کہ خواہرزادہ حضرت محبوب الٰہیؒ کے ساتھ) ہم نظام المشائخ کے مدیر اعلیٰ کی روش کو اُس وقعت سے نہیں دیکھتے جسکے وہ غلطی سے مستحق بتائے جاتے ہیں اور جسکی وہ بحالت موجودہ اُمید کر سکتے ہیں

. . . .

ایک ایسے زمانہ میں جبکہ تار اور ڈاک کی بدولت رسل و رسائل اس قدر آسان نہ تھے عمدہ پختہ سڑکوں، تیز رَو ریلوں اور دخانی جہازوں کی وجہ سے نقل و حرکت کے ذرایع اس درجہ سہل الحصول نہ تھے اور دنیا کی تین چوتھائی آبادی حالانکہ اُسوقت یقیناً مشرب صوفیانہ سے نابلد محض تھی، صوفیائے کرام کی باطنی و اشراقی قوتیں دنیائے اسلام میں نور بیزی و ضیا گستری اور خیالات باطلہ و عقائد ناقصہ کی اصلاح و درستی کرنے سے عاری نہ تھیں، لیکن مقام تعجب ہے کہ آج اِن آسانیوں کے باوجود اور فرقہ اہل باطن کے خودساختہ نائبوں کے دعوے کے بموجب دنیا کی آبادی میں تین چوتھائی حصہ صوفی مشرب لوگوں کا ہوتے ہوئے بھی محض ابلہ فریبی اور مغربی تقلید کے خیال سے علم تصوف کی درسگاہیں قائم کرنے اور صوفیوں کی اصلاح کرنے (اور اگر سارے عالم کو نہیں تو تمام مشرقی ممالک کے مسلمانوں کو مشرب صوفیانہ کی دعوت دینے اور اُنکو ایک محیط جہالت و توہم میں غرق کرنے کی کوشش میں ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگایا جاتا ہے اور زمانہ حال کی تمام علمی، تمدنی اور سیاسی ایجادات اس غایت تظلم و تعدی کے لیے صرف ہو رہی ہیں۔"

خواجہ صاحب کے کارخانہ تجارت کے بارے میں سطور بالا لکھنے کے بعد اسی سلسلہ میں مولانا محمد علی سے یوں شکوہ کیا گیا تھا :-

"قوم کے وہ برگزیدہ نفوس جو اپنی فطری سعادت اور ملکوتی ثقاہت کے باعث اس قسم کی نیرنگیوں اور بازیگریوں کی اصلیت سے بیخبر رہتے ہیں اُنکا تو ذکر نہیں، لیکن افسوس معلوم ہوتا ہے اُن حضرات پر

جو اپنی عالی دماغی و روشن ضمیری سے اِن شبدوں اور ڈھکوسلوں کے پیچ در پیچ اسرار سے واقفیت رکھتے اور علمی تجربوں اور چشم دید واقعات کے بدولت اُن کی حالت و حیثیت کا صحیح اندازہ کرنے کے باوجود محض ہر دلعزیزی قائم رکھنے کی خواہش یا اخلاقی جرأت کے فقدان سے واقعات کے چہرے پر دہ اُٹھانے اور حقیقتِ راز کا افسانہ سنانے کی ہمت نہیں رکھتے۔

ہمعصر کامریڈ نے اپنی ۱۳- جنوری کی اشاعت میں ایک دعوے باطلہ کی تردید کرتے ہوئے اس قسم کے لوگوں کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اُس سے ہمیں اتفاق کلی نہیں۔ ہمارے خیال میں ایسے موقعوں پر بزرگان ملت کا سکوت کرنا یا "دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ" کی قدیم ہدایت پر کاربند ہونا حالات موجودہ کے لحاظ سے کبھی مناسب نہیں۔ خصوصاً اس لیے کہ آجکل کے ذہین، طباع اور پڑھے لکھے عیار "الخاموشی نیم رضا" کا مفہوم خوب سمجھتے ہیں اور بڑے ناموں کی پرستش کرنے والوں کو اس طریقہ پر فوائد بیجا حاصل کرنے میں جو ید طولیٰ حاصل ہے اُس سے ملک و قوم کو سخت خمیازہ بھگتنا پڑا ہے اور پڑے گا"۔

ایک سال بعد جب خواجہ صاحب نے میرٹھ سے اخبار توحید جاری کیا تو مئی ۱۳ء کے الناظر میں اُسکے متعلق یہ عرض کیا گیا۔

"... اگر توحید کا ظاہری لباس تصوف کی باطنی تعلیم کے لیے مفید و کار آمد ہو سکتا تو مسلمانان ہند کے حق میں یہ اخبار ضرور نزول رحمت کا باعث ہوتا لیکن جب اہل باطن ظاہری تصنعات سے آراستہ ہو کر نمود و نمائش کو اکتساب برکت کا ذریعہ قرار دیں اور یخادعون اللہ والذین آمنوا وما یخدعون الا انفسھم وما یشعرون کی دل ہلا دینے والی آواز پر کان نہ دھریں تو ظاہر ہے کہ مذہب و اہل مذہب کے حق میں نتیجہ کبھی مفید نہیں ہو سکتا۔

ہم جانتے ہیں کہ ہماری آواز اِن معاملات میں نہایت مدھم ہوتی ہے لیکن پھر بھی جب کبھی ہمیں موقع ملے ہم اس بارے میں اپنی رائے کا اظہار آزادی کے ساتھ کرتے رہیں گے اس لیے کہ مسلمانوں کی موجودہ ذلیل اور پست حالت کا ذمہ دار زیادہ تر وہی گروہ ہے جو انانیت و خودی کی مئے دو آتشہ کا متوالا بن کر خدا اور رسول کے ارشاد و تعلیم کو پس پشت ڈال کے ظاہری لباس سے آراستہ ہو کر سادہ لوح حلقہ بگوشان مذہب کو بے وقوف بنانے کی ... رکھتا ہے۔

افسوس ہے کہ یہ خاکی نژاد انسان جسکی تخلیق میں ایک ناقابل شمار حصۂ وقت سے زیادہ اور ایک قطرۂ ناپاک کے سوا صرف نہیں ہوا ہے کتنی جلد اپنے نفس کا بندہ بن جاتا ہے۔ طرح طرح کی نیرنگیوں اور شعبدہ بازیوں سے اُس خالق ذوالجلال کی ہشیار مخلوق کو مصیبتوں میں پھنساتا ہے جسکی قدرت وطاقت کا اندازہ بھی امکان بشری سے خارج ہے اور پھر اپنی وقتی اور عارضی کامیابیوں سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ اُس بصیر وعلیم کو بھی دھوکے میں ڈال دیا ہے اور اُس وقت کو یاد کر کے نہیں لرزتا جبکہ یہ سراب، یہ بُلبلا، یہ دھوکے کا طلسم باقی نہ رہے گا اور دلوں کے اندر کے راز طشت از بام کر دیے جائیں گے۔

ٹٹولتے ہیں یہاں حال کو شۂ گوشۂ دل
یہاں نہیں ہے حکایت سے اور قیل سے کام　　(ظفرؔ)

ہمارے متعلق توحید کے پہلے ہی پرچہ میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ "ہم درویشوں کی ہستی کو ریاکاری کی ہستی قرار دیتے ہیں"۔ اور اگر مذکورالصدر خیالات کا مفہوم یا جو کچھ ہم نے اس مسئلہ پر فروری سنہ ۱۲ء کے الناظر میں نظام المشائخ پر ریویو کرتے ہوئے لکھا تھا اُسکا نشا و مطلب توحید کے طباع اڈیٹر کی رائے میں اسی قدر ہے تو ہم کو اُن سے شکایت نہیں ہو سکتی۔ البتہ ہم دوسروں کی خدمت میں یہ عرض کر دینا مناسب سمجھتے ہیں کہ ہم اُن لوگوں کی ہستی کو ریاکاری کی ہستی نہیں قرار دیتے جو واقعی درویش ہوں، مگر وہ لوگ جو خود پرستی و خود نمائی کے سکہ سے مقلوب کا تبادلہ عقیدت وارادت سے کرنا چاہیں اور مذہب ایسی مہتم بالشان چیز کو اپنے مفروضہ کشف وکرامات سے بازیچۂ اطفال بنائیں اُنکے سامنے سرِ تسلیم ونیاز جھکانا البتہ ہمارے مذہب میں ایک گناہ عظیم ضرور ہے۔ اور خواہ ہردلعزیز بننے کی ہمیں کیسی ہی سخت خواہش وضرورت کیوں نہ ہو لیکن ہم اپنی فطرت سے مجبور ہیں کہ امید وبیم کی کوئی حالت ہمیں اس معاملہ میں شکست نہیں دے سکتی"

سنہ ۱۹ء اور سنہ ۲۰ء میں بوہرہ فرقہ کے مشہور پیشوا ملا طاہر سیف الدین صاحب .... کی ایک تصنیف کی بدولت خواجہ صاحب اور اُن جیسے دوسرے مقدس اور مہذب ڈاکوؤں نے خوب داد قزاقی دی اور بمبئی کے احمقوں کی زرپاشی نے ملک میں ایک طوفان بے تمیزی بپا کر دیا تو تنگ آکر ہمیں فروری سنہ ۲۰ء کے الناظر میں سطور ذیل لکھنا پڑیں:-

ریل، ڈاک، تار، مطبع اور اخبارات بے شبہہ تمدن جدید کے بہترین ثمرات میں سے ہیں لیکن اُس قوم

کی قسمت کو کیا کہیے جسکے افراد ان نفع بخش اور راحت دہ چیزوں کو بھی شرارت اور نفسانیت کا آلہ بنا لیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ کم و بیش ایک سال سے مسلمانوں کی ایک جماعت انھیں تمدن پرور آلات کے ذریعہ افراد قوم کے دلوں میں کدورت و نفرت کے جذبات مشتعل کرنے میں مصروف ہے اور اگرچہ ہم نہیں چاہتے تھے کہ اس بحث میں ہم کسی قسم کا حصہ لیں لیکن وقت، روپیہ اور قوتوں کے بیجا اسراف کے ساتھ ساتھ جب ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس جنگِ زرگری کی بدولت کثیر افراد قوم کے اخلاق بھی برباد ہو رہے ہیں تو ہم معاف کیے جائیں اگر ہم خاموشی کو گناہ سمجھ کر چند سطور تحریر کریں۔

ابتدا اسکی یوں ہوئی کہ ایک صاحب محمد اسمٰعیل سریا واتے جنکے دل میں غالبًا اسلام اور مسلمانوں کا درد تمام قوم سے زیادہ ہے، ایک طولانی تحریر بعض اخبارات میں اس مضمون کی شائع کرائی کہ بمبئی میں جو داؤدی بوہروں کے ایک سرغنہ ملا طاہر سیف الدین صاحب ہیں اُنھوں نے "ضوء نور الحق المبین" کے نام سے ایک کتاب عربی زبان میں تصنیف فرمائی ہے اور اُس میں خدا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نعوذ باللہ توہین کی اور تمام فرق اسلام کے خلاف سخت زہر اُگلا ہے۔ قومی اخبارات و رسائل عمومًا نکالے تو اس دعوے کے ساتھ جاتے ہیں کہ اُنکے ذریعہ سے قوم و ملک کی خدمت منظور ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ بعض مستثنیات کو چھوڑ کر ایک بڑا حصہ اخبارات و رسائل کا محض اُن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جو حصول معاش کی تمام کوششوں میں ناکام رہنے کے بعد اس غریب پرور دروازہ پر آ بیٹھتے اور اپنی تن آسانیوں کی خاطر ملک و ملت کا نام لیکر بد اخلاقیوں کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں، مذہبی مناظروں اور سیاسی مجادلوں کی گرم بازاری میں تو خیر اخفیں اصحاب کا بڑا حصہ تھا ہی مگر اب روز بروز نئے نئے دروازے اِن بندگانِ غرض کے لیے کھُلتے جاتے ہیں۔

سریا وا صاحب کا یہ مضمون چند اخبارات کے سوا تقریبًا شمالی ہند کے اکثر اخبارات و رسائل میں شایع ہوا اور ہمیں ذاتی طور پر اس بات کا علم ہو گیا ہے کہ جن اخبارات و رسائل نے اس مضمون کو شایع کیا، اسکی حمایت میں نوٹ اور مضامین لکھے اُنھوں ... نہایت معقول تجارت کرلی۔ تجارت بُری شے نہیں ہے، لیکن جو اخبا ... سوس کیے بغیر محض چند سکوں کے معاوضہ میں اس فتنہ کی پرورش کر ... میں ہم سے بہتر طریقہ پر بتا سکتا ہے کہ یہ تجارت ہے یا کیا؟

سر یاوا صاحب کا زور ختم ہوا تو ملا صاحب کے ارادتمندوں کی طرف سے اُنکی تردید اسی دم خم کے ساتھ شروع ہوئی - اور اُنھوں نے ایک طرف تو بعض ایسے اخبارات ہی کو توڑ لیا جو سر یاوا صاحب کی زرپاشیوں سے کافی طور پر مستفید ہو چکے تھے حتیٰ کہ اُن میں سے چند نے اپنی رجعت اور احمق بنائے جانے کا بانگ دُہل اعتراف کرنا شروع کر دیا ہے اور دوسری طرف کسی مخلص زر سے شمیمۃ الاخلاص کے نام سے ایک رسالہ لکھواکر کثیر تعداد میں شایع کیا -

رد عمل کی یہ کوششیں ختم نہ ہوئی تھیں کہ بمبئی کے زر و نقرہ نے دہلی کی منٹ سے ایک نیا سکہ "سیف بردین" ڈھلواکر ملک میں رائج کرادیا - اس رسالہ میں علما و فضلا، شاعر و ادیب، مصلح اور معلم، غرضکہ ہر طبقہ کے نمایندوں اور لیڈروں کے فتاویٰ کی صف بندی کرکے سر یاوا صاحب نے جو فساد برپا کیا تھا اُسکی حمایت کا سامان جمع کیا گیا - بیان کیا جاتا ہے کہ حکومت دہلی نے اس پمفلٹ کو پریس ایکٹ کے رو سے ضبط کرکے پوری طرح شایع نہیں ہونے دیا - لیکن جو لوگ فریقین کو اُلو بنا کر اپنی جیبیں بھر رہے تھے اُنکی تشفی کے لیے یہ کافی نہ تھا لہذا جو نسخے اس رسالہ کے شایع ہو چکے تھے اُنکی تردید کے لیے اب تک کاغذ اور سیاہی فراوانی کے ساتھ بہائی اور تاجران بمبئی کی دولت اس مٹی کی آڑ میں اُڑائی جا رہی ہے - چنانچہ کچھ دنوں پہلے خاص لکھنؤ سے ایک رسالہ اسی نوعیت کا شایع ہوا تھا - مطبع عالم افروز بمبئی نے اسکے بعد "آئینۂ صداقت" دکھایا اور اب ایک پمفلٹ "سیف الدین علیٰ رؤس المعتدین" میرٹھ سے وصول ہوا ہے -

ہم نہیں جانتے کہ یہ حماقتیں اور یہ فضول خرچیاں کب تک جاری رہیں گی، لیکن بلا لحاظ اسکے کہ جن بندگانِ زر کو اِن ذرائع سے کافی مالی منفعت پہونچ رہی ہے وہ ہمیں بیشمار گالیاں دیں گے ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ملا طاہر سیف الدین کے ارادت کیشوں اور اُنکے فریق مخالف، دونوں کو آگاہ کر دیں کہ آپ دونوں کو اس جنگ زرگری سے کوئی نفع پہونچنے کی تو بظاہر امید نہیں، البتہ آپ کے پاس جو فاضل روپیہ ہے وہ ضرور اس حماقت میں آپ کی جیب سے نکل کر اُن لوگوں کے ہاتھوں میں پہونچ جائے گا جو آپ دونوں میں سے کسی کے دوست نہیں، بلکہ آپ کے روپیہ کے دشمن اور اس قسم کی ڈاکہ زنی میں کافی مہارت رکھتے ہیں آپ دونوں اگر گانٹھ کے پورے ہیں تو ویسے ہی بدبختی سے عقل کے کورے بھی ہیں -

ہمیں نہایت افسوس معلوم ہوتا ہے کہ اس بحث میں ڈاکٹر اقبال اور مسٹر عبد الماجد جیسے

ذم کے ایہ تانہ افراد بھی شریک کر لیے گئے ہیں اور اسکی تمام تر ذمہ داری جہاں تک ہمیں علم ہے خواجہ حسن نظامی صاحب کے سر ہے۔

ملا طاہر سیف الدین کے حامیتیوں نے جو تردیدی رسائل شایع کیے ہیں اُنکی حقیقت و نوعیت سے ہم ناواقف نہیں، اور اگر اُن میں خواجہ صاحب کا نام صاف صاف نہ لکھا ہوتا تب بھی ہمیں یہ باور کرنے کے کافی وجوہ موجود تھے کہ خواجہ صاحب بھی اس تجارتی کوٹھی کے شرکاء میں داخل ہیں۔

جب سے خواجہ صاحب کتابوں اور دواؤں کی تجارت میں باقاعدہ طور پر منہمک ہیں ہمیں توقع تھی کہ اس ذریعہ سے جو آمدنی اُنکو ہوجاتی ہوگی اس پر وہ اکتفا کریں گے۔ بلکہ ہم اُمیدوار تھے کہ وہ کسب حلال کے ان وسائل کی موجودگی میں اپنے کمالات تصوف و روحانیت کی نمائش کو بھی رفتہ رفتہ چھوڑ دیں گے لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب

قناعت میں عیب را کیمیاست

کے فلسفہ پر یقین نہیں رکھتے۔ ورنہ اس گندے کاروبار سے اپنا دامن آلودہ نہ ہونے دیتے"۔ ....

اقتباسات بالا سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ باوجودیکہ ہمیں خواجہ صاحب سے وہ قرب مکانی حاصل نہ تھا جسکی بدولت ہم اُنکے نہاں خانۂ خلوت کے "کاریگری" کا براۓ العین مشاہدہ کرکے پبلک کو بر وقت اُنکے کارناموں سے آگاہ کر سکتے، پھر بھی اُنکی خطرناک روش کو سمجھنے اور اُس سے موقع موقع متنبہ کرکے پبلک کو اس جال میں پھنسنے سے بچانے کی برابر کوشش کرتے رہے۔ اور جو ولے ہم نے اس قدر دور بیٹھ کر اور محض اُنکی تحریری کھیلوں اور کاغذی کھلونوں کو دیکھ کر قائم کی تھی تجربہ نے بخوبی اسکی صحت و صداقت ظاہر کر دی ہے۔ اگر مولانا محمد علی صاحب اور دہلی کے دوسرے وہ اصحاب جنھیں اُن سے قرب حاصل ہونے کی وجہ سے اُنکے حالات کا زیادہ صحیح علم ہو سکتا تھا ابتدا ہی میں اس فتنہ کو دبانے کی کوشش کرتے تو مسلمانوں کو اُنکی مقدس ڈاکہ زنی سے کب کی نجات مل گئی ہوتی۔

ملک میں اور خاص دہلی میں ایسے متعدد "ڈاکو" موجود ہیں جنکے ساتھ مروت و نیاب سلوک اگر روا نہ رکھا جائے تو اُنکی زہریلی زندگی کا نشو و نما ہزار پریشانی دنیا ہی کا موجب نہ بننے پائے۔

ظفر الملک
۱۳ - دسمبر ۲۶ء

پچھلے مہینے کے رسالے

دلگداز مولانا عبدالحلیم شرر کا اہم تاریخی مضمون "سلطان عالم واجد علی شاہ" ابھی تک چلا جا رہا ہے۔ سلطان عالم کے متعلق مشہور ہے کہ وہ دن رات ناچ رنگ میں مصروف رہا کرتے تھے اسکے خلاف یہ چشم دید شہادت ملاحظہ ہو:۔

"بادشاہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ناچتے تھے، مگر یہ بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ انتزاع سلطنت کے وقت بہت سی قلمی تصویریں ملک میں پھیلا دی گئیں جن میں دکھایا گیا ہے کہ وہ محلات کے غول میں کھڑے ناچتے اور بھاؤ بتا رہے ہیں، مگر مجھے خوب تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ سب وضعی اور جعلی ہیں۔ جو کچھ قیصر باغ کے میلوں کے موقع پر مشہور ہے اسکی اصلیت یہ ہے کہ بادشاہ ناچتے نہیں بلکہ کھیلتے تھے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ نہ کبھی لکھنؤ میں بعہد حکومت ناچے اور نہ کبھی مٹیا برج میں ناچے۔ یہ اور بات ہے کہ بکثرت ناچ دیکھنے اور موسیقی کے اُستاد ہونے کے باعث فن رقص میں بھی اُنھیں اتنی بصیرت حاصل ہوگئی تھی کہ جب کوئی ناچنے والی ناچ میں غلطی کرجاتی تو پلنگ پر بیٹھے بیٹھے دونوں ہاتھ اُٹھا کے بتا دیتے کہ یوں نہیں یوں۔

گانے میں البتہ کمال حاصل تھا، اگرچہ گلا اچھا نہ تھا مگر اصول موسیقی کو ایسا سمجھتے تھے کہ بڑے بڑے گویئے اُنکے سامنے کان پکڑتے۔ تاریخوں میں ہندوستان میں کئی مسلمان بادشاہ موسیقی کے کامل اُستاد بتائے گئے ہیں مگر میں نہیں سمجھتا کہ ان میں سے کسی کو بھی اتنی اعلیٰ معلومات حاصل ہوں، جتنی واجد علی شاہ کو حاصل تھیں۔ اسکا نتیجہ یہ تھا کہ ولیعہدی سے لیکر آخر عمر تک ہمیشہ بڑے بڑے مستند گویّوں کا اُنکے گرد ہجوم رہا، اور اُن کی قدردانی میں بادشاہ سے یہ افسوسناک بے اعتدالی ظاہر ہوئی کہ اُن میں سے بعض کو "دولہ" کا خطاب دے کر اُمرا و شرفا کے طبقہ میں داخل کر دیا . . . . لیکن یہ بھی بادشاہ کی قابل تعریف بات ہے کہ خطاب چاہے جیسا اعلیٰ درجے کا دیدیا ہو دربار و سرکار کی کوئی خدمت یا داروغگی کبھی کسی ڈھاڑی کو نہیں دی۔"

معارف مولانا سید سلیمان ندوی، اپنے ہر سفر سے اُردو دُنیا کے لیے ایک نیا تحفہ لاتے ہیں، اور وہ صحیح معنوں میں تحفہ ہوتا ہے۔ سفر حجاز سے لوٹ کر مولانا ممدوح نے معارف کے صفحات کے ذریعہ "حجاز کے کتبخانے" کے عنوان سے ایک دلچسپ اور قیمتی مقالہ جمہور علمی کی نذر کیا ہے۔ مکہ معظمہ کے ایک کتبخانہ کے متعلق اس مضمون سے مختصر اقتباسات ناظرین الناظر کی ضیافت نظر کے لیے درج ذیل ہیں اور اسی ضمن میں ایک غلط بیانی کی تردید بھی ہوئی جاتی ہے۔ حرم کے دو مختلف پہلوؤں میں دو سرکاری کتبخانے ہیں۔

باب السلام کے قریب، باب الزیادۃ کی طرف، مدرسۂ محمودیہ کے پاس جو کتبخانہ ہے اُسکے متعلق سید صاحب فرماتے ہیں

"حرم کی متفرق کتابیں اس میں یکجا کر دی گئی ہیں، اور کچھ قسطنطنیہ سے سلطان نے بھیجوائیں۔ بالفعل اس کتبخانہ میں میرے اندازہ کے مطابق چھ ہزار کتابیں ہونگی، ان میں مطبوعہ اور قلمی کتابیں ہیں، یہ کتابیں .... ہر علم و فن کی ہیں اور ترتیب سے کھلی الماریوں میں چنی ہیں۔ کتبخانہ کے موجودہ ناظر داغستان کے ایک عالم ہیں، جنھوں نے مصر میں تعلیم پائی ہے۔ کتبخانہ کی ایک پرانی فہرست ہے جو ایک ضخیم جلد میں ہے اور شکستہ ہو رہی ہے۔ داغستانی صاحب نے نہایت محنت اور جانفشانی سے اسکی ایک نئی فہرست ترتیب دی ہے اور ہنوز وہ تمام نہیں ہوئی کچھ حصہ زیر ترتیب ہے، شاید کہ اب تمام ہو گئی ہے۔

قلمی کتابوں میں سیکڑوں ایسی ہیں جو ابھی طبع نہیں ہوئی ہیں۔ نادر کتابیں بھی اس میں متعدد ہیں جن میں سے ایک فرقۂ ماتریدیہ کے امام ابو منصور ماتریدی کی تفسیر تاویلات القرآن ہے۔ یہ نسخہ نہایت باریک فارسی خط میں بہت بڑی تقطیع پر ایک ضخیم جلد میں ہے .... اس کتبخانہ میں ایک اور دوسری تفسیر نظم الدرر فی تناسب الای والسور کی متعدد جلدیں ہیں۔ اسکے مصنف امام برہان الدین ابراہیم بقاعی ہیں۔ اس تفسیر کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ اس میں آیتوں اور سورتوں کا باہمی ربط و نسق بیان کیا ہے ....

مکہ کے قیام کے زمانہ میں ایک ہندوستانی مہاجر عالم صاحب جو بالفعل سلطان ابن سعود کے مخالف ہیں اور روایتوں کے بیان کرنے میں نہایت بے احتیاط ہیں، اُنھوں نے مجھ سے فرمایا کہ نجدیوں نے مکہ معظمہ کے داخلہ کے وقت اس کتبخانہ سے ساٹھ آدمیوں پر یا ساٹھ اونٹوں پر لادکر کتابیں نجد بھیجوا دیں، اور فلسفہ و منطق اور امام غزالی کی سب تصنیفیں جلا ڈالیں۔ میں اس کتبخانہ کو پہلے دیکھ چکا تھا، تاہم اُنکے کہنے پر میں نے جاکر دوبارہ کتبخانہ کا جائزہ لیا تو اس میں فلسفہ، منطق، ہیئت، ریاضیات، تصوف، حتیٰ کہ رمل و جفر کی کتابیں بھی موجود پائیں۔ امام غزالی کی تصنیفات بھی موجود تھیں، اور ساٹھ آدمیوں یا اونٹوں پر اگر کتابیں منتقل کی جاتیں تو کتبخانہ کی الماریاں خالی ہوتیں۔ میں نے اسی پر بس نہیں کیا، ناظر صاحب سے دریافت کیا انھوں نے ہنسکر نئی اور پرانی فہرستیں سامنے رکھ دیں۔ میں نے اپنی تحقیق یہیں ختم نہیں کی، قاضی ابن بلیہد صاحب جو قاضی القضاۃ ہیں اور جن سے ان چیزوں کا تعلق ہے، اُن سے جاکر پوچھا کہ یہ افواہ ہے، اس میں کہاں تک صداقت ہے، انھوں نے نہایت غصہ سے اسکی تردید کی اور کہا بحمد اللہ ہم اہل نجد کو کتابوں کی حاجت نہیں ہمارے ملک میں سب کتابیں موجود ہیں ......

وفد خدام الحرمین کی رپورٹ میں اسی سرکاری کتبخانہ کے ذکر میں بیان کیا گیا ہے کہ انکو عینی شہادت ملی ہے کہ اس کتبخانہ کی فقہ و تصوف، فلسفہ .. کتابیں جلا ڈالی ہیں، یہ قطعی غلط اور کذب محض ہے، اور کتبخانہ میں آج بھ ... ندمذکور کی سنی ہوئی عینی شہادت کی تکذیب کرنے کو تیار رہے اور ہند ... لے دیکھنے والے

موجود ہوں گے۔

"حملہ معترضہ تھا جو اس لیے لکھا گیا تاکہ اسلام کا کوئی آیندہ مخالف مورخ اس واقعہ کو دوسرا کتب خانۂ اسکندریہ نہ بنا دے"

زمانہ ستمبر کے زمانہ میں مسٹر علی عباس حسینی نے مرزا غالب کو جس محبت کے ساتھ مذہب اثنا عشری کا پیرو ثابت کر دیا، اسکا حوالہ الناظر کے پچھلے نمبر میں دیا جا چکا ہے۔ اس مہینے کے زمانہ میں سید عاشق علی صاحب نے مسٹر عباس کے نتیجہ کے خلاف شہادتیں پیش کی ہیں۔ اب شاید مسٹر عباس کو اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرنا پڑے۔ ملاحظہ ہو:—

"ہر صبح کو حامد علی خاں کی مسجد میں جا کر جناب مولوی جعفر علی صاحب سے قرآن سنتا ہوں شب کو جامع مسجد جا کر نماز تراویح پڑھتا ہوں" (مکتوب بنام میر مہدی مجروح)

"... میاں نصیر الدین اولاد میں سے ہیں شاہ محمد اعظم کے، وہ خلیفہ تھے مولوی فخر الدین صاحب کے اور میں مرید ہوں اس خاندان کا" (مکتوب بنام میر مہدی مجروح)

"... غالب چشتی نظامی تھے شیعہ نہ تھے، اگر شیعہ ہوتے تو علی گنج شاہ مرداں کے قبرستان میں دفن ہوتے، جہاں اس وقت کے تمام شیعہ امرا دفن ہوتے تھے اور اب بھی ہوتے ہیں.....

انکی قبر بھی سنّی طریقہ کی بنائی گئی ہے یعنی اسپر اونچا، اونٹ کے کوہان کی شکل کا خشتی تعویذ بنایا گیا ہے۔ شیعوں کی قبریں زمین کے برابر ہوتی ہیں" (غالب کا روزنامچہ، مرتبۂ حسن نظامی)

"... لہذا کوئی گنجائش نظر بحالات و دلائل سندیۂ بالا شک وشبہ کی باقی نہیں رہتی جس سے غالب کو شیعہ کہا جا سکے۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ غالب کو حقیقی اور سچی محبت واہلبیت اطہار سے تھی۔ سیاسی محبت نہ تھی۔ اور یہی طریقہ وعقیدہ سنیوں کا ہے۔"

ہمایوں اکتوبر کے ہمایوں میں مولوی محمد حامد دہلوی نے "ہندوستان کی پیکر نگاری" کے تحت میں مشرقی اور مغربی مصوری کے اہم اختلافات بیان کیے ہیں۔ اسے پڑھکر مشرقی اور مغربی صناعی کے نمونوں کو غور سے دیکھیے۔ شاید کچھ بصیرت حاصل ہو:—

"(۱) مغربی تصویر میں مختلف رنگوں کی دلکش آمیزش، نیز سایہ وروشنی کی صنعت قابل قدر ہے

(۲) مغربی مصور، سطح تصویر کی دلچسپ رنگ آمیزی نیز اشکال مختلفہ کے اجتماع سے حیرت انگیز اور دل لبھانیوالا نظارہ پیدا کرتا ہے اور اپنی مجموعی تصویر کی متفرق اشیا بعینہ انھیں موقع پر دکھاتا ہے جو ناظر کے خاص زاویۂ نگاہ میں نظر آتی ہے۔

(۳) مغربی تصویر میں مناظر کی حد بندی خطوط سے نہیں کی جاتی، حدود کی نسبت صرف قیاس قائم کر لیا جاتا ہے۔

(۱) برخلاف مغرب، مشرقی تصویر کی خوبی صحیح، سجل اور باریک خطوط کے وسیلہ سے

مجسم اشیاء کا اظہار کرنا ہے۔ دنیا کے مبصر ہم زباں ہیں کہ مشرقی مصور باریک خطوط کی کشش اور رنگکاری میں یکتائے روزگار ہے۔

(۲) مشرقی مصور شبیہ کو خاص مدرسیہ طریقہ کی پیروی میں بناتا ہے

(۳) ہندوستان کی تصویر کام کی تازگی، نقوش کی صفائی، خطوط کی باریکی، اثبات دست اور دیگر برگزیدہ صفات میں بے مثل ہے"۔

جامعہ

مسٹر برٹرانڈ رسل کی قابل دید کتاب" مسئلۂ چین" کے ایک باب کا ترجمہ اس ماہ کے جامعہ میں شایع ہوا ہے۔ یورپ کا بہترین دماغ چین کی امن پسندی کی داد ان الفاظ میں دیتا ہے:۔

" اگرچہ چین بہت سی جنگوں کا معرکہ گاہ رہا ہے، لیکن چینی قوم کی طبعی افتاد مزاج بہت ہی امن پسند واقع ہوئی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ دنیا میں کوئی اور قوم ایسی ہے جسکا شاعر چینی شاعر پوچوئی کی طرح اپنی ایک نظم (بازو شکستہ مرد ضعیف) کا موضوع اور ہیرو ایک ایسے نو آموز فوجی سپاہی کو بناتا جسنے فوجی ملازمت سے گریز و گلو خلاصی حاصل کرنے کے لیے اپنے کو بے دست و پا کر لیا تھا۔ انکی اس امن پسندی کا راز انکے مفکرانہ مذاق طبیعت میں ہے۔ نیز اس میں اُنکے مزاج کی اس خصوصیت کو بھی دخل ہے کہ وہ قدرتی صورت حالات میں کوئی تغیر و تصرف کرنے کی خواہش نہیں رکھتے۔ .... وہ کہتے ہیں کہ جب تم بہترین چیزوں سے لطف اندوز ہو رہے ہو تو پھر اس کے بعد بھی ترقی کی تلاش میں لب تشنہ رہنے کی کیا ضرورت ہے؟ پہلی نظر میں دیکھنے سے ایک یورپین کو اس زاویۂ نگاہ میں ضرورت سے زیادہ کاہل الوجودی معلوم ہوتی ہے، لیکن رفتہ رفتہ جبکہ عقل و دانش میں ترقی ہوتی جاتی ہے تو اُسکو اپنے خیال کے متعلق شکوک لاحق ہوتے جاتے ہیں اور وہ خیال کرنے لگتا ہے کہ جس چیز کو ہم" ترقی" کہتے ہیں اُسکا غالب عنصر ایک بیچین قسم کی تغیر پسندی ہے جو ہم کو کسی مستحسن قسم کی منزل مقصود سے کچھ بھی قریب نہیں کرتی"۔

نیرنگ خیال

جناب سید حسن برنی نے" مسلمان عورتیں اور نیا زمانہ" کے عنوان سے نیرنگ خیال میں فرینچ مستشرق موسیو کراٹ دو کی ضخیم کتاب" محققین اسلام" کے ایک باب کا ترجمہ پیش کیا ہے۔ ترک عورتوں کے متعلق تو آپ بہت کچھ سُن چکے ہیں۔ بعض دوسرے اسلامی ممالک کی عورتوں کے کچھ حالات حاضر ہیں۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ مصنف یوروپی نقطۂ نظر پیش کر رہا ہے۔

" تاتاریوں نے عورتوں کی آزادی میں ترکوں سے بہت بڑھکر حصہ ا ... کریمیا میں عورتوں کو ووٹ دینے کا حق ہے۔ علاقہ قاف میں مدارس نسواں کھلے ... ، ہوتی ہیں اور انتخابوں کی تیاری میں عورتیں حصہ لیتی ہیں۔ علاقہ ما ... نے اپنا اتحاد قائم کرکے کانگرس منعقد کی اور ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۲ء میں، ... سیا کی عورتیں بھی آزادی پا چکی ہیں اور نقاب ترک کر چکی ہیں .... یہ ماننا پڑ ... لہ اکثر سرکیشیا کی عورتوں

میں بھی ناچ کا ایسا ہی شوق بڑھا ہوا ہے جیسا کہ اُنکی پیرس کی بہنوں کا تو واعظین کا یہ قول بالکل درست ہے۔ سرکیشیا کی عورتیں تعدد ازدواج کے خلاف ہیں، اس بات کو تسلیم نہیں کرتیں کہ کم عمر بچوں کی شادی کا کسی کو حق ہے۔ اُنکی خواہش ہے کہ شادی کے معاملہ میں انتخاب کی آزادی ہونی چاہیے۔ کرغز کے علاقہ میں تعدد ازدواج کے خلاف حال ہی میں ایک ڈگری ہوئی ہے.....

مصر کی بھی یہی حالت ہے اور وہاں پر اسکا بہت کچھ اظہار ہوا ہے۔ مصر کے سرکاری طبقہ میں اکثر امیرزادیاں، اور خواتین یورپ میں سیاحت کرتی ہیں اور آزادی سے یورپین طرز معاشرت کے ساتھ بسر کرتی ہیں۔ سلطان مصر کی والدہ ملکہ معظم کے ساتھ طوطن آمون کا مقبرہ دیکھنے گئی تھیں۔ سلطان مصر نے سنہ ۱۹۲۲ء میں ایک خاص نشان امتیاز قائم کیا ہے جو صرف عورتوں کے لیے ہے۔

شمالی افریقہ میں بہت سی خواتین موجود ہیں جو ہمارے ادب سے پورے طور پر مس رکھتی ہیں۔ کبھی کبھی وہ ہمارے ملکوں میں سفر کرتی ہیں اور یورپین مستورات کے طریق پر لباس پہنتی اور زندگی بسر کرتی ہیں۔ اپنے ملک میں واپس ہونے پر وہ اپنا قومی لباس پہن لیتی اور اپنے خاندان کے طرز معاشرت کو پھر اختیار کر لیتی ہیں۔ انھیں اپنی فرانسیسی بہنوں کی آزادی اور خوش وقتی پر کسی قدر رشک آتا ہے۔"

سہیل

انجمن اُردوے معلٰی علی گڈھ کے قابل قدر سہ ماہی رسالہ سہیل کا ستمبر نمبر، نومبر میں شایع ہوا ہے، مگر اتنی تاخیر ہو جانے پر بھی ہم سہیل کو اس بزم سے غیر حاضر نہیں کرنا چاہتے۔ اس میں سید محی الدین قادری کا ایک قابل دید مضمون "اُردو کے اسالیب بیان" شایع ہوا ہے۔ ایک جگہ مولانا نیاز فتحپوری کے اسلوب بیان پر یوں تنقید فرمائی ہے:-

"مولانا نیاز فتحپوری کے اسلوب میں بھی نامانوس الفاظ اور عجیب وغریب ترکیبوں کی وجہ سے کہیں کہیں ابو الکلام کا رنگ جھلک پڑتا ہے۔ مولانا ابو الکلام کا موضوع مذہب اور حضرت نیاز کا ادبیات، اسلیے موخرالذکر کی تحریروں میں رنگینی اور شوخی جگہ جگہ نمودار ہو جاتی ہے۔ مولانا ابو الکلام کو باوجود اپنے نطری بانکپن کے سنجیدگی ضرور قائم رکھنا پڑتی ہے۔ نیاز ایک کامل فن ہونے کی حیثیت سے آزاد ہیں۔ وہ اپنے اسلوب میں جس قدر چاہیں رعنائی پیدا کر سکتے ہیں اور یہ رعنائی جس قدر بڑھی ہوئی ہوگی اُنکی ادبی شان میں اُتنا ہی اضافہ ہوگا۔ مولانا ابو الکلام کے بہ نسبت حضرت نیاز کا دائرۂ عمل زیادہ وسیع ہے۔ ادبیات اُردو کا ہر طالب علم نیاز کی تحریروں کی طرف نظر شوق کے ساتھ بڑھتا ہے۔ اور انکے مطالعہ کے بعد کسی نہ کسی طرح متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ یہی وہ امر ہے جسکو مد نظر رکھتے ہوئے نیاز کی عجیب وغریب ترکیبوں اور نامانوس الفاظ سے خوف ہے کہ کہیں وہ اُردو اسلوب بیان کے لیے مضر نہ ثابت ہوں۔ آجکل اُردو کے دلدادہ اپنی انشاپردازی کو اکثر حضرت نیاز کے اسلوب کی پیروی کے ساتھ شروع کرتے ہیں،..... اور لطف یہ کہ مضمون نگار حضرت نیاز کی طرح خود بھی نئے نئے

الفاظ ایجاد کرنے کے متمنی رہتے ہیں اور اس کوشش میں وہ اور بھی راہِ راست سے دُور جا پڑتے ہیں - اس کا اصلی سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آجکل عربی میں مہارت تامہ حاصل کرنے کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے اور عربی زبان سے واقفیت حاصل کیے بغیر اس قسم کی "جرأتِ رندانہ" یقیناً "ایجاد بندہ" سے کم نہیں ہو سکتی ۔

اسی پرچہ میں پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنے مخصوص انداز سے " اُردو شعر و شاعری پر ایک نظر" ڈالی ہے شعر و شاعری پر نظر ڈالتے ہوئے شاعر کا جائزہ لیتے ہیں اور اپنے بیان کو ان الفاظ میں سپردِ قلم فرماتے ہیں:

" بعض لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ محض مقررہ اصول کے ماتحت خیالات کو موزوں کر دینا شاعری ہے - کچھ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ محض الفاظ اور جملوں کو مقررہ اوزان میں ترتیب دینا شاعری ہے - کچھ لوگ اور ہیں جو اسکے قائل ہیں کہ دل میں جو خیال آئے اُسکو من وعن بیان کر دینا شاعری ہے - ان میں کوئی ایسا نہیں ہے جو ترتیب خیال یا کلام میں اپنی انفرادی اور مخصوص حیثیت کو داخل کرنا ضروری سمجھتا ہو ۔ ۔ ۔ پہلی اور دوسری جماعت کے لوگ تو مسلمہ طور پر لکیر کے فقیر ہیں - انکے متعلق کچھ کہنا بھی بیکار ہے - اور انکا کلام ریلوے سینا (دہلی) کی سرکاری عمارات ہیں جو اس درجہ یکساں اور سپاٹ واقع ہوئی ہیں کہ انکی امتیازی خصوصیت صرف انکی کثرت تعداد ہے ۔۔۔۔ تیسری جماعت یہ سمجھتی ہے کہ جو کچھ دل میں آئے وہ زبان پر نہ آ سکے تو نہ آئے، مگر اُسے "صفحہ قرطاس" پر ضرور آنا چاہیے - یہی کمال انشا پردازی ہے جسمیں تغیر و تبدل کرنے سے آرٹ کا خون ہوتا ہے - ان بزرگوں کے نزدیک انکی ہر لغزش یا برہنگی کا جواز آرٹ میں مل سکتا ہے - انکے نزدیک دو اور دو کہنا بھی آرٹ ہے اور دو اور دو چار سو کہنا بھی آرٹ، اپنی کمزوریاں بھی آرٹ، اور دوسروں کی بیویاں بھی آرٹ - غرضکہ آپ کسی بے تکے پن کو آرٹ بنا سکتے ہیں بشرطیکہ آپ اپنی زبان و قلم، لب و لہجہ، صورت شکل، یا قول و فعل کو علی الرغم تعزیرات ہند یا ایڈیٹر پنچ برسر کار لا سکیں! بالفاظ دیگر بنفس نفیس آرٹ بن جائیں! "

رسید کتب

۱-	نفسیات ترغیب	پروفیسر د ہ ج الہ	۔۔مع کردہ دار المصنفین اعظم گڈھ
۲-	اقتباسات سیرۃ النبی	پروفیسر	۔ٹرنیڈیٹ کالج
۳-	براڈننگ	سید وقار احمد	۔ت منزل حیدرآباد
۴-	آئین اُردو	مولوی زین العابدین	رباد کوتانوی - میرٹھ

تنقیدیں

التربیۃ الاستقلالیہ

مترجمہ مولوی عبدالسلام ندوی - حجم ۲۰۸ صفحے - مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڈھ - ملنے کا پتہ : دفتر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ قیمت ۸؍

ہندوستان میں اولاد کی تربیت کی طرف سے بہت بے توجہی برتی جاتی ہے اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ہماری مذہبی، اخلاقی، اور معاشرتی پستی کی اصلی وجہ یہی بے توجہی ہے - مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے ملک میں تربیت اولاد کی اہمیت کا احساس پیدا کرنے کے لیے کچھ لٹریچر شایع کیا ہے - اسی ضمن میں یہ کتاب بھی آئی ہے -

اصل کتاب فرانسیسی زبان میں الفونس اگردس نے لکھی تھی، شیخ عبدالعزیز آفندی محمد قاضی محاکم الہلیہ مصر نے اسے عربی میں ترجمہ کیا، اور مولوی عبدالسلام ندوی نے اسکے ضروری حصوں کو اُردو لباس پہنا کر شایع کیا ہے - یہ کتاب افسانے کے طور پر لکھی گئی تھی - ڈاکٹر ارسم کسی سیاسی جرم میں گرفتار ہوکر ایک طویل زمانے کے لیے اپنی بیوی سے جدا ہوگیا ہے، جسکی گود میں ایک بچہ ہے، اور اُس بچہ کی تعلیم و تربیت کے متعلق جیل کے اندر سے میاں بیوی کے درمیان خط وکتابت ہوتی ہے - مولوی عبدالسلام صاحب نے خطوط کو اخذ کرکے فسانہ کو خارج کردیا - گویا فسانے کا ترجمہ اُنکی شان کے خلاف تھا - مگر واقعہ یہ ہے کہ اس ادبی جراحی کی بدولت کتاب کی دلچسپی میں کمی ہوگئی ہے - بہرحال زمانہ حمل سے عہد شباب تک لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے بہترین اصول جمع کردیے گئے ہیں جنسے بچوں میں آزادی اور استقلال کی روح پیدا ہو اور جبراً تقلید کی عادتیں اُن میں نہ پیدا ہوں - الفونس سن تمیز سے پہلے مذہبی تعلیمات و تلقینات کو بھی ضروری نہیں قرار دیتا - یہ خیال شاید مشرقی دُنیا میں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے، مگر اسکے علاوہ پوری کتاب کا ایک ایک لفظ اس قابل ہے کہ اُسکو بار بار پڑھا جائے - شروع میں مترجم موصوف نے تعلیم قدیم و تعلیم جدید کے اختلافات پر ۹۶ صفحے کا پُرمغز اور مفید مضمون بطور مقدمہ شامل کردیا ہے - جسکے مطالعہ سے کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کے عہد عروج میں جو عظیم الشان علمی ترقیاں ہوئیں یا جیسے پاکیزہ سیرۃ لوگ پیدا ہوئے وہ کس طریقۂ تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا - چودھویں صدی میں اگر اُن طریقوں کا اتباع کامل دشوار و محال ہو تو کبھی کبھی اُس زمانہ کے حالات و خصوصیات پر تو نظر کرلینا چاہیے تاکہ اپنے اولوالعزم اور مایہ دار اسلاف کی یاد سے موجودہ تغیر شدہ حالات میں بھی کچھ نہ کچھ مدد مل سکے۔

بادۂ ناب

مصنفۂ میر ولی اللہ وکیل ایبٹ آباد - ضخامت ۲۵ صفحے - قیمت ایک روپیہ - مصنف سے مل سکتی ہے - طباعت وکتابت نہایت دیدہ زیب -

یہ کتاب مولوی ولی اللہ صاحب کی فارسی رباعیات کا مجموعہ ہے - شروع میں چودھری محمد علیخاں وکیل ایبٹ آباد کے قلم سے ایک دیباچہ ہے - میر صاحب نے حسن وعشق اور گل وبلبل کے نقشوں کو چھوڑ کر اپنے قیمتی خیالات کو سادہ لباس پہنایا ہے - ان رباعیات میں مسلمانوں کو یہ ترغیب دی گئی ہے کہ

پھر اپنے اصلی مذہب کی طرف رجوع کریں۔ اور قرآن کریم کے سادہ اصول کی پابندی کریں :-

تیرہ شب کفر صبح ایماں روشن تاریک رہِ فلسفہ قرآں روشن
باید کہ غلام شہِ یثرب نہ کند کاشانہ دل بشمع یوناں روشن

مغربی تہذیب اُن کا خیال ہے کہ روحانیت کو تباہ کر دیتی ہے۔ اس لیے جگہ جگہ اُس سے احتراز کی تعلیم دی ہے :

مرو بیہودہ پیشِ بیکن و ہل چہ حاصل باشارت ہای سعیِ باطل
میاموز حکمت از یونان و فاراب چراغِ راہِ خود خود باش ایدل

زیادہ تر میر صاحب کے کلام پر اقبال اور اکبر کا رنگ چڑھا ہوا ہے مگر سادگی بیان بالکل اور یجنل ہے۔ ان رباعیات میں شاعرانہ صنائع و بدائع نہیں ہیں لیکن مسلمانوں کے اخلاقی، معاشرتی اور روحانی امراض کا علاج ضرور ہے۔

رپورٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اڑتیسویں[۳۸] اجلاس منعقدہ ۲۶-۲۷ دسمبر ۲۵ء بمقام علی گڈھ کی رپورٹ پیش نظر ہے۔ خطبۂ صدارت میں بجائے پُر شکوہ الفاظ کے کچھ کارآمد تجویزیں پیش کی گئی ہیں۔ جناب صدر نے تجارتی او صنعتی تعلیم پر خاص زور دیا ہے۔ اور بچوں کی اخلاقی تربیت پر مفید مشورہ دیا ہے۔ اُنھوں نے صاف صاف کہدیا کہ اسلامی درس گاہیں اس لیے قائم کی جاتی ہیں کہ نئی پود کی تہذیب اخلاق کا بھی سامان کیا جائے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان اسلامی درسگاہوں کی پیداوار بھی دوسرے طالب علموں سے بہتر اخلاق کے ساتھ آراستہ نہیں ہوتی۔ اسی ضمن میں مذہبی تعلیم کی ناگفتہ حالت کا کھُلے کھُلے الفاظ میں اظہار کر دیا ہے کاش مسلم یونیورسٹی ان الفاظ کی روشنی میں اپنی حالت کا جائزہ لیتی!

اسکے بعد سکرٹری کی سالانہ رپورٹ ہے۔ کانفرنس کی علمی خدمات میں تعلیمی وظائف اور تعلیمی لٹریچر کی اشاعت خاص طور پر قابل مبارکباد ہے۔ گو مسلمانوں کی حالت کو بہتر بنانے کے سے کافی نہیں کہا جاسکتا۔ ممالک متحدہ کی تعلیمی رپورٹ میں سوائے گورنمنٹ سے خط و کتابت کرنے کے اور کچھ نہیں۔ مگر ممالک متحدہ کی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ایک طویل نوم کے بعد جاگی ہے۔ آیندہ کچھ مفید خدمات کی امید کی جاسکتی ہے۔ اسکے بعد کفایت شعاری اور مسلم یونیورسٹی اور ٹکنیکل تعلیم پر دو مفید و پُر از معلومات لکچر ہیں۔ اس اجلاس کی اہم تجویزیں حسب ذیل ہیں :

ترقی تعلیم کے لیے کواپریٹو سوسائیٹوں کا قیام۔ مسلم یونیورسٹی ... ابتدائی تعلیم کو مفت و جبریہ کرنا۔

ان تجویزوں کی تعمیل کے لیے "سلطان جہاں منزل" اور مسلم یو... میں لگی ہوئی ہیں۔

ندائے روح مترجمہ پنڈت پربھو دیال عاشق لکھنوی۔ ضخامت ۱۱۵ صفحے۔ قیمت ۸؍ ملنے کا پتہ نولکشور پریس بکڈپو لکھنؤ یا سری مصر آشرم چھپاؤنی نیمچ (صوبہ متوسط)

بھگوت گیتا ہندو فلسفۂ روحانیت پر سب سے مشہور کتاب ہے۔ یورپ اور ایشیا کی اکثر زبانوں میں اسکے ترجمے ہو چکے ہیں۔ اُردو میں بھی اسکے ایک سے زائد ترجمے موجود ہیں۔ غذائے روح بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ ہے۔ نظم میں روانی کی کمی ہے لیکن لفظی ترجمہ کا یہ لازمہ ہے۔ اس نظم کے مطالعہ سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ اگر اُردو کو ہندی الفاظ سے پاک رکھنے کی کوشش کی گئی تو پھر ہندوؤں کا رہا سہا تعلق بھی منقطع ہو جائیگا۔ شروع میں ایک بسیط دیباچہ ہے جس سے نظم کے سمجھنے میں مدد ملیگی۔ آخر میں غیر مانوس سنسکرت الفاظ کے تلفظ اور معنی درج کر دیے گئے ہیں۔ اور کتاب میں جا بجا تصویریں بھی شامل کر دی گئی ہیں۔ مصنف صاحب اپنی جانفشانی پر مبارکباد کے مستحق ہیں مگر فلسفہ کی کتابوں کا لطف ترجمہ اور پھر منظوم ترجمہ میں کہاں ممکن ہے!

فتنۂ خلق قرآن

مترجمہ ملک ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی۔ حجم ۹۸ صفحے۔ ملنے کا پتہ: منیجر گلے زئی، سوہدرہ گوجرانوالہ۔

اسلام کے اُس پُر آشوب زمانہ میں جبکہ خلیفہ مامون الرشید نے معتزلہ کی طلاقت لسانی کے فریب میں آکر مسئلۂ خلق قرآن کو گویا بطور قانون نافذ کر دیا تھا۔ امام عبد العزیز سرکعب مکہ شریف سے بغداد پہونچے اور فتنۂ خلق قرآن کی پُر زور مخالفت فرمائی۔ اُسی زمانہ میں آپ نے اس مسئلہ پر کتاب الحیدہ بھی تصنیف فرمائی جسکا اُردو ترجمہ آج پیش نظر ہے۔ مغربی تعلیم اور عیسائی مشنریوں کے اثر سے اس وقت نئے تعلیم یافتہ گروہ میں جو کچھ شکوک پیدا ہو رہے ہیں۔ انکے لیے اس کتاب کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔

قادیانی نبی

مولفۂ مولوی لیاقت اللہ خاں۔ حجم ۲۸ صفحے۔ مولف سے کشمیری محلہ، شملہ کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

اس رسالہ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے اقوال و الہامات آپس میں متضاد اور مختلف ہیں، لہذا اُن کا کلام الہام نہیں اور وہ خدا کے فرستادہ نہیں۔ بعض اقوال سے یہ بھی ظاہر ہے کہ مرزا صاحب دروغگوئی اور توہین انبیاء کرام کے مرتکب ہوئے ہیں۔ کتاب میں کسی قسم کی بحث نہیں کی گئی ہے صرف وہ اقوال درج کر دیے گئے ہیں جنسے مذکورۂ بالا نتائج نکلتے ہیں۔

مصباح القوافی

مصنفۂ مولوی سید محمد نقوی۔ چھوٹی تقطیع کے سولہ صفحوں پر ۲ میں مصنف سے (دیوان خانہ سرسی ضلع مرادآباد) طلب فرمائیے۔

جناب مصنف نے ۶۸ اشعار میں تمام القاب حروف و حرکات قافیہ اور اُن سب کی تعریفات نظم کر دی ہیں۔ طلبا کے لیے مفید ہو سکتی ہے۔ نظم مجبوراً بہت ثقیل ہو گئی ہے۔

میلاد نبیؐ

مولفہ مولوی سید نذیر علی ثاقب پانی پتی۔ ضخامت پاکٹ سائز کے ۲۲۴ صفحے۔ ملنے کا پتہ سید نذیر علی، وکیل راجگڈھ (بیکانیر)

اس کتاب میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مختصر حالات درج کیے گئے ہیں۔ مگر سوانح رسول مقدس

مختصر ہیں کہ شاید محفل میلاد میں بھی پڑھنے کے لیے ناکافی ہوں۔ البتہ پیشہ ور میلاد خوانوں کے لیے دلچسپ ترانوں کا اچھا ذخیرہ فراہم کر دیا گیا ہے۔

نغمہ اور اسلام مولفۂ مولوی محمد علی شاہ میکش۔ حجم ۷۴ صفحے۔ قیمت ۱۲/ر

اس رسالہ میں مولف موصوف نے ساز اور سماع محضہ کے جواز پر بہت سے دلائل جمع کر دیے ہیں۔ اس مسئلہ پر اتنی بحث ہو چکی ہے کہ موافق اور مخالف تمام دلائل پبلک کے سامنے پیش ہو چکی ہیں اور ہر فرد اپنی رائے قائم کرنے کے لیے آزاد ہے۔ اسلیے اب اس پر خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔ شروع میں "اعتذار" کے عنوان سے مولف نے اپنی علالت کا حال بیان کیا ہے (؟) اور اسے ادبی فرو گذاشتوں کا سبب قرار دیا ہے۔ شاید پڑھنے والوں کو اس حصہ سے بھی دلچسپی ہو!

تواریخ وصال مولفۂ شاہ غلام جیلانی رزاقی بانسوی۔ مطبوعہ احمد المطابع کانپور۔ غالباً سید ممتاز احمد صاحب سجادہ نشین بانسہ شریف سے ۳/ر میں مل سکتی ہے

اس میں مشاہیر اولیاء متقدمین و متاخرین کے وصال کی تاریخیں درج ہیں۔ مرشدوں اور مریدوں کے لیے کارآمد چیز ہے۔

یاد رسولؐ مصنفہ خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب۔ مطبوعہ مرغوب ایجنسی لاہور۔ ضخامت چھوٹے سائز کے ۸۰ صفحات۔ قیمت ۶/ر

اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں قومی اور ملی ہیرو کی اہمیت، اُس کے اقسام پر بحث کر کے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں کے روحانی ہیرو کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور آپ کی تقلید و تابعت کے لیے محافل میلاد کو بہت ضروری قرار دیا ہے۔

دوسرے حصہ میں اسوۂ حسنہ رسولؐ اور تعلیمات نبوی پر فلسفیانہ بحث کی ہے۔ اسی ضمن میں احادیث کے استناد پر بھی کچھ بحث آ گئی ہے۔ عقائد کے صحیح اصول پر نشوونما پانے کے لیے یہ کتاب بہت مفید ہے۔ اسکی زبان سلیس اور خیالات سلجھے ہوئے ہیں اگرچہ تفصیلی بحث نہ ہونے کی وجہ سے جا بجا تشنہ رہ گئے۔ مگر دلائل کی تنقید کرتے وقت اگر مغربی اسلوب بیان بھی پیش نظر رکھا جاتا تو کتاب زیادہ قیمتی ہو جاتی۔

خیابان کے نام سے سید شہنشاہ حسین رضوی ایم اے ایل ایل بی وکیل لکھنؤ نے ایک رسالہ ابھی نومبر سے جاری کیا ہے۔ ابھی پہلا ہی پرچہ نکلا ہے اس لیے کسی قسم کی رائے کا اظہار قبل از وقت ہوگا۔ البتہ دلی مسرت کے ساتھ نئے معاصر کا خیر مقدم کیا جاتا ہے اور جو توقعات کہ گذشتہ سال اکبر [illegible] مقامی معاصر کے اجراء سے وابستہ کی گئی تھیں اور جو افسوس ہے کہ نہیں پوری ہوئیں وہ اس پرچہ [illegible] بیجا نہ ہوگا اس لیے کہ سید شہنشاہ حسین صاحب سے زیادہ اس کام کیلیے کون موزوں ہے [illegible] حضرات کو عموماً اور نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو خصوصاً اُردو کی خدمت پر آمادہ کر سکیں اور انکے د[illegible] کا وہی جوش و ولولہ پیدا کر دیں جسکی آگ خود اُنکے قلب کو گرماتی رہتی ہے۔ سالانہ چندہ ۵/ر ہے

ظفر الملک

اُردو رسائل کے خاص مضامین

(نومبر سنہ ۱۹۲۶ء)

دلگداز - لکھنؤ

(۱) سلطان عالم واجد علی شاہ

معارف - اعظم گڈھ

(۱) حجاز کے کتبخانے
(۲) غار ایلورا
(۳) ارتقاے ادب فارسی عہد اکبر میں

زمانہ - کانپور

(۱) مورخین اُردو
(۲) کربلا
(۳) شہید نمائش

ہمایوں - لاہور

(۱) اسلام کا اثر مغربی تہذیب پر
(۲) ہندوستان کی پیکر نگاری
(۳) نبش ناتمام (فسانہ)

جامعہ - دہلی

(۱) ہندوستانی زراعت کی کمزوریاں
(۲) چینی و مغربی تہذیب کا مقابلہ
(۳) ہندوستان کی تعلیمی حالت

مرقع - لکھنؤ

(۱) شعرا و علم

ہزار داستاں - لاہور

(۱) چاند اور تارے
(۲) گردش ایام (فسانہ)
(۳) امراکی شاعری

نیرنگ خیال - لاہور

(۱) عالمگیر اعظم کا یومیہ پروگرام
(۲) مسلمان عورتیں اور نیا زمانہ
(۳) ایک خواب کی تعبیر

پیمانہ - آگرہ

(۱) دول اتحاد کے قرضے اور دنیا کا مستقبل
(۲) قانون تمدن اور سیاسیات مدن
(۳) لسان العصر

سہیل - علی گڈھ

(۱) ایری اڈیٹی (افسانہ)
(۲) قاصد سحاب
(۳) اُردو کے اسالیب بیاں
(۴) اُردو شاعری پر ایک نظر

علیگڈھ میگزین - (تعطیل نمبر)

(۱) فلسفۂ تمدن اور اسلام
(۲) یورپ ایک طالب علم کے نقطہ نظر سے

نظرے خوش گذرے

مولانا محمد علی کو اڈیٹر الناظر سے شکایت ہے کہ ۱۹۲۸ء میں مہاراجہ صاحب محمود آباد نے انکو پانچ ہزار روپئے ارسال فرمائے تو اُس پر سختی سے اعتراض کیا گیا اور وہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ مہاراجہ ہوں یا آغا خاں، کسی سے بھی مالی امداد قبول کرنے کے بعد وہ "متاثر" نہیں ہوتے۔
قدرت کی کرشمہ سازی دیکھیے کہ جس اخبار میں مولانا محمد علی کی یہ تحریر شایع ہوئی ہے اُسی میں مہاراجہ صاحب محمود آباد کا وہ تار بھی شایع ہوا ہے جو اُنھوں نے بحیثیت صدر مظاہرہ عام لکھنؤ، شہنشاہ جارج پنجم کے نام بھیجا ہے اور جس میں صاف طور پر لکھا گیا ہے کہ

"یہ مسلم رعایا یور امپیریل مجسٹی سے بطور شاہ مسلمانان ہند ملتجی ہے کہ یور مجسٹی اپنی گورنمنٹ کو ہدایت فرمائیں کہ جس انہدام کا خطرہ درپیش ہے اُسکو روکنے کے لیے وہ ضروری قدم اُٹھائے۔"

اور حجاز مقدس کے معاملات میں غیر مسلم حکومت کو مداخلت کرنے کی اس دعوت صریح کے متعلق مولانا محمد علی نے اسوقت تک اپنے اخبار میں ایک حرفِ انتباہ بھی شایع فرمانے کی ضرورت نہیں سمجھی - حالانکہ اگر اسی قسم کی ملت فروشانہ اور غدارانہ التجا سر شفیع، سر علی امام، یا سر عبدالرحیم کی جانب سے کی گئی ہوتی، تو ممکن نہ تھا کہ ہمدرد کے نصف درجن کالم اس بے غیرتی و خباثت کے خلاف انتہائی غیظ و غضب کے اظہار کے لیے وقف نہ ہو جاتے - یہی نہیں - بلکہ جب ۵- دسمبر کو مجلس خلافت میں اُنکے ہمخیال اراکین تجاویز سازی کے دلچسپ مشغلہ میں مصروف تھے اور ایک تجویز اس مضمون کی تیار کی گئی کہ

"مسلمانان ہند، بقیہ دنیائے اسلام کے ساتھ حجاز میں غیر مسلم مداخلت کو کسی ہیئت و صورت میں اور کسی بہانہ سے بھی برداشت نہیں کر سکتے۔"

تو اُسوقت بھی نہ مولانا محمد علی صاحب کو اور نہ اُنکے متبعین اور رفقاء کو اسکی ضرورت محسوس ہوئی کہ مہاراجہ محمود آباد کی اس روش پر کم سے کم اظہا[illegible] حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ مہاراجہ محمود آباد نے اپنے اس تار کے ذریعہ اسلام ا[illegible] جو غداری اور مسلمانان ہند کے ساتھ جو بددیانتی و بے وفائی کی ہے اُسکے مقابلہ میں [illegible] ب کی مجلس خلافت سے

"بغاوت" اور ابن سعود کی مسلمانان عالم سے وعدہ خلافی بھی ہیچ ہے۔

ابھی گذشتہ ستمبر میں لکھنؤ کی حجاز کانفرنس میں کس بلند آہنگی کے ساتھ حجاز میں غیر مسلم مداخلت کو گوارا کرنے سے انکار کیا گیا تھا اور تین مہینے بھی گذرنے نہ پائے تھے کہ خود حجاز کانفرنس کے کرتا دھرتا کی طرف سے مداخلت کی التجا پیش ہو گئی۔ اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ جس مظاہرۂ عام کے صدر کی حیثیت میں یہ التجا پیش کی گئی ہے اُس نے نہ تو اس قسم کی کوئی تجویز منظور کی اور نہ صدر کو اس مضمون کا تار بھیجنے کی اجازت دی۔ مگر مہاراجہ صاحب جنھیں خدائے قادر و توانا کے حق بندگی اور اسلام اور بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے حق غلامی سے زیادہ حکومت کے حق نمک کا پاس و لحاظ ہے در اصل مہینوں سے اسکے لیے بیتاب ہو رہے تھے کہ حکومت انگریزی کو معاملات حجاز میں جس قسم کی دخل وہی مطلوب ہے اُس کا سامان اُنکی معرفت مہیا ہو جائے اور جس طرح اُنکے ایک سالار قافلہ کی غداری نے عباسیوں کی حکومتِ بغداد کو تاخت و تاراج کرا دیا تھا اُسی طرح ملت عربیہ اور حجاز کی مقدس سرزمین کو تباہ و برباد کرنے کا طغرائے امتیاز اُنکو حاصل ہو جائے۔ اسلیے نہ اُنھوں نے مجالس عام کے قواعد و قانون کی پرواکی، نہ حجاز کانفرنس کی قرارداد کا لحاظ کیا، نہ مسلمانوں میں اپنی رسوائی و بے آبروئی کا خوف کیا، نہ ملت اسلامیہ کے غیظ و غضب کا اندیشہ کیا اور جو کچھ دل میں ٹھانے ہوے تھے اُسے ایک ذرا سا موقع پانے پر فوراً کر بیٹھے۔

انجمن خدام الحرمین کے باجبہ و دستار علما و مجتہدین سے تو اس کی توقع ہی نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنے سرغنہ کی اس ملت فروشی و دین کُشی کے خلاف کوئی صدائے احتجاج بلند کریں گے لیکن مجلس خلافت کے غیور اراکین اور علی برادران جیسے مردانِ راہ خدا کی خاموشی غایت درجہ المناک و دردانگیز ہے۔

حجاز کانفرنس کے موقع پر ہم نے "مسلمانوں کو مشورہ" دینے کے خیال سے ایک اعلان شائع کیا تھا اور اسے بعض قومی اخبارات میں بھی شایع کرا دیا تھا تاکہ مقامی مسلمانوں کے ساتھ ساتھ بیرونی مسلمان بھی ان خیالات سے آگاہ ہو جائیں۔ مولانا محمد علی کو بدنصیبی سے یا تو اپنے متعلق یہ حسن ظن پیدا ہو گیا ہے کہ اُنکی رائے ہمیشہ صحیح ہوتی ہے یا اس خادم کے بارے میں اُنھوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اسکی رائے میں صحت کا امکان ہی نہیں ہے، اس لیے اُنھوں نے اس اعلان کو محض اس گمان پر کہ اس میں خطرات کو بہت بڑھا چڑھا کر ظاہر کیا گیا ہے اپنے اخبار میں درج کرنے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ جس خاص خطرہ کا اس تحریر میں ذکر تھا وہ تھوڑے ہی دنوں کے اندر اب

خود اُنکے معاونِ دیرینہ ولطف فرماے خاص کی بدولت مسلمانوں کے سامنے آگیا ہے۔ نامناسب نہ ہوگا اگر الناظر کی وساطت سے اُس خطرہ کو ایک بار پھر مسلمانانِ ہند کے روبرو پیش کردیا جائے جس کا اس اعلان کے ذریعہ اظہار کیا گیا تھا۔ وہو ہذا:—

"اور اگر حج کو بند کرنے کی تجویز سے قطع نظر کرکے ہمارے بھائیوں نے برطانوی حکومت سے اس معاملہ میں دخل دینے کی درخواست کی تو اُسکا بھی یہی نتیجہ ہو سکتا ہے کہ عراق وفلسطین کی طرح خدانخواستہ حجاز ونجد بھی انگریزی تصرف میں آجائیں انگریزوں کی پالیسی صاف ظاہر ہے۔ وہ ہر نہج سے عربوں کو اپنے تحت میں لانا چاہتے ہیں۔ خلیج فارس کے تقریبًا تمام چھوٹے چھوٹے عربی سردار انگریزوں کے ماتحت ہیں۔ یمن، عسیر، حجاز ونجد کے سوا باقی سارا جزیرۃ العرب انگریزوں اور فرانسیسیوں کے قبضہ وتصرف میں ہے۔ کیا مسلمانانِ ہند کو اب یہ بھی گوارا نہیں ہے کہ جزیرۃ العرب کے یہ چند صوبے بھی مسلمانوں کے قبضہ میں رہیں؟ بظاہر تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر نجد وحجاز پر انگریزوں کا تصرف ہوگیا تو پھر یمن و عسیر کے دن آزاد رہ سکیں گے؟

بس تاریخ میں جس طرح یہ واقعہ ہمیشہ یادگار رہیگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے اور حضرت شیرِ خدا رضہ کے جگر گوشہ امام حسین علیہ السلام اور خاندانِ رسالت کی اُن یادگاروں کو جو اُنکے ہمرکاب تھے میدان کربلا میں ایک مسلمان تاجدار کے ایما سے ایک اسلامی فوج نے شہید کردیا، اُسی طرح کیا ہندوستان کے مسلمان یہ تاریخی یادگار چھوڑنا چاہتے ہیں کہ جزیرۃ العرب کی چپہ چپہ زمین کو اُنھوں نے اپنے بدنصیب ہاتھوں سے مسیحیوں کے تصرف میں دیدیا؟"

مولانا محمد علی فرماتے ہیں کہ میں نے کئی بار اُن سے (مہاراجہ محمود آباد سے) اختلاف کیا۔ ہمیں مولانا محمد علی کے دونوں اخبارات کامریڈ و ہمدرد کے مستقل مطالعہ کا [illegible] سے شرف حاصل رہا ہے اور جہاں تک ہمیں یاد ہے مولانا نے کبھی بھی مہاراجہ صاحب [illegible] ب فرمانے کی ضرورت محسوس نہیں کی جس طرح آغا خاں، امیر علی، سر شفیع [illegible] کو وہ مخاطب فرماتے رہے ہیں۔ حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ جتنی ملت [illegible] اری، جتنی

اسلام دشمنی اور مِتبنی ایمان کُشی مہاراجہ صاحب سے ظاہر ہوئی ہے ہندوستان کے مسلمان مشاہیر میں سے کسی کا دامن بھی اس قدر داغدار نہیں ہے۔

مسلم یونیورسٹی کا چارٹر حکومت کے شرائط کے مطابق اور مسلمانوں کے مطالبات عام کے علی الرغم کس کی وسیسہ کاریوں کا رہینِ منت ہے؟

مسلم لیگ میں سنہ ۱۸ء کے اجلاس کی اہم تجاویز کو پیش کرنے کا وعدہ کرکے کون فرار ہوا تھا۔ اور کس نے حکومت کو باور کرانا چاہا کہ یہ چند شوریدہ سروں کی کارروائی ہے، ورنہ نیازمندانِ وفاکیش کو ایسی ہرزہ سرائیوں سے کیا سروکار؟

سنہ ۱۹ء میں جب لکھنؤ کی آل پارٹیز کانفرنس منعقد ہو رہی تھی تو کس نے اُسکے دعوتی خط پر دستخط ثبت کرنے کے بعد اس بہانہ سے واپس لے لئے کہ علی گڈھ پارٹی کہیں اس اجتماع سے علٰحدہ نہ رہ جائے۔ اور جب شیخ عبداللہ کے دستخط اور محترم ایڈیٹر البشیر جیسے علی گڈھ والوں کی تحریری ہمدردی حاصل کرلی گئی تو کون چھپ کر گھر بیٹھ رہا؟

سنہ ۱۷ء میں دوستوں، نیازمندوں اور اہل ملک کی رائے عامہ کے اصرار پیہم کے علی الرغم کون شخص تھا جسنے مسز اینی بسنٹ کے مقابلہ میں کانگریس کی صدارت کی امیدواری سے دست بردار ہونا گوارا نہیں کیا۔ سنہ ۱۸ء میں کس نے لیگ کی صدارت پر اپنا دوبارہ انتخاب اس ضد سے کرایا کہ رفیقِ خاص کو قلمدانِ معتمدی بھی دیا جائے۔ اور پھر کس نے لاٹ صاحب کے اشارۂ چشم پر چل کر استعفا دیدیا؟

ہندوستان کی جنگِ آزادی کے دوران میں جبکہ ترکی حکومت کا وجود اور جزیرۃ العرب کی آزادی معرضِ خطر میں تھی، اور ملک کو لڑکوں اور نوجوانوں سے لیکر ادھیڑوں اور بوڑھوں تک ایک ایک فرد کی ضرورت تھی، کس نے قوم و ملک سے بے اعتنائی کرکے حکومت کی غلامی کا طوقِ زریں اپنی گردن کو تا دم کے لیے پسند کیا؟ کس نے لاکھوں روپیہ اور سیکڑوں رنگروٹوں کی امداد دیکر اپنے دامنِ حریت کو خوں آلود کیا؟ اور کس نے حکومت کے ایک خونی جلاد کی طرح سیکڑوں ہزاروں خادمانِ ملک و ملت کو جیل خانوں میں بھر دیا؟

اور اِن تمام جفاکیشیوں اور غداریوں کے بعد آج جبکہ مسلمانانِ ہند باہمی تفریق و انتشار کی بدولت کِشتیِ بے ناخدا، کی طرح منجدھار میں پھنسے ہوئے ہیں، کس نے مارِ آستین بنکر حجاز کی مقدس سرزمین پر فرنگیوں کو اپنا دامِ تزویر پھیلانے کی دعوت دی؟

کیا آغا خاں، امیر علی، سر شفیع یا سر عبد الرحیم وغیرہ میں سے کسی ایک وفا کیش حکومت نے بھی مسلمانوں کے جسم قومی پر اس طرح پے بہ پے تیر اندازی کی ہے؟ پھر اُن سب کے متعلق تو مولانا محمد علی کا قلم انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں روانی کے ساتھ ناراضگی و بے اعتمادی حقارت و ملامت کے اظہار سے دریغ نہیں کرتا۔ پھر یہ کیا ہے کہ جناب مہاراجہ صاحب کا معاملہ سامنے آیا اور سارا جوش و خروش رخصت ہوگیا اور سارا جذبۂ وولولہ سرد پڑ گیا؟ ہم جانتے ہیں اور دل سے یقین رکھتے ہیں کہ مولانا محمد علی دام لیکر کام کرنے کے عادی نہیں، لیکن کیا انسانی فطرت کا یہ تقاضا نہیں کہ جو شخص کسی کے لطف و کرم سے بہرہ اندوز ہو اُس کے دل میں اپنے محسن کے متعلق حُسن ظن راسخ ہو جائے اور جب کبھی کوئی نازک موقع آئے تو اُسی حُسن ظن کی بدولت انسان مغالطہ میں آجائے اور اپنے محسن کی کمزوریوں کا صحیح احساس کرنے سے قاصر رہے۔

یقین واثق ہے کہ جلد یا دیر مولانا محمد علی صاحب اسکو جان جائیں گے کہ مہاراجہ محمود آباد کے اعلانات وطن پرستی و قوم دوستی کی حقیقت کیا ہے۔ اسی التجاے مداخلت کے بارے میں جب وہ غور فرمائیں گے کہ اس نے حجاز کے لیے کن کن روباہ بازیوں اور دسیسہ کاریوں کا دروازہ کھول دیا ہے، تو جس طرح اُنھوں نے آغا خاں کی امداد پر لات ماردی، انشاءاللہ ایک دن وہ مہاراجہ صاحب سے بھی منہ موڑلیں گے، اور جس طرح آج وہ ایک پیشہ ور عیار کی قباء کیادی کی دھجیاں بکھیر رہے ہیں، اُسی طرح بلکہ اس سے زیادہ قوت کے ساتھ وہ مہاراجہ صاحب کی بازیگریوں کو بے نقاب کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ اور جب تک وہ وقت نہ آجائے ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ وقتاً فوقتاً مولانا کو ٹوکتے رہیں۔

مہاراجہ صاحب کی التجاے مداخلت کے عواقب و نتائج کا اندازہ عام مسلمانوں کو تو ہو نہیں سکتا لیکن جن اصحاب کو برطانوی سیاست کا کچھ ... بخوبی جان گئے ہونگے کہ یہ کتنا بڑا فتنہ ہے۔ سلطان ابن سعود کے بارے میں ... اتنی قوت نہیں رکھتے کہ برطانیہ سے لڑائی مول لیں۔ یہ بھی صاف ظا... ...رت کبھی اس حماقت میں مبتلا نہیں ہو سکتی کہ حجاز پر براہِ راست قبضہ کرنے پر آمادہ ہو ... ے۔ لیکن ساتھ ہی اسکے ہر شخص کو معلوم ہے کہ حجاز اور سارے جزیرۃ العرب کو لطائف الحیل فرانس و اطالیہ کی آنکھ

بچاکر اپنے زیر اثر و اقتدار لانا اُسکی تمنائے دیرینہ اور سیاست موجودہ کا ایک ضروری مطمح نظر ہے۔ شریف حسین کے زمانہ میں باوجودیکہ اُس بدنصیب نے خلیفہ سے غداری کرکے مسلمانوں کے خون سے انگریزوں کے خط غلامی پر اپنے دستخط ثبت کردیے تھے، انگریزوں کو اتنی مداخلت بھی حاصل نہ ہوسکی کہ حجاج ہندی کی خدمت کے نام سے ایک اسپتال مکہ معظمہ میں قائم رہ سکتا۔ لیکن عرب کے دو سرداروں کی باہمی جنگ نے جو کمزوری پیدا کی اُسکے بدولت حکومت برطانیہ کی یہ تمنا تو اسی سال پوری ہوگئی۔ اور سمجھنا چاہیے کہ اندرون حجاز میں Peaceful penetration "مصالحانہ دخل یابی" کی بنیاد پڑ گئی۔ اب اسکے بعد دوسرا قدم اُٹھانے کے لیے کسی بہانہ کی ضرورت تھی جو مہاراجہ صاحب محمود آباد کی عنایت سے فراہم ہوگیا ہے۔

مہاراجہ صاحب کے تار کی آڑ پکڑ کر برطانوی نمایندۂ حجاز سلطان ابن سعود کو کس جال میں پھنسانا چاہے گا؟ اسکا علم ہمیں یا دوسرے اہل ہند کو شاید عرصہ تک نہ ہوسکے گا۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ مہاراجہ صاحب نے جس طرف قدم اُٹھانے کی التجا کی ہے اُسکی طرف خواہ قدم اُٹھے یا نہ اُٹھے مگر قدم اُٹھانے کی ضرورت کا اعادہ کرکے ابن سعود کے وزیر خارجہ کو اچھی خاصی گھبراہٹ میں تو مبتلا کرہی دیا جائے گا اور اسکے پردے میں عجب نہیں کہ اندرون ملک حجاز میں دخل یابی کا دوسرا روڑا بھی رکھ دیا جائے۔ مسلمانوں کی آنکھیں کہیں اُسوقت کھلیں گی جب اُنکو روڑے پر روڑا رکھتے جانےکے بعد اصل عمارت کے در و دیوار نظر آنے لگیں گے۔ خدا نہ کرے کہ مسلمانوں میں اتنی قوت بھی باقی نہ رہے کہ وہ حجاز میں برطانوی چالبازیوں کی مضبوط سے مضبوط بنیادوں کو بیک ضرب جڑ سے نہ اُکھاڑ سکیں، لیکن مسلمانوں کی مآل اندیشی اور مصلحت بینی کا تقاضا یہ ہے کہ اجانب کی مداخلت کا مضبوط بنیادوں پر قائم ہونے سے قبل ہی وہ اُنکی ریشہ دوانیوں کا استیصال کلّی کردیں۔

ہمیں مسرت ہے کہ دہلی میں ایک مخالف اجتماع کرکے مہاراجہ صاحب کے طریق کار سے بیزاری کا اظہار کردیا گیا۔ لیکن ہم اسے قطعاً ناکافی سمجھتے ہیں۔ اس شرارت کا اگر کچھ انسداد ممکن ہے تو مسلمانوں کی ہر بستی سے اگر نہیں تو کم سے کم تمام بڑے بڑے مرکزوں سے اس تار کے خلاف صدا بلند ہونا چاہیے۔ اور شہنشاہ جارج پنجم اور سلطان ابن سعود دونوں پر بکرّات و مرّات اس حقیقت کو واضح کردینا چاہیے کہ مہاراجہ صاحب کے اس تار کی اصلیت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ ایک خائنِ حکومت کی ذاتی اور حد درجہ قابل نفرت خواہش ہے۔ تاکہ ایک طرف حکومت انگریزی کو معلوم ہوجائے کہ ہمارے آلۂ کارکی ملک میں اب کیا وقعت باقی رہ گئی ہے، اور دوسری طرف سلطان ابن سعود

بھی اس سے پوری طرح آگاہ ہو جائیں کہ اس تار کے پس پشت کوئی قوت ایسی موجود نہیں ہے جس سے اثر پذیر ہو کر برطانوی حکومت کی طمانیت دہی کے لیئے کوئی خاص کارروائی کرنے پر مجبور ہو۔

مولانا محمد علی سے بھی یہ درخواست غالباً بیجا نہ ہوگی کہ وہ مہاراجہ صاحب کے اس تار پر کم سے کم اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں، خواہ اُنکا لب ولہجہ کتنا ہی نرم، دوستانہ اور نیازمندانہ ہو۔

---

۳ و ۴ - دسمبر کو مجلس مرکزیۂ خلافت کا جلسہ لکھنؤ میں منعقد ہوا - وفد خلافت کی رپورٹ، جس پر اس جلسہ میں بحث ہونا تھی اکتوبر کی آخری تاریخوں میں شایع ہوئی تھی، اور اسلامی پریس میں اُس پر کافی بحث ہو چکی تھی، اس لیے توقع کی جا سکتی تھی کہ جلسہ میں بیٹھ کر اراکین خلافت رپورٹ پر فضول مباحثہ میں وقت ضایع نہ کریں گے بلکہ اس رپورٹ کی روشنی میں اور باہمی تبادلۂ خیال کے بعد یہ طے کریں گے کہ آیندہ مسئلۂ حجاز میں کیا کارروائی کرنا چاہیے۔

لیکن بدقسمتی سے ہمارے نظام قومی میں ذاتی رنجشیں اور کدورتیں اور شخصی تفوق و امتیاز کا خیال اس درجہ دائر وسائر ہو گیا ہے کہ ہمارے سب کام اسکی وجہ سے ابتر رہتے ہیں۔ چنانچہ اس دفعہ مجلس خلافت کے جلسہ کا جن لوگوں کو تماشا کرنے کا موقع ملا اُنکے لیے مسلمانان ہند کی سب سے نامور مجلس کی کارروائیاں صد درجہ دردناک وما یوس کُن ثابت ہوئیں۔

اہل ہند عموماً اور مسلمان خصوصاً انضباطِ اوقات کے خوگر نہیں ہیں - جو حالت ہمارے شخصی و انفرادی کاموں کی ہے اُسی کا عکس ہمارے تمام اجتماعی کاموں میں نمودار ہوتا ہے - جس قومی مجلس میں جائیے یہی بات جو دل کو کمزور بنائے گی وہ اراکین وحاضرین کا وقت پر نہ آنا ہے - جلسہ کی کارروائی دیر میں شروع کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ضابطۂ عمل کی تکمیل کے لیے یا تو وقت میں اضافہ کرنا پڑتا ہے اور اگر اسکا موقع نہ ہو، جیسا کہ بالعموم واقع ہوتا ہے تو بس جلدی جلدی تمام کارروائیاں ختم کرنا ہوتی ہیں اور اس عجلت کے باعث اکثر وبیشتر معاملات پر یا تو کافی غور و بحث نہیں کر سکتے، یا بہت سی کام کی باتیں رہ جاتی ہیں - پھر اُس پر طرہ یہ ہے کہ بہت سے اراکین موقع اور محل کو نظر انداز کر کے فضول ولاطائل تقریروں اور لفظی و بے معنی نزاعوں میں قیمتی وقت ضایع کر دیتے ہیں۔

توقع تھی کہ ۲ - دسمبر تک یا زیادہ سے زیادہ ۳ - دسمبر کی صبح کی گاڑی اراکین لکھنؤ پہونچ جائیں گے - اور چند کے سوا بیشتر اراکین ایسے وقت تک لکھنؤ ب قرارداد بعد نماز جمعہ جلسہ کی کارروائی شروع ہو سکتی تھی، مگر صدر صاحب ہما ۴ - دسمبر کو

کلکتہ میل سے پہونچوں گا، جلسہ کی ابتداءات میں ہو - پہلی ہی بسم اللہ غلط کردی - اور ستم ظریفی یہ دیکھیے کہ اس تار کے بعد بھی جناب صدر تشریف نہیں لائے، بلکہ ایک دوسرا تار بھیجکر یہ اطلاع دیدی کہ میں روانہ نہ ہو سکا - اب انتظار نہ کیا جائے - اس طرح عجر کے صرف سے مولانا ابو الکلام آزاد نے اپنے لیے تو اس کشمکش سے یقیناً نجات حاصل کرلی - لیکن مجلس خلافت کا بہت سا قیمتی وقت ضائع ہوگیا۔

بعد مغرب جناب مولوی عبد القادر قصوری نائب صدر کی صدارت میں جلسہ شروع ہوا تو پنجاب کے ایک رکن نے یہ سوال اُٹھایا کہ رپورٹ پر رئیس وفد مولانا سید سلیمان کے دستخط ہیں یا نہیں؟ معلوم ہوا کہ نہ صرف رئیس وفد نے بلکہ کسی رکن نے اس قدر باضابطگی کی ضرورت محسوس نہیں کی - بے شبہ سوال محض ضابطہ کا تھا، لیکن ضابطے اگر محض نظرانداز ہونے کے لیے ہیں تو مغربی طرز کی مجلسیں بنانے کی کیا ضرورت ہے، جبکہ دارومدار ہی تمام تر ضابطوں پر ہے - بہرصورت ارا کین وفد نے اپنی خطا کا تی کا اعتراف کرلیا اور مجلس کے روبرو ایک مطبوعہ رپورٹ پر ـــــ کیونکہ مسودات یہاں موجود نہ تھے، اور عجب نہیں کہ بعض حصے بمبئی میں بھی نہوں ـــــ دستخط فرما دیے - رئیس وفد نے صرف دستخط ہی نہیں فرمائے بلکہ چند سطروں کا ایک اختلافی نوٹ بھی اضافہ فرمادیا - جسنے ایک نئی بحث کا دروازہ کھول دیا - اور اس بحث میں دو نشستیں رائیگاں گئیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی کے نوٹ پر اب کچھ لکھنا فضول ہے، خصوصاً جبکہ اُنھوں نے جلسہ کے کئی دن پیچھے، اور خدا معلوم کتنے غور و تامل، فہمایش و سرزنش، شکوہ و شکایت، یا ملاطفت و استمالت کے بعد اس بس کی گانٹھ کے لیے ایک تریاق بھی مہیا کردیا ہے - البتہ اس بات پر اظہار افسوس کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ رپورٹ کے معاملہ میں رئیس وفد کا سارا طرز عمل غایت درجہ الم آگیں، یاس افزا، اور سزاوار ملامت تھا۔

اختلافی نوٹ کی بحث کے خاتمہ پر جب شمار آرا کا وقت آیا تو رپورٹ کو رئیس وفد کے پاس مزید توضیح و تصریح کی غرض سے واپس بھیجنے والوں اور انکے مخالفین کی تعداد مساوی تھی - صاحب صدارت کو ایک دفعہ جماعت مخالف (پنجاب و بنگال کے اراکین) کی موافقت کرچکے تھے، اس دفعہ اُنھوں نے صوبجات آگرہ و اودھ و دہلی کے نمایندوں کے حق میں تصفیہ کرکے تلافی مافات کردی۔

تیسری نشست میں جب ایک جزوی مسئلہ پر رائے شماری ہوئی اور لوگوں کو یہ محسوس ہوا کہ بنگال و پنجاب کے اراکین اقلیت میں ہیں تو فوراً ہی یہ تجویز سامنے آگئی کہ رپورٹ لفظاً منظور کرلیجائے۔

اور ۴- دسمبر کی نصف شب تک جلسہ کا وقت اسی بحث کی نذر ہو گیا - اور اگر صدر جلسہ کامل ایک گھنٹہ کے بحث و مباحثہ کے بعد معینہ تاریخوں کے آگے بھی جلسہ کی کارروائی جاری رکھنے پر رضامند نہ ہو جاتے تو یہ جلسہ بالکل ہی بے نتیجہ طور پر ختم ہو جاتا -

تیسرے دن جلسہ ہوا تو بسبب اسکے کہ موتمر کی شاخ ہند کے بنیادی جلسہ کا اہتمام متعلق تھا، ہمیں جلسہ کی کارروائی کے مشاہدہ کا موقع نہیں ملا، مگر احباب سے یہ معلوم ہوا کہ بحث کسی نتیجہ پر نہ پہونچنے پائی تھی اور جن مقررین نے رات کو اپنے نام لکھا دیے تھے اُنکی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ وقت تمام ہو گیا اور جلسہ کو ختم کرنے کی تحریک پر باہم ایسی کچھ رد و قدح ہوئی کہ صاحب صدر کو تاب مقاومت نہ رہی اور وہ اپنی پگڑی دونوں ہاتھوں سے سنبھالتے ہوے جلسہ سے اُٹھ گئے - اُنکے جانے کے بعد پھر جلسہ منعقد کیا گیا تو ہمارے دوست عبد الماجد صاحب منصبِ صدارت پر فائز ہوے اور چند لمحوں کے اندر متعدد تجاویز پیش ہو کر منظور ہو گئیں اور قریب قریب اکثر بحث طلب امور کا تصفیہ بھی ہو گیا ——— نہیں کہا جا سکتا کہ اس سبک خرامی کے لیے صدر اول وہ خلافت کمیٹی کو مبارکباد دی جائے یا اُن اصحاب کو جو اخبار زمیندار کی اصطلاح میں "فداءندانِ خلافت" سے موسوم ہیں -

مولوی عبد القادر قصوری نے جو بیان اُس روز کی کارروائی کے متعلق شایع کیا ہے اور جسکے متعلق اخبار "ہمدرد" کا فتوا یہ ہے کہ

"باطل" است انچہ مدعی گوید

اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب موصوف جلسہ کو بجاے خود برخاست کر کے اُٹھے تھے - مگر شاید ملاحیوں کی باڑھ نے اس درجہ اُنکو مضطرب کر دیا تھا کہ جس طمانیت قلب کے ساتھ نشستِ اول میں اُنھوں نے اپنا فیصلہ خلافت کمیٹی کے کارکن سید ذاکر علی صاحب کو املا کرا دیا تھا، اس موقع پر وہ اپنے حکم کو معرض تحریر میں نہ لا سکے - اور صدر کی اس اضطراری فروگذاشت سے فائدہ اُٹھا کر تمام کارروائیاں بظاہر ضابطہ کے بالکل مطابق انجام دے لی گئیں -

---

جلسہ کی رو داد، النّاظر میں مزید گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے، باقی ہے - دسمبر نمبر جو انشاء اللہ ۱۵- جنوری سے پیشتر ہی شایع ہو جائے گا، باقی چھاپی جائیگی -

ظفر الملک

۲۰- دسمبر ۱۹۲۶ء

راقم۔ میں نے شعر کو جس طرح تحریر کیا ہے طرز کتابت سے بھی ذہن اصل مطلب کی طرف منتقل ہو جاتا ہے خلاصہ مطلب یہ ہے کہ معشوق کو مخاطب کرکے میرزا نے ایک سوالیہ قائم کیا ہے کہ مجھکو موت کا انتظار کرنا چاہیے یا تم سے معاشقہ کرنا چاہیے اور خود ہی اسکو اسطرح سے حل کیا ہے کہ موت کا انتظار کیوں نہ کروں کہ اسکا آنا یقینی ہے۔ یعنے موت کا انتظار ضرور کرنا چاہیے۔ دوسرے مصرعے میں کہتے ہیں کیا میں تم سے محبت کروں (تمکو چاہوں) کہ اگر تم نہ آؤ تو میں بلانے کی بھی جرأت نہیں کرسکتا یعنے بہ نسبت اسکے کہ تم سے معاشقہ کروں یہ بہتر ہے کہ موت کا انتظار کروں جسمین وصل کا میسر آنا لابدی ہے اور تم سے معاشقہ کرنے مین وصل تو درکنار اگر تم نہ آؤ تو تمھارے بلانے کی بھی جرأت نہیں کرسکتا۔ علامہ موصوف نے دوسرے مصرعہ مین چاہوں یعنی خواہم لیا ہے حالانکہ (تمکو چاہوں) از شما محبت کنم کی جگہ ہے۔

مولانا حسرت نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اُس پر کسی مزید حاشیہ کی ضرورت نہیں ہے۔

میرزا غالب کا وہ کلام جسکو بے معنی کہا جاتا ہے ہر قسم کی تنقید سے مستغنی ہے۔ شارحین دیوان غالب خواہ میرزا کی ہمدردی میں یا اپنی اعلیٰ ذہنیت کے اظہار مین متواتر کوشش فرما رہے ہین کہ میرزا کے اس کلام کو معانی سے ہم آغوش کرین ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں کسی حد تک کوئی شارح کامیاب بھی ہو جائے۔ لیکن مین میرزا کے اس کلام کو اگر اسمین معانی مستور بھی ہوں بے نقاب کرنے کی کوشش نہیں کرونگا۔ کیونکہ میرا نارسا ذہن اس دشوار خدمت کی انجام دہی مین معذور ہے۔ مذکورہ بالا کلام کا تذکرہ مضمون ہذا مین آیندہ "مشکل کلام" کہہ کر کیا جائیگا۔ قارئین کرام اور ناقدین عظام خود فیصلہ فرمائین کہ یہ "مشکل کلام" اگر معانی سے بیگانہ بھی نہیں ہے تو بھی میرزا کو غزل اردو کا کامیاب شاعر ثابت کرسکتا ہے یا نہین۔ میرزا کے کلام کا نصف حصہ تقریباً ایسا ہے جسکو "مشکل کلام" کے تحت مین داخل کرسکتے ہیں مگر میں صرف اہم شعر انتخاب کرکے نذر ناظرین کرتا ہوں۔

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے مین بھی عریاں نکلا

بہ فیضِ بیدلی نومیدیِ جاوید آساں ہے
کشایش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریِ قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہون اور افسوس حاصل کا

رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

صرفہ ہے ضبطِ آہ مین میرا وگرنہ مین
طعمہ ہون ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اس گرہِ نیم باز کا

شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا۔

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا
جادہ اجزای دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

گلہ ہے شوق کو دل مین بھی تنگیِ جا کا
گہر مین محو ہوا اضطراب دریا کا

اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیِ ناز
جوہرِ آئینہ کو طوطیِ بسمل باندھا

یاس و امید نے یک عربدہ میداں مانگا
عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سایل باندھا

بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی
کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خط ایاغ کا

تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سخن مجھے
تریاکیِ قدیم ہوں دودِ چراغ کا

بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار
یہ مے کدہ خراب ہے مے کے سراغ کا

باغِ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل
ابرِ بہار غم کدہ کس کے دماغ کا

لب خشک در تشنگی مرگان کا
زیارت کدہ ہوں ... آزردگان کا

ہمہ نا امیدی ہمہ بد گمانی
میں دل ... اں کا

ذرہ ذرہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے
گردش ... ئے لیلے آشنا

کوہکن نقاشِ یک تمثالِ شیرین تھا اسد
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

برنگ کاغذ آتش زدہ نیرنگ بیتابی
ہزار آئینہ دل باندھے ہی بال یک تپیدن پر

حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز
دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز

نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نورد وہم وجود
ہنوز تیرے تصور مین ہی نشیب و فراز

وصال جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں
کہ دیجیے آئینۂ انتظار کو پرواز

رخ نگار سے ہی سوز جاودانی شمع
ہوئی ہی آتش گل آب زندگانی شمع

زبان اہل زباں میں ہی مرگ خاموشی
یہ بات بزم مین روشن ہوئی زبانی شمع

کرے ہی صرف بہ ایمائے شعلہ قصہ تمام
بطرز اہل فنا ہی فسانہ خوانی شمع

ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہی
بہ جلوہ ریزی باد و بہ پر فشانی شمع

نشاط داغ غم عشق کی بہار نہ پوچھ
شگفتگی ہے شہید گل خزانی شمع

محفلیں برہم کرے ہی گنجفہ باز خیال
ہیں ورق گردانی نیرنگ یک بتخانہ ہم

باوجود یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں
ہیں چراغان شبستان دل پروانہ ہم

درس عنوان تماشا بہ تغافل خوشتر
ہی نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے

بیخودی بستر تمہید فراغت ہو جو
پر ہی سایہ کی طرح میرا شبستاں مجھسے

عرض ناز شوخی دنداں برائے خندہ ہی
دعوی جمعیت احباب جائے خندہ ہی

ہی عدم میں غنچہ محو عبرت انجام گل
یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہی

کلفت افسردگی کو عیش بیتابی حرام
ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہی

حسن بے پروہ خریدار متاع جلوہ ہی
آئینہ زانوے فکر اختراع جلوہ ہی

تاکجا ای آگہی رنگ تماشا باختن
چشم وا گردیدہ آغوش وداع جلوہ ہی

دل خون شدہ کشمکش حسرت دیدار
آئینہ بدست بت بدست حنا ہی

قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ
اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہی

مندرجہ بالا کلام اور اسی قسم کے دیگر کلام کی بابت خواجہ حالی کا فتوی بھی نظر انداز

کرنے کے قابل نہین ہے۔

یادگار غالب صفحہ ۱۰۰ "ان اشعار کو مہمل کہدیا بے معنی مگر اسمین شک نہین کہ میرزا اسنے وہ نہایت جانکاہی اور جگر کاوی سے سرانجام کیے ہونگے۔ جبکہ اپنے معمولی اشعار کاٹتے ہوئے لوگوں کا دل دکھتا ہے تو میرزا کا دل اپنے اشعار نظری کرتے ہوئے کیون نہ دکھا ہوگا۔ ظاہرا یہی سبب تھا کہ انتخاب کے وقت بہت سے اشعار جو فی الواقع نظری کرنیکے قابل تھے اُن کے کاٹنے پر میرزا کا قلم نہ اُٹھ سکا۔ ممکن ہے کہ ایک مدت کے بعد یہ اشعار اُنکی نظر مین کھٹکے ہون مگر چونکہ دیوان چھپکر شایع ہو چکا تھا اِسلیے اُنھون نے اِن اشعار کا نکالنا فضول سمجھا" خواجہ صاحب اِس مشکل کلام کو جسکا مختصر نمونہ آپ دیکھ چکے موجودہ دیوان غالب میں دیکھنا نہیں چاہتے تھے اور دیوان غالب کی اشاعت ہو جانے کے بعد خواجہ صاحب کی رائے مین میرزا ایک حدتک معذور تھے ورنہ اُن کا قیاس قوی ہے کہ خود میرزا اِس قسم کے کلام کو اپنے دیوان سے خارج کر دیتے۔

لیکن اردو زبان کی بدقسمتی پر جسقدر افسوس کیا جائے وہ کم ہے یہاں تو اِس مشکل کلام مطبوعہ ہی کی وجہ سے شارحین میں کشمکش تھی میرزا غالب کی محترم شخصیت کی وجہ سے اُنکے کلام کو مہمل کہدینا بھی نامناسب معلوم ہوتا تھا اور بامعنی قرار دیا جانا بھی ناممکن نظر آتا تھا زمانہ حال مین بھوپال کی حمیدیہ لائبریری مین میرزا غالب کے کلام کا ایک قلمی نسخہ دستیاب ہوگیا جو دیوان مطبوعہ کے انتخاب سے قبل ہی بھوپال پہونچ چکا تھا۔ اِس مجموعہ مین وہ کلام بھی شامل ہے جسکو میرزا نے اپنے احباب کے مشورے سے اپنی جوہر آفریں طبع کی ملکیت سے خارج کردیا تھا مگر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کے میرزا پرست جوش نے ریاست سے کثیر رقم خرچ کراکر "نسخہ حمیدیہ" کے نام سے اس کلام کو [illegible] ۱۔ مین نے مختلف رسائل مین "نسخہ حمیدیہ" سے منتخب کیے ہوئے کلام کو [illegible] ت ڈاکٹر مرحوم کی اِس خدمت کو بہت ہی اہم قرار دیتی ہے اور مرحو[illegible] مین ادا کیا جاتا ہے

"اور اس عظیم الشان ادبی اضافہ سے زبان کی محرومی کو مٹا دیا" مجھے حیرت ہو کر اس جماعت کی نظر میں معلوم نہین کہ ادبی کامیابی اور ادبی محرومی کے کیا معنی ہین۔ بہرحال اس مضمون کو مکمل کرنے کی غرض سے مین ناظرین کو تصدیعہ دیتا ہون کہ چند اشعار کو اور ملاحظہ فرمائین اور ادب اردو کی کامیابی یا محرومی پر کوئی نہ کوئی رائے قائم کرین۔ وھو ہذا۔

نہ کہہ کہ طاقت رسوائی وصال نہیں
اگر یہی عرق فتنہ ہے مکرر کھینچ

دریا نشاط دعوت سیلاب ہو اسد
ساغر بہ بارگاہ دماغ رسیدہ کھینچ

آئینۂ امتحان نذر تغافل۔ اسد
شش جہت اسباب ہو دہم توکل ہنوز

شکوہ درد و درد داغ ای بیوفا معذور رکھ
خونبہائے یک جہاں اُمید ہو تیرا خیال

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا
واماندگی شوق تراشے ہیں پناہیں

طلسم ہستی دل آں سوئے ہجوم سرشک
ہم ایک میکدہ دریا کے پار رکھتے ہیں

صد رنگ گل کترتا در پردہ قتل کرنا
تیغ ادا نہیں ہے پابند بے نیامی

اگر آسودگی ہو مدعائے رنج بیتابی
نثار گردش پیمانۂ مے روزگار اپنا

سیر ملک حسن کر میخانہ ہا نذر خمار
چشم مست یار سے ہو گردن مینا پہ باج

تمثال گداز آئینہ ہے عبرت بینش
نظارہ تحیر چمنستان بقا ہیچ

سادہ و پرکار تر غافل و ہوشیار تر
مانگے ہے شمشاد سے شانۂ سنبل ہنوز

خوں در جگر نہفتہ بہ زردی رسیدہ ہون
خود آشیان طائر رنگ پریدہ ہوں

ہوں گرمی نشاط تصور سے نغمہ سنج
مین عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

ہین چشم واکشادہ و گلشن نظر فریب
لیکن عبث کہ شبنم خورشید دیدہ ہوں

خواجہ حالی مرحوم کی چند شہادتین اور درج کیجاتی ہیں اوسکے بعد میرزا کے دوسرے قسم کے کلام کا انتخاب مختصر پیش کیا جائیگا۔

یادگار غالب صفحہ ۱۸ "بہرحال میرزا ایک مدت کے بعد اپنی بیراہہ روی سے خبردار ہوئے اور استقامت طبع و سلامتی ذہن نے اُن کو راہ راست پر ڈالے بغیر نہ چھوڑا"

یادگار غالب صفحہ ۱۰۴ "میرزا کی طبیعت اسی قسم کی واقع ہوئی تھی وہ عام روش پر چلنے سے ہمیشہ ناک چڑہاتے تھے...... عامیانہ خیالات اور محاورات سے جہانتک ہوسکتا تھا اجتناب کرتے تھے"

یادگار غالب صفحہ ۱۰۸ "اُنکی غزل مین زیادہ تر ایسے اچھوتے مضامین پائے جاتے ہیں جن کو اور شعرا کی فکر نے بالکل مس نہین کیا۔ اور معمولی مضامین ایسے طریقے میں ادا کیے گئے ہیں جو سب سے نرالا ہے۔ اور اُن میں ایسی نزاکتیں رکھی گئی ہیں جن سے اکثر اساتذہ کا کلام خالی معلوم ہوتا ہے"

خواجہ کی رائے مین میرزا کا آخر الذکر کلام جو بیراہہ روی چھوڑ کر لکھا گیا ہے میرزا کی شاعری کا مایۂ ناز ہے وہ نزاکتوں کا مخزن ہے۔ عام خیالات و محاورات سے علیحدہ ہے مضامین کے لحاظ سے اچھوتا ہے۔ مین میرزا کے اِس کلام کا "آسان کلام" کہہ کر تذکرہ کرونگا۔

مجھے افسوس ہے کہ آسان کلام مین عموماً وہ خوبیاں نہیں ہین جسکو خواجہ نے اپنے حُسن ظن سے میرزا کے کلام مین موجود فرض کر لیا ہے۔ میرزا کے کلام سے تخمیناً دوسو اشعار مین ایسے منتخب کر چکا ہون جنکی بندش اور تخیل عامیانہ ہے، مضامین پامال شدہ ہین، اور ندرت وجدت کا کہین پتہ تک نہیں ہے۔ بنظر اختصار اُن دوسو اشعار منتخبہ میں سے صرف چند اشعار منتخب کرکے قارئین کے ملاحظہ کیلیے پیش کیے جاتے ہین اور اپنی مختصر تنقید بھی اشعار کیساتھ شامل کر دی ہے اگر یہ سلسلہ آیندہ کچھ اور طویل ہوگا تو کل اشعار بھی کسی نہ کسی موقع پر شرف ملاحظہ حاصل کرینگے۔

بغل میں غیر کی آج آپ سوئے ہیں کہیں ورنہ سبب ... ہائے پنہاں کا

تبسم ہائے پنہاں سے میرزا نے رقیب کی بغل میں ... ں جدت کو فن

شاعری کی بیداری کہیے یا بدخوابی۔ لیکن شعر مین کسی قسم کی بلندی نہیں ہے۔

آج واں تیغ وکفن باندھے ہوئے جاتا ہوں مَیں   عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائینگے کیا

شعر...... بہ لحاظ مضمون معمولی درجہ سے بھی گرا ہوا ہے عذر لانا۔ عذر آوردن کا ترجمہ ہے جو ابھی اردو زبان میں رائج نہیں ہے۔

ہر بُن مو سے دم ذکر نہ ٹپکے خوں ناب   حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہوا

قصہ حمزہ سے مراد مشہور داستان امیر حمزہ ہے جو ایک افسانہ ہے۔ شعر نہایت عامیانہ ہے۔

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی   آج ہی گھر مین بوریا نہوا

عاشق کے واسطے بوریا نشینی مضائقہ نہیں رکھتی لیکن فرش زمین اِس سے زیادہ موزوں ہے۔ ہاں معشوق کے لیے چٹائی کی نشست اور اُسکے نہونے پر افسوس ضرور ایک جدت ہے

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہوا تھا   اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھپر نہوا تھا

میرزا صاحب نے معلوم نہین کس دل سے رقیب کی وکالت وحمایت کی ہے

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق   آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

دوسرے مصرعہ میں ایسی شدید تعقید ہے جو کسی طرح قابل درگزر نہیں ہے میرزا صاحب کہنا یہ چاہتے ہین "آدمی کوئی ہمارا بھی دم تحریر تھا"، لیکن اِس بھی کو ردیف کی خاطر کہاں پہونچا دیا۔

کافی ہے نشانی ترے چھلے کا نہ دینا   خالی مجھے دکھلا کے بوقت سفر انگشت

کسقدر عامیانہ تخیل ہے۔ اگر یہ شعر مبتذل نہیں ہے تو مبتذل کسے کہتے ہیں۔

مرے قدح میں ہے صہبای آتش پنہاں   بروئے سفرہ کباب دل سمندر کھینچ

اردو زبان ابھی تک فارسی کے ایسے ترجمہ کو جذب کرنیکے لیے تیار نہیں ہے۔ لیکن اسے چھوڑیے یہ میرزا کے خصوصیات سے ہے میرزا نے محض آتش پنہاں کی خاطر سے سمندر کے

دل کا کباب بنا کر دستر خوان کو تو زینت دی مگر جو لوگ اردو زبان کا ذوق سلیم رکھتے ہین اُن کو بد مزہ کردیا۔

خوب وقت آئے تم اِس عاشق بیمار کے پاس ۔۔۔ مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہی ہی

ایک شعر اِسی مضمون کا میرزا صاحب پہلے لکھ چکے ہین بندش بہت سُست ہی مضمون بعینہٖ ہی معلوم نہین میرزا خود کہہ رہے ہین یا کسی دوسرے کی زبان سے کہا ہے

مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں ۔۔۔ حیراں ہوں دلکو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

تخئیل تو وہی ہے جو میر کے شعر میں ہی ؎

اپنی دونوں سے آشنائی ہے ۔۔۔ دلکو روؤں دیا جگر کو میر

لیکن میرزا نے شاید لفظ "پیٹوں" کے اضافہ سے شعر میں کوئی ندرت پیدا کی ہو۔

ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پانون ۔۔۔ بھاگے تھے ہم بہت سو اُسی کی سزا ہی یہ

بظاہر شعر بہت پست ہی اور مضمون مبتذل ہی لیکن میرزا کی اُپچ کا کیا ٹھیک ہے ممکن ہی راہزن سے بھی معشوق مراد ہو اور پاچپی کی خدمت لازمۂ عشق ہو۔

ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں ۔۔۔ اللہ رے ذوق دشت نوردی کہ بعد مرگ

کفن کے اندر خود بخود پاؤں ہلنے کا کوئی ثبوت نہین دیا اور معمولاً خلاف واقعہ ہے ایک نہایت مبتذل شعر جو مشہور عام ہی معلوم نہیں کس نے کہا ہی ؎

تختہ پہ بھر غسل لٹایا اکڑ گئے ۔۔۔ مرنے کے بعد بھی نہ گئی بانکپن کی شان

شدت برودت سے اعصاب کا کھنچ جانا اور مردہ کا اکڑ جانا پھر بھی ممکن ہو لیکن میرزا نے جو کہا ہے وہ ناممکن محض ہی۔

صدرہ آ[illegible]گ[illegible]س قدم ہی ہمکو ۔۔۔ واں پہونچکر جو غش آیا پئے ہم ہی ہمکو

بہیم کی جگہ پئے ہم باضافت جائز بھی ہو لیکن وا[illegible]نہ یہ ثقیل بندش سوائے اپیچ اور ایچا د بندہ ...... کے اور کوئی معنی نہیں۔

تم جانو تمکو غیر سے جو رسم وراہ ہو　　مجھکو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

میرزا نے عاشقانہ مشرب مین جس رواداری کے اصول کی تلقین کی ہے دنیائی عاشقی مین اِس سے پہلے اِس کا وجود نہ تھا۔ اِس جذبۂ رواداری کو اپج کہنا چاہیے اور میرزا کو مصوّر جذبات۔

حاصل سے ہاتھ دہو بیٹھ۔ اے آرزو خرامی　　دل جوش گریہ مین ہے ڈوبی ہوئی اسامی

آرزو خرامی کی ترکیب اور مضمون کا ابتذال دونون کروہ ہیں۔ حاصل سے مراد لگان ہے نادار کاشتکار کو ڈوبی ہوئی اسامی کہتے ہیں جس سے لگان ملنے کی کوئی اُمید نہین ہوتی لیکن اِس زمینداری و کاشتکاری کی تخئیل کو غزل اردو میں جگہ دینا غالباً میرزا نواز جماعت ایک اضافہ (اضافہ لگان) سمجھی ہوگی۔

درد سے میرے ہے تجھکو بیقراری ہائے ہائے　　کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

کیوں مری غمخوارگی کا تجھکو آیا تھا خیال　　دشمنی اپنی تھی میری دوست داری ہائے ہائے

"ہائے ہائے" کو اِن دو شعرون میں بلکہ ساری غزل میں دیکھئے کسقدر لطف دے رہا ہے اسکے سوا شعروں میں اور کچھ نہیں ہے۔

بینس میں گزرتے ہیں وہ کوچہ سے جو میرے　　کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

شعر بہ لحاظ عوام پسندی مزید تعریف سے مستغنی ہے۔

مجھے اُس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی　　کبھی کودکی میں جس نے نہ سُنی مری کہانی

یونہین دکھ کسی کو دینا نہیں خوب۔ ورنہ کہتا　　کہ مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی

دونون شعروں میں اسقدر سادگی ہے کہ اگر میرزا اِن شعرون کو قادرنامہ میں شامل کردیتے تو موزوں تھا۔

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے　　جاں کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے

سایہ کی طرح ساتھ ہی ہے سرو و صنوبر　　تو اِس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے

اُس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے اشارہ — طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے
غارت گرِ ناموس نہو گر ہوسِ زر — کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

گفتگو کرنے کے بجائے گفتار میں آنا نظم فرما کر میرزا ایک عطیہ زبان اردو کو دینا چاہتے ہیں لیکن زبان اردو نے آجتک بھی اِس عطیہ کو قبول و منظور نہیں کیا ہے۔ میرزا پرست ہر اختراع کے مداح ہیں جو میرزا سے منور ہو۔ لیکن کسی مقلد میرزا نے بھی گفتار میں آنے کو رواج نہین دیا۔ بہ لحاظ مضامین ... شعر اسقدر عام ہیں کہ ہر شاعر جو دل و دماغ پر زور نہ دینا چاہتا ہو ایسا ہی لکھتا ہے۔

حُسنِ مہ گرچہ بہ ہنگام کمال اچھا ہے — لیکن اُس سے مرا خورشید جمال اچھا ہے
ہم سخن تیشہ نے فرہاد کو شیریں سے کیا — جس طرح کا کہ کسی مین ہو کمال اچھا ہے
قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے — کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

بظاہر ان معمولی اشعار میں کوئی جدت اور اپج نہیں ہے۔

صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر — جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیے
چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل — بارے اب اِس سے بھی سمجھا چاہیے
دوستی کا پردہ ہے بیگانگی — مُنھ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

ہر شعر کے دوسرے مصرعہ کی بندش نہایت بھدی ہے۔ میرزا کی جدت طراز طبیعت نے اگر ان شعروں میں کوئی گلکاری کی بھی ہے تو ظاہر بین نگاہیں اُسکو ہرگز نہیں دیکھ سکتی ہیں

اِس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا — ہاتھ آئیں تو اُنھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

شعر میں فحش کی جھلک موجود ہے اور قلق لکھنوی کا سا شعر معلوم ہوتا ہے۔

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے — کام ... ہے نہ بنے

دونو مصرعے برابر کے ہیں لیکن یہ نہیں معلوم ہے ... گرا ہے اور کیا کام

درپیش ہے خیر مضمون کچھ ہو یا نہو۔ لیکن شعر کانوں کو بھلا معلوم ہوتا ہے

اسدخوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے   کہا جو اُس نے ذرا میرا پانوٗں داب تو دے
ابھی یہیں راہزن کے پانوٗن دابنے پر میرزا صاحب کو ٹوک چکا ہوں معلوم نہیں
میرزا منشی کے خلاف پانوٗن دابنے کی مبتذل تخیل کی طرف میرزا کو اتنی زیادہ توجہ کیوں ہے۔

کیوں بوتے ہیں باغبان تونبے   گر باغ گدائے مے نہیں ہے
شادی سے گزر کہ غم نہووے   اُردی جو نہو تو دے نہیں ہے
ابن مریم ہوا کرے کوئی   میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی
چال جیسے کڑی کمان کا تیر   دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

کیا اِن اشعار میں کوئی لطافت شعری ہے۔ کیا خواجہ نے جس اُپج کو میرزا کے کلام
کی خصوصیت قرار دیا ہے اُسکا اِن اشعار میں کہیں وجود ہے۔

قارئین کرام۔ ذوق اور غالب کے کلام کے مختلف نمونے آپ ملاحظہ فرما چکے موقع
بموقع میں نے دونوں کے کلام میں مقابلہ کرکے دونوںکے تخیل کے فرق کو بھی نمایاں کر دیا ہے
اب اِس سوال کا فیصلہ کہ اُن محترم شخصیتون سے غزل اردو کس حد تک فیضیاب ہوئی
زیادہ دشوار نہیں ہے میرا اور سودا کی تعمیر میں بہت کچھ نقش و نگار باقی رہ گئے تھے جنکی تکمیل
اُنکی وفات کے بعد ہوئی اِس آخر الذکر تکمیل مین سب سے زیادہ نمایاں حصہ حضرت ذوق
مرحوم نے لیا ہے۔ اُنھوں نے زبان کی صفائی مین حد سے زیادہ کوشش کی۔ مضامین کی
کثرت وندرت سے زبان اردو کو ایک سرمایہ دار زبان بنا دیا۔ فارسی ترکیبون کو نہایت
سلیقہ سے زبان اردو مین منتقل کیا اور جو کچھ کیا وہ خاص وعام مین مقبول ہو گیا۔ ذوق کے بعد
بھی ان کے متلمذین نے اِس کوشش کو جاری رکھا۔ فصیح الملک داغ مرحوم کے مساعی
بھی غزل اردو کے واسطے بہت کچھ قابل فخر ہیں اسلیے یہ کہنا بیجا نہیں ہے کہ حضرت ذوق مرحوم
کے فیوض غیر فانی ہیں اور اردو شاعری خاقانی ہند کے احسانات سے آج بھی منکر نہیں ہو سکتی

میرزا غالب مرحوم کی بابت مین نے دعویٰ کیا تھا کہ اُنھوں نے اردو غزل کی شاعری کو نہایت بیدلی سے انجام دیا ہے۔ اُن کی ضرورت تونگی وجہ سے مجبوراً اُنھوں نے اردو شعرا کی فہرست میں شامل ہونا پسند فرمایا تھا۔ اِس دعوے کو میں نے بہترین دلائل اور براہین سے ثابت کیا ہو جو بظاہر ناقابل تردید ہیں۔ میرزا کے مشکل کلام پر مین نے خود تنقید نہیں کی ہو لیکن معتبر اور متواتر شہادتوں سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ کلام زبان اردو کے واسطے باعث عار ہو۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہو کہ مشکل گوئی میں کم سے کم میرزا وحید اور فرید تھے! در موجد و مجتہد کا درجہ رکھتے تھے۔ یہ بھی صحیح نہیں ہو۔ میرزا کے زمانہ مین عبداللہ خاں اَوج اور مومن خاں مومن موجود تھے ان کی طبیعت بھی مشکل پسند واقع ہوئی تھی یہ حضرات بھی فارسی ترکیبون سے اور کبھی کبھی بندش کی پیچیدگیوں سے اپنے شعر کو معنی سے بعید کر دیتے تھے۔ میرزا کے سہل کلام مین اگر کچھ اشعار جدت وندرت کے حامل ہیں تو اِس سے زیادہ تعداد میں ایسے اشعار بھی موجود ہیں جو نہایت پست ہین جن کو آپ گزشتہ اوراق مین پڑھ چکے ہیں۔ میرزا کے کلام مین تنافر۔ تعقید۔ ضلع کا بھی دخل ہو لیکن میں نے اِس پر زور نہین دیا ہے اگر آپ اِسے تفصیل سے دیکھنا چاہتے ہین تو طباطبائی کی شرح دیوان غالب پڑھیے۔ بعض میرزا پرستون کا خیال ہو کہ جب تک باشوکت الفاظ شعر میں جمع نہ کیے جائین شعر بلند درجہ حاصل نہین کرسکتا لیکن اُن حضرات کو چاہیے کہ صفی لکھنوی اور عزیز لکھنوی کی شاعری کو دیکھین کہ آسان الفاظ سے شعر اور مضمون شعر کس طرح بلند کیا جاتا ہے۔ زبان اردو میر کے زمانے میں جن منزلون کو طے کر چکی تھی ذوق مرحوم نے اُس سے آگے کا راستہ صاف کیا تاکہ زبان اردو آیندہ مدارج کو طے کرکے اعلےٰ کمال پر پہونچ جاسکے۔ میرزا غالب نے اردو زبان کی طرز رفتار کو بہ نظر حقارت دیکھا اور موجودہ راستہ مین جھیل جھانکڑ ڈالکر اُسکو بند کرنا چاہا اور عنقریب ... ایک دوسرا راستہ تجویز کیا اگر زبان اردو اِس نئے راستہ پر چلنا شروع کرے ... پہنچ جاتی جہاں سے میر اور سودا کی رہنمائی میں ابتدا گر چلنا شروع کیا تھا ... ی ذاتی عداوت

نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ گزارش کیا ہے وہ میری آزادرائے ہے۔ ممکن ہے کہ میرزا نواز جماعت میرے اس اظہار رائے کو بہت زیادہ ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھے لیکن مجھے یقین ہے کہ جن لوگوں کو زبان اردو کے ساتھ سچی ہمدردی ہے وہ میری محنت کی قدر کرینگے اور میری راست گوئی کی عزت فرمائیں گے۔

قارئین کرام۔ مین آپ کو یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ میرزا نواز جماعت سے میں کونسی جماعت مراد لیتا ہوں اور وہ کن کن قسم کے اشخاص پر مشتمل ہے۔ اِس جماعت میں تین قسم کے لوگ شامل ہیں۔

قسم اول۔ یہ لوگ نہایت شریف النفس ہیں اور میرزا کی اردو شاعری کی حقیقت حال سے بخوبی واقف ہیں مگر حسن عقیدت اور خلوص محبت کی وجہ سے میرزا کی شاعری کے تاریک پہلو پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں اور صرف اُنکے بہترین اشعار کو روشنی مین لانا چاہتے ہین یہ حضرات حق وصداقت سے زیادہ دور نہیں ہیں اِن میں سب سے زیادہ قابل الذکر خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم ہیں جو میرزا کی تائید تو کرتے ہیں لیکن اُنکی تقلید نہیں کرتے مین ایسے لوگوں کو بھی قابل عزت جانتا ہوں اور اُنکا احترام کرتا ہوں۔ اِس قسم کے لوگونکی تعداد بوجہ وفات کے اب بہت کم ہے۔

قسم دوم۔ یہ حضرات میرزا کے شدید عقیدتمند ہیں اور میرزا کو اردو زبان کا بہترین شاعر سمجھتے ہین۔ لیکن زبان اردو کے ساتھ بھی سچی ہمدردی رکھتے ہیں۔ اس لیے میرزا کے مشکل کلام کو معانی کے زیور سے آراستہ دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ بجا طور پر اسکا داخلہ بزم اردو میں ہو سکے میرزا کی حمایت کے ساتھ ساتھ اُن کو موجودہ قواعد وضوابط زبان اردو سے بھی کافی ہمدردی ہے اور خلاف ورزی کو جائز نہیں سمجھتے ہیں اِسی وجہ سے میرزا کی لغزشوں کو تاویلات وتمثیلات سے حق بجانب ثابت کرنا چاہتے ہیں یہ اپنی کوشش مین کامیاب ہوں یا نہوں لیکن اِن کی ہمت قابل مبارکباد ہے۔ گو میں ان کی رائے سے متفق نہیں ہوں لیکن

ان کے مساعی زبان اردو کے واسطے کسی طرح مضرت رساں نہیں ہیں اس قسم میں مولانا حسرؔت موہانی کی شخصیت بالخصوص قابل تذکرہ ہے۔

قسم سوم۔ یہ وہ اشخاص ہیں جنھوں نے یورپ میں یا ہندوستان میں علوم مغربی کی تحصیل کی ہے۔ اکثر نہایت متمول ہیں۔ اردو شاعری سے انھیں اصلی ذوق نہیں ہے لیکن شکسپیر اور گیٹے کی شاعری پر مفتون ہیں۔ اپنی وضع و لباس اور خورد و نوش کو انگریزی تہذیب کے حوالے کر چکے اب اردو شاعری کو مغربی شاعری پر نثار کرنا چاہتے ہیں حقیقت میں مشرق و مغرب کی شاعری میں بھی بعد المشرقین و المغربین ہے۔ یہ حضرات اپنے ارادہ میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ان کی رائے میں میرزا غالب ہی ایسا شاعر ہے جو زبان اردو کے قواعد کی خلاف ورزی نہیں جری ہے اور صرف میرزا ہی میں شکسپیر بننے کی گنجایش ہے اسلیے یہ میرزا کو نبی اور اُسکے کلام اردو کو الہامی قرار دیتے ہیں یہ اپنی اکثریت اور دولت کی وجہ سے دنیائی شاعری کو مرعوب کر کے اپنا رنگ جمانا چاہتے ہیں۔ اکثر پریس اور رسائل ان کی ملکیت میں ہیں جو ملکیت میں نہیں ہیں وہ ان کے دست کرم سے مستفیض ہیں ایسی باقتدار شخصیتوں سے اختلاف کرنا اور کامیاب ہو جانا کچھ آسان نہیں ہے لیکن میں مایوس نہیں ہوں حق ہمیشہ باطل پر فتح پاتا ہے۔ یہ حضرات زبان اردو کو دوستی کے پردے میں نقصان پہونچا رہے ہیں میں ان لوگوں کا علمبردار ڈاکٹر عبد الرحمن صاحب بجنوری مرحوم کو قرار دیتا ہوں اور بجنوری مرحوم کے خیالات پر کسی قدر وضاحت کے ساتھ بحث کرنا چاہتا ہوں۔

ڈاکٹر موصوف کے جذبات عقیدت میرزا کے ساتھ نہایت راسخ ہیں مرحوم نے میرزا کے ایک شعر کو پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ میرزا اپنے دیوان اردو کو الہامی سمجھتے تھے۔

غالب اگر ایں فن سخن دیں بودے ... آں دیو ... بودے
میرزا تو نہایت لطیف طرز میں یہ کہہ رہا ہے کہ فن سخن ... میرا دیوان

فارسی کتاب الہامی ہے۔ مگر ڈاکٹر بجنوری نے بغیر کسی شرط اور قید کے استعارتاً نہیں بلکہ حقیقتاً مقدس وید اور دیوان غالب (اردو) کو ہندوستان کی الہامی کتب قرار دیدیا۔

وید کی تقدیس اور الہامی تسلیم کو ہمارے مبحث سے کوئی تعلق نہیں ہے اسکا شکریہ آریہ سماجوں ادا کرنا چاہیے۔ میرزا نے اپنے کلام فارسی کو کتاب ایزدی کہہ کر اوسکی فوقیت مین مبالغہ کیا تھا لیکن ڈاکٹر مرحوم نے میرزا کے کلام اردو کو الہامی قرار دیکر میرزا کو پیغمبر سخن کہدیا۔ خدا بجنوری مرحوم کی لغزشوں کو معاف فرمائے یہ اُنکا کہنا کوئی شاعرانہ تخیل نہیں ہے بلکہ غالب کے ساتھ جو اُنھیں حسن عقیدت تھا اُسکا لازمہ یہی تھا۔ ڈاکٹر مرحوم اگر میرزا کے کلام فارسی پر الہامی ہونیکا فتویٰ دیتے تو بھی غلط تھا لیکن غالب کی شاعرانہ تخیل سے کچھ ملتا جلتا ضرور ہوتا ڈاکٹر مرحوم نے میرزا کی تمام شاعرانہ لغزشوں کو تسلیم کرتے ہوئے بھی اُن کو حسن قرار دیا ہے ڈاکٹر بجنوری کہتے ہین "دیوان غالب مین ایسے اشعار بھی ہیں جن کا مفہوم بانی سے ذہن مطلقاً قاصر ہے تخیل عرصۂ امکان میں ہر جانب پرواز کے بعد مجبوراً واپس آجاتا ہے گویا ایک دائرہ ہے جس سے گریز ناممکن ہے بہت سے نقاد اسکو کیف شراب پر محمول کرتے ہیں ایسا نہیں ہے۔ گیٹے کے اعلیٰ ترین کلام پر بھی اعتراض ہر جانب سے کیا گیا تھا۔ ایک دن ایکرمان نے دریافت کیا کہ اِس اشکال کا کیا باعث ہے گیٹے نے جواب دیا یہی تاریکی تو ہے جسپر لوگ فریفتہ ہیں۔ لوگ اِن مقامات پر لاینحل سائل کی مثال پر غور کرتے ہین اور اپنی ناکامیابی سے نہیں اُکتاتے۔ انسانی طلب کی انتہا تحیر ہے اگر کسی فعل سے حیرت پیدا ہو تو وہ کمال فن ہے اور اِس بات پر اصرار نہ کرنا چاہیے کہ اِسکے پس پشت کیا ہے۔ لیکن بچے جب آئینہ میں اپنا عکس دیکھ کر حیران ہوتے ہیں تو نادانی سے پشت آئینہ کو بھی دیکھنے لگتے ہیں"

ڈاکٹر بجنوری دوسرے موقع پر فرماتے ہین "میرزا غالب نے بعض اوقات قواعد کے خلاف زبان لکھی ہے اسکے متعلق سید فضل الحسن حسرت اور علی حیدر طباطبائی نے چند مناسب اور

معقول اعتراضات کیے ہیں لیکن واقعہ یہ ہی کہ قواعد منطق کا خارجی پہلو ہی اور شاعری منطق سے آزاد ہی علم القواعد کا کام تقریر و تحریر میں صحت پیدا کرنا ہی کلام مین لطافت پیدا کرنا نہیں اسلیے بعض اوقات شاعر کو اپنے جذبات کے کامل اظہار کے لیے قیود سے آزادی حاصل کرنا ضروری ہی۔ ڈاکٹر موصوف ایک جگہ لکھتے ہیں "کبھی کبھی ایک ایسا پیغمبر سخن دنیا مین آتا ہی جو نظریات اور قواعد زبان سے آزاد اور صرف روح القدس کا ترجمان ہوتا ہے۔ شکسپیر اور غالب کا کام قواعد زبان کی پابندی نہیں ہی۔ یہ قواعد زبان کا کام ہی کہ اُن کی پابندی کرے یا اُنکی خاطر سے اپنے درسیات مین خاص ضمیمہ جات کا اضافہ کرے" ڈاکٹر بجنوری مرحوم کی رائے میں میرزا غالب نبی تھا اور اُسکے کلام کا اہمال۔ الہام تھا داہمال کو الہام سے اگر کوئی اور نسبت نہیں ہی تو کم سے کم اُلٹ پھیر کر حروف تو واحد ہیں) اور دیوان غالب (اردو) معہ نسخہ حمیدیہ کتاب آسمانی منزل من اللہ تھا (معاذ اللہ) ڈاکٹر بجنوری کو جو واہمہ پیدا ہوا ہی اسی قسم کا ایک وسوسہ ابوطیب بن حسین کوفی عرب کے ایک مشہور شاعر کو پیدا ہو گیا تھا یعنے اُسکا خیال تھا کہ وہ جو کچھ کہتا ہی ایک الہام الٰہی ہی اور ابوطیب دنیائی شاعری کا نبی ہی۔ لیکن اہل بصیرت نے اِس دعائے باطل میں اسکی ہمنوائی نہیں کی اور آج تک وہ تمام دنیا میں متنبی (بنا ہوا نبی یا جھوٹا نبی) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ افسوس ہے ڈاکٹر بجنوری کے ہم خیالوں نے غالب کے نبی ماننے مین ذرا بھی پس و پیش نہیں کیا بلکہ بغیر سوچے سمجھے بجنوری صاحب کی آواز پر لبیک کہا۔ باایں ہمہ بھی ڈاکٹر بجنوری کا طریقہ استدلال نہایت نادر ہی اُنکی رائے میں میرزا کا بے معنی یا مہمل المعنی کلام بھی معجزہ نبوت ہی (معاذ اللہ) قواعد زبان اردو کی خلاف ورزی بھی میرزا جیسے مہتم بالشان نبی (معاذ اللہ) کے واسطے لازمی تھی۔ میرزا روح القدس کا ترجمان ہی اور اُسکے کلام کے لحاظ سے قواعد زبان میں ترمیم ہونا چاہیے ... ن استدلالات پر مولانا بیخود بھی غور فرمائیں اگر انکی رائے میں ڈاکٹر صاحب ... نام کو بامعنی اور باقاعدہ ثابت کرنے کی مساعی کوہ کندن وکاہ برآوردن ہیں ... بی ہے کہ اگر میرزا کے

کلام پر سے الزام ہٹ گیا تو اُنکا کلام الہام کے درجہ سے گر جائیگا (معاذاللہ) فی الحقیقت ڈاکٹر بجنوری مرحوم نے نہایت آسان طریقہ سے تمام اعتراضات کا قلع قمع کردیا جو میرزا کے کلام پر وارد کیے جاتے تھے اور میرزا کو مرتبۂ نبوت سخن میں حاصل ہو گیا۔

قارئین کرام۔ آپ کا تعارف میرزا نواز جماعت سے ہو گیا۔ اِس جماعت کی جدوجہد نے نثر اردو پر بھی زبردست اثر کیا ہے اور عجب نہیں کہ وہ بھی الہام وابہام کا درجہ حاصل کرلے۔ النا ظر نومبر و دسمبر ۱۹۲۵ء میں ایک مضمون "گلابی اردو" شایع ہوا ہے۔ فاضل نامہ نگار نے اپنے نام کو اشارات میں ظاہر فرمایا ہے لیکن ع۔ ہم سمجھ لیتے ہیں مضمون خط کا عنواں دیکھ کر

اِس مضمون میں نثر اردو کے چند نمونے پیش کیے ہیں شائقین خود النا ظر میں مضمون کو پڑھیں بنظر طوالت اِن اوراق میں اُسکے نقل کرنیکی گنجائش نہیں ہے۔ غالباً اُس مضمون کو پڑھ لینے کے بعد اِس نتیجہ پر پہونچ جانا آسان ہوگا کہ اب اردو نثر کو بھی عام فہم معانی سے عار و ننگ ہے اور اگر یہ سلسلہ بغیر روک ٹوک کے جاری رہا تو کوئی شک نہیں ہے کہ زبان اردو کی حالت بد سے بد تر ہو جائیگی۔ اُس مضمون میں۔ ارتعاش ملتجی اور لرزہ مسترحم۔ تراکیب جدیدہ کو ملاحظہ فرمائینگے جو موجودہ انشاپردازوں کی خود روی اور ایجاد و اجتہاد کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔

اِن حالات کو دیکھتے ہوئے ایک خادم زبان اردو کا فرض تھا کہ وہ عام و خاص کو اُن خطرات سے آگاہ کرے جو زبان اردو کی ترقی میں سدراہ ہیں ورنہ میرزا غالب کو دنیائے شاعری سے رخصت ہوئے ۵۰ برس ہو چکے مرحوم کے کلام پر آج اسقدر سخت تبصرہ کی ضرورت نہیں تھی۔ قارئین کرام۔ میں اپنے دعوے کا اعادہ کرتے ہوئے مضمون کو ختم کرتا ہوں اور فیصلہ آپکی رائے پر چھوڑتا ہوں "ذوق مرحوم میر علیہ الرحمۃ کے بعد اردو غزل کا سب سے زیادہ کامیاب شاعر تھا"

امیر بدایونی

حضرت امیر بدایونی کی دو کتابیں

اسلام بجواب ترک اسلام

عبدالغفور دھرمپال جی برہمچاری نے اپنی کتاب "ترک اسلام" میں قرآنی تعلیم پر جو اعتراضات وارد کیے تھے، قاضی غلام امیر صاحب نے مہذب پیرایہ میں قانون فطرت اور کتب وید دونوں کی رُو سے اُنکا مدلل اور مفصل جواب اس نام سے شایع کیا ہے۔ ان اعتراضات کی تردید کے ساتھ ہی ہندو قوانین مذہب کے ناقابل عمل ہونے، گوشت خوری کے جواز، قیامت، بہشت، دوزخ، فرشتے، اور معجزات پر تحسین اور پُر از معلومات بحث کی ہے، اور نہایت خوبی کے ساتھ تعلیم قرآنی کی افضلیت کا مسکت ثبوت پیش کیا ہے۔ قاضی صاحب نے یہ نادر رسالہ لکھ کر محض ترک اسلام کی تردید ہی نہیں کی ہے بلکہ مسلمانوں کے لیے آریہ سماجی مذہب سے ضروری واقفیت کا ذخیرہ بھی بہم پہونچا دیا ہے۔ قیمت ۱۲ار

ریویو

اس کتاب میں قاضی صاحب نے آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند جی مہاراج کی سوانحعمری مع اپنی فلسفیانہ تنقید کے عوام کی واقفیت کے لیے شایع کی ہے اور مدلل طور پر ثابت کیا ہے کہ نہ سوامی جی نے توحید کا صحیح خیال پیش کیا، نہ ہندووں کو چھوت چھات اور ذات پات کی قیود سے آزاد کیا، نہ اُنکی وید کی تفسیر کوئی اہمیت رکھتی ہے، نہ اُنکا سماج عرصہ تک قائم رہنے والا ہے، اور نہ خود اُنھوں نے سنیاس کے سچے اصولوں کی پابندی کی۔ اس کتاب کے مطالعہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سوامی جی خود مہارشی نہیں بن بیٹھے بلکہ ایک تعلیم یافتہ گروہ نے ہندومت کو قابل اصلاح دیکھ کر دیانند مہراج کو مہارشی کی منزلت پر پہونچا دیا اور اپنے اصلاحی اغراض کے لیے اُنکو آلۂ کار بنایا۔

یہ کتاب ہر حیثیت سے سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ — قیمت عہ ر

ملنے کا پتہ

الناظر بک ایجنسی۔

بسم اللہ

فہرست مضامین بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۶ء

نمبر ۶ — جلد ۳۱

ناظرین الناظر سے التماس

الناظر بابت جولائی لغایت دسمبر ۱۹۱۷ء کی دفتر کو سخت ضرورت ہے۔ ایک کتاب کی اشاعت تقریباً چھ ماہ سے اس جلد کے نہ ہونے کی وجہ سے رکی ہوئی ہے۔ اگر متفرق پرچے مل سکیں تو اور پوری جلد یکجائی مل جائے تو ہر صورت میں دفتر کو درکار ہیں۔ قیمتاً علیحدہ نہ کرنا چاہیں تو کوئی صاحب مستعار دیدیں۔ مصارف ڈاک دفتر سے ادا کر دیے جائیں گے، اور اپنا کام نکال کر جلد واپس کر دی جائے گی۔ مجھے امید ہے کہ احباب فوراً توجہ فرما کر ممنون بنائیں گے۔

ظفر الملک

نئی کتابیں

مضامین شرر

مولانا شرر مرحوم کے مشہور رسالۂ دلگداز کے تمام مضامین اپنی نوعیت کے لحاظ سے علحدہ علحدہ مجلدات میں جمع کردیے گئے ہیں اور صفائی کے ساتھ چھاپے گئے ہیں حسب ذیل مجلدات موجود ہیں :-

مضامین شاعرانہ و عاشقانہ - جلد اول عگہ دوم عہ

آغاز و اختتام سال عہ

تاریخی وجغرافی مضامین - جلد اول عگہ دوم عہ

مشرقی تمدن کا آخری نمونہ - یعنی گذشتہ لکھنؤ عگہ

سیر رجال - مشہور اکابر کے حالات عہ

نامور خواتین کی سوانحعمریاں جلد اول عہ جلد دوم عہ

ادب و تحقیق مسائل عہ

اصلاح قوم و ملت عہ

تاریخی واقعات پر خیال آرائی عہ

نظم و ڈراما عہ

معتزلہ

معتزلہ اور اُنکے عروج وزوال کے متعلق مولانا عبدالحلیم شرر مرحوم نے مسلم اکیڈمی لکھنؤ میں ایک محققانہ لکچر دیا تھا - اب اسے دلگداز پریس نے عوام کی واقفیت کے لیے شایع کردیا ہے - لکچر کے اخیر حصہ میں ہندوستانی مسلمانوں کے اعتزال سے نہایت مفید بحث کی ہے اور کارآمد مشورے دیے ہیں - قیمت ۱۲ر

تصانیف خواجہ عشرت

ہمجولی - عورتوں میں شریفانہ خیالات اور اصول تربیت و خانہ داری کی اشاعت کے لیے خواجہ محمد عبدالروف عشرت لکھنوی نے عورتوں کی زبان میں بہت سے اصلاحی افسانوں کا مجموعہ ہمجولی کے نام سے شایع کیا ہے - ہمجولی کے قصے اتنے دلچسپ ہیں کہ کتاب کو دوبارہ شایع کرنا پڑا - اور مصنف کو اس کتاب کا دوسرا حصہ لکھنے کی ضرورت پڑی - قیمت حصہ اول عہ دوم عہ

مضمون نویسی - اُردو کی زباندانی اور علم بیان کے قواعد پر محقق زبانِ اُردو خواجہ محمد عبدالروف عشرت لکھنوی نے یہ نادر کتاب تصنیف فرمائی ہے - اسکا مطالعہ صحیح انشاپردازی اور بامحاورہ زبان لکھنے کے لیے بہت مفید ہے - قیمت ۸ر

چوتھی کتاب - مستند الشعرا خواجہ محمد عبدالروف عشرت لکھنوی نے شاعری کے قواعد کی کئی مفید کتابیں لکھی ہیں جن سے بغیر اُستاد کے عروض و قافیہ کے اصول سمجھ میں آجاتے ہیں اور مبتدیوں کو صحیح تقطیع میں آسانی ہوتی ہے - یہ کتاب اسی سلسلہ کی چوتھی کڑی ہے - ... شعر کے عیب و حسن، لفظی او رمعنو ... ہے - یہ مفید سلسلہ ملک ... ہو رہا ہے - قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ :- منیجر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۶ جلد ۳۱ —— دسمبر سنہ ۱۹۲۶ء

پانچ ناول نگار

"ذرا انسان پر غور کیجیے کہ اُس نے سیکڑوں جیتی جاگتی ہستیاں یا کیرکٹر پیدا کیے ہیں - ان میں سے ہر ایک، ایک دوسرے سے اصلاً یا کلیۃً جداگانہ ہے - اور پھر یہ سب بالکل اصلی، سچ مچ زندہ اور بیحد دلکش اور کبھی کسی صورت میں کوئی بات ان میں خلاف فطرت نظر نہیں آتی اور معمولی ادب میں اس قسم کا ایک کیرکٹر بھی پیدا کرنے کے یہ معنی ہیں، کہ اَمٹ ادب کی چیز پیدا کر دی - ایسی شہرت حاصل کر لی جو صدہا سال باقی رہیگی - ایسا کارنامہ پیش کیا جو قدرت الٰہی کے لگ بھگ ہے - یہ وہ کام ہے جو ایک دیوتا کے کام کی طرح جان کا ڈالنا ہے۔"

Lafcadio Hearn, Interpretations of Literature volume ii

"میں اس بات کا دعویدار نہیں ہوں کہ کسی بڑے مصنف میں بحیثیت مصنف کے کوئی بڑی خیال کی گہرائی یا نظر کی پہنائی یا فلسفہ یا دانشمندی یا فطرتِ انسانی کا علم یا انسانی زندگی کا تجربہ ہونا چاہیے - حالانکہ یہ ایسے اضافی عطیے ہیں جو اگر کسی بڑے مصنف میں ہوں تو وہ اُسکو اور بھی بڑا بنا دیں گے - لیکن میں جس چیز کو بڑے مصنف کا امتیازی عطیہ سمجھتا ہوں، وہ وسیع معنوں میں اظہارِ خیال

کی قوت ہے۔ وہ قادر الکلام ہوتا ہے۔ یعنی کلام کے دونوں پہلو، خیال اور لفظ
کا اُستاد ہوتا ہے۔ یہ دونوں پہلو اگرچہ بالکل جداگانہ ہیں، لیکن ایک دوسرے
سے جدا نہیں کیے جا سکتے .... اُسکو ہر صحیح خیال کے لیے صحیح لفظ ہمیشہ
مل جاتا ہے۔ اور اُسکی تحریر میں ایک لفظ بھی ضرورت سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اگر
وہ اختصار پر آتا ہے، تو اس لیے کہ چند لفظ کافی ہیں۔ اگر لفظوں کی گنگا بہاتا ہے
تو بھی ہر لفظ اپنے موقع سے ہوتا ہے۔ اور اُسکی فصاحت کے زبردست بہاؤ میں
میں مدد دیتا ہے، رُکاوٹ پیدا نہیں کرتا۔ وہ وہی باتیں کہتا ہے جو سبھوں کے
دلوں میں ہوتی ہیں لیکن سب ادا نہیں کر سکتے۔ اور اُسکے جملے لوگوں میں کہاوت
بنجاتے ہیں اور اُسکے فقرے، روزمرہ یعنی گھر لو بول چال اور محاورے بنجاتے ہیں"

Newman: Lectures & Essays on University Subjects: Lecture on Literature.

کہانی اور انسان

کہانی کہنے یا سُننے کی چاٹ خواہ کسی طرح بھی اولادِ آدم کو لگی ہو، واقعہ یہ ہے کہ ہے مزے کی چیز! اِس چاٹ کی اگر منطقی موشگافی کے ساتھ ساتھ گہری جانچ پڑتال ہو، تو ممکن ہے ہمیں بہت سی باتیں کھُل جائیں، لیکن ایک تو مضمون "زلفِ یار" کا سا طول کھینچتا جائے گا، جس میں بقول ہمارے شعراء، ایک مرتبہ اُلجھ کر نکلنا آسان نہیں، دوسرے یہاں پر مضمون کا اس پہلو سے پھیلایا جانا بھی بے جوڑ سی بات سمجھی گئی۔ یوں اگر سائن ٹی فِک چھان بین نہ بھی ہو، تو میں نہیں سمجھتا اسکے یہ معنی ہو سکیں گے کہ کہانی کہنے یا سننے کی زبردست اور آفاقی (Universal) چاٹ سرے سے اتنی ہیچ ہو جائے کہ وہ ہمارے بھاویں ہی نہ ہو۔ یہ روزمرہ ظہور میں آنیوالی سدابہار ذہنی لپک قدیم الایام سے ہمارا ساتھ دے رہی ہے۔ تاریخ عالم کے ابتدائی سے ابتدائی صفحے بھی اس ذکر خیر سے خالی نہیں، پھر اس پاسداری
کے تو یہ معنی ہیں کہ آپ بھی اور کچھ نہیں تو شرما شرمی ہی روا ... یہ ضرور نہیں کہ ایک
اتنی پُرانی رفیق زندگی کو نفسیاتی نقطۂ نظر سے ہی پرکھ ... ں ورنہ ایکدم سے
مُنہ موڑ لیں۔ اُس کا پاس رفاقت تو دیکھیے کہ روزِ اول ... دامنگیر ہے تو ہٹائے
نہیں ہٹتی!

غرض فطرت انسانی کی یہ پرانی اور آفاقی چاٹ جو سایہ کی طرح لگی لپٹی چلی آتی ہے، کبھی بھی بھلائے نہیں بھولی اور نہ بظاہر بھلائی جا سکتی ہے۔ بلکہ غور کیجیے تو زندگی کے ہر دور میں اس سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ حتیٰ کہ بچپنے کی معصوم گھڑیاں بھی خالی نہیں۔ جوں جوں انسان کا مذاق بدلتا جاتا ہے، یہ بھی بھانت بھانت کے روپ بدلتی رہتی ہے۔ کون ایسا ہے جس نے بچپنے میں "چڑیا چڑے" کی سی تحفہ کہانی نہیں سنی؟ اس کہانی کا خصوصاً وہ چٹخارے دار مکالمہ ـــــ

"چڑا (گھی لیکر آتا ہے) چڑیا! چڑیا! کنڈی کھول؟"

"چڑیا (کھچڑی کھا، پی آنکھوں میں تیل ڈال لیتی ہے) دور موئے میری آنکھیں دکھتی ہیں ـــــ"

عجب چٹپٹی چیز ہے! ایک زمانہ ہوتا ہے کہ یہ "کھچڑی" نہیں! اس کا مزیدار ذکر ہی خوش ذائقہ بریانی سے کہیں زیادہ اچھا معلوم دیتا ہے۔ واقعی اس کہانی کے قابل رشک طول زندگی کا اس سے بڑھ کر اور کیا پکا ثبوت ہو سکتا ہے کہ گو عمر کے ساتھ ساتھ مذاق بدلتا جاتا ہے اور یہ سہانی کہانی حالانکہ پھیکی اور خوش فعلی نظر آنے لگتی ہے لیکن پھر بھی کچھ اتنی مجبوری سی ہوگئی ہے کہ خیال سے دور نہیں ہوتی۔ شاید ہی کوئی ایسا ہو تو ہو کہ یہ کہانی سنے اور اسکے چسکے سے اتر جائے ورنہ پتھر کی لکیر کی طرح جب دیکھو ہمہ شما سب کی یاد میں موجود!

کہانی کے درجے

خیر، تو ذکر تو یہ تھا کہ کہانی والی چاٹ جدید پرانی اور ہمہ شی ہے اور انسان جوں جوں ارتقائی کینچلیاں بدلتا رہا، یہ بھی بیسیوں روپ بدلتی رہی۔ اردو بولنے والی دنیا میں آج اسکی یوں رونمائی ہوتی ہے کہ بچپنے کے معصوم زمانہ میں "چڑے چڑیا" جیسی کہانیوں پر جی لوٹ لوٹ جاتا ہے: ذرا بڑھے۔ اور ذوق سخن بدلا تو "انوار سہیلی" "باغ و بہار" اور "فسانۂ آزاد" کی سی کہانیاں سن کر باچھیں کھلنے لگیں، جوانی دیوانی آتی ہے: تو ایک دم سے دنیا سے ذوق ہی بدل دیتی ہے: یعنی طلسم شباب کی ہوش ربائیاں "ایک صنم آباد الفت دپرستش" نظروں کے سامنے لے آتی ہیں، ہر مندر اجبین نیاز کا طالب اور ہر ہر تی تن من دھن چھین لینے پر آمادہ نظر آتی ہے۔ غرض چپہ چپہ سے

"شہر سیت پر زخوباں و ز ہر طرف نگارے
یاراں صلائے عام ست گرمی کنید کارے"

کی گونج کانوں میں سما جاتی ہے۔ اسوقت انسان ایک ایسے عالم میں سے گویا گذرتا ہے جس میں بیخبری و حیرانی منٹ منٹ کو اپنا افسوں پھونکتی ہے۔ سرمستی جنون شباب کا ہاتھ پکڑ پکڑ کے ہوس

اور ولولوں کی مدبھری گلابیاں خالی کراتی جاتی ہے۔ مزاج کی جب یہ کیفیت ہو جائے تو جس قسم کی کہانیاں جی لُبھا سکیں گی معلوم! اس لیے اگر میں غلطی نہیں کرتا اور آپ بھی بُرا نہ مانیں تو ایک بات کہوں یعنی یہی کہ حضرات شرر اور حکیم محمد علیخاں کی قریب ساری موہنی کہانیاں، اُن کی اور خصوصیتیں جنھیں آگے دکھاؤں گا چھوڑ کر میری جانم میں تو یاروں کے لیے "ملاے عام" کا حکم رکھتی اور "کام" کو گرما دیتی ہیں!

لیکن یاد رہے "زندگی ایک مسلسل ارتقاء ہے" - "جسمانی، ذہنی اور روحانی"۔ عہد شباب کی صبح جس طرح بڑھتے بڑھتے دوپہر ہوتی ہے: ڈھل بھی جاتی ہے، اور یہی بُڑھاپا ہے۔ "جسکے آنے پر کوتاہ خیال اور محض مسرت پرست اوسان باختہ ہو جاتے ہیں"۔ لیکن سوچیں تو پتہ چلے کہ "بڑھاپا انسانی زندگی کا بہترین زمانہ ہے، اس لیے کہ اس ارضی زندگی میں انسانی ارتقاء کا یہ وہ آخری پھل ہے" جسے سوچ سمجھکر چکھا جائے تو ایک دوسری ہی زندگی کا مزہ آنے لگتا ہے۔ اچھا، یہ عالمگیر کیف کالے کوسوں دُور بھی جس خوبصورتی سے محسوس ہوا، سننے کے قابل ہے۔ سات سمندر پار سے ایک بزرگ کی آواز ان الفاظ میں ہم تک پہونچی ہے۔ سنیے گا "

"ماضی کا زمانہ خواہ وہ بزم عیش ہو یا بزم غم تجربہ کا زمانہ تھا، جس سے میں تجربہ کار رہنا، اور اب نفع و نقصان کی تمیز کر سکوں گا۔ جوانی کی خواہشات اور جذبات کی بھڑکتی ہوئی آگ نے اب تک آنکھیں خیرہ کر رکھی تھیں، وہ جل کر بھسم ہو گئی۔ جو کچھ اب باقی رہ گیا ہے راکھ نہیں! کردار کا خالص سونا ہے"

تو خلاصہ یہ کہ زندگی کے اس اسٹیج میں بچپنے کا بھولا پن ہی چمپت نہیں ہو جاتا، جوانی والے جذبات اور ولولوں کا پردہ بھی آنکھوں پر سے اُٹھ جاتا ہے۔ نہ چڑیا چڑے ہی کی کہانیوں میں اب دل لگتا ہے اور نہ پُرجوش نازنین کی سی چلبلی، چنچل اور جذباتی (Sentimental) داستانوں ہی میں مزہ آتا ہے، بلکہ یہ جی چاہنے لگتا ہے کہ یہاں جو کچھ ہو سوچ میں ڈوبا، جچا تُلا، ٹھیک ٹھاک ہو۔ اور ساتھ ہی ماضی کا تجربہ ہمارے ہر فعل کو جہاں تک ہو سکے کندن سا چمکاتا جائے: غرض طبیعت اپنے آپ اصلیت کی پر چول پر پل پڑتی ہے۔ عقل کی پختگی اور وسعتِ نظر کے لحاظ سے یہاں دوسری ہی قسم کی کہانیاں جی کو بھانے لگتی ہیں۔ لیکن ہر کلیہ کے چند مستثن[illegible] ہوتے ہیں، اس لحاظ سے یہ کہنا ناموزوں نہیں ہو سکتا کہ جس طرح عالم جوانی میں [illegible] ایسے نکل آتے ہیں جو شباب کے نقار خانے تک میں بھی سوچ میں ڈوبی [illegible] تے اور خوش ہوتے،

یا اپنی طبع خداداد کے بل پر ایسی کہانیاں کہہ کہہ کر دوسروں کو خوش کرتے ہیں - اسی طرح بڑھا یا بھی کم سواد بوڑھے بچوں اور بچکانہ منشوں سے خالی نہیں - مگر یہ میں اوپر کہہ آیا ہوں کہ ایسے لوگ مستثنیات میں سے ہوتے ہیں - مجھے یہاں عام اصول ابھار کر دکھانا مقصود تھا، عقل مندوں یا بیوقوفوں کی مردم شماری سے سروست کام ہی نہیں!

اچھا، خود یہ اوپر والی مستثنیات بھی اصولی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں - یعنی جوں جوں علم یا جہالت کی روشنی یا تاریکی سماج کو گھیر لیتی ہے، یہی اٹل اصول بنتی جاتی ہیں - کوئی ایسا سماج لیکر دیکھ لیجیے جس پر پورا پورا علمی رنگ رچ گیا ہو، آپ دیکھیں گے کہ اس میں سلامت مذاق اور اصابت رائے کے لحاظ سے بیسیوں جوان بوڑھے ہیں - گویا انکے شباب کا سارا اُبال آپ کو سلامتِ ذوق کے نازک نازک شیشوں میں جھلکتا اور چھلکتا دکھائی دیگا - برخلاف اسکے تصویر کا رخ "تیرگوں" آپ دیکھنا چاہیں گے تو ایک آدھ سماج ایسا بھی آپ کو ضرور مل جائے گا جو جہالت کی بسلی نکبت میں پڑا، ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہو، اور جو میرے خیال میں سماج کی سب سے بڑی بخبتی ہے -

حضرت سیدؒ اور اردو اگر آپ اس اوپر والے استدلال کو مثال کے ذریعہ سے ذہن نشیں فرماتے چلیں تو میرا خیال ہے زیادہ مناسب ہو - مثال کی تلاش میں بھی بظاہر زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں - کیوں؟ کہ خیر سے ہندوستان موجود ہی ہے! یہ اگر زندگی کا روشن رخ نہیں دکھا سکتا تو کیا تاریک رُخ سے بھی گیا گذرا ہوا؟ اچھا، اب ہم ہندوستان کو تمثیلاً لیے لیتے ہیں ہمیں اول اول تو یہ شہنشاہیت کے اورنگ جلالت پر متمکن نظر آتا ہے، جہاں غرب قرب ہر قسم کی چہل پہل ہے - مگر ساتھ ہی بربادی و تباہی کی مہلک دیمک بھی اس اورنگ جلالتماب کو چاٹتی دکھائی دیتی ہے - اور بالآخر حوادث کے ایک زوردار تھپیڑے سے تو یہ نیچے ہی آ رہتا ہے - چونکہ زیادہ اُنچائی سے گرا تھا، اس لیے "اسفل السافلین" کی تاریکی میں جا اُترےگا - اس پر ستم ظریفی یہ ہوئی کہ بیگانہ قوتوں کے دباؤنے اُس کا رہا سہا بھی زور توڑ ڈالا - بالخصوص زبانِ اردو، جسکو پیدا ہوے جمعہ جمعہ آٹھ روز سے زیادہ نہیں ہوے تھے اور جس کا ابھی ادبی تتلانا بھی نہیں گیا تھا، کہ اس مصیبت میں مبتلا ہوگئی - مختصر یہ کہ واقعۂ غدر کی الٹ پلٹ میں کیا خود اردو اور کیا اردو بولنے والے دونوں کا کچومر نکل گیا - وہ تو خدا بھلا کرے ایک خوش اوصاف مردِ میدان اور سچے شیدائے وطن سیدؒ کا، جس نے اس ابتلائے عظیم سے خاص طور پر متاثر ہوکر ایک طرف تو ہمیں سہارا سہارا کر قعرِ ہلاکت سے اُبھارا، دوسرے علی گڈھ کی مبارک سرزمین میں ایک مادر علمی کو لا کھڑا کیا - جس نے اپنی گود

میں تھپک تھپک کر ادبی گھگی کو بھی دُور کیا اور ادھر ادب اُردو نے بھی چونچال ہو کر ہاتھ پیر مارنے شروع کیے۔ یہاں تک کہ سماجی چہرہ پر اُردو کے آثار صحت کا نور جھلکنے لگا۔ یہ پانچ ناول نگار جنکا اس مضمون میں تعارف کرانا مقصود ہے۔ اور انکے علاوہ بھی کئی اور مصنفین جنکا نام گنوانا یہاں ایک بےموقع بات ہے "سیدی دَور" کے ہی پیداوار ہیں۔ پیداوار سے میرا مطلب اُس سوئی ہوئی پٹیک کا جاگ جانا ہے جس سے عام کلچر اور اس لیے زبان منجھی جائے۔

ناول غرض یادس پخیر اعلی گڑھ کے آغوش محبت میں جب ادب اُردو اس طرح پل کر بڑی ہوئی اور اُس نے نئی نئی ادائیں دکھانی شروع کیں، تو بڑے بڑوں کی رال ٹپکنے لگی۔ ہر ایسا شخص جو بےادبی معاف! ادبی خواجہ سرا نہ تھا!! اس سے ہم کنار ہونے کی آرزو کرنے لگا، اور ہندوستان میں جابجا اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ سُنا گیا ہے غدر کے بعد سب سے پہلے اس نازنیں کا تعلق مقدس سرسیدؒ سے ہوا، جنکے فیض تصرف سے یہ اپنی بڑی بوڑھیوں یعنی علمی زبانوں سے آنکھ ملانے لگی۔ اس قدر افزائی سے ایک تو بڑا افائدہ یہ ہوا کہ اسکے ادبی نازو انداز انجان طور پر دن دُونے رات چوگنے ہوتے گئے۔ دوسرے، تھی بھی یہ بلا کی چرتر، چاہت کی جو بھر مار دیکھی تو جو اور جہاں دلکش ادا ہاتھ لگی، اس نے جان بوجھ کر اُڑالی۔ چاہنے والوں کی نت نئی فرمائشیں اسپر مستزاد تھیں۔ اس لیے کہ وہ زبان عربی، فارسی، انگریزی اور فرانسیسی کی نازک خیال نازنینوں کے جھرمٹ میں سے جب ہوتے ہُواتے آتے تو اُنھیں ساری کی ساری اداؤں کو اُردو میں ڈھونڈتے، اَوروں سے تو یہاں بحث نہیں، پنڈت جی سرشار، حکیم محمد علیخاں، شمس العلما نذیر احمد، مرزا رسوا، اور شرر جیسے خوش صفات حضرات پھسل پڑے۔ سُنا ہے، ان سب کو کہانی کہنے والی ادا نے بڑی حد تک لُبھا لیا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ ناول (ادبی کہانی) کی طرف مائل ہو گئے۔

ادب اُردو میں "ناول" انگریزی زبان سے لیا گیا ہے۔ خود انگریزی میں یہ لفظ "نوویلس" سے مشتق ہے: جو لاطینی زبان کے لفظ "نوَوس" کا مخفف ہے۔ نوَوس کے معنی "نئے" کے ہیں کہا جاتا ہے کہ یہ لفظ بھی اطالوی زبان کے لفظ "نوِوی لا" سے لیا گیا ہے: ادب انگریزی میں انسانی افعال و کردار کے مطالعہ کا نام ناول رکھا گیا ہے۔ ناول چونکہ گذشتہ یا روزمرہ واقعات پر مبنی ہوتا ہے، اس لیے اسکو "آئینۂ زندگی" کہا جا سکتا ہے ... ر پلاٹ اگرچہ بیشتر
فرضی ہوتے ہیں مگر اصل میں یہ سارے کے سارے انسا ... ڈں کے حال ہوا
... تے ہیں۔ یعنی انسان جو کچھ دیتا، کرتا دھرتا، اور دیکھتا بھا ... ات میں سے سچی سچی

باتوں کی ایک خاص حیثیت سے نمایندگی، ناول کے مفہوم میں داخل ہے۔
یا یوں سمجھیے کہ ناول ایک ترقی یافتہ کہانی ہے، جو سماجی تعلقات پر مبنی ہے۔
اور نثر میں کہی گئی ہو۔ اور جو اگرچہ تاریخی نقطۂ نظر سے لفظ بلفظ تو صحیح نہیں ہوتی، تاہم اتنی لگ بھگ ضرور رہوتی ہے کہ ذرا سے رد و بدل سے وہ تاریخ بن سکتی ہے۔ فی زمانہ ناول ادب لطیف کے ڈھالنے کا نیا سانچا بنگیا ہے، لیکن اس سانچے کو ایسا شخص ہی خوبصورت بنا سکتا ہے اور اس میں ادب لطیف کو ڈھال سکتا ہے جو خود پوری طرح بھلمنساہیت میں بس گیا ہو، تاکہ وہ سماجی رسم و رواج کی نت نئی تصویریں اُتار اُتار کر اُنھیں متانانہ اور ناقدانہ دیکھ سکے، اور تجربہ کے مختلف رنگوں میں ادب لطیف کا شوخ پن شامل کر کرکے تصویروں کا حُسن دوبالا کرتا جائے: یوں ناول، ہجو، تعلیم، سیاسی اور مذہبی تلقین، اور اصطلاحی معلومات کا بھی ذخیرہ بن چکا ہے: لیکن یہ ساری اضافی باتیں ہیں، اسکا سیدھا سادھا اور بالراست کام یہ ہے کہ سماجی زندگی کے مختلف سینوں کو یہ نفس کی پلیٹس پر اس طرح اُتارے کہ ایک تو نیچر کے شوخ رنگوں کی قدرتی رنگارنگی ہاتھ سے نہ جانے پائے، دوسرے یہ سارے کے سارے سین نہیں! در شہسوار ہنرمندانہ زورِ قلم کے ساتھ حُسن بیان کی ایک ہی نازک لڑی میں پرو دیے جائیں!

قولِ مذکور آج مغربی دنیاے ادب کا مکمل اور محبوب تصور ہے، جسے "ناول" کا نام دیا گیا، اس میں منجملہ اور باتوں کے ناول کے صحیح تصور کے لیے جن اساسی اور اہم اجزاء کا پتہ چلا، وہ یہ ہیں:— پلاٹ، کیرکٹر، قوتِ اظہار۔

پلاٹ پلاٹ کو ناول کی داغ بیل کے نام سے تعبیر کیا جائے، تو میرا خیال ہے اسکی صحیح صحیح ترجمانی ہو جائے گی۔ واقع میں یہی مختلف راہوں کا وہ باکیف مجموعہ ہوتا ہے جن پر ایک ناول نگار کی پیدا کی ہوئی ہستیوں (کیرکٹرز) کو چلنا پھرنا ہے، اسکی سمجھداری اور کامیابی کی یہ نشانی ہے کہ وہ ان راہوں کو اپنے کیرکٹر کے لحاظ سے متناسب و موزوں بناتا جائے۔ اور ساتھ ساتھ جب ان سب کو ایک جا اکٹھا کرے تو پوری سلیقہ مندی سے بھی کام لے، تاکہ یہی مجموعہ باعتبار لطافت "ایک ایسا خوبصورت گلدستہ بن جائے، جس کی ساخت میں نہایت خوشرنگ اور نازک نازک پھول پتیاں صرف ہوئی ہوں" ایسے پھول پتیاں جن کی نزاکت و خوشرنگی بجاے خود بھی دل لبھا ہو، مگر بحیثیت مجموعی تو ایک پُرشباب دلدار کی طرح بے قابو بنا دے!

کیریکٹر کیریکٹر کے معنی "تخیلی پیکر" پیدا کرنے کے ہیں، انکی پیدائش کا ذکر امام ڈرامہ یعنی شیکسپیر نے کیا ہے، میں اسے محترمی جناب مولوی محمد عظمت اللہ خاں صاحب بی۔اے کی زبانی آپ کو سنانا چاہتا ہوں، ذرا سنیے گا کیا چیز ہے!

"کوی کی نفیس آنکھ وارفتہ سی گھومتی
نظر ڈالتی ہے زمیں پر کبھی آسماں پر
تو جوں جوں تخیل میں ڈھلتی ہیں انجانی اشیا
کے پیکر۔ کوی کا قلم انکی شکلیں بنا کر
مقرر بھی کرتا ہے ان خواب سی ہستیوں کا
مقام ایک بسنے بسانے کو اور ایک نام"

تو اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ تخیلی پیکروں کا پیدا کرنا شاعری ہے، اور اگر ایک ناثر بھی اپنے میں اتنی قوت رکھتا ہے کہ تخیلی پیکر پیدا کر دے تو میرے خیال میں اس اوپر والے نتیجہ کا بھی یہ نتیجہ ہوگا کہ ایسا ناثر بھی، پیدا کرنے کی حد تک ہی کیوں نہ ہو، "شاعر نثر" کہا جا سکے گا: میں دیکھتا ہوں کہ یہاں پیدا کرنے کا ذکر چھڑ گیا ہے: اسکے سہانے پن کو دیکھتے ہوے اگر میں آگے بڑھ جاؤں تو عجب نہیں جو قارئین کرام کو بار گذرے اس لیے لگے ہاتھوں ذرا اور تفصیل وار سنا دینا مناسب ہوگا،

" پیدا ہونے کی بہترین مثال افزائش نسل ہے۔ نر اور ناری دونوں جانب سے مادی اور نفسی عنصر میل کھاتے ہیں۔ اور اس میل کا جو نتیجہ ہوتا ہے وہ ایک تیسری شے ہوتی ہے، یعنی یہ کہنا سچا ہے کہ بچے میں ماں باپ دونوں کا حصہ ہے۔ دونوں کے حصے کیا بلحاظ مادہ اور کیا بلحاظ نفس مل جل کر ایک نئی چیز بن جاتے ہیں۔ بچہ ایک جداگانہ مستقل ہستی ہوتا ہے۔ یہ تصور ہے پیدائش کا۔ اب ادبیات کے میدان میں اس تصور کو نظر کے سامنے رکھ کر خیال دوڑائیے کہ یہاں پیدا کرنے کا کیا مفہوم ہو سکتا ہے۔ یہ بات تو ظاہر ہے کہ ادب میں جو چیزیں پیدا کیجا سکتی ہیں وہ گوشت پوست سے مستغنی ہوتی ہیں۔ ایک مثال لے لیجیے۔ مولانا نذیر احمد نے "اصغری" کو ادبی ہستی دی ہے۔ اصغری ایک ایسی ہستی ہے جسنے گوشت پوست میں کبھی جنم نہیں لیا۔ دوسرے الفاظ میں کہہ سکتے ہیں جو اصغری پیدا کی ہے۔۔ اس طرح پیدا نہیں کی جس طرح انکی مولانا نے

دماغ نے بغیر کسی بیوی کے اصغری کو پیدا کیا۔ اب آپ کے یہ ذہن نشین ہوگیا کہ افزائشِ نسل کے لیے نر اور ناری کا یکجا ہونا اٹل ہے۔ ادبی ہستیوں کے لیے اس قسم کی یکجائی ضروری نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ مولانا کی اصغری محض ایک تخیلی پیکر ہے لیکن اس تخیلی پیکر کی خوبی یہی ہے، کہ اس میں گوشت پوست کے سوا اور ساری باتیں ایسی ہی ہوں، جو جیتے جاگتے، سانس لیتے انسانوں میں ہوتی ہیں۔ اصغری کا احوال ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی واقعی شریف بیوی کی سوانحمری ہے جو کسی زمانہ میں گذر چکی ہے۔ اس مادی دُنیا میں سانس لے چکی ہے۔ اسکی بات چیت، اسکی چال ڈھال، اسکے طور طریقے اس طرح بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں اس طرح جان پھونکی گئی ہے کہ اُنکو پڑھ کر ہمارے تخیل کے پردے پر ایک تصویر کھنچ جاتی ہے۔ اور تصویر بھی ایسی ہستی کی گویا ہم نے کبھی اُسکو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ——"

علو مطالب کی "مئے دو آتشہ" جسے ابھی ابھی آپ نے چکھا" ولایتی" کی نفیس خو لیے ہوئے ہے، اور جو ایسا معلوم دیتا ہے کہ ہارن کے خمخانہ سے ہم تک لنڈھائی گئی ہے: چنانچہ سرِ مضمون جو قول نقل ہوا اُس سے اس خیال کی ایک حد تک تائید ہوتی ہے۔ بایں ہم حضرت خاں صاحب کی ادبی سلیقہ مندی اور لطافت ذوق نے جس آرٹس ٹک انوکھے پن سے دو آتشہ سہ آتشہ کرکے اسے ادب اُردو کے جام میں چھلکایا ہے، قابلِ رشک ہے۔ بدستان ادب کے لیے تو میرا خیال ہے یہی جام "جامِ جمشید" سے کم نہیں۔ کیوں؟ کہ اسی میں انھیں چلتے پھرتے "تخیلی پیکروں" کی معنوی پرچھائیاں نظر آجائیں گی: جنھیں "مسہری کی جد و جہد" نے نہیں! "اِی زی چیئر" کے انہماک ذہنی" نے پیدا کیا ہے!

اظہارِ خیال کی قوت خوش کلام نیومن نے کیا خوب کہا ہے کہ خیال کی گہرائی یا نظر کی بینائی یا فلسفہ یا دانشمندی یا فطرتِ انسانی کا علم یا انسانی زندگی کا تجربہ ہی ایک مصنف کو اچھا اور بڑا مصنف بنانے کے لیے کافی و وافی نہیں۔ یہ ساری اضافی خوبیاں ہیں جن سے بیشک چار چاند لگ سکتے ہیں، لیکن ایک بڑے مصنف کی امتیازی جودت اسکے اظہار خیال کی قوت ہے: یعنی وہ اتنا قادرِ کلام ہو کہ ہر صحیح خیال کے لیے اُسے ہمیشہ صحیح لفظ بھی مل جائے۔ وہ لوگوں کے دلوں کی بات کہے مگر اس طرح کہ دلوں میں اُتر جائے۔ وہ

اختصار پر اُترے تو اُسی میں چھپکا دے اور اگر الفاظ کی گنگا بہائے تو قریب قریب ہر لفظ "گنگا جل" کی کی طرح لائقِ پرستش قرار پائے - یہاں تک کہ اُسکے جملے کہاوتیں بن بن جائیں۔

سچ بھی ہے ادبی دنیا میں تو الفاظ کی وہ کیفیت ہے جیسے مصوری میں پنسل، کہ اُٹھایا، تصویر کا خاکہ اُتارا، اور اُس میں بھانت بھانت کے رنگ بھربھرا کے ایک سندر صورت بنا کے کھڑی کر دی - اچھا مثال کے طور یوں سمجھیے، فرض کیجیے آپ ایک ادبی مصور ہیں اور آپ کے ذہن میں ایک کیریکٹر اُبھرا اب آپ چاہتے ہیں کہ وہی کیریکٹر بجنسہٖ دوسرے کے ذہن میں منتقل ہو جائے، اس خیال سے آپنے ایک فن داں مصور کی طرح ان خاص خاص لائنز کو بھی چُن لیا جنکے ٹریس کرنے سے آپ اس کیریکٹر کو دوسرے کے صفحۂ خیال پر منتقل کر سکتے ہیں۔ لیکن آپ کے پاس الفاظ کی ایسی پنسلیں نہیں جن سے آپ خاکہ تیار کر سکیں یا اُس میں رنگ بھر سکیں - تو فرمائیے ایسی صورت میں کیا خاک آپ کسی چیز کی تصویر اُتار دیں گے؟ اور کیا خاک اُس میں جلت پھرت کی تدبیر کی جا سکے گی؟ غرض عرض یہ کرنا ہے کہ تخیل کی "عروس جمیل" جب حجلۂ دماغ سے باہر آئے تو کسی قسم کا گھونگھٹ نہ رہے کہ اُس سے سوا رکاوٹ کے اور کوئی حاصل نہیں! اور ساتھ ہی مناسب و موزوں الفاظ کا ایسا "لباسِ حریر" بھی زیب تن ہو کہ شوقین نگاہیں ملیں تو ل کر اس کا فرادا کا پورا پورا جائزۂ حسن لے لیں!

(باقی)

سید وزیر حسن دہلوی

جذباتِ احسن

اضطرابِ دلِ پُرشوق سے مجبوری ہے — عشق والوں کے لیے قرب میں بھی دُوری ہے
نہیں واقف جو وہ کیا درد کی لذت جانے — راحتِ جاں خلشِ پیہم مجبوری ہے
کلفتِ بُعد ہے لیکن گلۂ بُعد نہیں — اللہ اللہ یہ کیا عالمِ مجبوری ہے
وہ تمنا نہیں جو خوگرِ تسلیم نہ ہو — وہ محبت نہیں جسکو گلۂ دُوری ہے
مذہبِ عشق میں دعوائے محبت ہے حرام — حال صورت سے جو کھل جائے تو مجبوری ہے
دل میں اُس نام سے اک حشر بپا ہوتا ہے — قُرب [illegible] میں اگر دوری ہے
ہے محمدؐ کی غلامی کا شرف — دُور اُس سے خلشِ ناوک ر[illegible]

محمد نجم احسن احسن

شعر الہند (حصۂ دوم)

کتاب شعر الہند کا دوسرا حصہ جو حال ہی میں چھپ کر با اصطلاحِ قدیم زیورِ طبع سے مزین ہو کر شایع ہوا ہے، اسوقت میرے سامنے ہے اور ایڈیٹر صاحب الناظر کا فرمان واجب الاذعان پیش نظر۔ اس لیے ان چند سطور میں اُن خیالات کا اظہار مقصود ہے جو اس کتاب کے مطالعہ سے میرے ذہن میں آئے۔

حصہ دوم کی اشاعت سے پہلا فائدہ تو یہ ہوا کہ کتاب شعر الہند کے پہلے جزو کی اشاعت کے بعد بعض ایسے معمے جو کتاب کی نوعیت اور ترتیب کے متعلق ناظرین کے دل و دماغ کو پریشان کر رہے تھے خود بخود حل ہو گئے۔ یعنی اب سمجھ میں آیا کہ مصنف پہلے حصہ میں تو صرف شعرائے اردو کا ذکر اور اُنکے ادوار کا بیان فرداً فرداً کرنا چاہتے تھے اور دوسرے جزو میں اُردو شاعری کی تمام مختلف انواع پر ایک عام تبصرہ۔ اور یہ تبصرہ یا ریویو بھی دو حیثیتوں سے یعنی تاریخی اور ادبی نقطۂ نظر سے۔ کیا اچھا ہوتا کہ مصنف اس ارادہ کا ذکر پہلے جزو کے دیباچہ میں کر دیتے تاکہ قارئین مختلف اور پراگندہ توجیہات اور ظنون سے اپنے دماغ کو پریشان نہ کرتے۔ دوسرا فائدہ یہ مرتب ہوا کہ کتاب مکمل ہو گئی اور جائے شکر ہے کہ مصنف کو اس قدر فرصت اور توفیق ہوئی کہ جس کام کا اُنھوں نے بیڑا اُٹھایا تھا اُسے ساحل مقصود تک پہونچا دیا اور اُردو شاعری کے تذکروں میں ایک اور اضافہ ہو گیا۔ لیکن کیا یہ اضافہ بہت بیش قیمت بھی ہے؟ یہ ایک دوسرا سوال ہے جس کے متعلق میں اپنے خیالات کا اظہار جزوِ اول کی تنقید لکھتے وقت کر چکا ہوں۔ اور مجھے افسوس ہے کہ جزوِ دوم کو دیکھ کر میرے اُن خیالات میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔

کتاب شعر الہند کا جزو دوم ایک مختصر مقدمہ سے شروع ہوتا ہے، جس میں "اُردو زبان میں فنِ تنقید" کے عنوان سے یہ دکھایا گیا ہے کہ زبان اُردو میں تنقید ابتداءً صرف الفاظ و محاورات، بندش و اسلوب پر بحث تک محدود تھی۔ صرف آخری ایام یعنی دورِ جدید میں تنقید کے صحیح مفہوم کو سمجھا گیا اور حالی نے ایک نئے طرز تنقید کی بنیاد ڈالی جس میں معانی اور مطالب کی اہمیت کو کماحقہٗ تسلیم کیا گیا ہے اور اسکے بعد دیگر اُدباء مثلاً شمس العلما امداد امام صاحب مرحوم اور شبلی مرحوم نے اُن کا تتبع کیا۔

اسکے بعد پہلے باب میں اُردو شاعری کی مختلف صنفوں پر تاریخی حیثیت سے فرداً فرداً ریویو کیا گیا ہے - ان اصناف میں غزل، ریختی، واسوخت، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، ڈراما، مذہبی، صوفیانہ، اخلاقی اور فلسفیانہ شاعری شامل ہیں - دوسرے باب میں انواع شاعری پر ادبی نقطۂ نظر سے تبصرہ کیا گیا ہے اور غزل، خمریات، قصیدہ، فخریہ، مرثیہ، ہجو، مثنوی، سہرا، وصف اور تشبیہ و استعارہ کا بیان ہے - اسکے بعد چند مختصر فصلوں میں مختلف مضامین کا ذکر ہے یعنی اجزائے شعر اور محسنات شعر - تیسرے باب میں "ملکی سرمایہ"، "ہندوؤں کا تعلق اُردو شاعری کے ساتھ" اور "مربیان سخن" کے عنوانوں سے چند فصلیں لکھی گئی ہیں اور خاتمۂ کتاب فارسی اور دیگر زبانوں کی شاعری اور اُردو شاعری کے مقابلہ پر ہوتا ہے - اِن اصناف شاعری کی طویل فہرستوں پر نظر ڈالنے سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس بنا پر قائم کی گئی ہیں - اُردو شاعری کو مختلف قسموں میں مختلف اعتباروں سے تقسیم کیا جا سکتا ہے اور زیادہ تر دو لحاظ سے - یعنی مضمون اور شکل نظم - مضمون کے اعتبار سے یہ شاعری عشقیہ، خمریہ، صوفیانہ، اخلاقی، مدحیہ، ہجویہ وصفیہ مذہبی اور قومی وغیرہ وغیرہ ہو سکتی ہے اور شکل کے لحاظ سے غزل، قصیدہ، مربع، مخمس، واسوخت، مثنوی، رباعی، مسدس، وغیرہ - اور اقسام شاعری پر ریویو کرنے کے لیے یہی مناسب ہے کہ ایک خاص اعتبار سے اُنکو دیکھا جائے - یعنی یا تو مضمون مدنظر ہو یا شکل، ورنہ ان دونوں کو خلط کرنے سے سوائے اسکے کہ ایک اُلجھن پیدا ہو اور سلاست و وضاحت کتاب زائل ہو جائے اور کوئی مفید مطلب پورا نہیں ہو سکتا - مدح غزل میں بھی ہو سکتی ہے اور قصیدہ میں بھی، ہجو بھی کسی خاص شکل کی قید سے آزاد ہے - شراب کا بیان رباعیوں میں بھی ہو سکتا ہے اور لمبے چوڑے قصیدوں اور طویل غزلوں میں بھی - اسی طرح سب اصناف شاعری جو مضمون کے لحاظ سے متصور ہو سکتی ہیں مختلف شکلوں میں لکھی جا سکتی ہیں - اور دونوں اصناف کو ملانے کا نتیجہ بے ضرورت اعادہ اور ناپسندیدہ طوالت ہے جو کسی طرح پر بھی کتاب کی وقعت کے لیے باعث افزونی نہیں ہو سکتی -

علاوہ ازیں مصنف نے بعض ایسے مضامین کو ایک مستقل صنف شاعری قرار دیا ہے جو ہرگز اس عزت کے مستحق نہیں - یہ سمجھ میں آنا مشکل ہے کہ چونکہ غالب اور ذوق کے دو سہرے اُردو شاعری میں موجود ہیں اسلیے سہرے کو رتبہ حاصل ہو گیا کہ وہ غزا [illegible] کے پہلو بہ پہلو کھڑا ہو اور مرثیہ و مثنوی سے دعوئے ہمسری کرے - اگر سہرے [illegible] سکتی ہے تو منڈھے نے کیا گناہ کیا ہے کہ اسکو یہ درجہ نصیب نہ ہو، اور منڈھے [illegible] پر اس عزت سے

محروم رہے۔ اسی طرح اُردو شعرا نے اگرچہ شراب کی تعریف میں بہت کچھ روانی طبع دکھائی ہے لیکن اُردو شاعری میں کوئی خاص صنف اس مضمون سے متعلق نہیں ہے۔ اُردو کا دامن اس نا قابل فخر قسم شاعری سے آلودہ نہیں ہے اور نہ کسی اُردو شاعر ہی نے بنت عنب کی توصیف و مدح کو کلیۃً اپنا مطمح نظر بنایا، یا پرانے یونانی شاعروں کی طرح شراب کے دیوتا بیکلس کے قدموں میں شرابی قصیدوں کے پھول اور انگوری غزلوں کے جواہر نثار کیے۔ پھر معلوم نہیں کہ مصنف کو یہ مضمون اس قدر اہم کیوں معلوم ہوا کہ اُسکو ایک علٰحدہ فن شاعری تصور کرکے اسپر ادبی ریویو ضروری سمجھا۔ اگر خمریات اُردو شاعری کی ایک نوع قرار پا سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ عشقیات، بہاریات، خزانیات اور شتائیات کا شمار بھی اسی زمرہ میں نہ ہو۔ لیکن سب سے حیرت خیز اور اچھوتی صنف شاعری جسکا بیان مصنف نے باب دوم میں کیا ہے تشبیہ و استعارہ ہے۔ یہ قسم ایک معمولی عقل و فراست کے انسان کے فہم سے بالاتر ہے اور اس لیے اسپر زیادہ لکھنا بے سود ہوگا۔

باب اول اور باب دوم کی فہرستوں کے مقابلہ سے ایک اور تعجب خیز حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ یعنی یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض اقسام شاعری تو ایسی ہیں کہ اُن پر ادبی حیثیت سے ریویو ہو سکتا ہے لیکن تاریخی حیثیت سے بالکل ناممکن ہے اور بعض اصناف ایسی ہیں کہ تاریخی اعتبار سے تو ہم اُن پر تنقید کر سکتے ہیں لیکن ادبی لحاظ سے نہیں۔ "خمریات" کے متعلق تو یہ متصور ہو سکتا ہے کہ یہ صنف چونکہ مشرب تصوف سے گوناگوں تعلقات رکھتی ہے اس لیے اسکا شمار "علم سینہ" میں ہے اور تاریخ یا روایت سے اسکو کوئی سروکار نہیں۔ لیکن وصف تو غالباً (باوجود ایک لفظی مماثلت کے) کبھی تصوف کا جزو نہیں سمجھا گیا کہ اسکو بھی اسی زمرہ میں شامل کیا جائے۔ ریختی تو شاید اس قابل نہ ہو کہ ادب میں اسکو جگہ دی جائے، لیکن کیا ڈراما اور واسوخت وغیرہ بھی ایسی مبتذل اور ساقط قسمیں ہیں کہ اُن پر ادبی ریویو کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو؟ ممکن ہے کہ بعض نوعیں شاعری کی ایسی ہوں کہ انکے متعلق کافی تاریخی سالہ ہم نہ پہونچ سکتا ہو اور اس لیے مصنف نے تاریخی ریویو کے وقت انکو نظر انداز کر دیا ہو، لیکن ایسا کرنا ایک مصنف اور محقق مصنف کے لیے خصوصاً کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے اور ادبی ریویو میں تو کسی صنف شاعری سے پہلو تہی کرنے کی بظاہر کوئی بھی توجیہ نہیں ہو سکتی۔ تاریخی ریویو کا نام سُن کر ہر شخص کے دل میں یہ توقع ہوتی ہے کہ وہ اُردو شاعری کی مختلف قسموں کے تدریجی نشو و نما کا ایک پُر لطف مرقع اور ایک پُر رنگ نقش ہوگا۔ لیکن باب اول کی ورق گردانی سے اُس کی توقع کو مایوسی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

اس باب میں جو تاریخی ریویو ہے وہ تاریخ سے اسی طرح بے نیاز اور بے تعلق ہے جس طرح الف سے لام یا لام سے میم۔ مصنف بجائے اس کے ادبی اور تاریخی ریویو کی حدود و فاصلہ کو قائم نہ رکھ سکے اور ایک کو دوسرے سے ملا دیا۔ مثلاً غزل میں وہی پرانے دقیانوسی چار دَور مذکور ہیں جنکی چار دیواری میں مولانا آزاد مرحوم کے زمانہ سے یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ اردو شاعری محدود و مقید ہے۔ اور ان ہی دوروں کے مشہور اساتذہ کے کلام کے نمونے انکے زمانہ کی خصوصیتوں کے اظہار کے لیے پیش کردیے گئے ہیں۔ انکے کلام کے عیوب اور محاسن بھی بہت تشریح اور تدقیق سے بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن اگر کوئی یہ معلوم کرنا چاہے کہ کس سنہ میں غزل کی ابتدا ہوئی کس حصۂ ملک میں اور کس بادشاہ کے عہد میں، کس طرح اور کن کن وقتوں میں اس میں بتدریج ترقی ہوئی، تو وہ اس باب سے بہت کم بہرہ یاب ہو سکتا ہے۔ اور اُسکو یا تو ڈی تاشے کے تذکرہ کا رخ کرنا پڑے گا یا کسی آیندہ تذکرہ کا انتظار۔ ان چار دوروں کا بیان اور انکی خصوصیات کا ذکر تو مصنف بہت شرح و بسط کے ساتھ جزو اول میں بھی کر چکے تھے اس لیے جزو دوم میں ان ہی باتوں کو کچھ اضافہ کے ساتھ دوہرا دینا کتاب کی جامعیت میں کوئی اضافہ نہیں کرتا۔ غزل پر جو ریویو ادبی اور تاریخی حیثیت سے باب اول و دوم میں کیے گئے ہیں اُنکا مقابلہ کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ میرا مقصد کیا ہے۔ یعنی جو شخص اس زحمت کو گوارا کرے وہ دیکھے گا کہ جا بجا ایک ہی قسم کے خیالات دونوں میں موجود ہیں اور بہت سے اشعار جو تمثیل کے لیے دیے گئے ہیں مشترک ہیں۔

ادبی ریویو میں غزل اور قصیدہ وغیرہ کے متعلق اصول و قوانین قائم کرنے کے لیے ادبا، عرب مثلاً ابن قدامہ اور ابن رشیق کی کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔ میرے خیال میں اردو شاعری پر یہ ایک ظلم ہے کہ اُسکا معیار عرب کی شاعری کو قرار دیا جائے اور اس زر ہندی کو پرکھنے کے لیے عرب سے کسوٹی مستعار لی جائے۔ اردو شاعری عربی شاعری کی بہت کم مرہون احسان ہے، اس لیے کہ اردو کے شاعروں نے جو کچھ بھی لیا فارسی کے شعراء سے لیا، اور فارسی شاعری عربی شاعری سے اس قدر مختلف ہے کہ شاید قصیدہ کے سوا اور کوئی بھی صنف اسکی قدیم شاعری سے مماثل نہیں ہے دور آخر یعنی خلفاے بنی عباس اور انکے مابعد کی عربی شاعری بیشک فارسی شاعری سے بہت مشابہ ہے لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ عربوں نے ایرانیوں کی تقلید [illegible] انکے طرز شعر کا تتبع کیا۔ غزل تو کبھی بھی عربی شعر میں کوئی صنف مستقل نہیں سمجھی گئی اور [illegible] اور اردو قصائد سے بہت مختلف ہے۔ موخر الذکر میں مقام شکر ہے کہ لیلیٰ [illegible] کی اونٹنی اور

امرؤ القیس کا گھوڑا کہیں مذکور نہیں۔ معشوق کے لب جاں بخش، رخ رنگیں، اور زلفِ پیچاں کے پہلو بہ پہلو کہیں اونٹ کے لٹکے ہوئے ہونٹ، بھرے ہوئے گالوں یا اُلجھی ہوئی پشم کا ذکر نہیں ہے۔ اردو کا شاعر کبھی بھیڑیے اور چرخ کے ساتھ نہیں سویا۔ اُس نے جلتے ہوئے میدانوں میں جھلسے ہوئے گرگٹ کو نہیں دیکھا اور نہ اپنے ممدوح یا معشوق تک پہونچنے کے لیے لق ودق میدانوں میں ببول اور جھاؤ کے درختوں کے درمیان کوسوں کے سفر ہی طے کیے۔ صرف یہی نہیں کہ اردو غزل عربی غزل (اگر اسکی مستقل ہستی مان بھی لی جائے) سے بالکل بے نیاز ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ فارسی غزل سے بھی بہت مختلف ہے۔ اسکا اندازہ ہر صاحب نظر کو ہو سکتا ہے جو فارسی کے کسی مشہور غزل گو مثلاً حافظ کا مقابلہ کسی اُردو کے اُستاد مثلاً میر یا داغ سے کرے۔ دریں صورت یہ عقدہ حل ہونا مشکل ہے کہ مصنف کو اُردو غزل اور قصیدہ کا بیان لکھنے میں ان ادبائے عرب کی کتابوں کا جائزہ لینے، اور اُنکے مقرر کردہ اصولوں کو اُردو شاعری کی عمدگی یا رذالت کا معیار بنانے کی کیا ضرورت تھی چنانچہ قصیدہ کے متعلق ابن رشیق کے خیالات نقل کر کے لکھتے ہیں کہ "لیکن ہمارے شعراء کے قصائد بمشکل ان شرائط کے معیار پر پورے اُتر سکتے ہیں" (ص ۳۴۳)

کتاب کا آخری حصہ یعنی اجزائے شعر وغیرہ کی بحث، مضمون کتاب سے کچھ تعلق نہیں رکھتا بہتر ہوتا کہ مصنف اس فن پر کوئی علٰحدہ کتاب تصنیف کر دیتے۔ مگر خیر جامعیت نہ ہو تو تفنن ہی سہی۔ لیکن "ہندوؤں کا تعلق اُردو شاعری کے ساتھ" میری رائے میں ایک بالکل بے معنی فصل ہے شاعری قیود مذہب وملت سے آزاد ہے اور سیاست سے بے نیاز۔ اُردو شاعری ہندوستان کے ایک طبقۂ کثیر کی مشترکہ شاعری ہے۔ جس طرح اردو انکی مشترکہ زبان ہے۔ اور اس طبقہ میں ہندو مسلمان سب شامل ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ خاص طور پر ایک فرقہ کا تعلق اس شاعری سے بیان کیا جائے اور وہ بھی اس حسنِ اختصار سے کہ تین چار صفحوں اور دو تین ناموں تک محدود ہے

تمام کتاب کو دیکھنے کے بعد مجھے ایک افسوسناک حقیقت کا اظہار کرنا پڑتا ہے یعنی یہ کہ مصنف نے اگرچہ اسکو بلاشبہ بہت محنت وجانکاہی سے مکمل کیا ہے، لیکن اس میں کوئی نئی بات، کوئی خاص خصوصیت جو اسکو دوسرے تذکروں سے ممتاز کرے اور اُردو شاعری کے متعلق ہماری معلومات میں اضافہ کا باعث ہو نظر نہیں آتی۔ مصنف نے اپنی طرف سے بہت ہی کم لکھا ہے اور زیادہ تر اوروں کی رائے پر انحصار کیا ہے۔ چنانچہ مرثیہ کا بیان تقریباً تمام و کمال اور حرف بحرف مولانا شبلی کی کتاب "موازنۂ انیس و دبیر" سے نقل کر دیا گیا ہے۔ اور اگر کہیں اُردو اُدبا کی کتابوں

سے مدد نہ مل سکی تو عرب مصنفین سے استفادہ ضروری خیال کیا گیا۔ یہ فقدان رائے اور عدم تحقیق اس زمانہ کے کسی مصنف کے لیے باعث فخر نہیں ہو سکتا۔ مصنف نے شاید دو ایک جگہ پر ہی اپنی رائے کے اظہار کی جرأت کی ہے۔ مثلاً خاتمۂ کتاب میں مختلف زبانوں کی شاعری کا مقابلہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ: (اُردو شاعری) کلیۃً فارسی شاعری کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ ..... عشق و محبت کے متعلق جس قدر لطیف و نازک اشعار فارسی میں ہیں اُردو میں نہیں مل سکتے۔ فلسفہ اور تصوف بھی جس قدر فارسی میں ہے اُردو شاعری میں نہیں ہے۔ مولانا روم، فرید الدین عطار، سنائی، عراقی، اوحدی، نظامی، امیر خسرو، اور خیام، وغیرہ کے مقابلہ میں کون اُردو شاعر پیش کیا جا سکتا ہے" لیکن افسوس ہے کہ مجھے اس رائے سے بھی اختلاف ہے۔ میرے خیال میں اُردو شاعری باوجود اپنی صغر سنی کے فارسی شاعری سے کئی میدانوں میں سبقت لے گئی ہے اور بحیثیت مجموعی اُس سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ عشق و محبت کی باریکیاں اور فلسفہ و تصوف کے دقائق اس میں فارسی سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہیں۔ اور اگر کسی فارسی نظم میں یہ مضامین اردو کی نسبت زیادہ اچھی طرح اور کثرت سے بیان ہوے ہیں تو وہ مولانا روم اور اوحدی وغیرہ کی نظم نہیں ہے بلکہ نظیری اور عرفی وغیرہ کی شاعری ہے۔ یعنی وہ فارسی شاعری جس نے اُردو ہی کے ملک میں جنم لیا اور نشو و نما پائی۔ لیکن یہ ایک طویل بحث ہے اور اس مختصر ریویو میں اسکا چھیڑنا غیر موزوں۔

آخر میں مصنف کی ایک قابلیت کی داد ضرور دینا چاہتا ہوں، یعنے اُنکے ذوق شعری کی۔ کتاب شعر الہند میں جو اشعار انھوں نے مختلف شعرا کے کلام سے لیے ہیں وہ اس کا بدیہی ثبوت ہیں۔ اس طرح پر کتاب اُردو شاعری کی مختلف اصناف کے نمونوں کا ایک بہت اچھا مجموعہ ہے اور یہی ایک خوبی کتاب کے بہت سے نقایص کی تلافی کر سکتی ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص اسکو بحیثیت ایک ادبی کتاب کے پڑھے گا تو یقین ہے کہ بہت کچھ روحانی حظ اور ادبی فائدہ حاصل کر سکے گا۔ اور اسی وجہ سے مجھے امید ہے کہ قابل مصنف کی محنت رائگاں نہ جائے گی اور کتاب شعر الہند بہت سے علم دوست اصحاب کے کتبخانوں کی زینت کا باعث بنے گی۔

محمد وحید مرزا

آیولینتھی

چھٹا منظر

(بادشاہ رینی، ایمرک، ٹرسٹان جو مکمل طور پر مسلح ہے مع اپنے سپاہیوں کے۔ اُسکے بعد جیوفری مع اپنے سپاہیوں کے)

(یہ وقت وہ ہے کہ آسمان پر شفق پھول رہی ہے)

ٹرسٹان۔ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کردو۔ جو درہ کی حفاظت کرتے تھے اُنھوں نے ہتھیار رکھ دیے۔ کیا تم بھی اُنکی پیروی کرتے ہو؟

رینی۔ کیا کہا؟ تو کون شخص ہے جسکے شریر ہاتھوں نے مسلح ساتھیوں کے بل پر اس سرزمین کو ناپاک کیا۔ آگے قدم نہ بڑھانا ورنہ خاک ہیں نانک نظر آئیگا

ٹرسٹان۔ بوڑھے شخص، ذرا اپنے الفاظ کا خیال رکھو۔ میں ڈرتا نہیں لیکن مجھے یقین کامل ہے کہ یہ جگہ کسی موذی اور ناپاک طاقت کے پنجے میں ہے اسی وجہ سے تو کانپ رہا ہے (رینی درحقیقت غصہ سے کانپ رہا تھا) اور میرا دل شیر ہے۔ اگر تو جادوگر ہے اور یہ امید ہے کہ سحر تیری مدد کرے گا تو اسکے برتتے پر نہ بھولنا۔ حضرت پوپ نے اِس تلوار کو منزہ کیا ہے اور یہ رومال بھی پاک ہاتھوں نے آدبیاں کی خانقاہ سینٹ میری میں تیار کیا ہے اور اس زرہ کے نیچے وہ مصمم عزم ہے جو تجھ پر غلبہ حاصل کرے گا جس طرح سینٹ جارج نے اژدر کو ہلاک کیا تھا۔

رینی۔ گمراہ شخص! تو یہاں کس لیے آیا ہے؟

ٹرسٹان۔ تو میری بات کا جواب دے۔ کیا تو اس وادی کا مالک ہے؟

رینی۔ بیشک، اور اسی پر میری ملکیت کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ لیکن تو کون ہے؟

(جیوفری مع اپنے ساتھیوں کے داخل ہوتا ہے)

جیوفری۔ میری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں۔ شاہ رینی! (زانو ٹیک کر) میرے بادشاہ!

رینی۔ جیوفری، تو بھی اپنے بادشاہ کے دشمن کا شریک ہے!

جیوفری۔ خداوند! کیا ارشاد ہوتا ہے! وہ پہلے روانہ ہو گیا۔ مجھے دیر میں اطلاع ہوئی۔

رینی (ٹرسٹان سے) بتاؤ تم کون ہو۔

ٹرسٹان۔ میرا نام ٹرسٹان آف دومانٹ ہے۔ آپ اس نام سے اچھی طرح واقف ہیں۔

رینی۔ کیا ٹرسٹان! (جیوفری سے) کیا یہ سچ ہے؟

جیوفری۔ حضور ایسا ہی ہے۔

رینی (کچھ سوچ کر) تو شاید تمھیں تھے جو آج ایک مرتبہ پیشتر بھی یہاں آچکے ہو؟

ٹرسٹان۔ ہاں جناب! مگر اتفاقیہ نہ کہ بالقصد مجھے خواب میں بھی یہ شبہہ نہیں ہوا کہ یہاں آپکی عملداری ہے۔

رینی ۔ لیکن تم دوبارہ کس نیت سے آئے؟

ٹرسٹان ۔ آپ جانتے ہیں ۔

رینی ۔ نہیں، میں نہیں جانتا ۔ تم بتاؤ ۔

ٹرسٹان ۔ کیا یہ ممکن ہے؟ اس پھولوں سے لدی ہوئی وادی میں جہاں کی ہر چیز حیرت خیز ہے اُن سب سے زیادہ عجیب خوبصورت ایک لڑکی ہے ۔ پر دہ انس کے تمام ٹروبیڈور متفقہ کوشش کریں تو بھی کما حقہٗ اُسکی تعریف نہ کر سکیں ۔

رینی ۔ اور تم کہتے ہو کہ یہ خوبصورت لڑکی ——— کہو کیا کہتے ہو!

ٹرسٹان ۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ اُس لڑکی نے مجھ پر ایسا گہرا جادو کر دیا ہے کہ میں ہمیشہ کے واسطے اُسکا غلام ہو گیا ہوں ۔

رینی ۔ کیا تمھیں معلوم ہے کہ وہ کون ہے؟

ٹرسٹان ۔ نہیں ۔ لیکن اُسکے چہرہ اور اُسکے الفاظ سے نمایاں ہے کہ وہ شریف و عالی نسب ہے ۔

رینی ۔ کیا تم نے غور نہیں کیا کہ قدرت نے اور تمام باتوں نے اُسکے ساتھ نہایت فیاضی برتی مگر ایک

"———

ٹرسٹان ہاں! افسوس وہ نابینا ہے ۔ تاہم اُسکی روح میں ایک موج نور رواں ہے جو ہر تاریک شے کو منور کر دیتی ہے ۔

رینی ۔ باوجودیکہ تمھیں علم ہے کہ وہ نابینا ہے ———

ٹرسٹان ۔ تاہم میں اپنا تاجِ شاہی نہایت خوشی سے اُس کے قدموں پر رکھنے کو تیار ہوں

رینی ۔ کالیرولے میں جو پاک مورت ہے اُسی کی قسم کہ تم عجیب و غریب شخص ہو ۔ تم یہاں مسلح ہو کر زبردستی اُس چیز کے لیجانے کو داخل ہوے جو مدت سے تمھاری تھی ۔ تاہم تم نے حقارت آمیز طریقہ سے انکار کر دیا ۔

ٹرسٹان ۔ یہ آپ نے کیا فرمایا؟

رینی ۔ تمھیں جاننا چاہیے کہ یہ خوبصورت لڑکی جسنے تمھارے دل کو اسیر کر لیا ہے میری بیٹی ہے ۔

ٹرسٹان ۔ وہ آپ کی بیٹی ہے؟

رینی ۔ ہاں اے نوجوان کاؤنٹ، میری بیٹی ہے اور وہی ہے جسکو، تمھارے خط سے واضح ہوتا ہے، تم کبھی بطور ملکہ کے قبول نہیں کر سکتے ۔ وہی ہے جسکے سبب سے تمھارے دل میں ایسی نفرت پیدا ہوئی کہ تم نے اپنی گلو خلاصی کے لیے لورین کے پورے صوبہ سے دست بردار ہونے پر آمادگی ظاہر کی ۔ وہی ہے جسکے دل پر تم نے ایسا قبضہ کر لیا ہے کہ مجھے شک ہے وہ غریب لڑکی تمھیں بآسانی بھول جائے گی ۔

ٹرسٹان ۔ مجھے اُمید ہے کہ جناب والا ایسی غیر مترقبہ خوشی کی بلاوجہ خوشخبری نہیں سناتے ۔

رینی ۔ [illegible] نہیں کہا ۔

ٹرسٹا[illegible]

———

رینی ۔ [illegible] رکھی گئی؟ یہ تمھیں

عنقریب معلوم ہو جائے گا۔ تمہیں شاید اس امر سے آگاہی نہیں کہ تم ایک نہایت نازک موقع پر یہاں آئے ہو۔ میری پیاری بیٹی آیولنیقی، شاید اسی وقت جبکہ ہم باتیں کر رہے ہیں ہمیشہ کے واسطے تاریک ترین شب میں داخل یا دن کی پُر از آب و تاب روشنی میں بیدار ہو رہی ہے۔

ٹرسٹان۔ آپ ایسا کیوں فرماتے ہیں۔

ریٖنی۔ اسی وقت حکیم ابن یحییٰ دیکھ رہا ہے کہ آیا

(مکان کے قریب جاتا ہے)

خاموش! میرا خیال ہے کہ اندر کچھ باتیں ہو رہی ہیں۔ سب خاموش رہیں، وہ بول رہی ہے۔ آہ ٹرسٹان سنو! آیولنیقی بول رہی ہے۔ آہ تم سنو اور مجھے بتاؤ کہ اُسکے لہجہ سے خوشی کا اظہار ہوتا ہے یا غم کا ——— لیکن کوئی آ رہا ہے۔

ساتواں منظر

(علاوہ اُن لوگوں کے جو موجود ہیں پہلے برٹرانڈ اور اسکے بعد مارتھا، آیولنیقی اور ابن یحییٰ داخل ہوتے ہیں)

ریٖنی (برٹرانڈ سے جو مکان سے آیا ہے) برٹرانڈ فوراً بتاؤ کہ کیا حال ہے!

برٹرانڈ۔ افسوس میں نہیں جانتا۔ وہ بیدار ہوئی اور سب عمل ختم ہو گیا۔ لیکن میں خوفزدہ ہو کر چلا آیا۔

(مارتھا تیزی سے داخل ہوتی ہی)

مارتھا۔ وہ دیکھ سکتی ہے۔

ریٖنی۔ کیا مارتھا؟ دیکھ سکتی؟

ٹرسٹان۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔

مارتھا۔ خاموش! خاموش! وہ آ رہی ہے۔

(ابن یحییٰ آیولنیقی کا ہاتھ پکڑے ہوئے داخل ہوتا ہے اور لوگوں کو اشارہ کرتا ہے کہ نظر سے اوجھل ہو جائیں)

آیولنیقی۔ آپ مجھے کہاں لیے جاتے ہیں۔ اے خدا میں کہاں ہوں۔ مجھے سنبھالیے۔ آہ مجھے سنبھالیے۔

ابن یحییٰ۔ بیٹی۔ گھبراؤ نہیں۔

آیولنیقی۔ مجھے سنبھالیے۔ ٹھہر جائیے۔ میں یہاں پہلے کبھی نہیں آئی۔ اس غیر مانوس جگہ میں کس طرح رہونگی کیا کرونگی۔ یہ کیا ہے؟ مجھے سنبھالیے۔ یہ مجھ پہ ڈھایا پڑتا ہے۔ مجھے تکلیف پہونچ رہی ہے۔

ابن یحییٰ۔ بیٹی اپنے دل کو ٹھکانے کرو۔ زمین کی طرف دیکھو۔ یہی ہمیشہ تمہاری بہترین دوست رہی ہے اور اب بھی خندہ پیشانی سے تمہارا خیر مقدم کرتی ہے۔ یہی باغ ہے جس کی تم نے ہمیشہ نگہداشت کی۔

آیولنیقی۔ میرا باغ! میرا! افسوس میں اسے نہیں پہچانتی۔ یہ پودے کس قدر خوفناک معلوم ہوتے ہیں۔ ہوشیار رہیے! وہ ہم پہ گرے پڑتے ہیں!

ابن یحییٰ بیٹی ڈرو نہیں۔ یہ شاندار درخت کھجور
کے ہیں جنکی پتیوں اور پھلوں کو تم ایک رت سے جانتی ہو۔
آیو لینتھی۔ آہ نہیں، میں انکو نہیں جانتی (آسمان
کی طرف آنکھیں اُٹھاتی ہے) یہ چمک جو مجھے گھیرے
ہوئے ہے اور وہ گنبدِ عظیم جو ہمارے سروں پر ہے
اُف اُس قدر بلند ہے۔ یہ کیا ہے؟ کیا یہی خدا ہے۔
کیا یہی اُسکی روح ہے جو آپ کہتے تھے تمام دُنیا
پر چھائی ہوئی ہے۔
ابن یحییٰ یہ چمک روشنی کی ہے۔ اس میں بھی
خدا ہے جس طرح ہر شے میں ہے۔ یہ گہرا نیلا رنگ
جو اس ہوائی گنبد میں بھرا ہوا ہے آسمان ہے۔
جہاں ہمارا عقیدہ ہے کہ خدا کا عرش عظیم ہے۔
میری بیٹی۔ اپنے گھٹنے ٹیک دو اور درگاہِ باری
میں ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگو!
آیو لینتھی۔ مجھے سکھائیے کہ کس طرح دعا مانگوں۔
آج تک مجھے کسی نے یہ طریقۂ دعا تعلیم نہیں کیا۔
ابن یحییٰ میری پیاری بیٹی، مودب ہو کر کہو کہ
اے پُر از اسرار خالق، تو نے مجھسے گفتگو کی جب میری
آنکھوں پر تاریکی کی نقاب تھی، اب اپنی روشنی
کی شعاعوں میں جو اس دنیا کو منور کرتی ہیں میری
رہبری کر اور مجھے سکھا دے کہ میں کس طرح
تیرے دامن رحمت سے لپٹی رہوں۔
آیو لینتھی (مندرجۂ بالا الفاظ کو دہرا کر) ہاں!
اُس نے میری سُن لی۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ اُس نے
سکون و امن کو میرے دل پر مسلط کر دیا۔ صرف
وہی مجھ سے گفتگو کرتا ہے اور سابق کی طرح مجھپر مہربان
ہے، گو نظر نہیں آتا۔
ابن یحییٰ اُٹھو! میری بیٹی اُٹھو اور اپنے چاروں
طرف دیکھو!
آیو لینتھی۔ بتائیے وہ کون لوگ ہیں جنکے قد
ایسے شاندار ہیں۔
ابن یحییٰ۔ تم اُن سب کو جانتی ہو۔
آیو لینتھی۔ آہ نہیں۔ میں کچھ نہیں جانتی۔
ریمی۔ (آگے بڑھ کر) آیو لینتھی میری طرف دیکھو۔
تم میری بیٹی ہو۔
آیو لینتھی ابا جان۔ اے میرے خدا! اب
میں آپ کو پہچانتی ہوں، آپ کی آواز اور آپ
کے ہاتھ کی گرفت سے۔ اب آپ نہ جائیے گا۔
میری خبرگیری اور رہنمائی کیجیے۔ میں اس روشنی
کی دنیا میں بالکل اجنبی ہوں۔ جو کچھ میرے پاس
تھا مجھ سے چھین لیا گیا ہر شے جس سے پیشتر آپکی
بیٹی خوش ہوتی تھی۔
ریمی۔ بیٹی میں نے تیرے لیے ایک رہبر
انتخاب کیا ہے۔
آیو لینتھی۔ آپ کا مطلب کس سے ہے؟
ریمی (ٹرسٹان کی طرف اشارہ کرکے) وہ دیکھ
وہ تیرا منتظر ہے۔
آیو لینتھ[illegible] ۔ کیا وہ اُن[illegible]
فرشتو[illegible] ایک مرتبہ ذکر کیا تھا
کیا وہ [illegible] آسمان سے نازل ہوا ہے۔

رینی - یاد کرو - تم اُسے جانتی ہو اور اُس سے باتیں کر چکی ہو -

آیو لنیتھی - اُس سے ؟ اُس سے ؟ (اپنے اپنے ہاتھوں سے آنکھوں کی آڑ کر کے) اب جان اب میں سمجھی - اُسی کے شاندار جسم سے وہ آواز مشابہ ہے جو کچھ دیر اُدھر میں نے سُنی تھی یتین مگر قوی - صرف وہی آواز تمام فطرت میں دَورہ کر رہی ہے -

اے مہربان و خوشخو ملکہ !
سُننے ! آہ سُنیے ! انھیں دلکش لفظوں کے
ساتھ روشنی کی پرلطف شعاعیں مجھ تک پہونچیں اور
یہی شیریں الفاظ میرے دل کی حرارت کے ساتھ اس طرح مل گئے کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے -

ٹرسٹان (آیو لنیتھی کو گلے سے لگا کر) آیو لنیتھی ! سب سے زیادہ عزیز !

رینی - تم دونوں کو خدا برکت دے - وہ خدا جسکی حیرت انگیز صناعیوں کے لیے ہم سب سر عبودیت خم کرتے ہیں -

(ختم شد)

آثر - لکھنوی

افکارِ تازہ

جانشین جلال جناب سید انور حسین آرزو لکھنوی

دَم گھُٹتے گھُٹتے ضبط سے دیوانہ ہو گیا　　چُپ رہتے رہتے رازِ دل افسانہ ہو گیا
دل حُسنِ عارضی کا بھی دیوانہ ہو گیا　　ناداں چراغِ صبح کا پروانہ ہو گیا
سرسبزیاں ہیں دیدۂ اہلِ وطن میں خار　　سبزہ لہک کے باغ سے بیگانہ ہو گیا
ہر جا مرا مزار ہے اور پھر کہیں نہیں　　یوں مٹ کے خاک کوچۂ جانانہ ہو گیا
حالِ مریض ہجر نے بدلی یہ صورتیں　　شکوہ سے ذکر ذکر سے افسانہ ہو گیا
ساقی رُکا تو بڑھ گئی تاثیرِ جذبِ شوق　　منہ تک بلند ہاتھ سے پیمانہ ہو گیا
مدت کے بعد اُٹھا ہے زنداں سے کچھ غبار　　آزاد آج آپ کا دیوانہ ہو گیا
جب کہہ چکا تو راکھ کا تھا ڈھیر قصہ گو　　لو ختم سوزِ عشق کا افسانہ ہو گیا

جب ہوں گے اُنکے جور تو کیا ہوگا آرزو
اب تک تو کچھ نہ ہونے پہ کیا کیا نہ ہو گیا

مقدس ڈاکو

(۲)

گذشتہ نمبر میں صرف الناظر کے اقتباسات پیش کیے گئے تھے جن سے اندازہ ہوا ہوگا کہ خواہرزادۂ حضرت محبوب الٰہیؒ کے متعلق ہم شروع ہی سے کیا رائے ظاہر کرتے رہے ہیں - اسی لیے جب مولانا محمد علی نے خواجہ صاحب کی جاسوسی کا پردہ فاش کرنے والی تحریر کا اشاعت سے قبل ایک موقع پر ذکر کیا تو کم سے کم مجھے اسیر ذرا تعجب نہیں ہوا - کیونکہ جس شخص کا سالہا سال سے یہ شیوہ رہا ہو کہ علانیہ تصوف کے فریب آمیز بہروپ میں مسلمانوں کو دھوکا دیکر اپنی گرم بازاری کا سامان مہیا کرتا رہے اور دن دہاڑے بھولے، با مروت اور نیک دل لوگوں کو لوٹ لیا کرے اُسکے لیے مخبری و جاسوسی کے خفیہ جرائم کچھ زیادہ سنگین نہیں ہو سکتے - خدا معلوم گذشتہ پندرہ سال کے اندر ایسی ہی کتنی وارداتوں کا ارتکاب کیا گیا ہوگا جنکی تفصیلات اور نتائج سے اہل ملک ہنوز بے خبر ہیں -

ہمدرد میں اس واقعۂ مخبری کے سلسلہ میں جو طولانی مضامین شائع ہوئے ہیں اُنکو ہمنے بالاستیعاب پڑھا اور اس راز کے فاش ہو جانے کی وجہ سے خواجہ صاحب کو جس رسوائی کا سامنا ہے اُسکے دفعیہ کے لیے "غریبوں کا اخبار" جو نکالا گیا اُسکے اکثر پرچے بھی ہمارے مطالعہ میں آئے اور خواجہ صاحب کا مفصل جواب جو اخبار سے علیحدہ بھی شایع کیا گیا ہے وہ بھی ہمارے سامنے ہے - اور غالبًا یہ کہنا بالکل غیر ضروری ہے کہ مولانا محمد علی نے خواجہ صاحب کا جو خط شایع کیا ہے اُسکی موجودگی میں نہ ہمدرد کے طولانی مقالات کی تائید مزید درکار تھی نہ خواجہ صاحب کے لاطائل جوابات سے مغالطہ کھانا ممکن ہے - ایسا کم ہوتا ہے کہ کوئی چور عین ارتکاب سرقہ کے وقت یا رُوداد جرم بیان کرتے ہوئے یا مال مسروقہ کو بغل میں دبائے گرفتار ہو جائے. لیکن جب کبھی ایسی صورت پیش آجائے تو پھر چور خواہ کتنے ہ... ٹھائے یا سرقہ کے محرکات اور مال مسروقہ کے قبضہ میں آنے کے اتفاقات کی کتنی ہی عا... لت مجبور ہوگی کہ ایک بات کو بھی باور نہ کرے اور مجرم کو قانون مروجہ کے ... سزا جو اُس کے اختیار میں ہو بے تکلف دیدے - خواجہ صاحب اگرچہ عین ... نہیں گرفتار ہوئے

مگر اُنکے جرم کی داستان خود اُنکے معصور فطرت قلم کی لکھی ہوئی رائے عامہ کی عدالت میں پیش ہو چکی ہے - اب اُنکے بچاؤ کی کوئی تدبیر نہیں - اور اُن جیسے طباع و ذہین شخص کا اتنی سی بات کو نہ سمجھنا اس بات کی دلیل ہے کہ ارحم الراحمین نے جو ڈھیل چھوڑ رکھی تھی اُسکی میعاد ختم ہو گئی - اور منتقم حقیقی کی سزا دہی کا وقت آگیا - ان اللہ یمہل ولا یہمل - اب نہ خواجہ صاحب کے حلف اُن کی بیگناہی کا یقین دلا سکتے ہیں نہ اُنکے رفقاء و شرکاء کی عیاریاں وابلہ فریبیاں اس بدنما داغ کو اُنکی پیشانی سے چھڑا سکیں گی - نہ مہذب ڈاکو کا مجرم عادی ہونا اُنکی معصومیت کی دلیل بن سکتا ہے اور نہ مولانا محمد علی پر آریوں سے سازباز، لیڈروں سے رقابت، لامذہبیت، ملت فروشی، اور چندوں کے خورد برد کرنے کے انواع و اقسام کے بے حساب الزامات عائد کرنے سے اُنکی قبائے تصوف و عبائے تقدس پاک و صاف ہو جائیں گی -

خواجہ صاحب کی قسمت میں خدا کی لاٹھی سے بچنا لکھا ہوتا تو وہ اس راز کے فاش ہوتے ہی یا تو اعتراف تقصیر کرکے رائے عامہ سے طالب عفو ہوتے یا کم سے کم اس تلخ گھونٹ کو پی جاتے اور کچھ دنوں کے لیے گمنامی و خاموشی میں زندگی بسر کرتے - لوگوں کا حافظہ عموماً بہت کمزور واقع ہوا ہے کچھ عرصہ کے بعد بات آئی گئی ہو جاتی - مگر غرور و انانیت یا حرص و آز نے انھیں اسکی اجازت نہ دی - اور وہ "چوری" کھُل جانے پر اور سینہ زوری کرنے لگے - جس سے نہ صرف اُنکے گناہوں میں اضافۂ کثیر ہوا بلکہ ملک کے تعلیم یافتہ اور دردمند لوگوں کی نفرت و حقارت میں زیادتی ہو گئی - چنانچہ خود اُنکے اخباروں میں جن بے عقل سادہ لوحوں اور چالاک ہوشیاروں کی کثرت تحریریں شائع ہوئی ہیں اُنھیں سے ہر شخص نے اندازہ کر لیا ہو گا کہ تعلیم یافتہ، معاملہ فہم اور بے لاگ لوگوں نے کہاں تک اُنکی ہمدردی و غمخواری سے اجتناب کیا ــــ حالانکہ ان تحریروں کے حصول میں خواجہ صاحب نے ایڑی چوٹی کا سارا زور صرف کر دیا اور بہت ممکن ہے کہ اُن کا بیشتر حصہ بھی اُن کی اپنی دوکان کے کاریگروں کی تخلیق ثابت ہو -

جو اخبارات یا اخباروں اور رسالوں کے اڈیٹر اُنکے لیے سینہ سپر کیے ہوئے ہیں اُنکے متعلق اتفاق سے وہ خود اپنے اخبار منادی میں اعلان کر چکے ہیں کہ تبلیغ فنڈ سے اُنکو ماہوار اور وقتی امداد ملتی ہے - جسکے بعد ایسے لوگوں کی تائید کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی - کیونکہ کچھ لوگوں کو تھوڑے دنوں تک تو دھوکے میں رکھا جا سکتا ہے مگر ساری دنیا نے ہمیشہ کے لیے آنکھوں اور کانوں کو بیکار بنا لینے کی قسم نہیں کھائی ہے -

روزنامہ اخباروں میں لکھنؤ کا وہ بےحقیقت اخبار جسکے اجراء کا گناہِ عظیم راقم الحروف کے سر ہے خواجہ صاحب کی اگر تیس پوت کر رہا ہے تو کچھ مقامِ تعجب نہیں کہ خود منادی کے اعلان کے بموجب اُسے پچیس روپیہ ماہوار کا وظیفہ تبلیغی راجہ یا مقدس ڈاکو کی سرکار سے ملتا ہے۔ دین و دنیا کے اڈیٹر کی خوش فہمی کا راز بھی اُس قرطاس الحساب سے بآسانی معلوم ہوسکتا ہے جو تبلیغی جریدۂ دُرِہ پیش میں چھپا کرتا ہے۔ اور اڈیٹر پیشوا کے متعلق خواجہ صاحب اور پیشوا صاحب دونوں کی تحریریں خود ہمارے پاس موجود ہیں جنسے ظاہر ہوتا ہے کہ خاندان حضرت خواجہ باقی باللہ رحمتہ اللہ علیہ کا نام روشن کرنے والا یہ گوہر شب چراغ "علی بابا" کے جیتھے کا مستقل رکن ہے اور جس شخص نے اُنکی گندی اور غلیظ تحریریں پڑھی ہیں وہ بآسانی اس حقیقت سے آشنا ہو جائے گا کہ مقدس ڈاکو کی بساطِ شطرنج پر یہ ڈھائی گھر چلنے والا مُہرہ کیا منزلت رکھتا ہے۔ اور یہی صورت تقریباً اکثر مؤیدین و معاونین خصوصی کی ہے جو بجا طور پر علی بابا کے "چالیس چور" قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ کچھ لوگ شاید ایسے بھی ہوں جو محض خواجہ صاحب کے دامِ ابلہ فریبی کا شکار ہوں یا مولانا محمد علی صاحب سے کبھی کا بدلہ نکالنے کے لیے دانستہ اس جال میں پھنس گئے ہوں۔

خواجہ صاحب نے اگر یہی ارادہ کیا تھا کہ اپنی اشتہار بازی اور پمفلٹ سازی سے دھول اُڑا کر مسلمانوں کو اندھا بنا دیں گے تو اُنھیں صاف انکار کر دینا چاہیئے تھا کہ مہذب ڈاکو نے جو خط مولانا محمد علی کو دیا ہے وہ اُنکا نہیں بلکہ مہذب ڈاکو نے کسی اُن سے زائد چالاک جعل ساز سے اُنکو بدنام کرنے اور لوٹنے کی غرض سے لکھوالیا ہے۔ ممکن تھا کہ خود مولانا محمد علی تھوڑی رد و قدح کے بعد اسے باور کر لیتے کیونکہ شیخ ضیاء الحق یا پوری اپنی پمفلٹ بازی کی وجہ سے بہت ہی ساقط الاعتبار رہیں اور بد اچھا بدنام بُرا کی مشہور مثل کے مطابق خواجہ پیشے "مقدس بزرگ" کے مقابلہ میں ان پر اعتماد کرنا آسان نہ تھا۔ اور اگر مولانا محمد علی کو ذرا سا بھی شک پیدا ہو جاتا تو غالباً وہ اس تحریر کی اشاعت میں بہت تامل کرتے۔ مگر خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔ جب پردہ داری کا دور تمام ہوتا اور پردہ دری کا وقت آ جاتا ہے تو چالاک سے چالاک مجرم کی عقل و ذہانت جواب دے جاتی ہے۔

مقدس ڈاکو کا جو خط "مہذب ڈاکو" نے مولانا محمد علی ... یہ ہے:-

۴۸۶

از درگاہ شریف حضرت محبوب الٰہی - دہلی　　۱۲-اگست ۱۹۱۸ء

مکرمی - سلام علیکم - دو خط پہونچے - ابھی دو چار دن کی اور مصروفیت ہے اسکے بعد لکھنے کی کوشش کروں گا - لکھائی کا حساب رجسٹر میں دیکھ کر مطلع کروں گا - کیا عجب ہے کہ گورنمنٹ نے لکھا ہو - میں نے چیف کمشنر صاحب دہلی سے مفصل حالات بیان کر دیے تھے اور نظام کو پان اسلام زم کے جو سبق دیے جاتے تھے اُن کی با ضابطہ اطلاع دیدی تھی - اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ اُنھوں نے پنجاب گورنمنٹ کو اس خطرہ سے آگاہ بھی کیا تھا - (یہ خط بالکل خانگی ہے - اسکو چاک کر دیجیے اور اسکی اطلاع کسی کو نہ دیجیے - یعنی میرے اس کام کی خبر سوائے آپ کے کسی کو نہ ہو)

حسن نظامی

خواجہ صاحب نے اس خط کی اصلیت یا اسکی تحریر سے انکار نہیں کیا ہے، اس لیے اسکے مطالب و منشاء کے بارے میں خواجہ صاحب اور اُنکے چیلے چاپڑوں کی حاشیہ آرائیوں کی حاجت نہیں رہتی - خط یونانی، عبرانی یا قدیم مصری زبان میں نہیں ہے کہ اُس کا مفہوم سمجھنا دشوار ہو - ہر اردو داں شخص بآسانی اسکا مطلب سمجھ گیا ہوگا - البتہ اگر کوئی اختلاف رائے ہو سکتا ہے تو اس میں کہ یہ مخبری کس کس کے خلاف تھی اور کون کون اس ناوکِ جاسوسی کا ہدف بنے -

خواجہ صاحب کی تحریر مندرجۂ بالا کو پڑھ کر یہ حقیقت سب سے پہلے اور نمایاں طور پر سامنے آتی ہے کہ خواجہ صاحب نے چیف کمشنر کو مفصل حالات سُنا کر باضابطہ اطلاع دیدی کہ نظام کو پان اسلامزم کے سبق دیے جا رہے ہیں - سبق پڑھانے والا کون ہے؟ اسکا تحریر سے صاف پتہ نہیں چلتا، البتہ پنجاب گورنمنٹ کے حوالہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی پنجاب سے تعلق رکھنے والا شخص ہوگا - مگر مخبری کا راز کھلتے دیکھ کر خواجہ صاحب نے اس خیال سے کہ جرم کی اصلی نوعیت پر شاید پردہ پڑ جائے، اس معلم کا نام خود ہی ظاہر کر دیا - ظفر علی خاں صاحب اپنی سابقہ لغزشوں کی بنا پر قوم کی ایک بڑی جماعت کے مغضوب رہ چکے ہیں اور اگرچہ بعد کے دَورِ ابتلا

میں اپنی ثابت قدمی اور مسلسل قربانیوں سے اُنھوں نے بہت کچھ اپنی غلط کاریوں کی تلافی کردی لیکن مسئلۂ حجاز میں جو اختلافات ۲۵ء اور ۲۶ء میں رونما ہوئے اُنکی وجہ سے بہت سے لوگوں کو آج بھی اُن سے شدید بیزاری و مخالفت ہے۔ اس لیے خواجہ صاحب نے غالباً سمجھا کہ اُنکا نام ظاہر کرکے وہ اپنی شیطنت کو لوگوں کی نگاہوں میں بہت کم وزن اور اس بنا پر ناقابلِ لحاظ بنا دیں گے۔ مگر خواجہ صاحب کو یاد نہیں رہا کہ مخبری کرتے وقت پیشِ نظر مقاصد کی بدولت اُن کا دل نورِ ایمان سے اور دماغ عقل و ہوش سے قطعًا خالی تھا اسلیے وہ ایک ایسے جرم کا ارتکاب کر بیٹھے جو انسانوں سے ممکن تھا کہ پوشیدہ رہے مگر انسانوں کے خالق سے جو علیم و بصیر ہے مخفی نہیں رہ سکتا تھا۔ اور اس لیے اُسکا داغ ابدالآباد تک اُنکی پیشانی سے نہ چھوٹے گا۔

خواجہ صاحب نے چیف کمشنر کے سامنے ظفر علی خاں صاحب پر ایک ایسا الزام لگایا جو درحقیقت اگر سچا ثابت ہو جائے تو ظفر علی خاں کی تمام لغزشوں کا کفارہ کر دیگا۔ اسلیے کہ کسی تاجدار یا والیِ ریاست کو اخوت و ہمدردیِ اسلام کا سبق پڑھانا بجائے خود ایک ایسی سعادتِ عظمیٰ ہے کہ اُسکے صلہ میں خدا کے فضل و کرم سے بہترین نعمتوں کی توقع رکھنا چاہیے۔

خواجہ صاحب نے اپنے بیان میں اور اُنکے جتھے کے لوگوں نے اپنی تحریروں میں اس بات کے ثابت کرنے پر ساری قوت صرف کی ہے کہ چیف کمشنر صاحب سے جو کچھ کہا گیا وہ صرف ظفر علی خاں کے خلاف تھا۔ حضور نظام کی شکایت نہ تھی بلکہ حضور نظام کی بھلائی کے لیے یہ زحمت بھی گوارا کی گئی ورنہ کہاں مقدس ڈاکو کی محترم شخصیت اور کہاں اس قسم کی مخبری و شکایت۔ خدانخواستہ وہ یا اُنکے باپ دادا کوئی پولیس کے تنخواہ یاب ملازم تو نہ تھے۔ اب یہ محض اتفاق ہے کہ ۱۸ء میں ظفر علی خاں سے مقدس ڈاکو محض اس بنا پر ناراض تھا کہ وہ دعویدارانِ تصوف کی شان میں گستاخیاں کرتے رہتے تھے۔

مگر ان بدنصیبوں سے کوئی پوچھے کہ جو شخص پان اسلامزم کے سبق پڑھانے کو جرم قرار دے اُسکو اسلام سے بھی کوئی تعلق باقی رہتا ہے۔ کیا دنیا میں اُس سے زیادہ کوئی بدبخت غدارِ ملت ہو سکتا ہے جو خود اپنے مذہب کی بنیادی تعلیم کی اشاعت کو ایک فرنگی کے سامنے جا کر قابلِ گرفت قرار دے۔ کیا صریح بے دینی و لامذہبیت کے اس مظاہرہ کے بعد بھی حسن نظامی کا یہ منہ ہے کہ اُس خدائے واحد کے نام کی قسمیں کھا کھا کر مسلمانوں کو ... دلائے۔ جسکی تعلیم اخوت کے گلے پر خود اُنکی سرشت کی خباثت اور نفس کی غدارئ ... چھری پھیری جا چکی ہو۔

لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ جسوقت یہ مقدس ڈاکو اپنے آقائے ولی نعمت کے پاس ظفر علیخاں کی شکایت کرنے گیا تھا اُسوقت اسکا یہ منشا شاید نہو کہ رئیس حیدرآباد کو وہ کسی آفت میں مبتلا کرے۔ لیکن اس سے کون شخص انکار کر سکتا ہے کہ ہوا و ہوس کی بندگی میں اُسکے ہوش و حواس بجا نہ رہے تھے اور جو کچھ اُس نے ظفر علی خاں سے انتقام لینے کی غرض سے دہلی کے فرنگی حاکم کے سامنے گفتگو کی اُسکے عواقب و نتائج پر اُس نے ایک لمحہ کے واسطے غور نہیں کیا۔ اور وہ ایسا کرتا ہی کیوں۔ اُس کا تو زندگی بھر پیشہ ہی مسخرگی و عیاری کے سوا کچھ نہیں رہا۔ اُس نے دیکھا کہ مسلمان مذہب و تصوف کے نام سے زیادہ آسانی و فراوانی کے ساتھ لوٹے جا سکتے ہیں اسلیے اُس نے شروع ہی سے اپنا یہی وطیرہ بنا رکھا تھا۔ آج جو کچھ وہ اپنی مدافعت میں کہنے پر مجبور ہے اُس کا سبب تو صرف یہ ہے کہ اُمید کے خلاف اہتمام کے باوجود یہ تحریر جس پر اسلام ظفر علیخاں اور نظام حیدرآباد، تینوں کے خونِ ناحق کی مہر لگی ہوئی ہے چھپ نہیں سکی اور اخبار ہمدرد کے افق پر شفق بنکر اُسکی خونخواری و غداری کی ایک عالم میں تشہیر کر رہی ہے۔ حیدرآباد سے اپنی برات کی فکر اگر ہے تو صرف اس خیال سے کہ وہاں سے اُسکو کثیر آمدنی تھی اور اب اُسکا ہمیشہ کے لیے دروازہ بند ہوا جاتا ہے۔ مہاراجہ کشن پرشاد کی عنایات بے غایات کے باوجود نظام حیدرآباد کی مخبری کا خون اُسکے چہرہ کو داغدار بنائے رہا تو ظاہر ہے کہ دکن کے بھولے بھالے لوگوں پر اسکا داؤ نہ چل سکے گا۔

لیکن درحقیقت اس کا سب سے بڑا قصور یہ نہیں ہے کہ نظام کو یا ظفر علی خاں کو اُسنے نقصان پہونچایا، بلکہ اُس کا اصلی جرم یہ ہے کہ اُس نے خود اسلام سے غداری کی اور ایک غیر مسلم کے سامنے اُس چیز کو جرم و معصیت ظاہر کیا جو ایک مسلمان کے لیے بہترین عبادت و نیکی ہونا چاہیے۔

ظفر علی خاں صاحب کی شکایت سے اگرچہ مقدس ڈاکو نے انکار نہیں کیا ہے لیکن رئیس حیدرآباد کی خیر طلبی کی آڑ میں وہ اس الزام سے بھی بری ہونا چاہتا ہے۔ اور اسکی تائید میں فخریہ کہتا ہے کہ

"میں نے مولانا ظفر علی خاں صاحب کی نسبت یہ نہیں کہا کہ وہ سب بنا رہے ہیں، اِنکو پھانسی دیدو۔ بلکہ یہ کہا کہ انکی صحبت حضور نظام کے لیے مفید نہیں ہے۔ یہ کہنا بے شک مولانا ظفر علی خاں کے مالی مفاد کے لیے تو مضر ہوا مگر انکو اور کوئی نقصان نہیں پہونچا۔"

گویا مقدس ڈاکو کے نزدیک کسی شخص کو جب تک وہ پھانسی کے تختے تک نہ پہونچا دے تب تک مخبری کی ملعون خدمت پوری طرح سرانجام نہیں پاتی — اس سے حضرت محبوب الہیٰ کے اس مصنوعی خواہرزادہ کی خباثتِ طینت کا اندازہ کرنا چاہیے کہ ایک مسلمان کو شدید مالی نقصان پہونچانے اور ریاست حیدرآباد سے نکلوا دینے کے باوجود اسے اپنی بدبختانہ شیطنت پر شرم نہیں آتی بلکہ وہ ریاست حیدرآباد کا خبرسگال بنکر اس مکروہ عیب کو بھی اپنے لیے ہنر بنا دینا چاہتا ہے۔ اور سمجھنا چاہیے کہ اگرچہ ابھی تک یہ امر پردۂ خفا میں ہے لیکن اسکو موقع ملا ہوگا تو اس نے مولانا محمد علی اور دوسرے لوگوں کے خلاف جنکو وہ بجائے خود اسلام کا دشمن سمجھتا ہے اس قسم کی خفیہ اطلاعیں بھی ضروری ہونگی جنسے مولانا محمد علی اور دوسرے قومی کارکنوں کو مالی نقصان اٹھانے کے بجائے اپنی عزیز جانوں سے ہاتھ دھونا پڑے

کہ خبثِ نفس نہ گردد بسالہا معلوم

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ چیف کمشنر سے شکایت کرتے وقت ممکن ہے کہ مقدس ڈاکو حضور نظام کو نقصان پہونچانے کا خواہاں نہ ہو اور یہ زیادہ سے زیادہ حُسن ظن ہے جو اس غدارِ اسلام اور مجسمۂ شیطنت کے ساتھ روا رکھا جا سکتا ہے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو کچھ چیف کمشنر سے کہا گیا اُس سے حضور نظام کو نقصان نہیں پہونچا۔

حیدرآباد کے معاملات پر کچھ ایسے تہ بہ تہ پردے پڑے ہوے ہیں کہ کم سے کم راقم الحروف کو اس بارے میں کچھ لکھتے ہوے عذر پیش و پیش ہوتا ہے۔ لیکن اگر کوئی نیا واقعہ نہ بھی پیش آتا اور وہاں کے حالات میں آج بھی ویسا ہی سکون ہوتا جیسا کہ چند سال قبل تھا، تب بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ نظام کو پان اسلامزم کا سبق پڑھائے جانے کی اطلاع کسی انگریز کو دیجانے تو اس سے انگریزوں کے دلوں میں نظام کی طرف سے کوئی بدگمانی اور سوءِظن پیدا نہ ہوگا۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ یورپ کے مدبرین عموماً اور انگریز خصوصاً پان اسلامزم سے حد درجہ بیزار اور خوفزدہ ہیں۔ چنانچہ مقدس ڈاکو نے خود اپنے بیان میں اعتراف کیا ہے کہ

"پان اسلامزم کی تحریک یورپ کی گوری قوموں کو خوفناک ہوا، اور گوری اقوام کو نگل جانے والا اژدہا نظر آنے لگی"

جو چیز انگریزوں کے خیال میں کہ وہ بھی گوری قوم ہوتے ہا نظر آتی ہو اُسکے سبق اگر اُسکے کسی یار وفادار کو دیے جاتے ہوں اور ... یا مخبر پہونچائے

جو دنیا کو باور کرانا چاہتا ہے کہ وہ بانیِ اسلام علیہ السلام کا نواسہ ہے اور اُنکے مقربین بارگاہ سے قرابتِ قریبہ کے تعلقات اختصاصی رکھتا ہے تو ظاہر ہے کہ انگریزوں کے دلوں میں اپنے یار وفادار کی طرف سے حسن ظن نہ بڑھے گا بلکہ وہ اگر اپنے یار وفادار کے دشمنِ جانی نہ بن جائیں بت بھی اس میں ذرا شک نہیں کہ اُنکے دلوں میں بدگمانی اور خوف کا جاگزیں ہو جانا بالکل یقینی ہے۔ اور یہی وہ سب سے بڑی اسلامی خدمت ہے جو مقدس ڈاکو کے ہاتھوں انجام پا سکتی تھی۔

حسن نظامی کا یہ خط بہت مختصر ہے۔ چیف کمشنر صاحب سے مفصل گفتگو ہونے کا ذکر اسمیں موجود ہے اور ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ چند سطروں کے خط میں جب اس قدر زہر بھرا ہوا ہے کہ خود راقم تحریر کی دلی تمنا یہ ہے کہ خط پڑھ کر فوراً چاک کر دیا جائے اور کسی کو اطلاع نہ ہونے پائے، تو مفصل گفتگو میں خدا معلوم ظفر علی خاں اور حضور نظام کے تعلقات کو کس کس پیرایہ سے بیان کیا گیا ہوگا۔ اور چیف کمشنر نے پان اسلامزم کے اژدہے سے خوف کھا کر اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ گورنر جنرل اور پنجاب کے لاٹ صاحب کو دونوں کے خلاف کتنا بھرا ہوگا۔

قیاس کن ز گلستانِ من بہارِ مرا

الناظر کے نئے دور میں، جو جنوری ۱۹۲۷ء سے شروع ہوتا ہے، ذاتی افکار و ترددات اور مشاغل کے ہجوم و کثرت نے اس کا موقع نہیں دیا کہ خواجہ صاحب کے اُن کارناموں پر کوئی تبصرہ کیا سکتا جنکی بدولت مولانا محمد علی نے اُنکو تبلیغی راجہ کا لقب عطا فرمایا ہے۔ اسکے یہ معنی نہ سمجھے جائیں کہ خواجہ صاحب کی بازی گریوں اور شعبدہ بازیوں پر ہماری نظر نہیں رہی یا خدا نخواستہ خواجہ صاحب نے اس عرصہ میں پارسائی کی قسم کھالی تھی۔ اب جو یہ سلسلہ چھڑ گیا ہے تو خدا نے چاہا خواجہ صاحب کے اس نئے اور بظاہر نہایت کامیاب سوانگ سے بھی ناظرین الناظر رُوشناس ہو جائیں گے۔ وما توفیقی الا باللہ

۲۲ - جنوری ۱۹۲۷ء　　　ظفر الملک

پچھلے مہینے کے رسالے

دلگداز

نومبر کے دلگداز میں مولانا عبدالحلیم شرر (مرحوم) کا ایک پُرمغز مضمون "اسلام اور فلسفہ کا سابقہ" کے زیرِ عنوان شایع ہوا ہے، جس میں قوم کو ایک بڑے خطرہ سے متنبہ کرکے مناسب مشورہ دیا گیا ہے۔ ناظرینِ النّاظر کی اطلاع کے لیے یہاں اُسکا اندراج ضروری معلوم ہوتا ہے:-

"یورپ میں مسیحیت کا نشاۂ ثانیہ ظہور پذیر ہوا تو اُنھوں نے اُن علوم (علوم معقول وفلسفہ) کو مسلمانوں سے لیکر رواج دینا شروع کیا تو وہی فتنہ جو اُنھوں نے پروپیگنڈا کرکے اسلام میں پیدا کرنا چاہا تھا خود مسیحیت میں پیدا ہوگیا۔ سچ یہ ہے کہ اُس نے مسیحیت کو بالکل پامال کرڈالا۔ فی الحال دینِ عیسوی برلے نام اور ایک طرزِ معاشرت کی حیثیت سے موجود ہے مگر اُسکی سچائی پریقین شاذونادر ہی وہاں کسی کو ہو......

جو علوم مسیحیت کو مٹا چکے اب اسلام کو مٹا رہے ہیں۔ علمائے اسلام نے اس آفت سے بچنے کے لیے جو کچھ کیا صرف اسی قدر ہے کہ اپنے چند جداگانہ مدارس قائم کردیے مگر اس سے انگریزی پڑھنے والوں پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ بلکہ جو خلیج انگریزی اور اسلامی تعلیم کے درمیان ہے روز بروز زیادہ وسیع ہوتی جاتی ہے اور فرزندانِ اسلام کے دو متنازع و متضاد گروہ تیار ہوتے جاتے ہیں، جو دونوں ایک دوسرے کو ذلیل اور جاہل تصور کرتے ہیں۔ ایک دین پرست ہے اور ایک سائنس پرست۔

علما اور دیندار اُمرا کا فرض ہے کہ اس مشکل کو حل کریں ورنہ نہایت خراب نتیجوں کے برآمد ہونے کا قطعی اندیشہ ہے"

زمانہ

نومبر کے زمانہ میں سید اطہر حسین جعفر (مرزاپوری) نے ایک دلچسپ مضمون عراق کے آثارِ قدیمہ پر سپردِ قلم فرمایا ہے۔ مضمون کے آخری حصہ میں تلاش آثار کی تاریخ اختصار کے ساتھ بیان کردی گئی ہے۔ اس دلچسپ حصہ کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے:-

"اہلِ برطانیہ کو بابل کے آثارِ قدیمہ کی طرف توجہ دلانے کی ابتدا ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے ہوئی تھی۔ چنانچہ کمپنی مذکور نے رزیڈنٹ متعینۂ بصرہ کو حکم بھیج کر وہاں کی اینٹوں کے نمونے لندن میں منگوائے تھے۔ لیکن جس شخص نے کہ اول اول بابل اور نینوا میں تحقیقات کی بنیاد ڈالی وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا رزیڈنٹ متعینۂ بغداد تھا۔ جسنے ۱۸۲۱ء میں بعارضۂ ہیضہ شیراز میں انتقال کیا۔ اسکے بعد دیگر مشاہیر مثلاً کرپورٹر، چزلی، ولالن سن، لیبرڈ، جارج اسمتھ، رسام، اور رکنگ وغیرہ اُنھیں کے نقشِ قدم پر چلے۔

اہل جرمنی کی جانب سے تحقیقات کی ابتدا ۱۸۸۶ء میں مقام سرغول اور الحبہ میں ہوئی جو تلو سے بالکل نزدیک ہے۔ لیکن کالڈیوی نے بابل کے ویرانوں کے کھودنے کی ابتدا ۱۸۹۹ء میں کی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ بنوخذ نصر (۶۰۴-۵۶۱ ق م) شہر کا ایک بہت بڑا حصہ برآمد ہوا۔

۱۸۸۹ء میں اہل امریکہ نظر آئے جہاں اُنھوں نے کھدائی کا کام نہایت جانفشانی سے شروع کیا اور اگرچہ درمیان میں اکثر رکاوٹیں پڑیں لیکن پھر بھی بہت درجہ کامیاب رہے، مگر جنگ چھڑتے ہی اُن کا کام بالکل رک گیا۔

پچھلی نصف صدی میں ترکی حکومت کی بدولت عراق کی وہ حالت ہوگئی کہ سائنسدانوں کی تحقیق اور تفتیش کے کاموں میں بیحد دشواریاں پڑنے لگیں .... جس وقت کہ باے صاحب خورس آباد کے ٹیلوں کو کھدوا رہے تھے اُنکو زر کثیر صرف کرکے بلّیاں منگوانی پڑیں تاکہ مدفون شہر کی دیواروں کو اُنکے سہارے سے کھڑا رکھا جائے۔ لیکن افسوس ہے کہ قرب وجوار کے قریوں کے باشندے ایک ایک کرکے اُن لکڑیوں کو چُرانے لگے؛ جسکی وجہ سے دیواریں مسمار ہوگئیں۔ ترکی گورنر کا خیال تھا کہ باے صاحب سونا نکالنے کی فکر میں ہیں۔ چنانچہ اُسنے وہاں پہرہ لگا دیا۔ اور جب سونا نہ نکلا تو باے صاحب کے آدمیوں کو قید کردیا ....

اسی پر مصیبت کا خاتمہ نہیں ہوا بلکہ بہت سے عجائب روزگار جو خورس آباد میں نکلے تھے مع ۶۰ عدد صندوقوں کے جن میں اشور بنی پال کے محل واقع نینوا کی تحقیق سے برآمد شدہ ہونے کی تصویریں تھیں، دجلہ میں کشتی کے غرق کردیے جانے کی وجہ سے ضایع ہوگئے۔ علاوہ اسکے وہ سارا سامان جو آرٹ صاحب نے بابل میں کھود کر نکالا تھا یا اوروں سے مول لیا تھا مع عہد زمستین (۵۰ ، ۳ ق م) کی قیمتی سنگ مرمر کی چھوٹی سی کشتی کے قرنا دریا کے قریب بصرہ جاتے ہوے غرقاب ہوگیا۔

اہل امریکہ کو مقام نفر میں بڑی بڑی مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ ایک مرتبہ تو عربوں نے یہ غضب ڈھایا کہ اُنکے کیمپ میں آگ لگادی۔ جس سے نصف سے زیادہ گھوڑے جلکر مر گئے۔ اور ایک ہزار ڈالر نقد عربوں کے ہاتھ آئے۔ بہرچند کچھ عرصہ تک کھدائی کا کام ملتوی رہا۔ لیکن غنیمت ہوا کہ برآمد شدہ اشیاء سب بچ گئیں۔

اگر ملک عراق کی یادگاروں کو محض سطحی نظروں سے دیکھا جائے تو بھی یہ پتہ چل جائیگا کہ مورخین، علماے آثار قدیمہ، سیاحوں اور مسافروں کے لیے قدیم اور دلچسپ اشیاء کا کتنا بڑا ذخیرہ یہاں موجود ہے۔"

معارف

گذشتہ ماہ میں مولانا سید سلیمان ندوی کے مضمون "حجاز کے کتبخانے" سے مکہ معظمہ کے ایک مشہور کتبخانے کا کچھ اقتباس درج کیا گیا تھا۔ ابکی بار اُسی مضمون کی دوسری قسط

سے مدینہ منورہ کے مشہور ترین کتبخانے کا کچھ بیان پیش کیا جاتا ہے۔ یہ کتبخانہ مسجد نبوی سے متصل باب جبریل کے قریب قبلہ کی سمت میں واقع ہے اور عارف حکمت بے کا کتبخانہ کہلاتا ہے :-

" کتبخانے کے کمرے کے باہر وانی دیوار پر عربی، فارسی، ترکی کے مختلف قطعات اور رباعیاں نہایت خوشخط وصلیوں پر لکھی ہوئی آویزاں ہیں۔ قدیم ترکی سلطنت، حجاز ریلوے اور مسجد نبوی کے نقشے بھی آویزاں ہیں۔ قطعات میں بعض قطعے خود شیخ الاسلام عارف حکمت بے کے طبعزاد ہیں منجملہ ان عربی، فارسی، اور ترکی کے منظومات کے یہ دیکھ کر کسقدر تعجب ہوا کہ ان میں ایک اُردو کی نعتیہ غزل بھی کاغذ پر خوشخط لکھی ہوئی شیشے میں جڑی ہوئی آویزاں تھی۔ نیچے اُردو کے اُس خوش نصیب شاعر کا نام دیکھ کر اور تعجب ہوا کہ یہ دکن کے ہندو نام اور اسلام دل صوفی شاعر مہاراجہ کشن پرشاد (مدارالمہام دولت آصفیہ) تھے۔ مطلع اور مقطع یہ ہے :-

ہی کہتے ہیں مدح خوانِ محمدؐ جو شانِ خدا ہے وہ شانِ محمدؐ
شفاعت تری شادؔ کیونکر نہ ہوگی کہ دل سے ہے تو مدح خوانِ محمدؐ

کتبخانے کے واقف عارف حکمت بے تیرہویں صدی کے مشہور ترک علما میں تھے ..... اُنھوں نے یہ زمین خریدی، اُس پر یہ مختصر سی مگر نہایت صاف اور نکھری ہوئی عمارت بنوائی۔ کتابوں کے بڑے شائق اور عاشق تھے۔ اپنی جائداد کا بڑا حصہ انھوں نے ان پر صرف کیا تھا۔ یہ کتابیں اسی عمارت میں رکھیں۔ پھر مقدونیہ اور ایشیائے کوچک میں اپنی جائداد اس کتبخانے کی بقا و ترقی کے لیے وقف کی .... کتبخانے میں عربی، فارسی، ترکی کی کتابیں ہیں، زیادہ تر حصہ عربی کتابوں کا ہے۔ جلدوں کی تعداد مجھے سترہ ہزار بتائی گئی۔ ہر کتاب عمدہ جلد بندھی ہوئی، صاف ستھری، اور خوشخط ہے۔ اکثر کتابیں غیر مطبوعہ اور قلمی ہیں اور مختلف علوم و فنون سے متعلق ہیں .... کتبخانے میں قدامت کے اعتبار سے جسکی تاریخ معلوم ہے سب سے پُرانی کتاب غالباً حضرت ابن عباسؓ کی روایاتِ تفسیر، جو تفسیر ابن عباس کے نام سے ملتی ہے، اُسکے آخری چند اوراق ہیں۔ یہ سورۂ فلق اور الناس وغیرہ آخری سورتیں ہیں۔ ختم پر اُسکی کتابت کی تاریخ سہ شنبہ ۱۲۔رجب المرجب ۲۱۶ھ مرقوم ہے۔ یہ ہرن کی کھال کے کاغذ پر لکھی ہوئی ہے۔ ہرن کی کھال کو اس قدر پتلا اور چکنا کیا گیا ہے کہ موٹا کاغذ معلوم ہوتا ہے۔ قرآن مجید کا ایک چھوٹی تقطیع کا نسخہ ہے جو پورا شترمرغ کی کھال کے کاغذ پر ہے۔ ابتدائی اوراق ضایع ہوگئے ہ ... کی کھال پر

لکھکر لگا دیے گئے ہیں۔ شترمرغ کی کھال کا کاغذ ... کا خط
کوفی ہے اور اعراب اور شاید نقطوں سے بھی خالی ... یا ہی ہے
اُس پر اعراب اور نقطے لگا کر اُس کی خوبی کو برباد کیا ... ہر بھی ہے

مگر کسی نے پہلے صفحے پر لکھدیا ہے کہ بخط عثمانؓ - یہ صحیح ہو یا نہ ہو مگر اعراب اور نقطوں کے سبب سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اعراب اور نقطوں کی ایجاد کے پہلے لکھا گیا ہوگا۔ اعراب اور نقطے حجاج کے زمانہ میں لگائے گئے ہیں "

ہمایوں نومبر کے ہمایوں میں مسٹر حامد حسین اعظمی نے محمد تغلق پر ایک محققانہ مضمون تحریر فرمایا ہے جس میں محمد تغلق پر جو الزامات لگائے جاتے ہیں اُن کا نہایت مدلل جواب دیا گیا ہے لائق مضمون نگار نے محمد تغلق پر الزامات عاید کیے جانے کی یوں توجیہ کی ہے :-

" جس طرح سترہویں صدی میں انگلستان میں وگ (Whig) اور ٹوری (Tory) کے نام سے ملک میں دو جماعتیں قائم تھیں جن کے اختلاف نے ملک میں شور و شر برپا کر رکھا تھا بعینہ محمد تغلق کے دوران حکومت میں ہندوستان میں بھی دو جماعتیں تھیں جو سلطنت کی باگڈور کو دو متضاد سمتوں میں کھینچ رہی تھی - ایک جماعت اُن لوگوں کی تھی جنکا خیال تھا کہ ہندو یا مسلمان، پارسی یا یہودی، جو بھی حکومت کے فرائض انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہو اچھے سے اچھے عہدے پر جسکو وہ بخوبی نباہ سکتا ہو مقرر کیا جائے اس جماعت کا سب سے بڑا رکن خود محمد تغلق تھا ..... دوسری جماعت اُن ولائتیوں کی تھی جو چاہتے تھے کہ جتنی طرفداری ممکن ہو پردیسی مسلمانوں کے ساتھ برتی جائے۔ "خطرناک" ہندیوں کو ملک کے کسی انتظام میں حصہ نہ دیا جائے - اسی جماعت کے نمک خواروں میں سے برنی بھی تھا، جو اپنے وقت کا سب سے معتبر مورخ مانا جاتا ہے - ظاہر ہے کہ محمد تغلق کا انتظام سلطنت برنی کی خواہش کے مطابق نہ تھا اور یہ محمد تغلق کی سب سے بڑی بدنصیبی ہے کہ اُسکے عہد کا بہترین مورخ برنی ہے - ؎ ولیکن قلم در کفِ دشمن است ؛

یہ انصاف پرست مورخ اُسکو ظالم و بے رحم بتاتا ہے کیونکہ اُس نے خراج میں اضافہ کیا، دارالخلافہ کی جگہ بدل دی، تانبے کے سکّے جاری کیے - اور ظلم تو یہ ہے کہ وہ اُسکو سخی بھی کہتا ہے - مگر اسی سخاوت کو عنوان بناکر جس قدر اُسکی بُرائی کرسکتا ہے نہایت صفائی کے ساتھ بیان کرجاتا ہے - اسکی انصاف پرستی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اُس نے کہیں بھی یہ نہیں کہا کہ وہ کسی قدر منصف مزاج یا کسی قدر جویاے علم و عمل بھی تھا - اُسکے یکطرفہ فیصلے کا یہی نتیجہ ہوا اور یہی ہونا بھی چاہیے کہ بہت سے مورخین کو سونے میں سُہاگہ ملانے کا اچھا موقع ہاتھ آگیا "

آگے چل کر دوآبہ پر خراج بڑھانے کے الزام کا یہ جواب دیا ہے :-

" محمد تغلق نے صرف دوآب بنارس اور دوآب دریاے سندھ و گنگا ہی میں خراج کا اضافہ کیا تھا اور کہیں اس تغیر کا اثر نہ ہوا، اس موقع پر سوال یہ ہے کہ کیا

محمد تغلق کی حکومت ان تمام ضروریات سے بے نیاز تھی جن سے مجبور ہو کر آج کی متمدن سے متمدن حکومت آئے دن رعایا کی جیب ٹٹولتی ہے۔ اگر وہ بے نیاز نہ تھا اور یقیناً نہ تھا تو یہ بتاؤ کہ علاقۂ دوآب سے نہیں تو اور کہاں کے لوگوں سے یہ خراج لیا جاتا۔ کیا چٹیل میدانوں اور ریگستانی علاقوں سے؟ اگر یہ سچ ہے کہ ٹیکس زیادہ تر زرخیز مقامات ہی کے لوگوں پر بڑھایا جاتا ہے تو اب اس سوال کی گنجائش ہی نہیں کہ دوسری جگہ خراج کیوں نہیں بڑھا۔ سب سے اہم بات جو ہمیں یاد رکھنی چاہیے یہ ہے کہ اتنا خراج نہیں بڑھایا گیا تھا کہ رعایا کسی حالت میں ادا نہ کر سکتی۔ لیکن بادشاہ و رعایا دونوں کی بدقسمتی سے اسی سال قحط پڑ گیا۔ رعایا مجبور ہو گئی اور خراج کے ادا کرنے میں دشواریاں پیش آئیں ورنہ بذات خود خراج میں اضافہ کرنا جبکہ حکومت کو اسکی ضرورت ہو نہ تو کوئی عیب ہے اور نہ کوئی ظلم۔ یہ تو ایک منحوس موقع تھا جو آخرالذکر جماعت کو خوش قسمتی سے مل گیا جسکی بنا پر انھوں نے ملک میں جا بجا بغاوتیں پھیلانے کی کوشش کی اور جب ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو جنگل کو بھاگ کھڑے ہوے مگر محمد تغلق نے ان مفسدوں کو گھیر لیا اور "شاہی تعزیرات" کے مطابق سزائیں دیں۔ غالباً یہ بعض مورخین کی دانستہ غلط فہمی ہے کہ محمد تغلق نے اپنی بھاگی ہوئی معصوم رعایا کو تباہ و برباد کرنے کی غرض سے یہ فوج بھیجی تھی۔ بادشاہ کو اپنی مصیبت زدہ، بیگناہ، اور امن پسند رعایا کا اتنا خیال تھا کہ اس نے چار مہینے تک خیرات کا سلسلہ جاری رکھا۔ جسکے باعث غربا اور مفلسوں کا طبقہ زمانۂ قحط کو قحط نہ سمجھ سکا۔ رہے کسان جو خیرات نہ لے سکتے تھے انکو آیندہ نسل کی ترقی اور عمدہ فصل کی غرض سے سلطنت نے تقاوی تقسیم کی۔ اس سے ہم تو یہی نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس نے فوج بھیجی تو مفسدین کے خلاف اور پر امن رعایا کی ہر طرح مدد کی، لیکن برنی اور برنی کے غیر متعصب، بے لوث اور انصاف پسند شاگرد بتائیں کہ یہ محمد تغلق کے متضاد کیرکٹر کا نتیجہ ہے؟"

نگار انگلستان کے ایک ادیب مسٹر الڈونس نے سیر ہندوستان کے بعد "دی نیشن اینیم" میں تاج کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ سارے مضمون کا ماحصل یہ ہے کہ (۱) عمارت سستی کاریگری کا نمونہ ہے (۲) چاروں مینار نہایت غیر موزوں بنائے ہیں (۳) تخیل کی فراوانی اس میں نہیں ہے (۴) اسکے نقش و نگار غلط ہیں۔ نومبر کے نگار میں حضرت نیاز نے ان الزامات پر مختصر تبصرہ فرمایا ہے۔ اور مشرقی "ہندسۃ البناء" کے ماہروں کو مسٹر الڈنس کے خیالات کی تنقید کی دعوت دی ہے۔ فی الحال حضرت نیاز کے تبصرہ کا اقتباس ملاحظہ فرمایئے (حالانکہ یہ بہت غیر مکتفی ہے):

"پہلے اعتراض کے متعلق میں نہیں کہہ سکتا کہ مسٹر الڈنس کا بیان کہاں تک صحیح ہے

کیونکہ اول تو اندر سے کھود کر میں نے دیکھا نہیں اور اگر دیکھا بھی ہوتا تو بھی میں نہ سمجھ سکتا تھا کہ اسکو سستی کاریگری کا نمونہ سمجھوں یا بیش قیمت عرق ریزی کا۔ علی الخصوص اُسوقت جبکہ تاریخ سے یہ امر پوری طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ اُس عہد میں جبکہ محنت و مادہ دونوں ارزاں اور بہت ارزاں تھے اسپر موجودہ سکّے کے لحاظ سے لاکھوں روپئے صرف ہوئے تھے۔ میناروں کی مخروطی شکل کو ناموزوں سمجھنا اُنکو نامناسب حد تک تپلا ظاہر کرنا اُنکے برآمدوں یا چھجّوں کو بدنما بتانا اگر اسکا تعلق نظر اور ذوق سلیم سے ہے تو ہمیں تعجب نہیں کیونکہ ہمارا روز کا مشاہدہ ہے کہ وہی چیزیں جو دنیا کے اکثر افراد کو اچھی معلوم ہوتی ہیں بعض کے نزدیک بُری ہوتی ہیں۔ لیکن اس سے نفسِ تاج کی تعمیر پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔

....

یہ صحیح ہے کہ تاج میں تخیل کی فراوانی نہیں ہے اور نہ ہو سکتی تھی، فاضل نقاد نے اس امر پر غور نہیں فرمایا کہ یہ عمارت مقبرہ کی ہے اور قبر یا مزار کے ساتھ انسان کا جو خیال وابستہ ہوتا ہے وہ جدت پسند نہیں ہوتا اور نہ اُسکو تنوع کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا تعلق اک ایسے انعطاف سے ہوتا ہے جو صرف تشائم ہے اور اس میں بہار کی رنگینی مجلسِ نشاط کی چہل پہل کی جستجو کرنا یقیناً نقاد کی بے بصیرتی پر دلالت کرتا ہے۔

رہا یہ امر کہ نقش و نگار غلط ہیں، ممکن ہے اس الزام میں کچھ صحت ہو، کیونکہ جن پھولوں کو بیلوں کو پچّے کاری کے ذریعے سے دکھایا گیا ہے اُن میں وہ سایہ دکھانا جو اُسکو حقیقی پھول یا بیل کی صورت دیسکے ناممکن تھا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اُبھرے ہوئے پھولوں کو بڑی حد تک اصل کے مماثل بنایا گیا ہے اور سترہویں صدی کی عمارتوں میں مشکل سے کوئی عمارت ایسی نظر آسکتی ہے جس میں اس درجہ فن و نزاکتِ نقش کا لحاظ رکھا گیا ہو۔"

جامعہ

اُردو رسائل کے خلافِ دستور جامعہ نے اپنے نومبر نمبر میں مولوی سعید انصاری کے قلم سے اورنیٹل کانفرنس کے مفید خطبۂ صدارت کا ترجمہ شایع کیا ہے۔ جناب صدر شمس العلماء ڈاکٹر جیون جی جمشید جی مودی، مہابھارت کے مطالعہ کی تاریخ پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:—

"پونہ میں جس طرح کا عملہ ادارت بنایا گیا ہے اُسی طرح کا ایک عملہ آج سے تین سو برس پیشتر شہنشاہ اکبر نے بھی مہابھارت کی تالیف و ترجمہ کے لیے قائم کیا تھا۔ اس دُور اندیش بادشاہ کا خیال کم و بیش ویسا ہی تھا جیسا کہ میکس مولر نے ظاہر کیا ہے۔ یعنی یہ کہ تمام ہندوستانیوں کو مہابھارت پر فخر کرنا چاہیے اور اسکے متعلق ہر شخص کو کچھ نہ کچھ واقفیت رکھنی چاہیے۔ چنانچہ اسکی کوشش یہ تھی کہ مہابھارت کے مضامین تمام فارسی بولنے والوں تک پہونچ جائیں۔ ابو الفضل اور بدایونی نہایت تفصیل کے ساتھ اکبر کے اُس شوق کا ذکر کرتے ہیں جو اُسے ہندوؤں کی اس اہم کتاب کے متعلق تھا اور جس کا نام اُس نے "رزم نامہ" رکھا تھا۔ ابو الفضل نے ہندوستان کے علوم و فنون کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔

انھوں نے یہاں کے فلسفہ کے نوؤں مذاہب کا بہ تفصیل ذکر کیا ہے - غرض ہم کو ابوالفضل کی "آئین اکبری" اور بدایونی کی کتاب "منتخب التواریخ" سے پتہ چلتا ہے کہ اکبر نے مہابھارت کا فارسی میں ترجمہ کرنے کے لیے ایک عملہ تیار کیا تھا جس میں یہ اشخاص شریک تھے : نقیب خاں - مولانا عبدالقادر بدایونی، شیخ سلطان تھانیسری، مُلّا شیری، اور شیخ فیضی - ترجمہ کا پورا کام ان اشخاص میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور اسکی نگرانی اور دیکھ بھال کا کام خود یہ بیدار مغز بادشاہ انجام دیتا تھا - ان میں سے ایک کے سوا کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اچھی طرح سنسکرت جانتا ہو، لہذا اُنکی امداد کے لیے اُنھیں لایق پنڈت دیے گئے - یہ پنڈت سنسکرت کی عبارت کو سمجھاتے جاتے اور یہ اُس کا ترجمہ کرتے جاتے تھے - بعض وقت اکبر خود بول اُٹھتا اور بتاتا کہ پنڈتوں کے مفہوم کو فارسی میں بہتر طریقہ پر کس طرح ادا کرنا چاہیے - وہ اس اہم کام میں کم سے کم چار سال برابر لگے رہے جسکے متعلق ان ارکان میں سے ایک کا بیان ہے کہ "حرفِ دہ ہزار سالہ را بزبان حال موافق می سازم"۔

شہنشاہ اکبر کی اس کوشش کے متعلق میں نے یہاں اس قدر تفصیل کے ساتھ اس وجہ سے ذکر کیا ہے، تاکہ میں اس بڑے کام کے لیے جسے اکبر اور میکس مولر جیسی دو بڑی شخصیتوں نے اس قدر سراہا ہے، آپ سے اپیل کروں - ایرانی فضلا بھی مہابھارت سے بہت کچھ دلچسپی رکھتے ہیں اسوجہ سے کہ اس کے بعض واقعات شاہنامہ سے ملتے جلتے ہیں - انکی شاہنامہ گویا ایران کی مہابھارت ہے - کہا جاتا ہے کہ اکبر کی توجہ مہابھارت کی طرف اُسوقت سے منعطف ہوئی جبکہ وہ اپنے ہاں شاہنامہ سنا کرتے تھے"۔

شمع

اکتوبر و نومبر کا شمع ایک ساتھ شایع ہوا ہے - اس نمبر میں "محمود کی سیرت اور کارنامے" پر پروفیسر محمد حبیب کا عالمانہ مضمون جو انگریزی میں لکھا گیا تھا، بعد ترجمہ شایع کیا گیا ہے جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ محمودی حملوں کی غرض مذہبی نہ تھی - ملاحظہ ہو :-

"غزنوی فوج مجاہدین کا اجتماع نہ تھی جو مذہب کی خاطر لڑنے پر آمادہ ہوتی - وہ تو تربیت یافتہ ماہرین فن کی بھرتی شدہ تنخواہ دار فوج تھی جو ہندو مسلمانوں سے یکساں لڑنے کے عادی تھے - صرف ...... دو حملوں میں رضا کاروں کا وجود پایا جاتا ہے اور وہ بھی اس قدر قلیل تعداد میں کہ افواج باقاعدہ کے مقابلہ میں اُنکا شمار فضول ہے - علاوہ ازیں تیز گامی اور باقاعدگی کے ساتھ دھاوے مارنے میں بھی جیسا محمود چاہتا تھا وہ اسکے کام کے نہ تھے - سلطان میں بھلا جمہوری مشیر ہونے کی صلاحیت کہاں تھی کہ وہ جوش مذہبی
سے لبریز افواج کی کمان اپنے ہاتھ میں لیتا، اور نہ کبھی اُ [illegible] - محمود میں
وہ تبلیغی جوش قطعاً مفقود تھا جس کی وجہ سے وہ مشیار" [illegible] کی قسمت
پر غم کے دو آنسو بہاتا، یا ہندوستان کو دین محمدی کی اشا [illegible] ن کی حیثیت

سے دیکھتا۔ اُس کا نصب العین بہت ہی حقیر تھا جو آسانی سے حاصل ہو سکتا تھا۔ وہ تو صرف اس پر قانع تھا کہ کافروں کا مال و متاع چھین لے۔ اُس نے کبھی لوگوں کو تبدیل مذہب کے لیے مجبور نہیں کیا اور ہندوستان کو بعینہٖ اُسی حالت کفر میں چھوڑا جسمیں پایا تھا۔

.... ہندوستانی منادر میں بھی یورپ کے کلیسیا ے روم کی طرح یہ ممکن نہیں تھا کہ کسی طاقتور من چلے کو تصرف بیجا کی تحریص سے باز رکھا جا سکتا اور نہ اسی کی توقع کیجا سکتی تھی کہ محمود جیسی سیرت کا شخص اپنے آپ کو حصول زر سے روکتا، محض اس خاطر کہ اسلام مذہبی رواداری کی تلقین کرتا ہے درانحالیکہ اُسکا دل دولت کی طرف اس طرح جاتا تھا جیسے مقناطیس کی طرف لوہا کھنچ آتا ہے ...... اس زمانہ کے معاصرین کے نزدیک دشمن کی عبادت گاہ کو برباد کرنا جنگ کا جائز فعل خیال کیا جاتا ہے اور یہ شکست کا بدیہی نتیجہ ہوا کرتا تھا .... اُس نے اُنکو ایک ایسا مذہب قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جس پر اُنکا اعتقاد نہیں تھا۔ اُسکے ہندوستانی سپاہیوں کو دارالخلافہ غزنین میں سنکھ بجانے اور بتوں کی پرستش کرنے کی مکمل آزادی تھی۔ مذہبی رواداری کا اصول جس محدود شکل میں اُسوقت رائج تھا محمود بھی اُسکا قائل تھا۔ محمود کو یہ الزام دینا کہ وہ اپنے ماسبق یا آیندہ پشتوں کے اخلاقی معیار تک نہیں پہونچ سکا کارِ عبث ہوگا۔"

"سید"

رسید کتب

(۱)	سیرت ازواج النبی	مولانا عبد الرؤف قادری	کمالی پریس کلکتہ۔ قیمت	۲ر
(۲)	کائنات روحانی	مولانا سید مناظر احسن گیلانی	کتبخانہ القاسم دیوبند "	۵ر
(۳)	دشنیت و شکنتلا	اقبال ورما سحر ہنگامی	زمانہ بک ایجنسی کانپور	۸ر
(۴)	قواعد اُردو (طبع ثانی)	مولوی عبد الحق بی اے	انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد	۱ر۴
(۵)	انتخاب کلام میر	"	"	۱ر۴
(۶)	مثنوی خواب و خیال	خواجہ سید محمد میر اثر	"	۱۰ر

اُردو رسائل کے خاص مضامین

(نومبر سنہ ۱۹۲۶ء)

دلگداز ۔ لکھنؤ

(۱) اسلام اور فلسفہ کا سابقہ

معارف ۔ اعظم گڈھ

(۱) حجاز کے کتبخانے

(۲) ارتقائے ادب فارسی

(۳) مغار ایلورا

زمانہ ۔ کانپور

(۱) عراق کے آثار قدیمہ

(۲) کربلا (ڈرامہ)

ہمایوں ۔ لاہور

(۱) محمد تغلق

(۲) ایثار (افسانہ)

نگار ۔ بھوپال

(۱) میر تقی میرؔ اور خارجی حالات کی ترجمانی

(۲) تاج بدترین عمارت ہے ۔

جامعہ ۔ دہلی

(۱) ہندوستان اور علوم مشرقی

(۲) بندوبست دوامی

نیرنگ خیال ۔ لاہور

(۱) تاریخ نسل انسانی

(۲) پادری نارکیسوس (افسانہ)

قوس قزح ۔ لاہور

(۱) مطائبات (افسانہ)

(۲) عہد تیموریہ میں فن مصوری

مرقع ۔ لکھنؤ

(۱) کارثواب (افسانہ)

(۲) گمراہ رہبر

شمع ۔ آگرہ

(۱) محمود کے

(۲) ہند باربرداری کے ذرائع

نظرے خوش گذرے

گذشتہ جلسۂ خلافت نے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ جب تک پھر کوئی سامان قدرت الٰہی سے ایسا فراہم نہ ہو جائے کہ قوم کے دردمند اصحاب باہمی اختلافات اور رقابتوں کو فراموش کرکے ہمہ تن اُس مصیبت کے مقابلہ میں مصروف ہو جائیں نہ آپس کی لڑائیاں ختم نہ ہونگی اور ایک جماعت کی قوت دوسری جماعت کو زک دینے کے لیے رائیگاں ہوتی رہیگی۔

اجتماعی کاموں میں کامیابی اُسی وقت ممکن ہے جب مختلف کارکن جمع ہو کر تبادلۂ خیال کے بعد قوم کی فلاح و بہبود کی تجاویز سوچیں اور انکو عملی جامہ پہنانے کے لیے پوری یکدلی کے ساتھ جد و جہد کریں۔ لیکن جب ساری جد و جہد کا ماحصل یہ رہ جائے کہ ایک فریق دوسرے فریق کو نیچا دکھائے اور اپنی بات کو بالا رکھنے کے لیے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگائے تو قومی فلاح و بہبود کی توقع رکھنا فضول ہے۔

جب تک حکومت کے مقابلہ میں آزادی کی جنگ جاری رہی مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت باوجود طبائع اور عقائد کے اختلافات کے یکجہتی اور یکسوئی کے ساتھ مصروف کار رہی مگر جیسے ہی جنگ ملتوی ہوئی کارکنوں کے طبعی اختلافات بالائے سطح آنا شروع ہوے۔ کارکنان خلافت ہی میں سے ایک گروہ کثیر شدھی کے مقابلہ کے لیے تبلیغی میدان میں صف آرا ہوگیا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مجلس خلافت کو کچھ عرصہ کے لیے قریب قریب معطل ہو جانا پڑا۔ تبلیغی جوش جب ذرا مدھم پڑا تو تنظیم کے نام سے ایک نئی جماعت بنی جس نے مجلس خلافت کو اور کمزور بنا دیا۔ اسکے بعد ہی مسلمانانِ ہند کی بدنصیبی سے مسئلۂ حجاز نے ایک نزاعی صورت اختیار کرلی اور خدام الحرمین کے قیام نے کارکنان خلافت کی رہی سہی قوت کو فنا کر دینے کی کوشش کی اور بالآخر انحطاط و زوال کی تکمیل کے لیے خود اُس جماعت میں شدید اختلافات رونما ہو گئے جو خدام الحرمین کے معرض وجود میں آنے کے بعد بھی مجلس خلافت کے بقا میں ساعی تھی۔

جلسہ کے انعقاد سے قبل ہر کارکن کو ان اختلافات کا پورا پورا علم تھا، اور اس بنا پر کم سے کم مجھے توقع تھی کہ اس موقع پر ہر فریق اسکے لیے تیار ہوگا کہ حتی الامکان دوسرے فریق کے ساتھ مفاہمت کی انتہائی کوشش کی جائے اور مجلس خلافت کو تباہی سے بچا لیا جائے۔ مگر

آں غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

نومبر کے تیسرے ہفتہ میں اتفاق سے مولانا شوکت علی اور مسٹر شعیب قریشی انتخاباتِ کونسل کے سلسلہ میں یہاں آئے اور اُن سے گفتگو آئی تو اس اجتماع کے متعلق میرے تمام خیالاتِ مایوسی سے بدل گئے۔ اور اس لیے میں نے بجائے خود یہ ٹھان لی کہ اگر باہمی مفاہمت کی کسی کوشش میں اعانت ممکن ہو تو کروں ورنہ کم سے کم میں اپنا دامن اس جنگ زرگری سے ملوث نہ ہونے دوں۔ چنانچہ اراکینِ خلافت کے جمع ہو جانے کے بعد پہلا موقع مولوی ظفر علی خاں صاحب سے گفتگو کا آیا تو میں نے اس بنا پر کہ مسئلۂ حجاز میں مجھے اُنکی رائے سے بہت کچھ اتفاق تھا اُن سے درخواست کی کہ وہ بجائے مقابلہ و جنگ کے سپر انداز ہو جائیں۔ کیونکہ اس طریقہ پر سلطان ابن سعود کے خلاف جنگ و جہاد کی ساری ذمہ داری علی برادران کے سر پڑ جاتی اور مجھے اُمید تھی کہ باہمی ضد کا قدم درمیان سے اُٹھ جانے تو وہ جلد اپنی غلط روی کا احساس کر لیں گے —— لیکن افسوس ہے کہ مولوی ظفر علی خاں صاحب اسکے لیے آمادہ نہ ہوئے۔ دوسرے روز میں نے ایک تجویز مفاہمت تیار کی جسکو میں سمجھتا تھا کہ دونوں جماعتیں اگر قبول کر لیتیں تو کم از کم اس بدمزگی کا بخیر و خوبی خاتمہ ہو جاتا اور میں خیال کرتا ہوں کہ مجلس خلافت جس نے موتمر اسلامی میں شرکت اور ہندوستان میں اُسکی شاخ قائم کرنا گوارا کیا عملاً اُسی راہ کو اختیار کرنے پر مجبور ہوگی جو اس مفاہمت میں تجویز کی گئی تھی۔ مگر افسوس ہے کہ مولانا محمد علی نے ایک نہ سُنی، اور میں نے جلسہ کے روبرو اس تجویز کو لانا فضول سمجھا۔

چونکہ میں نے اس باہمی جنگ میں شرکت سے محترز رہنے کا ارادہ کر لیا تھا اسوجہ سے جب تک جلسہ میں شریک رہا میری حیثیت ایک میزبان اور تماشائی ہی کی رہی حتیٰ کہ رائے شماری کے وقت بھی میں نے کسی جانب ہاتھ نہ اُٹھایا۔ حالانکہ مولوی ظفر علی خاں صاحب کو اس بات کی شکایت کرنے کا بھی موقع ملا کہ اگر میرا ووٹ اُن کی طرف ہوتا تو اُن کی جماعت کامیاب ہو جاتی۔ اور غالباً اسی قسم کی شکایت مولانا محمد علی اور اُنکے ساتھیوں کو مجھ سے رہی۔

مغربی تعلیم اور مغربی نظامات ہمیں یہی سبق دیتے ہیں کہ تمام قوم اور ملکی کام دھڑے بندی کی بنیاد پر انجام پائیں۔ اور اب یہ وبا یہاں تک عام [illegible] ہے تا آج اسی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ اور ہم میں سے کوئی فرد ایسا نہیں [illegible] سے بڑا شکار نہ ہو۔ لیکن انسان اگر اپنی قوتِ تمیز کو بالکل ناکارہ نہ بنا دے [illegible] ترفع کے خیال

کو چھوڑ کر محض قوم و ملک کے فلاح و بہبود کو پیش نظر رکھے تو بہت کچھ دھڑے بندی کے اثرات سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

یورپ کی پارلیمنٹوں اور اکثر مجلسوں میں اسی دھڑے بندی کے بدولت اب ہاتھا پائی کی نوبت تک آجاتی ہے جسکی بنا پر کبھی کبھی پولیس کو دست اندازی کرنا پڑتی ہے۔ اس جلسہ میں بھی بعض اوقات یہی رنگ نظر آتا تھا۔ مگر غنیمت ہے کہ لوگ اس حد تک بے قابو نہیں ہوئے۔ اور اس بارے میں سب سے المناک طرز عمل جو میں نے مشاہدہ کیا وہ بہار کے پُرجوش کارکن سید فضل الرحمن اور جناب مولانا محمد علی کا تھا۔

سید فضل الرحمن کا حد سے زیادہ متجاوز ہو جانا اور مولانا محمد علی جیسے رہنمائے قوم کا احترام ملحوظ نہ رکھنا ازبسکہ نہایت درجہ قابلِ ملامت ہے

چوں حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی

لیکن اس سے زیادہ لائق ماتم مولانا محمد علی کی حالت ہے۔ انکے ذیابطیس نے معلوم ہوتا ہے کہ اب انھیں بالکل بے بس کر دیا ہے۔ مشکل سے ایک منٹ بھی وہ کسی مقرر کو خاموشی کے ساتھ تقریر کرنے دیتے تھے۔ اور اس خفیف وقفہ میں بھی شاید ہی وہ کسی وقت خود خاموش رہتے ہوں۔ کم سے کم جو شخص انکے قریب ہوتا تھا وہ اسی سے کچھ نہ کچھ اُس تقریر کے متعلق کہتے رہتے تھے۔ پھر صدرِ جلسہ کے لیے جس قدر صبر آزما اُن کی روش تھی شاید ہی کسی دوسرے کی ہو۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ حالات موجودہ میں مناسب ہوگا کہ مجلس خلافت انھیں کو صدر منتخب کرے یا کم سے کم کسی ایسے شخص کو صدر بنائے جسے انکے مقابلہ میں اپنی خودداری کے تحفظ کی ضرورت نہ ہو۔ مولانا عبد القادر قصوری کو جن حالات میں صدارت کرنا پڑی خدا نہ کرے کہ کسی شریف انسان کو اس مصیبت کا سامنا ہو۔۔۔ اگر مولانا ابو الکلام نے اسی خیال سے پہلو بچایا اور اس جلسہ میں شرکت سے احتراز کیا ہو تو کون انکی موقع شناسی پر حرف گیری کر سکتا ہے۔

ناظرین الناظر کو بخوبی اندازہ ہے کہ سیاسی اور مجلسی کاموں کی وجہ سے الناظر اور اُسکے متعلقہ کاروبار کو کس قدر نقصانات پہونچے ہیں۔ گذشتہ سولہ مہینے میں میرا جس قدر وقت ان کاموں پر صرف ہوا اُس نے کاروبار کی ابتری کو آخری درجہ پر پہونچا دیا ہے۔ جیسے کہ ۲۶ء میں الناظر کے تین پرچے شائع نہیں ہو سکے۔ اور الناظر کا ایجنسی کی سالانہ فہرست جس پر بہت کچھ کتابوں کی اشاعت

کا دارومدار ہے قطعاً شایع نہیں ہوئی - ایک طرف یہ ذاتی ضرورت اور دوسری طرف حالت یہ ہے کہ سارے ملک میں خانہ جنگی کی وبا پھیلی ہوئی ہے اور اندیشہ ہے کہ اسکی بدولت نہ صرف اس ملک کے باشندوں کی غلامی کی میعاد میں اضافہ ہو رہا ہے بلکہ عجب نہیں جو ہم عرب کے بقیہ تین آزاد ملکوں نجد- حجاز و یمن کو بھی یورپین طاقتوں کی غلامی میں ڈھکیل دینے کا ذریعہ بنجائیں -

کانگرس اور خلافت دونوں جماعتوں سے میرا تعلق تھا، لیکن میری اصل خدمت شروع سے خلافت کمیٹی کے تحت رہی - موجودہ حالات میں نہ کانگرس کے سامنے کوئی ایسا نظام عمل ہے جسکی تابعیت میرے لیے ممکن ہو اور نہ اُس طریق کار کی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے میں تیار ہوں جو مسئلۂ حجاز میں محترم علی برادران نے اختیار کیا ہے - اس لیے میں نے کم سے کم سال رواں کے لیے مقامی کانگرس کمیٹی کی مجلس منتظمہ اور مرکزی خلافت کمیٹی دونوں کی رکنیت قبول کرنے سے احتراز کیا - اور چاہتا ہوں کہ کچھ عرصہ تک ساری توجہ اپنے کاروبار پر صرف کروں -

مجھے امید ہے کہ جو احباب عرصہ سے مجھ پر زور ڈال رہے تھے کہ میں ہمہ تن ادبی خدمت کے لیے وقف ہو جاؤں وہ اس اعلان سے خوش ہوں گے اور مجھے الناظر اور انجمن اُردو کے کاموں میں فراخ حوصلگی کے ساتھ ہر قسم کی مدد دیں گے -

---

۲۴ - دسمبر روز جمعہ کی صبح کو تین روز کی علالت کے بعد اُردو کے نامور انشا پرداز و مورخ جناب مولانا عبد الحلیم شرر لکھنوی ایڈیٹر دلگداز نے انتقال فرمایا - اِنا للہ و اِنا الیہ راجعون - مرحوم کی عظیم الشان خدمات اور آپ کے مفصل حالات انشاء اللہ بعد میں لکھے جائینگے اس وقت صرف اس حادثہ پر دلی حزن و ملال کا اظہار کرتا اور اُنکے بڑے صاحبزادے منشی صدیق حسن صاحب اور دیگر پسماندگان کو الناظر اور اُسکے ناظرین کرام کی طرف سے دلی ہمدردی کا پیام پہونچانا مقصود ہے -

---

توقع ظاہر کی گئی تھی کہ یہ نمبر ۱۵ - جنوری تک شایع ہو جائیگا، مگر مہاراجہ صاحب محمود آباد کے تار سے خاص لکھنؤ کے مسلمانوں کا اظہار برات ضروری تھا اس لیے ایک جلسۂ عام کے انتظام کی وجہ سے تقریباً دو ہفتے کے لیے پرچہ اور پیچھے ہٹ گیا - خدا کرے کہ آیندہ یہ صورت نہ ہو -

۲۶ - جنوری ۲۵ء ظفر الملک

جزیرۃ العرب

عرب کو اہل عرب "جزیرۃ العرب" "جزیرہ نما (جزیرہ) عربوں کا" یا مخفف طور سے "جزیرہ" کہتے اور اسی کو ایرانی اور ترک عربستان کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اسکے شمال میں ایشیا کا بر اعظم ہے، مغرب میں بحر احمر، مشرق میں خلیج فارس اور بحر عمان ہے اور جنوب میں بحر ہند۔ صرف خاکنائے سوئز کے ذریعہ اس کا تعلق افریقہ سے ہے اور فقط باب المندب کی آبنائے اسکو افریقہ سے جدا کرتی ہے۔ مشرق کی طرف ملک عرب فارس کے ساحل تک چلا گیا ہے۔ عرب کا رقبہ یورپ کے چوتھائی رقبہ کے برابر ہے لیکن اس کا ٹھیک ٹھیک رقبہ بتانا قریب قریب ناممکن ہے، اس لیے کہ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ شمال میں اس کی حدود بہت کچھ مختلف ہیں۔ بعض نے اسکی حد حلب اور دریائے فرات تک بتائی ہے۔ اگرچہ عراق عرب کے میدان میں عربی قبائل صدیوں سے آباد چلے آتے ہیں پھر بھی کسی جغرافیہ نویس نے عرب کا حال دریائے فرات کی حد سے آگے نہیں لکھا ہے۔ اور نہ اس علاقہ کو جو حجاز کے نام سے موسوم ہے عرب سے ملحق سمجھنا چاہیے گو وہ عربوں سے آباد ہے بلکہ اسکو شام سے متعلق خیال کرنا چاہیے۔ برخلاف اسکے جزیرہ نمائے سینا جسکو اکثر عربی اور یورپی عالم مصر کا ایک حصہ سمجھتے ہیں، جغرافیائی حیثیت سے عرب سے متعلق ہے۔

مغربی عرب (طول تقریباً ۱۶ درجہ ہے) اسکے دو بڑے حصے ہیں۔ ایک حصہ کو حجاز اور دوسرے کو یمن کہتے ہیں۔ حجاز کے لغوی معنی حجز کے ہیں۔ یہ ملک ٹھیک ٹھیک وہ سلسلۂ کوہ ہے جو تہامہ (وہ نشیبی علاقہ جو ساحل کے برابر برابر چلا گیا ہے) کو نجد (بلند علاقہ) سے جدا کرتا ہے۔ اصل میں حجاز اس سرزمین کا نام ہے جسکے مغرب میں بحر احمر ہے اور مشرق میں نجد۔ اور یہ علاقہ خلیج عقبہ کے آخری سرے سے لیکر مکہ کے جنوب میں اس مقام تک پھیلا ہوا ہے جہاں سے یمن کا علاقہ شروع ہوتا ہے۔ پہاڑ کا سلسلہ شمال سے جنوب کی طرف پار کرنے کے بعد حجاز کا انتہائی شمالی علاقہ (تبوک تک) حسما کہلاتا ہے۔ یہ کوئی زرخیز علاقہ نہیں ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس میں بہت سی وادیاں ہیں۔ سخت بارش ہونے کے بعد ان وادیوں میں سے پہاڑی چشمے بہ بہ کر سمندر میں جاکر گرتے ہیں۔ لیکن پھر بھی یہ علاقہ زیادہ تر خشک ہی رہتا ہے۔ پہلے اس علاقہ میں جذام قبیلہ کے افراد آباد تھے لیکن اسوقت وہ لوگ آباد ہیں جن کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ

قدیم نبطی نسل سے ہیں۔

عقبہ سے مدینہ کو جانے والی سڑک۔ یہ وہ حجاج والی قدیم سڑک ہے، جو مصر سے آکر ساحل کے کنارے ینبوع یا اور تھوڑی دور الجار تک چلی گئی ہے۔ یہ مدینہ کا قدیم بندرگاہ ہے اور مدینہ سے یہاں تک دو دن کے سفر کا راستہ ہے۔ خلیج عقبہ پر صرف مقنا کا مقام قابل ذکر ہے یہاں کے باشندوں نے ۹ ہجری (۶۳۱-۶۳۰) میں نبی کریم صلعم سے ایک عہدنامہ کیا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ بافندے اور مچھیرے تھے۔ اب ہم الوجہ کا ذکر کرتے ہیں جہاں سے بالی عربوں (۹) کا علاقہ شروع ہوتا ہے اور یہاں چھوٹے چھوٹے جہازوں کے لیے ایک اچھا بندرگاہ بھی بنا ہوا ہے۔ اسکے قریب ہی وادی اعظم اور اسکی بہت سی شاخیں ہیں۔ اب اسکو وادی الحمد کہتے ہیں جو خیبر کے جنوب مشرق سے شروع ہوتی ہے اور وادی رما کے دہانے سے بہت قریب ہے۔ وادی الحمد پہلے جنوب مشرق کی طرف مڑتی ہے، مدینہ کے قریب گذر کر ایک بڑا چکر لگاتی ہوتی شمال مغرب کی طرف چلی جاتی ہے۔ زمانۂ قدیم میں یہ وادی ضرور بہت مشہور ہوگی۔ اب جبکہ بارش بہت زیادہ ہوتی ہے تو اس میں اکثر پانی پایا جاتا ہے۔ آگے بڑھ کر خشکی میں لیکن زیادہ تر شمال کی طرف جاکر مدین کے کھنڈر ملتے ہیں، مدین سے بادا میں ہوکر ایک سڑک سیدھی وادی القرے کو جایا کرتی تھی۔ زمانۂ قدیم میں قری خاص مقام تھا۔ اس مقام پر وہ سڑک جو مصر سے مکہ کو گئی ہے، حاجیوں کی اُس سڑک سے مل جاتی ہے جو دمشق سے آکر حسما کے پہاڑوں کے مشرق کی طرف، معان، تبوک، حجاز اور مدائن صالح کو جاتی ہے۔ اسپرنجر نے الوجہ کو حجر کا بندرگاہ بتایا ہے جو اسٹرابو کے مقام Egra سے مطابقت کرتا ہے۔ ساحل پر اس مقام کے جنوب میں الحورا واقع ہے۔ قبیلہ بالی کے عربوں کا علاقہ یہاں ختم ہوتا، اور اسی قبیلہ کے ہم رشتہ قبیلۂ جہنیہ کا ملک شروع ہو جاتا ہے حجر اور وادی القرے کے درمیان قبیلۂ عذرا کا علاقہ واقع ہے۔ یہ قبیلہ اب تک اپنے جذبہ کی بنا پر مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ کسی سے محبت کرتے ہیں تو اُسی میں فنا ہو جاتے ہیں۔

مدینہ کے اطراف کا تمام ملک آتشیں مادہ سے بھرا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پالمیرہ سے مکہ تک کوہ آتشیں کا رقبہ ہے اور زمانۂ قدیم میں کئی مرتبہ آتشیں ما[illegible] کا ہے۔ جہاں تک ہمیں علم ہے آخری مرتبہ ۶۵۴ھ (۱۲۵۶ء) میں آتشیں مادہ نے خروج [illegible] سیاہ آتش فشاں پہاڑوں کو حرۃ یا لابہ کہتے ہیں۔ یہ بات تو مشہور بھی ہے کہ "تو[illegible] فشاں پہاڑوں کے درمیان آباد ہے" ان آتشیں پہاڑوں کے درمیان جو وادیاں ہیں ... ایسا سرسبزی اور شادابی

کے لیے مشہور ہیں۔ گذشتہ صدیوں سے ان میں خاص طور پر کھجور کی کاشت ہوتی چلی آرہی ہے۔
مدینہ کے شمال میں اُحد کی پہاڑی ہے۔ مدینہ سے اس پہاڑی تک ایک گھنٹے سے بھی کم کی مسافت کا فاصلہ ہے۔ خیبر کا بڑا کوہ آتش فشاں (جو وادی القریٰ کے مشرق میں ہے) جہاں سے وادی رتا شروع ہوتی ہے شہر مدینہ کے علاقہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ صحرائے نفود کی مغربی سرحد پر، تبوک کے مشرق میں مقام تیماء نیز دومہ کا نخلستان (دومۃ الجندل جسکو اب الجوف بھی کہتے ہیں) واقع ہیں۔ مدینہ سے یہاں تک تیرہ دن کے سفر کا راستہ ہے اور دمشق سے دس دن کا۔ ان مقامات کو عرب جغرافیہ نویسوں نے مدینہ کے علاقہ میں شمار کیا ہے۔

ینبوع سے جدہ تک ساحل کے کنارے کنارے سفر کیا جا سکتا ہے۔ اور جدہ سے سیدھا مشرق کی طرف مکہ تک دو روز کے سفر کا راستہ ہے۔ یہ مقدس علاقہ (جسکو اب الحدود، حدود الحرم بھی کہتے ہیں) مقام تنعیم سے شروع ہو جاتا ہے اور مکہ کے اُس مقام سے جہاں مسجد عائشہؓ واقع ہے ایک فرسنگ کے فاصلہ پر ہے۔ دوسری سمتوں میں حرم کی حدود مکہ سے دُور دُور واقع ہیں۔ حرم کی حدود کو پار کرنے سے پہلے ہی احرام باندھ لیا جاتا ہے۔ نجد اور یمن سے جو زائرین آتے ہیں، وہ مقام قرن المنازل سے احرام باندھا کرتے ہیں۔ اس مقدس مقام کے نواح میں کسی زمانہ میں عکاظ کا مشہور و معروف بازار لگا کرتا تھا جہاں شاعروں میں علمی مباحثہ ہوا کرتا تھا۔ قرن المنازل سے قریب قریب ۳۶ میل کے فاصلہ پر بجانب جنوب غزوان کی بلند پہاڑی پر طائف واقع ہے۔ مکہ کے متمول لوگ گرمیوں کا زمانہ یہیں بسر کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اس مقام کی آب و ہوا صحت بخش ہے اور وہ تمام میوے جو جنوبی یورپ میں ہوتے ہیں یہاں بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ زمانۂ قدیم سے یہاں کے انگور اور کشمش خاص طور سے مشہور ہیں۔ اصطخری نے لکھا ہے کہ حجاز میں صرف طائف ہی ایسا مقام ہے جہاں جاڑوں میں پانی منجمد ہو جاتا ہے۔ گلیسر نے بھی اس بیان کی تائید کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ یمن کے بہت سے پہاڑوں پر بھی پانی برف کی شکل میں منجمد ہو جاتا ہے۔

وہ پہاڑیاں جو مکہ کے جنوب میں واقع ہیں۔ ان میں زمانۂ قدیم سے ہذیل کا قبیلہ آباد ہے، اس قبیلہ میں بہت سے ذکی و ذہین شاعر پیدا ہو چکے ہیں۔ انکے قرب و جوار میں اب بھی ثقیف لوگ آباد ہیں اور پہلے طائف انھیں کا تھا۔ یہاں پر پہاڑ کا وہ سلسلہ جو آگے جا کر سرات کہلاتا ہے، چوڑا ہو کر بہت ہی سرسبز و شاداب علاقہ ہو گیا ہے۔ یہ حجاز کا نہایت زرخیز حصہ ہے۔ ان پہاڑوں پر یمنی عرب آباد ہیں جن کو ابن المجاور نے انکی غیر مہذب رسوم کی وجہ سے بہیمیہ کہا ہے۔

انکے متعلق جو مثالیں اُس نے لکھی ہیں اُنکی برک برڈ نے بھی تھوڑی تھوڑی تائید کی ہے۔ تیرہویں صدی تک انکو بجیلہ کے نام سے یاد کرتے تھے مگر اب انکو عسیر کہتے ہیں۔ حجاز کے سرسبز و شاداب بلند علاقہ کے مشرقی حصہ میں بنی قحطان کے افراد آباد ہیں جس میں زیادہ تر جمّال ہیں۔ یہ بہت ہی قدیم قبیلہ ہے اور اب بھی قوی اور طاقتور مشہور ہے۔ بیشتر یمنی عرب اپنے آپ کو اسی قبیلہ کی نسل سے بتاتے ہیں۔

یمن کا ملک "داہنی جانب والا" "جنوبی علاقہ" اور "زرخیز" کے ناموں سے موسوم ہے۔ یہ علاقہ نہایت قدیم زمانہ سے اپنی زرخیزی اور شادابی کے لیے مشہور چلا آرہا ہے۔ اور دو غیر مساوی حصوں میں منقسم ہے۔ ایک حصہ کو تہامۃ الیمن کہتے ہیں اور دوسرے کو نجد الیمن۔ اور اسکا جائے وقوع یہ ہے:

شمال میں نجد کا میدان مرتفع ہے اور مشرق میں مأرب۔ وسط میں صنعا واقع ہے اور جنوب میں تعز۔ تہامۃ الیمن، حجاز کے ساحلی علاقہ کا سلسلہ ہے۔ گلیسر نے موقع کا مشاہدہ کرکے لکھا ہے کہ سمندر کا پانی چونکہ بتدریج پیچھے ہٹتا جاتا ہے اس لیے یہ علاقہ دن بدن وسیع ہوتا جارہا ہے۔

مکہ سے یمن کی بلندیوں تک جو سڑک گئی ہے، وہ اُن پہاڑوں کے اطراف ہوکر جاتی ہے جنپر طائف واقع ہے اور مشہور مقامات تربہ اور تبالہ سے ہوتی ہوئی بیشیہ کو چلی جاتی ہے۔ وادی بیشیہ کے زرخیز علاقہ کا بیشیہ ایک خاص شہر ہے اور یہ علاقہ جنوبی عرب تک مسلسل چلا گیا ہے۔ حجاز سے یمن کی طرف سفر کیا جائے تو یہ زرخیز علاقہ تثلیث کے قریب ختم ہوتا ہے۔ اور مقام تثلیث قریب قریب اسی عرض البلد پر واقع ہے جس پر السرین اور جرش واقع ہیں۔ یہاں سے ایک بڑی سڑک سیدھی سعدہ کو چلی گئی ہے اور اسی کی ایک شاخ مشرق کی طرف نجران کو جاتی ہے۔

سعدہ سے بجانب جنوب یمن کے دارالسلطنت صنعا کو ایک سڑک جاتی ہے۔ صنعا کے مشرق میں مأرب واقع ہے۔ وہ علاقہ جسکا مأرب صدر مقام ہے، اب الجوف کہلاتا ہے۔ الجوف کا علاقہ نجران سے مأرب کے جنوب مغرب کی طرف وادی بیحان تک چلا گیا ہے۔ اسوقت بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ علاقہ کسی زمانہ میں خوشحال و سرسبز و شاداب رہا ہوگا۔ ابن المجاور نے لکھا ہے کہ زمانہ قدیم سے براقش ایک مشہور و معروف شہر چلا آرہا ہے۔ ان مقا[illegible] سے پہلے جن یورپی سیاحوں نے اپنی جانوں کو سخت خطرہ میں ڈال کر دیکھا، اُ[illegible] ی ہیں۔ جنوب کی طرف اور آگے بڑھ کر یمن کے علاقہ کا ذکر حال ہی میں نیبڈ[illegible] دہ یہ ہے۔

صنعا سے خمار (اس مقام کے گھوڑے اچھی نسل کے ہوتے ہیں) ہو کر مقام یریم پہونچتے ہیں۔ یہاں سے نصف دن کا سفر طے کرنے کے بعد حمیریوں کے صدر مقام ظفار کے کھنڈرات آجاتے ہیں۔ یہ مقام صنعا کے طول البلد اور زبید کے عرض البلد میں واقع ہے۔ یہاں سے سحول ہو کر ایک سڑک جند کو چلی گئی ہے۔ سحول کا کپڑا بہت مشہور تھا۔ جند زمانۂ قدیم میں یمن کا دوسرا صدر مقام رہا ہے۔ اور معاذ بن جبل کی مسجد کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ مقام جند تعز سے قریب ہی واقع ہے سحول کے قرب و جوار میں المذیخرہ کی مشہور گڑھی ہے جسکی نسبت یہ خیال تھا کہ قرمطی لوگ اسی گڑھی پر قابض رہنے کی وجہ سے یمن پر حکمراں رہے۔ جنوب کی طرف آگے بڑھ کر پہاڑوں میں تعز واقع ہے۔ زمانۂ متوسط سے لیکر اب سے ایک صدی قبل تک تعز رسولیوں کا مشہور و معروف صدر مقام رہا ہے مگر اب شکستہ حالت میں ہے۔ یہاں کے پہاڑ صبر کے نام سے مشہور ہیں۔ ابن المجاور نے ان پہاڑوں کو "یمن کے پہاڑوں کا بادشاہ" لکھا ہے۔ اور کہا ہے کہ یہ پہاڑ کافی اوقات کی کاشت اور آبپاشی کے اچھے انتظام کے لیے مشہور ہیں۔ قات کے پودوں کی کوپلیں دافع سکر ہیں بہت قیمتی ہوتی ہیں اور تہامہ کے تمام شہروں میں بکثرت بھیجی جاتی ہیں۔ ان پہاڑوں کے شمال کی جانب بحر احمر اور بحر ہند کے درمیان اب اور جبلہ کے بیچ میں جبلہ کا بلند اور پہاڑی علاقہ ہے جسکو ذو جبلہ بھی کہتے ہیں۔ یہاں سے دو چشمے مدامی طور پر بہتے رہتے ہیں۔ ایک کا نام وادی زبید ہے جو بجانب شمال بہتی ہے اور دوسری وادی نبا ہے جو قدیم مخلاف میں سے بہتی ہوئی جاتی ہے اور وادی تیتم یا وادی یتن کے دہانہ کے مشرق کی جانب خلیج عدن میں گر جاتی ہے۔ منزولی نے لکھا ہے کہ ایک اور سڑک یریم سے بالکل جنوب کی طرف عدن تک چلی گئی ہے۔ گلیسر نے بیان کیا ہے کہ حدیدہ اور صنعا کو متافہ ہوتی ہوئی ایک اور سڑک گئی ہے۔ متاخہ قہوہ کی تجارت کی خاص منڈی ہے۔

جنوبی عرب یمن کے مشرق میں حضرموت واقع ہے۔ اب اسکا تلفظ عام طور پر حضرموت کیا جاتا ہے۔ یہ ایک پہاڑی علاقہ ہے جس میں بہت سی وادیاں (گھاٹیاں) ہیں۔ ان گھاٹیوں کے محنتی، جفاکش اور حوصلہ مند باشندے بہت سی باتوں میں سوئز کے باشندوں سے ملتے ہیں۔ بہت ہی قدیم زمانہ سے یہ لوگ ہر سال نوجوان مردوں کو دوسرے ملکوں میں روزگار کی تلاش کے لیے بھیجتے چلے آرہے ہیں۔ اور اسکا ثبوت یہ ہے کہ یہاں کے باشندے نہ صرف عرب کے آباد بندرگاہوں میں پائے جاتے ہیں، بلکہ مصر، برطانوی اور ولندیزی ہند میں بھی موجود ہیں۔ اِن

دونوں آخرالذکر مقامات میں جو عرب موجود ہیں وہ حضرموت ہی کے باشندے ہیں۔ جنوبی عرب کو مغرب سے مشرق کی طرف وادی الکسر برابر برابر کے دو حصوں میں تقسیم کر دیتی ہے۔ اس وادی سے ایک چشمہ دواماً بہتا رہتا ہے جو سیحوت کے قریب مشرقی سرحد پر سمندر میں گر جاتا ہے۔ دو سب سے بڑے مقامات شبام اور ریدم بھی یہیں پر واقع ہیں۔ ریدم کے جنوب مشرق کی طرف وادی برہوت کے منبع کے قریب (لہوت، برہوت نامی یہاں ایک کوہ آتش فشاں بھی ہے جس میں اب تک آتشیں مادہ نکلتا رہتا ہے اور اس وادی کا نام اسی پہاڑ کے نام پر مشہور ہو گیا ہے) حضرت ہود علیہ السلام وعلیٰ نبیّنا کی قبر پائی گئی ہے۔ یہ بہت مشہور پیغمبر ہوئے ہیں اور ان کا ذکر کلام مجید میں بھی آیا ہے۔ یہاں سے صحرائے اعظم شروع ہوتا ہے جو حضرموت کو شمال مغرب۔ شمال اور مشرق کی طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ جنوبی عرب کا بہترین بندرگاہ مکلا ہے (مکلا کے معنی محض بندرگاہ کے ہیں) اغلب ہے کہ یہ مقام وہی ہو جسکو عرب جغرافیہ نویسوں نے لسا (الرسعا) لکھا ہے۔ جس طرح یمن کے متعدد کھنڈرات اور مقبرے وہاں کی گذشتہ خوشحالی اور دولتمندی کا پتہ دیتے ہیں اسی طرح حضرموت میں بھی اسی قسم کے آثار سے یہاں کی فارغ البالی اور دولتمندی کا پتہ چلتا ہے۔

سیحوت کے مشرق کی طرف (سیحوت کا پرانا نام شاید خیرن ہے) ساحل شروع ہوتا ہے اسکو عرب جغرافیہ نویسوں نے مہرہ اور اکثر شہر کے نام سے بھی تحریر کیا ہے۔ جنوبی عرب کی قدیم زبان میں مہرہ یا شہر کے معنی ساحل کے ہیں۔ شہر کا نام اب پہلے اس بندرگاہ کے لیے مخصوص ہے جو بجانب غرب واقع ہے۔ مرباط کے مشرق میں مشرقی سرحد ہاسک کہلاتی ہے مرباط کا ایک بہت اچھا بندرگاہ تھا مگر اب وہ ایک غیر مشہور گاؤں رہ گیا ہے۔ شہر جو اب مرباط کہلاتا ہے اس بندرگاہ کے مشرق کی طرف واقع ہے۔ زمانۂ قدیم میں مرباط قدیم صدر مقام ظفار کا بندرگاہ تھا۔ مقام ظفار اب بالکل غیر آباد ہے۔ ابن المجاور نے لکھا ہے کہ شہر ظفار ۶۱۸ھ ۱۲۲۱ء میں تباہ و برباد کیا گیا تھا۔ ابن بطوطہ کے زمانہ میں یہ ایک مشہور شہر رہا ہے۔ چنانچہ اُس نے لکھا ہے کہ یہاں (سارڈین کی قسم کی) مچھلیاں بہت ہوتی ہیں لوگ انکو کثرت سے پکڑتے اور اونٹوں کو کھلاتے ہیں۔ ان مچھلیوں کو یہاں ورق یا عُد کہتے ہیں۔ پہاڑی سلسلہ میں جو ساحل کے متوازی چلا گیا ہے لوبان کے درخت اُگے ہوئے ہیں۔ ابن المجاور نے لکھا ہے کہ اسکے زمانہ [illegible] اور عمان کے درمیان ہر جگہ کیاریوں کی کاشت کی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔ [illegible] قہ کی نسبت جو کچھ لکھا ہے اُس سے ابن المجاور کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔ [illegible] سوں کی کاشت

اب بہت محدود ہوگئی ہے۔ گرا (Gara) کے پہاڑوں اور سمندر کے بیچ میں، اس سرسبز و شاداب ساحل پر جو لوگ آباد ہیں اُنکا کچھ حصہ غیر متمدن ہے۔ ہاسک کے مشرق میں عمان تک جو ساحلی علاقہ چلا گیا ہے اُسکی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس میں درخت اور جھاڑیاں مطلق نہیں ہیں اور اس سرزمین کے اندرونی حصہ کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں ہے۔

مشرقی عرب | عمان، عرب کا بالکل مشرقی صوبہ ہے، اسکا بیشتر حصہ بہت زرخیز پہاڑی علاقہ ہے اور اسکے ساحل پر بہت سے بندرگاہ ہیں۔ خلیج عمان میں مچھلیاں بکثرت ہوتی ہیں اور ساحل کے باشندے زمانۂ قدیم سے فن جہازرانی میں مشہور ہیں۔ شہر قلہات، جسکی تعمیر کی بنا بارھویں صدی میں پڑی تھی اور کسی زمانہ میں خوبصورت اور مستحکم شہر رہا ہے، اب شکستہ حالت میں ہے۔ برخلاف اسکے مسقط زمانۂ متوسط میں غیر مشہور رہا ہے، مگر اب اس ملک کا نہایت مشہور شہر ہے۔ اور خلیج فارس میں اسکے لیے نہایت عمدہ بندرگاہ بنا ہوا ہے۔ المقدسی نے مسقط کو خوبصورت شہر لکھ کر بتایا ہے کہ یہاں میوے کثرت سے پیدا ہوا کرتے تھے مگر اس شہر کا ابن بطوطہ نے ذکر بھی نہیں کیا۔ یوروپین سیاحوں نے لکھا ہے کہ بہ نسبت عدن کے یہاں گرمی بہت پڑتی اور قریب قریب ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ غالباً اسی وجہ سے بادشاہ یا تو الرستاق میں رہا کرتے ہیں یا نزوہ میں۔ یہ دونوں مقام سرسبز و شاداب پہاڑ (جبل اخضر) میں واقع ہیں۔ ویلسٹیڈ نے نزوہ کو خود دیکھا ہے، جو قدیم شہر ہے مگر اب بھی ترقی پر ہے۔ مسقط کے شمال میں قدیم صدر مقام صحار واقع ہے۔ اس شہر کا نام بالکل اسی طرح عمان پڑ گیا جس طرح دمشق اب عام طور پر الشام کہلاتا ہے۔ صحار میں مشرق سے بکثرت تجارت ہوا کرتی تھی۔ اسی وجہ سے المقدسی نے اس شہر کو "چین کا دروازہ" لکھا ہے۔ المجاور نے تحریر کیا ہے کہ یہ شہر اُسکے زمانہ میں ابتری کی حالت میں تھا۔ ممکن ہے کہ اسکے زمانہ کے بعد اسکی حالت اچھی ہوگئی ہو کیونکہ ویلسٹیڈ نے اسکو مضبوط و مستحکم شہر لکھا ہے اور تھوڑی بہت اہمیت بھی دی ہے۔ صحار کے شمال میں جزیرہ نما کے مشرق کی طرف، راس مسندم پر شہر دبا (یا دما) آباد ہے۔ یہ شہر رسول کریم صلعم کے عہد میں بہت مشہور تھا۔ اور اب بھی شمالی عمان کا صدر مقام ہے۔ جزیرہ نما کے مقابل میں مغرب کی طرف شرجہ کے بندرگاہ کا شہر واقع ہے جو ترقی پر ہے۔ عمان کی قدیم آبادی کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں۔ البتہ روایات سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ بند مارب کے ٹوٹنے کے بعد قبیلۂ ازد کے افراد عمان میں آکر آباد ہوگئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے قدیم باشندے مازون تھے، اس لیے کہ عمان کو بعض اوقات اس نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ امویوں کے عہد میں اگرچہ یہاں کی کثیر آبادی عراق کو

چلی گئی تھی پھر بھی معلوم ہوتا ہے کہ ازد کا قبیلہ بڑھتا ہی رہا۔ قبیلہ طے کے افراد بھی عمان میں آکر آباد ہو گئے تھے اور انھیں کا ایک خاندان جسکو نبہان کہتے تھے، عرصہ دراز تک بالادست رہا۔ شمالی عرب کے لوگ (بنو غافر) بھی بعد میں یہاں آکر بس گئے تھے۔ کھجور یہاں کی بہت مرغوب غذا ہے اور دوسرے ملکوں کو بکثرت بھیجی جاتی ہے

وہ علاقہ جو عمان کے مغرب اور شمال مغرب کی طرف عراق کی حدود تک پھیلا ہوا ہے۔ عربوں کے بہترین عہد میں البحرین (اب البحرین، اوال کے جزیرہ کا نام ہے) کہلاتا، یا دار السلطنت ہجر کے نام پر ہجر کے نام سے موسوم تھا۔ دسویں صدی کے آغاز میں قرمطیوں نے اپنے رہنے کیلیے ایک مقام الاحسا (اسکا تلفظ لحسا بھی کیا جاتا ہے) کے نام سے بنوایا تھا جو ہجر سے قریب ہی تھا۔ یہی الاحسا (یا لحسا) اسوقت اس علاقہ کا نام ہو گیا ہے۔ اس علاقہ کے انتہائی جنوبی حصہ کا نام اس قبیلہ کے نام سے موسوم ہے جو اس میں آباد ہے اور اس قبیلہ کا نام قواسم ہے جو مشہور بحری قزاق ہیں۔ مغرب کی طرف آگے بڑھ کر قطر کا جزیرہ نما واقع ہے۔ زمانۂ قدیم سے یہاں کے باشندے غواص اور خوفناک بحری قزاق مشہور چلے آرہے ہیں۔ آجکل جو صدر مقام ہے اُسکا نام یا تو الحسا ہے یا ہفوف اور یہ نام عرب جغرافیہ نویسوں نے نہیں لکھا ہے۔ مشرق کی طرف اور آگے بڑھ کر چند گھنٹوں کی راہ پر عقیر کا بندرگاہ واقع ہے۔ معلوم نہیں کہ مبرز، جو ہفوف کے شمال میں اس سے قریب ہی واقع ہے، قدیم شہر مشقر سے مطابقت کرتا بھی ہے یا نہیں اور اس بات کا فیصلہ کرنا مشکل ہے اسلیے کہ عرب جغرافیہ نویسوں نے اس علاقہ کے متعلق جو واقفیت لکھی ہو وہ بہت ناکافی ہے۔ علاقہ لحسا کے شمال کی طرف مقام القطیف واقع ہے۔ اور یہ نام ایک مشہور بندرگاہ کے نام پر مشہور ہو گیا ہے پہلے یہاں کے ساحل کو اُس بندرگاہ کے نام پر الخط کہا کرتے تھے، جہاں سے عرب لوگ اپنے نیزوں کے لیے بانس لایا کرتے تھے۔ اور اس بندرگاہ میں ہندوستان سے بانس آیا کرتے تھے۔ علاقہ لحسا میں کھجور بکثرت پیدا ہوتی ہے چنانچہ ایک عربی مثل ہجر (لحسا) کو کھجور لیجانے کے بارے میں بالکل انھیں معنوں میں مشہور ہے جس طرح نیوکیسل کو، کوئلہ لیجانے کے متعلق ہمارے ہاں ایک کہاوت زبان زدِ عوام ہے۔ عبد القیس اور تمیم کے قبائل میں صدیوں تک بالادستی کے لیے جنگ رہی۔ بالآخر تمیم کا قبیلہ تقریبًا دو سو برس تک برسراقتدار رہا۔ یعنی جتنے عرصہ تک قرمطی لوگ برسرحکومت رہے اتنے ہی زمانہ تک یہ بھی صاحب اقبال رہا۔ القطیف ... ساحل کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں اس لیے کہ یہ علاقہ بالکل ہمو... کے معنی گرمی کے ہر...

اسکو قُرَین بھی کہتے ہیں۔ اب اس کا تلفظ گرین (Green) کیا جاتا ہے اسی وجہ سے انگریزی میں اسکے ہجے (Grane) لکھے ہیں۔ یہ مقام ایک خلیج کے جنوبی آغاز پر واقع ہے اور غالباً آیندہ زمانہ میں ایک مشہور تجارتی منڈی بنجائے گا اس لیے کہ ممالکت شمر کے لیے یہ بندرگاہ مشرق سے تجارت کے لیے سب سے قریب ہے۔ اس علاقہ کا شیخ اب عملی طور پر خود مختار ہے (پہلے یہ ترکی سیادت میں تمام اس خلیج کے مغرب کی طرف کاظمہ واقع ہے۔ یہ نہایت مشہور مقام ہے اور اس سڑک پر واقع ہے جو بصرہ سے لحسا اور وہاں سے یامہ تک چلی گئی ہے۔

وسط عرب یمن کے مشرق کی جانب، حضرموت اور مہرہ کے شمال کی طرف اور عمان کے مغرب میں وسط عرب تک وسیع ریگستان ہے جسکی صرف حدود ہمیں معلوم ہیں مگر وہ بھی نامکمل طور سے۔ یہ ریگستان نفود کے ریگستان (جو شمالی عرب میں ہے) کی طرح معلوم ہوتا ہے یہاں پانی بمشکل ملتا ہے۔ بارش ہونے کے بعد زمین سبزہ زار بنجاتی ہے اور کثرت سے چراگاہیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ پھر تو بدو لوگ اندرونی علاقہ میں' اپنے اونٹوں' بھیڑوں اور تمام خاندان کو لیکر آجاتے اور یہاں تین یا چار مہینے تک مقیم رہتے ہیں۔ انسانوں کو پانی کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ انکے جانوروں کو، اس لیے کہ انسان تو دودھ پر گذارہ کرتے ہیں اور چونکہ سخت سے سخت دھوپ کی تپتی ہوئی زمین پر بھی سبزہ اس قدر رَس دار ہوتا ہے کہ چوپایوں کو پانی کی مطلق ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر انکو پانی پینے کے لیے دیا بھی جاتا ہے تو نہیں پیتے۔ جب گرمیوں کی دھوپ سے یہاں کا سبزہ سوخت ہو جاتا ہے تو پھر بدو لوگ اپنے اپنے اصلی مقامات پر واپس چلے جاتے ہیں۔ ریگستان کے کنارے جو بدو آباد ہیں اُن کا ہمیشہ یہی طریقہ رہتا ہے۔ یہ بات کہ اندرون ریگستان وہ ٹھیک ٹھیک کہاں تک جاتے ہیں' ہمیں معلوم نہیں۔ اس لیے کہ ریگستان کے کئی نام ہیں۔ مشرقی یمن اور شمال مغربی حضرموت کے درمیان کا حصہ صیہد کہلاتا ہے۔ حضرموت کے شمال اور مشرق کی طرف والا علاقہ الاحقاف کے نام سے مشہور ہے۔ مہرہ کے شمال کی طرف جو سرزمین ہے اسکو عرب لوگ دبار کہتے ہیں مگر یہ علاقہ عموماً الدہنا کہلاتا ہے، یعنی سرخ زمین کا علاقہ۔ یہاں کی مٹی کا رنگ سرخ ہے اسلیے یہ علاقہ اس نام سے مشہور ہوگیا۔ نقشوں میں اسکو "الخالی" بتایا جاتا ہے۔ یہ بات کہ آیا اس علاقہ کے اندرونی حصہ میں کم ازکم جانوروں کے لیے بھی پانی ملتا ہے یا نہیں، بالکل غیر یقینی اور خلاف قیاس نہیں ہے اس لیے کہ مہرہ کے بدو، جنکے اونٹوں کے جہاز کا بیڑہ دُنیا بھر میں مشہور ہے، اس بات کو واقعہ کے طور پر بیان کرتے ہیں کہ انکی اونٹنیاں بعض اوقات

جن کے اونٹوں سے جفتی کھا جاتی ہیں۔ اس سے قیاس کو راہ ہوتی ہے کہ اندرونی علاقہ میں اب بھی جنگلی اونٹ رہتے ہیں کیونکہ عرب لوگ ان اونٹوں کو حوشیہ (جنگلی) کہتے ہیں۔ غالبا یہی بات مغربی عمان کے اونٹوں پر بھی عائد ہوتی ہے جو اتنے ہی مشہور ہیں جتنے کہ یہ۔ اور یہ واقعہ، کہ اس علاقہ میں ایک ایسی قوم آباد ہے جو نامعلوم زبان بولتی ہے، صحیح نہیں ہے۔ ابن المجاور نے لکھا ہے کہ یہاں کے بدووں نے تیرہویں صدی میں اس ریگستان کو پار کرکے بالکل داہنی جانب مرباط اور ظفار کو جانے کی جسارت کی تھی تاکہ اپنے ہاں کی پیداوار سے عراق کی پیداوار کا تبادلہ کریں۔ اس وسیع ریگستان کی شمالی مشرقی سرحد پر، (جو یمامہ کے جنوب میں تین دن کے سفر کی دوری پر واقع ہے اور بحرین سے قریب قریب اتنی ہی دور ہے) قدیم سرسبز وشاداب اور سیراب یرین کا نخلستان واقع ہے جسکو قرمطیوں نے تباہ و برباد کر دیا تھا۔ نخلستان کے نام پر ریگستان کا یہ حصہ بعض اوقات "یرین کی ریت" کہلاتا ہے۔ عمان سے مکہ کو جو سڑک گئی ہے وہ اسی نخلستان میں ہوکر جاتی ہے۔ یہاں سے شمال کی طرف بحرین اور یمامہ کے بیچ میں ریگستان کا ایک ناگوار حصہ پھیلا ہوا ہے جو الدہنا یا نفود بھی کہلاتا ہے اور بعض وقت اسے "عالج کی ریت" کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں۔ بیان ہوا ہے کہ اس میں چراگاہیں کثرت ہیں اور سرسبز وشاداب پہاڑوں کے سلسلے اس علاقہ میں ایک دوسرے کو قطع کرتے ہوئے چلے گئے ہیں۔ یہاں کی آب وہوا خوشگوار اور صحت بخش ہے۔ اس ریگستان اعظم کے مغرب اور شمال مغربی کنارے پر قحطان کا علاقہ بہت نشیب میں واقع ہے جسکو پہلے فلج کہتے تھے مگر اب اسکو ایک عرب قبیلہ کے نام پر وادی دواسر کہتے ہیں۔ یمامہ کے جنوب مغرب میں اسی وادی کا سلسلہ وادی افلاج کہلاتا ہے (اسکو پہلے فلج الافلاج بھی کہا کرتے تھے)۔

اس ریگستان کے شمال کی طرف وسط کا بلند علاقہ (نجد) شروع ہو جاتا ہے۔ یہ بلند علاقہ جزیرہ نما کا قلب کہلاتا ہے اور واقعی نہایت صحت بخش اور عربوں کے لیے عرب کا بہترین حصہ ہے۔ جنوبی مشرقی صوبہ یعنی یمامہ بہت زرخیز علاقہ ہے (اسکو اکثر اصلی نجد میں شامل نہیں کرتے) یمامہ اور بحرین کو ملاکر العروض کہتے ہیں۔

یمامہ سے دو پہاڑی درے (عینہ اور رہر کلیہ) ثمام وثمم (وشوم) میں واقع ہے۔ اور پھر وہاں سے شمال مغرب کی طرف ... یہ اس صوبہ کا خاص شہر ہے۔ یہاں سے عنیزہ کو نو گھنٹے میں ہو پہنچتے ہیں یم کے صوبہ کا خاص

شہر ہے ۔ اس صوبہ کے شمال میں شمر کا علاقہ واقع ہے ۔ اور بجانب مغرب مدینہ کے علاقہ میں خیبر ہے ۔ ہم ڈوٹی کے ممنون ہیں کہ انھوں نے اس ملک کا مفصل حال تحریر کیا ہے ۔ عنیزہ کے شمال مشرق میں دو گھنٹے کے راستہ پر شہر بریدہ واقع ہے ۔ قصیم کے داہنی جانب بڑی وادی رُمّہ چلی گئی ہے جو خیبر کے کوہ آتش فشاں سے شروع ہو کر آئی ہے ۔ یہ پہاڑ چھ ہزار فٹ بلند ہے اور نواح بصرہ تک چلا گیا ہے ۔ وادی رُمّہ میں اس مقام پر پستی واقع ہو گئی ہے اور اسکی اغلب وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ زمانۂ تاریخ سے بھی قبل یہ مقام کسی دریا کا گذرگاہ رہا ہوگا ۔ اگرچہ اس وادی میں بہت سے دریا گرتے ہیں اور گو دریاؤں کے تیز دھارے کی وجہ سے اس وادی میں پانی اچھی خاصی مقدار میں آجاتا ہے لیکن پھر بھی یہ وادی، جسکی چوڑائی کہیں کہیں ایک دن کے سفر کی مسافت کے برابر ہے، عام طور پر خشک ہی رہتی ہے ۔ ایک صدی میں صرف دو یا تین مرتبہ اس میں حقیقی دریا کی شان پیدا ہو جایا کرتی ہے ۔ لیکن ساتھ ہی اسکے پانی اسکی تہ میں جذب ہو جاتا اور بعض مقامات پر دکھائی بھی دیتا ہے ۔ قصیم کے علاقہ میں جو سرسبزی اور شادابی ہے وہ اسی وجہ سے ہے ۔ اس صوبہ کے مغرب کی طرف یہ وادی، ابان کی دو پہاڑیوں کے بیچ میں سے ہو کر گئی ہے (شعرائے قدیم نے اس مقام کا بیشتر ذکر کیا ہے) ۔ شمالی پہاڑی سیاہ پہاڑی کہلاتی ہے اور جنوبی سرخ ۔ یہاں پر اس وادی کی چوڑائی دو سے تین عربی میل تک ہے ۔ نجد کا وہ حصہ جو انتہائی جنوب مشرق کی طرف واقع ہے، اب سُدَیر کہلاتا ہے ۔ (بعض اسکا تلفظ صُدَیر، سِدر کرتے ہیں ڈوٹی نے سِدَیر لکھا ہے) جہاں نما میں زائرین کی اس سڑک پر جو بصرہ سے چلی گئی ہے اسی کا نام کا ایک مقام مذکور ہوا ہے ۔ زمانۂ قدیم میں نجد کے مختلف علاقے مختلف قبائل کے نام پر مشہور تھے ۔

صوبۂ قصیم کے مغرب میں شمر کا ملک واقع ہے ۔ اس ملک کا نام طے کے بڑے قبیلہ کے ایک خاندان کے نام پر مشہور ہوا ہے اور اسی خاندان کے نام پر یہ علاقہ "طے کے دو پہاڑوں" کے نام سے موسوم ہے ۔

شمر کے پہاڑ نجد کو نفود یا الدہنا سے جدا کرتے ہیں ۔ نفود کے اصلی ریگستان کی ٹھیک ٹھیک وہی خصوصیات ہیں جو جنوب کے بڑے ریگستان کی ہیں ۔ بارش ہونے کے بعد اس ریگستان کی سرزمین بھی سرسبز و شاداب اور رس دار سبزہ سے لہلہانے لگتی ہے ۔ انسان اور جانور کثرت سے آکر یہاں پر چند ہفتوں تک آباد رہتے ہیں ۔ لیکن بعد میں جب دھوپ ہر چیز کو

جھُلس دیتی ہے تو پانی کا قحط ہو جانے کی وجہ سے ملک بالکل خشک ور ویران ہو کر بھٹکے ہوئے مسافروں کے لیے سخت خطرناک ہو جاتا ہے۔ چند انگریزوں نے اس لق و دق صحرا کو عبور کیا ہے جن میں لیڈی بلنٹ اور یوٹنگ قابل ذکر ہیں۔ یوٹنگ نے لکھا ہے کہ اس علاقہ کی مٹی سرخی مائل ریت کے شکل ہوتی ہے اور اُسپر نشانات بنے ہوتے ہیں "گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے قدآور گھوڑوں کے گلہ نے مشرق سے مغرب تک اُس میدان کو پامال کر دیا ہے"۔ بلند ریتیلا علاقہ، جسے نِفد یا نفُد کہتے ہیں اور جسکی جمع نفود (انفاد) ہے اس سے تمام ریگستان کی تعریف ظاہر ہوتی ہے۔ اسی طرح جنوبی ریگستان کے متعلق احقاف کا لفظ رائج ہے اور اس سے وہاں کے ریگستان کی قسم کا پتہ چلتا ہے۔ لفظ نفد جسکا کسی مستند زبان میں پتہ نہیں چلتا، شاید کثرت استعمال سے لفظ فِند یا فَند (جس کی جمع افناد یا فنود ہے) رائج ہو گیا ہے۔ حائل سے جوف تک (مخالف سمت میں) یوٹنگ نے آٹھ دن کے سفر میں رستہ طے کیا تھا، اور لیڈی بلنٹ نے دس دن میں۔ تین دن کے سفر کے بعد جبّہ کا نخلستان آجاتا ہے۔ یہاں کی چٹانوں پر بہت سے کتبے اور نقوش پائے جاتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم سے اس مقام پر اکثر لوگ آتے رہے ہیں۔ جوف سے نو دس گھنٹے کے سفر کے بعد شقیق کا کنواں ملتا ہے اسکو یوٹنگ نے ۱۸۸۳ء میں دیکھا اور اُسوقت یہ کنواں اَٹا ہوا تھا۔ الجوف کا اسکے قدیم نام (دومہ) سے اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہ مقام وادی سرحان پر واقع ہے۔ یہ وادی کاف میں ہو کر حوران تک پتھریلے ریگستان کے داہنی جانب آر پار چلی گئی ہے۔ یہ مقام اسوقت حماد کہلاتا ہے۔ یہ ایسا نام ہے جسکا کسی زبان میں پتہ نہیں چلتا۔ والن نے لکھا ہے کہ شاید اسکی اصلی شکل ہماد ہو جو ہمد کے فعل سے مشتق ہے اور اسکے معنی "بنجر" کے ہیں۔

عراق عرب اہل عرب اسکے مغربی حصہ کو بادیۃ الشام کہا کرتے تھے۔ مشرقی حصہ کو جو جنوب کی طرف ہے بادیۃ عراق کے نام سے پکارتے تھے اور شمالی حصہ کو بادیۃ الجزیرۃ، عراق عرب کا ریگستان اور خسافت بھی کہتے تھے۔ جنوبی علاقہ کو اکثر سماوہ کے نام سے یاد کرتے تھے اس بادیہ کے ڈھالوں کو جو مغرب اور شمال کی جانب سے مشرق اور جنوب کی طرف چلے گئے ہیں بہت سے چھوٹے چھوٹے نالے قطع کرتے ہیں۔ جنکا پانی کچھ تو تالابوں [illegible] جاتا ہے اور کچھ بڑے بڑے چشموں میں چلا جاتا ہے اور یہ سب جا کر دریائے فرات [illegible] موسم بہار میں یہاں کثرت سے گھانس اُگ آتی ہے اور کنوؤں کے قریب نخلستان [illegible] پیدا ہو جاتے ہیں بعض مقامات پر زیادہ برہنہ یا پتھریلی زمین جس پر ریت [illegible] وہ بالکل بنجر رہتی ہے۔ اس

علاقہ کو عبور کرکے عراق سے شام کی طرف ۱۳ھ مطابق ۶۳۴ عیسوی میں حضرت خالد بن ولیدؓ اپنی سوارہ فوج کے ساتھ ایک مہم پر گئے تھے۔ یہ مہم درحقیقت نہایت پُرخطر تھی۔ اس علاقہ کی حدود کا گھٹنا یا بڑھنا، ان متمدن ریاستوں کی طاقتوری یا کمزوری پر منحصر ہے جو اسکے اطراف واقع ہیں۔ ساکو نے لکھا ہے کہ اسوقت الحمص کے پہاڑ جو حلب کے جنوب میں واقع ہیں، اس علاقہ کی شمالی حد قائم کرتے ہیں پھر بھی گرمیوں کے موسم میں بدو لوگ اپنے گلوں کو لیکر مرعش تک چلے جایا کرتے ہیں۔

آب و ہوا اور پیداوار

فی الجملہ عرب میں بہ نسبت سردی کے گرمی زیادہ ہوتی ہے۔ تاہم مرتفع میدانوں کی راتیں گرمی میں بھی اکثر سرد ہوا کرتی ہیں اور جاڑوں میں برف کی سرد شمالی ہوا نہایت ناگوار ہو جاتی ہے۔ شعرا، مشرقی ہوا (صبا) کو نہایت خوشگوار خیال کرتے ہیں۔ برخلاف اسکے سَمُوم کا بہت خوف ہوتا ہے۔ اب اس کا تلفظ عام طور پر سِمُوم کیا جاتا ہے۔ یہ زہریلی جھلس دینے والی خشکی کی ہوا ہوتی ہے۔ ہر قسم کی خوشحالی بارش پر منحصر رہتی ہے۔ اسی وجہ سے اکثر بارش کو "خدا کی رحمت" کہا جاتا ہے اور پانی اور فیاضی کے خیالات اکثر مترادف ہوا کرتے ہیں۔ بارش کے موسم کے بعد، ربیع کا زمانہ سال کا بہترین زمانہ ہوتا ہے۔ اس موسم میں ہری ہری جھاڑیاں اور گھانس جانوروں کے لیے پیدا ہو جاتی ہے۔ اونٹ خاص طور پر کٹیلے پودوں کو بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ ان پودوں میں سعدان کا پودا انکو بہت مرغوب ہوتا ہے۔ انسانوں کو کھانے کے لیے اس بادیہ میں جو اناج پیدا ہوتا ہے اُسکو فِث کہتے ہیں۔ اب عام طور پر اسکو سمح کے نام سے پکارا جاتا ہے (غالباً یہ نام قمح سے ماخوذ ہے)۔ اس غلہ کے سرخی مائل دانوں کا آٹا جَو کے آٹے سے بہتر ہوتا ہے۔ جو حلوا پکانے کے لیے زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔ لوگ ضرورت کے وقت حنظل کے بیجوں کا آٹا بھی استعمال میں لاتے ہیں۔ اس ریگستان میں کھمبہ بھی پیدا ہوتا ہے لوگ اسکو بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ اور مشہور و معروف سَنا بھی کھائی جاتی ہے۔ گیہوں صرف یمامہ، یمن، اور چند نخلستانوں میں پیدا ہوتا اور ہمیشہ گراں رہتا ہے اس لیے اسکی روٹی عموماً عیش و طرب کی چیز سمجھی جاتی ہے۔ جَو کی کاشت زیادہ ہوتی ہے اس وجہ سے کہ اسکو گھوڑے کھاتے ہیں۔ جوار، باجرہ اچھی خاصی تعداد میں پیدا ہوتا ہے۔ لحسا اور عمان میں چاول خوب پیدا ہوتا ہے۔ وہابیوں کے عہد میں تمباکو کی کاشت کم ہوگئی تھی اس لیے کہ انھوں نے اس فضول چیز کی کاشت کی ممانعت کردی تھی لیکن اب پھر اسکی کاشت میں ترقی ہو رہی ہے۔

اس بادیہ میں جو درخت پیدا ہوتے ہیں، ان میں طلح کے درختوں کے مانند گوند کے درخت

کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ ان کی اقسام کا بیان کرنا بہت ضروری ہے۔ ان سے صمغ عربی نکلتا ہے اور انکی اقسام حسب ذیل ہیں :- سلم، سمر، سیال، اثل، نبک، عضا (اس درخت کی لکڑی کا کوئلہ بہت عمدہ ہوتا ہے)۔ جنگلی کھجور اور مہندی کے درخت بھی اس بادیہ میں ہوتے ہیں۔ عرب لوگ کھجور کے درختوں کی بہت قدر کرتے ہیں۔ اور یہ درخت واقعی اعلیٰ درجہ کے ہوتے ہیں۔ عربوں کی خاص خوراک کھجور ہے۔ مدینہ کے علاقہ میں کھجور کی قسمیں سو سے بھی زائد شمار کی جاتی ہیں۔

قدیم شعرائے شیروں کا مسلسل ذکر کیا ہے اور ہمدانی نے تو اُن علاقوں کے نام تک بتائے ہیں جن میں وہ پائے جاتے تھے۔ ابن المجاور نے لکھا ہے کہ صنعا کے شمالی پہاڑوں میں اُسکے زمانہ میں بھی چند شیر موجود تھے۔ اور ڈوٹی نے بھی یہی اطلاع وسط عرب میں سُنی تھی۔ چیتے، تیندوے، جرغ، اور لومڑیاں بڑے شکاری جانور ہیں۔ شکار کے متعلق ہم نے ضروری باتیں اس مضمون کے اُس حصے میں لکھی ہیں جس میں ہم نے عربوں کی نسل اور طرز معاشرت کا ذکر کیا ہے۔ شکاری پرندوں میں دو قسم کے عقاب، شاہین، شکرے اور اُلو ہوتے ہیں۔ بندر یمن میں زیادہ ہیں اور غالباً دوسرے حصوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ کوّے عام طور پر ہر جگہ ہوتے ہیں۔ دوسرے پرندوں میں ہُدہُد، چنڈول، بلبل، چند قسم کے کبوتر، اور خصوصاً قطا قسم کے تیتر پائے جاتے ہیں۔

چوپاؤں میں سب سے زیادہ قابل قدر اونٹ ہیں، بغیر انکے ریگستان عملی طور پر ناقابل رہائش ہوجاتا ہے۔ شعرائے اسکو "خشکی کا جہاز" واقعی ٹھیک کہا ہے اس وجہ سے کہ ریگستان میں نقل و حرکت کا واحد ذریعہ یہی ہے۔ یہ قصہ کہ انسانوں کو جب پانی کی شدید ضرورت ہوتی ہے تو وہ اونٹوں کو مارکر وہ پانی بھی پی جاتے ہیں جو انکے پیٹ میں جمع رہتا ہے۔ اس قصہ کو جکیب نے "پریوں کا قصہ" بتایا ہے۔ لیکن طبری کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کا یہ واقعہ بالکل اختراع بھی نہیں ہے (ملاحظہ ہو طبری صفحہ ۲۱۲۳) جہاں گھوڑوں کو اسی طریقہ سے پانی پلایا جاتا ہے۔ عربی اونٹ کے صرف ایک کوہان ہوتا ہے۔ بار برداری کے اونٹ کو بعیر کثیر تعداد کو ابل کہتے اور سواری کے اونٹ کو ذلول (پالتو) یا (ہجین) شریف کہتے ہیں۔ اونٹ کا گوشت بہت زیادہ کھایا جاتا ہے، اُسکا دودھ باذائقہ اور مفرح ہوتا ہے، بہت پیا جاتا ہے لیکن گھی کے کام کا نہیں ہوتا۔ بھیڑ بکریوں کے دودھ سے گھی نکالتے ہیں بھیڑ اور بکری کے گلّے عرب میں عموماً رکھے جاتے ہیں لیکن گائے بھینس شاذ ... دریائے فرات کے نواح میں گایوں کے گلّے پائے جاتے ہیں جن کو بقارہ کہتے ہیں ... دنیا بھر میں مشہور ہے۔ چھوٹا ہوتا ہے مگر بہت خوبصورت۔ بہت تیز اور محنتی ... بہت محبت رکھتا ہے

صرف دولتمند لوگ ہی گھوڑا رکھ سکتے ہیں اس لیے کہ یہ گھوڑے صرف لڑائی یا تفریحی کھیل، دوڑ اور شکار کے موقع پر کام میں لائے جاتے ہیں۔ علاوہ اسکے انپر صرفہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ مکمل طور سے تربیت یافتہ ایک گھوڑی ۲۵ اونٹوں کی قیمت کے برابر سمجھی جاتی ہے اور اسکے لیے جَو اور پانی زیادہ صَرف ہوتا ہے۔ قزاقانہ تاختوں میں گھوڑوں کے واسطے اونٹوں پر پانی لیجایا جاتا ہے اور ضرورت کے وقت اکثر انکے لیے گھر کے اثاثہ کا بیشتر حصہ صرف کر دیا جاتا ہے۔ لیڈی بلنٹ اور فان اپن ہیم کے سفرناموں میں اسکے متعلق بہت سے واقعات بالتفصیل درج ہیں۔ صرف نجد ہی میں گھوڑوں کو پرورش نہیں کیا جاتا بلکہ یمن کے چند حصوں مثلاً ضمار اور جوف وغیرہ میں بھی انکی پرورش ہوتی ہے۔ زمانۂ قدیم سے ہندوستان میں عربی گھوڑے آتے رہے ہیں۔ حاکم شمر ہر سال چند گھوڑے براہ کویت ہندوستان بھیجا رہتا ہے۔ اگرچہ حجاز، لحسا اور یمن کے باشندے، نیز وسط عرب میں قبیلۂ صلیب کے افراد بھی خچروں کو سواری کے کام میں لاتے ہیں لیکن بدو اسکی سواری کو کسر شان سمجھتے ہیں۔ دریائے فرات پر سجو رکے وادی میں نیم بدو خچروں کے بہت سے گلّے رکھتے ہیں۔

پالتو جانوروں میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں:۔ معمولی کُتّے، جن سے دیکھ بھال (چوکیداری) کا کام لیا جاتا ہے، بہت زیادہ گیدڑ سے مشابہ ہوتے ہیں۔ اور شکاری کُتّوں کو سلوکی کہتے ہیں (یہ لفظ سلوق سے ماخوذ ہے) بلّیاں، یورپی بلّیوں سے بڑی ہوتی ہیں۔ شہروں میں مرغیاں بہت کم پائی جاتی ہیں، اگرچہ بادیہ میں وہ کثرت سے موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یمن میں کسی زمانہ میں بندروں سے گھر کا کام کاج کرایا جاتا تھا

عرب میں یہ بات تو مشہور ہی ہے کہ ٹڈیاں بہت نقصان کا باعث ہوا کرتی ہیں کہتے ہیں کہ انکا دورہ ہر ساتویں سال ہوتا ہے۔ جس وقت ٹڈیوں کا دَل بادَل چھا جاتا ہے تو پھر بچے سے لیکر بوڑھے تک گھر سے نکل آتے ہیں۔ ان کا صرف یہ ہی مقصد نہیں ہوتا کہ انکا خاتمہ کردیں بلکہ وہ انکو بہت شوق سے کھاتے بھی ہیں۔ یہ لوگ ٹڈیوں کو نمک کے ساتھ اُبال کر یا بھون کر کھاتے ہیں۔ شہد کی مکھیوں کو پرورش کرنے کا یہاں قاعدہ نہیں ہے، البتہ بیشتر حصوں میں جنگلی شہد پایا پایا جاتا ہے جو خدا کی نعمت سمجھا جاتا ہے۔

نسل اور طرز معاشرت

عرب شجرہ نویسوں نے تمام عربوں کی نسل کے متعلق یہ لکھا ہے کہ وہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی اولاد ہیں، شمالی عرب تو حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام)

ل نسل سے ہیں اور جنوبی عرب قحطان کی نسل سے - اور اس نظریہ کی بنیاد توراۃ کے بیان پر ہے۔
اس کلیہ سے یہ بھی متعلق ہے کہ "اصلی عرب" (العرب العاربہ) عاد و ثمود، عملیق وغیرہ کے قبائل
فنا ہو چکے ہیں نیز وہ قبائل جو قحطان کی نسل سے تھے وہ بھی باقی نہیں رہے اور یہ کہ حضرت اسمعیل
(علیہ السلام) کی نسل "العرب المستعربہ" کہلاتی ہے۔ یعنی وہ لوگ جو باہر سے آکر عرب میں آباد ہوئے
اور رہتے رہتے عرب بن گئے۔ وہ بدو بھی اصلی عرب کہلاتے ہیں جو خالص عربی زبان بولتے ہیں
جمع کے الفاظ "اعراب" اور "عربان" بھی ضمناً انکے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ بدوی اُن لوگوں
کو کہتے ہیں جو بادیہ (کھلے میدان) میں رہتے ہیں۔ انکے مقابلہ میں اہل الحضرہ لوگ کہلاتے ہیں
جو مستقل سکونت رکھتے ہیں۔ انھیں لوگوں کو اہل الوبر اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اونٹ اور بکروں
کی اُون کے بنائے ہوئے خیموں میں رہتے ہیں۔ انکے مقابلہ میں اہل المدر (یا الطین) مٹی کے گھروں
میں رہتے ہیں۔

یہ تو ایک بدیہی واقعہ ہے کہ اہل عرب شمالی اور جنوبی قبائل میں منقسم ہیں۔ جنوبی قبائل یمنی
کہلاتے ہیں اور شمالی بنی نزار۔ عہد نبوی صلعم میں بھی بہت سے یمنی قبائل عرصہ سے شمالی علاقوں
میں آباد چلے آرہے تھے اور جنوب میں بنی نزار کے قبائل کے کچھ حصے۔ روایت چلی آرہی ہے کہ
سدّ مآرب کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے یمنی قبائل خانماں برباد ہوکر شمالی اور درمیانی عرب میں جاکر
آباد ہو گئے تھے۔ معلوم نہیں کہ یہ بات تاریخی حیثیت سے کہاں تک صحیح ہے اس لیے کہ جو سنین
ہم تک پہونچے ہیں اُن سے ہم اس واقعہ کی صحت کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کرسکتے۔ بہر صورت
نقل وطن کے کچھ نہ کچھ دیگر اسباب ضرور معاون ہوئے ہوں گے جنکی وجہ سے اور لوگوں کو بھی ترک
وطن کرنا پڑا ہوگا۔

خود مُلک عرب کی طبعی حالت، اونٹوں کو پرورش کرنے والے عربوں کو ہمیشہ خانہ بدوشی کی
زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ وسطِ عرب کے شمال، مشرق اور جنوب کی طرف جو ریگستان ہے،
وہ موسم باراں کے بعد غیر معمولی طور سے کوئی تین مہینے تک سرسبز و شاداب چراگاہ بنا رہتا ہے۔
انسان اور جانور آآکر کثرت سے اس میں آباد ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب زمین بنجر ہو جاتی ہے تو یہ
لوگ اپنے اہل و عیال اور سامان کو لیکر پھر اپنے اپنے اصلی [illegible] جاتے ہیں۔ اکثر
ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب انکے خاص علاقہ میں پورے قبائ[illegible] جاتی ہے تو قبائل کے
چند حصے دوسرے علاقوں میں جاکر بعض اوقات زبردستی [illegible] بدو بہت ہی کثیر الاولا[illegible]

ہوتے ہیں اور حالات کی مساعدت میں خاندانوں کا ایک چھوٹا سا گروہ بہت ہی قلیل عرصہ میں ایک طاقتور قبیلہ بن جاتا ہے۔ پھر اس صورت میں قرب و جوار کے قبائل کے لیے ترک وطن ناگزیر ہو جاتا ہے۔ چونکہ بدوؤں کا وہ جنوبی علاقہ جو ریگستان اور ساحلی ریاستوں کے درمیان واقع ہے، محدود ہے۔ اس لیے جنوب کے باشندوں کو بہ نسبت شمالی باشندوں کے زیادہ دور جا کے آباد ہونا پڑا۔ عہد نبوی صلعم سے بھی صدیوں قبل طے کے طاقتور یمنی قبیلہ نے شمالی نجد میں ایک علاقہ فتح کیا تھا اور اس بنا پر قضاعہ کے قبائل کو شام کے مشرق اور جنوب میں جا کر آباد ہونا پڑا تھا۔ پس شمالی قبائل، جنوب کی طرف، صرف استثنائی حالات ہی میں نقل وطن کیا کرتے ہیں۔

جنوبی اور شمالی قبائل میں مخالفت کی ممکن ہے، سب سے پہلی وجہ یہ ہو کہ آخر الذکر نے اول الذکر کو اپنے رسم و رواج اور معاملات میں مخل سمجھا ہو۔ جنوبی ریاستوں (یمن، حضرموت، عمان) کے باشندوں کے میل جول سے، شمالی باشندوں نے انکی زبان سیکھی اور شاید انکے رسم و رواج کی خصوصیات سے شمالی عرب مانوس نہ تھے، اس لیے وہ جنوب والوں سے ناراض ہو گئے۔ بعد میں یہ ناراضی بہت زیادہ بڑھ گئی یہاں تک کہ آخر کار اہل مدینہ، انصار (جو یمنی الاصل ہیں اور اہل مکہ قریش (جو نزاری الاصل ہیں) میں رفتہ رفتہ نسلی دشمنی قائم ہو گئی۔ یہی دشمنی عربی حکومت کے لیے خطرناک ثابت ہوئی اور اب تک چلی آتی ہے۔

خاندان قبیلہ کی بنیاد ہوتا ہے۔ ایک عرب کے لیے قابل فخر یہ بات ہوتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو زیادہ تعداد میں مضبوط اور بہادر پوت پیدا کرے۔ انکے ذریعہ سے اس کا خاندان مشہور ہو کر، اپنے چھوٹے چھوٹے خاندانوں پر بالادست ہو جاتا ہے جو اسکو اپنا بڑا (شیخ) سمجھنے اور اپنے تئیں اُس کا بچہ تصور کرتے ہیں۔ ایسے افراد کا ایک قبیلہ بن جاتا ہے۔ اگر یہ قبیلہ طاقتور اور دولتمند ہے تو دوسرے کمزور قبائل بھی اس میں شریک ہو جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں دیگر قبائل بھی اکثر امداد باہمی یا بڑی بڑی مہموں کو سر کرنے کے لیے آپس میں مل جایا کرتے ہیں۔ اس قسم کے قبائل کے مرکب یا مجموعہ کا ایک عمومی نام رکھ لیا جاتا ہے جو عموماً کسی خاص اور مشہور قبیلہ کے نام پر ہوتا ہے نیز یہ نام اکثر بلا سوچے سمجھے بھی رکھ لیے جاتے ہیں مثلاً بنی انمار یا بنی کلاب وغیرہ۔ تمام ماتحت قبائل کو ایک باپ یا ایک ماں کی اولاد کی طرح سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ زمانہ قدیم میں یمنی اور نزاری قبائل میں اتنی سخت دشمنی نہ تھی جتنی کہ بعد میں ہو گئی اس لیے اکثر خاص شمالی عرب کے قبائل میں بھی واقعی چند یمنیوں کے خاندان ملتے ہیں اور یمنیوں میں شمالی عرب کے خاندان بھی پائے جاتے ہیں۔

محققین نے قحطان کو تمام یمنیوں کا مورثِ اعلیٰ بتایا ہے - یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ قحطان ایک مشہور و معروف قبیلہ کے نام سے اُس علاقہ میں اب تک موجود ہے جو جنوبی حجاز کے مشرق اور یمن کے شمال میں واقع ہے اور ریگستان اعظم تک چلا گیا ہے (بنیٹ نے قبیلہ قحطان کو اس علاقہ کا باشندہ بتایا ہے جس میں خوشبو کے درخت اُگے ہوئے ہیں - اب معلوم نہیں کہ ہمارا قحطان بنیٹ کے (Kathan) سے مطابقت کرتا بھی ہے یا نہیں - اور میں اسکے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا) اس علاقہ کے جنوب میں قبیلہ کہلان آباد ہے - کہا جاتا ہے کہ اس قبیلہ سے یمنی قبائل کی دو نہایت مشہور شاخیں نکلی ہیں :

قبیلۂ کہلان سے (یہ دونوں جماعتیں متعلق ہیں یا تھیں حسب ذیل ملاحظہ ہو :-

۱ — قبیلۂ طے تقریباً دو ہزار برس تک اجاء اور سلمیٰ کے پہاڑوں پر قابض رہا - اس قبیلہ کے دو افراد کے نام پر یہ دونوں پہاڑ اس نام سے مشہور ہوئے - شامی اور ایرانیوں نے اسی مشہور و معروف قبیلہ کے نام پر تمام عربوں کو طے کے نام سے یاد کیا - بنی طے کا ایک خاندان (شمر نامی) جب برسرِ حکومت آیا تو اس حکمراں خاندان کے نام پر اس علاقہ کے باشندے شمر کہلانے لگے - خاندان شمر کے جد اعلیٰ اجاء کے پہاڑوں میں توارن نامی ایک گاؤں میں رہتے تھے - اسوقت عراق عرب میں صرف چند چھوٹے چھوٹے قبائل کو قبیلہ طے کے افراد کہا جاتا ہے جو حاکم شمر کے ماتحت ہیں لیکن ان لوگوں کو یہ نہیں دینا پڑتا اس لیے کہ یہ لوگ خاندان شمر کے ہم نسل سمجھے جاتے ہیں - قبیلۂ شمر کو ریگستان شام سے عنزہ کے قبیلہ نے نکال دیا تھا اور یہ لوگ عراق عرب میں جہاں وہ اس وقت حکمراں ہیں سترہویں صدی کے اختتام کے بعد آئے تھے -

۲ — ہمدان اور مذحج کے قبائل بہت عرصہ تک یمن میں آباد رہے - مذحج سے قبیلۂ الحارث جو طائف کے جنوب مشرق میں آباد تھا متعلق ہے - قبیلۂ بجیلہ کے افراد بھی مذحج ہی کی نسل سے ہیں - بجیلہ نے حضرت عمرؓ کے عہد میں عراق عرب کی تسخیر میں زیادہ حصہ لیا تھا -

۳ — بنی عاملہ اور بنی جذام کے قبائل فلسطین میں آباد ہوئے تھے - بنی لخم نے دریائے فرات پر حیرہ کی سلطنت قائم کی تھی - بنی کندہ صرف اپنے خاص وطن حضرموت میں برسرِ حکومت رہے بلکہ انھوں نے یمامہ میں بنو اسد پر بھی حکومت کی ... (حکمراں) نے بادشاہ کا لقب بھی اختیار کیا تھا - مشہور و معروف شاعر امرا ... ان سے تھا -

۴ — ازد کے طاقتور قبیلہ نے (جس میں بہت سے ... فتح کر کے سرات کے

پہاڑوں میں بود و باش اختیار کرلی تھی - اسی قبیلہ کے ایک خاندان نامی غسان نے مشرق میں ایک حکومت قائم کی تھی - اس خاندان کی دوسری شاخیں خزعہ کہلاتی ہیں جو کسی زمانہ میں مکہ پر حکمراں رہی تھیں - یثرب (مدینہ) میں جو دو قبیلے اوس اور خزرج (انصار) آباد تھے وہ بھی خزعہ کی نسل سے ہیں -

قحطان سے جو دیگر نسلیں چلی ہیں اُن میں محققین قبیلۂ حمیر کو سب سے پہلے جگہ دیتے ہیں - اس سے قضاعہ کا بڑا اصیل جول ہے - اور قضاعہ میں بہرا اور تنوخ کے قبائل بھی شامل ہیں - یہ قبائل شمالی شام میں بہت زمانہ قبل آباد ہوئے تھے - جہینہ حجاز کی وادی اعظم میں آباد تھا اور اُس کا ہم رشتہ قبیلۂ عذراء اسکی نواح میں بسا ہوا تھا - قبیلۂ عذرا کے افراد عاشق مزاجی میں مشہور ہیں بنی کلب ریگستان شام میں آباد تھے اور قبیلۂ بلی شمالی حجاز میں - حضرت عمرؓ کے عہد میں بلی اور جہنیہ کی بڑی بڑی جماعتیں مصر میں جاکر آباد ہوگئی تھیں -

شمالی عربی قبائل اپنے اسلاف کے نام پر نزاری یا معدی کہلاتے ہیں - معدی کی نسبت روما کی تاریخ میں مذکور ہے کہ وہ قبائل کا ایک مجموعہ تھا اور نزاری کا پتہ ۳۲۸ء کے کتبہ سے چلتا ہے جسکو وسود نے النمارہ میں (حوران کے مشرقی جانب) صفا کے نواح میں دریافت کیا تھا - اس کتبہ سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ امرءالقیس بن عمروؓ بادشاہ عرب نے اسد اور بنی نزار پر حکومت کی تھی - اس کتبہ میں ایاد کے قبیلہ کا نام مذکور نہیں ہے جو کسی زمانہ میں بہت طاقتور تھا مگر اسلام سے قبل ہی معدوم ہو چکا تھا - قبیلۂ ایاد دو بڑی جماعتوں میں منقسم تھا - ایک کو ربیعہ کہتے ہیں اور دوسرے کو مضر - یہ دونوں گروہ عہد اسلام سے قبل ہی فنا ہو چکے تھے - نیز یہ دونوں حکمراں قبیلے تھے جو عراق عرب کو نقل وطن کر کے چلے گئے تھے، جہاں ان دونوں قبائل کے نام پر دو صوبوں کے نام بہت عرصہ تک قائم رہے - ایک صوبہ کا نام تو دیار ربیعہ تھا جو دریائے دجلہ پہ آباد تھا، اور دوسرے صوبہ کا نام تھا دیار مضر جو دریائے فرات پر واقع تھا - بعد میں ان صوبوں پر بنی تغلب اور بنی نمیر کے قبائل قابض ہوگئے تھے -

عنزہ اور اُسکے قریبی رشتہ دار قبیلۂ اسد کے افراد جو وادی رمہ کے شمال میں ایک دوسرے کے قریب قریب آباد تھے قبیلۂ ربیعہ سے متعلق ہیں - بصرہ سے مدینہ کو جو زائرین کی سڑک جاتی ہے وہ اُنکے علاقہ میں سے ہوکر جاتی تھی - زمانۂ قدیم میں عنزہ کے افراد، قضاعہ کو عرب سے نکال کر یہاں برسرحکومت رہے ہیں اور سترہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں اُنھوں نے قریب قریب

تمام ریگستان شام کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا تھا - شمال مشرق میں بنو ساعدہ اور مغرب میں قبیلۂ رلہ کے افراد آباد تھے اور یہ دونوں قبیلے عنزہ سے متعلق تھے - عراق میں قبیلۂ اسد کے افراد اتبک موجود ہیں - اس قبیلہ سے وائل کا قریبی رشتہ ہے - وائل کی دو مشہور جماعتیں ہیں - ایک کو بکر کہتے ہیں اور دوسری کو تغلب - کلیب، وائل کے افراد پر حکمراں تھا، اسکے قتل کی وجہ سے بکر اور تغلب میں جو جنگ ہوئی اُس نے ان دونوں قبائل کو فنا کر دیا - چنانچہ بکر اور تغلب اپنے حلیف قبیلۂ نمیر کو لیکر عراق عرب کو نقل وطن کر کے چلے گئے تھے - بکر تو شمالی حصہ میں جاکر آباد ہوے تھے جو انکی وجہ سے دیار بکر کہلایا - صدر مقام آمد اتبک اسی نام سے مشہور رہے - تغلب اور نمیر جنوبی علاقہ میں آباد ہوے تھے - یہ لوگ عیسائی تھے اور اس وجہ سے انکو عہد اسلام میں دوگنا جزیہ ادا کرنا پڑتا تھا - دوسرے قبائل میں بنو حنیفہ، یمامہ کے امراء اور وہ قبیلے جو شیبان کے پڑوس میں آباد تھے، بکر بن وائل سے متعلق ہیں - نیز عبد القیس کے افراد جو بحرین میں آباد تھے کہا جاتا ہے کہ یہ بھی قبیلہ ربیعہ میں شامل تھے -

مضر کے گروہ میں ابتداءً سب سے ممتاز قبیلۂ قیس ہوا - اس قبیلہ نے ایسی شہرت پائی تھی کہ اکثر تمام غیر یمنی عرب بھی اس قبیلہ سے متعلق کہلانے لگے تھے - اسوقت دریاے فرات پر قیس ایک چھوٹے سے نیم چرواہوں کے قبیلہ کا نام ہے جو حاکم شمر کو خراج ادا کرتا ہے - اس قبیلہ کے مشرقی جانب عدوان کا قبیلہ آباد ہے اور یہ بھی حاکم شمر کا ماتحت ہے - پہلے اس قبیلہ کے افراد فہم کے قریب آباد تھے اور ہذیل کا قبیلہ جنوبی حجاز میں آباد تھا - ہوازن اور سلیم کے قبائل بھی قیس ہی کے قبیلہ سے ہیں جو نجد کے مغربی حصہ سے لیکر مکہ اور مدینہ کے مشرقی علاقہ تک قابض و متصرف تھے - تیسری صدی ہجری (نویں صدی عیسوی) کے اوائل میں قبیلۂ سلیم اور انکے پڑوسی ہلال کے افراد کثرتِ تعداد کی بنا پر ایسے ضرر رساں، اور مقدس مقامات کے لیے اس قدر خطرناک ہوگئے تھے کہ جبراً انکو مطیع کرنا پڑا تھا - چنانچہ ان دونوں قبائل نے مصر کو نقل وطن کرنے کا فیصلہ کر کے پہلے تو دریاے نیل کے دوآبہ میں جاکر آباد ہوے پھر وہاں سے انکو شمالی مصر میں جبراً بھیجا گیا تھا - پھر ۴۴۲ھ ہجری میں انھیں فی کس ایک اونٹ اور ایک دینار دیے جانے کی ترغیب دیکر دریاے نیل کے پار شمالی افریقہ میں آباد کیا گیا تھا - ... افریقہ کے بدوی عرب اکثر اپنے آپ کو انھیں دو قبیلوں کی نسل سے ہونے کے مدعی ... تک وسطِ عرب میں موجود ہیں - اس قبیلہ کے افراد امیر بن صعصعہ کے ... تھے - جس سے

کلاب، قشیر اور عقیل کے افراد بھی علاقہ رکھتے تھے۔ قبیلہ عقیل نجد میں اب تک مشہور و معروف قبیلہ ہے۔ شام سے بغداد کو جو کاروان جاتے ہیں اُنکے لیئے زیادہ تر اونٹ اور حفاظتی دستے یہی قبیلہ مہیا کرتا ہے۔ عقیل کا ایک خاندان منتفق کہلاتا ہے جو چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) میں بھی طاقتور تھا اور اب بھی ہے۔ ان کا علاقہ دریائے فرات کے زیریں حصہ میں ہے۔

قبیلۂ غطفان بھی قیس کی ایک شاخ ہے۔ جماعت قیس کے دو خاص قبیلے عبس اور ذبیان باہمی جنگ کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ان قبیلوں میں یہ جنگ گھوڑدوڑ کے دو گھوڑوں کے سبب سے ہوئی تھی جو "داحس اور غبرا کی لڑائی" کے نام سے مشہور ہے۔ ذبیان کی خاص شاخ فزارہ تھی۔ ضبہ اور تمیم کے قبائل بھی مضر سے متعلق تھے جو نجد کے ان علاقوں میں آباد ہو گئے تھے جن میں پہلے بکر اور تغلب جا کر آباد ہوے تھے۔ تمیم کا بڑا قبیلہ تھا اور اُسکے افراد ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ اس نام کے خالص بدو اب عرب میں موجود نہیں ہیں (گو تھوڑے سے دریائے دجلہ کے زیریں علاقہ میں آباد ہیں) تاہم نجد کے شہروں میں آبادی کی بیشتر تعداد اپنے آپ کو اس قبیلہ سے بتاتی ہے۔ نجد میں بڑے بڑے بدوی قبائل آباد ہیں جو تمام و کمال قبیلۂ مضر سے ہیں۔ ان میں قبیلۂ حرب (مزنیہ) کے افراد حجاز کے مشرق میں دونوں مقدس شہروں کے درمیان والی سڑک پر آباد ہیں۔ انکے مشرق میں عتیبہ کا طاقتور قبیلہ آباد ہے ان دونوں قبائل کو وادی رمہ ایک کو دوسرے سے جدا کرتی ہے۔ ان قبائل کے مشرق کی طرف مطیر کا قبیلہ آباد ہے۔ یمامہ کے مشرق میں بنو خالد بسے ہوئے ہیں اور یہ بھی مضر سے متعلق ہیں۔ وہابیوں کے عہد میں انکی شہرت جاتی رہی۔ قبیلہ ہذیل کے افراد بھی بالآخر قبیلہ مضر سے متعلق ہیں۔ ہذیل کے لوگ زمانۂ قدیم سے مکہ کے قرب و جوار کے پہاڑوں میں آباد چلے آرہے ہیں اور قبیلہ کنانہ بھی قبیلۂ مضر کی ایک شاخ ہے۔ کسی زمانہ میں کنانہ جنوبی حجاز کا بہت طاقتور اور مشہور قبیلہ تھا اور اس سے قریش کا قدیم حکمراں قبیلہ بھی متعلق ہے۔

اسلامی فتوحات نے بدوی دنیا کی کایا پلٹ کر دی تھی۔ بدو لوگ جنگ کے لیے بہت مضبوط فوجی دستے فراہم کیا کرتے تھے اور جب عراق اور شام میں پہلے پہل بڑی بڑی فوجی چھاؤنیاں قائم کی گئیں تو ان فوجی مرکزوں کی امداد کے لیے مشرق اور مغرب میں دوسری چھاؤنیاں بھی قائم کر دی گئی تھیں جہاں بدووں کے اور امدادی فوجی دستے بھیجے جاتے تھے۔ اس بنا پر بعض قبائل ایسے کمزور ہو گئے کہ دوسرے قبیلوں میں شراب ہو کر وہ عرب میں اپنی خود مختاری کو کھو بیٹھے۔
ربیعہ اور مضر کے قبیلوں میں نسلاً بعد نسل سے اس درجہ دشمنی چلی آرہی تھی کہ ربیعہ کے افراد

قبیلۂ مضر کے خلاف اکثر یمنی قبائل سے طالب امداد ہوا کرتے تھے۔

قبیلۂ ہتیم کے افراد کو، جو حجاز اور نجد میں منتشر طور سے آباد ہیں، خالص عربوں میں شمار نہیں کیا جاتا۔ یہ لوگ بہت اچھے شکاری ہیں، جانوروں کے چھوٹے چھوٹے گلّے رکھتے ہیں اور اُن میں اکثر لوہار کا پیشہ بھی کرتے ہیں۔ اس قبیلہ سے شرارات کے افراد کو بھی منسوب کیا جاتا ہے جو ریگستانِ شام کے جنوب و مغرب میں آباد ہیں اور سواری کے اونٹوں کو پرورش کرنا انکا پیشہ ہے۔ انکے علاقہ سے آگے بڑھ کر صلیب کے افراد "ریگستان کے خانہ بدوش" بسے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ کسیرے ہیں اور کم وبیش شکاری بھی۔ سواری گدھے پر کرتے ہیں۔ قدیم عربی ادب میں ان کا مطلق ذکر نہیں کیا گیا۔

ایک شریف بدوی ہنر کو نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اُسکے خیال میں جانوروں کو پرورش کرنا، تجارت کرنا، شکار کرنا ایسے پیشے ہیں جو انسان کو اختیار کرنا چاہییں۔ زراعت اور جہازرانی کو بھی وہ قابل توجہ نہیں سمجھتا۔ تمیم کے افراد ازد کے قبیلہ کے لوگوں کو اکثر حقارت سے "ملاح" کہا کرتے تھے اس لیے کہ اُنکے خویش و اقارب عمان میں ملاحی کا کام کیا کرتے تھے۔ قریش بھی مدینہ والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا کرتے تھے اس لیے کہ اہل مدینہ زراعت پیشہ تھے۔ بدوؤں کی خاص خوراک دودھ ہے۔ دودھ کو پکا کر وہ اکثر دہی کے مثل جما لیا کرتے ہیں۔ جو پانی ملانے سے پھر اپنی اصلی صورت میں آجاتا ہے۔ اس قسم کا منجمد دودھ سفر میں بہت کارآمد ہوتا ہے۔ مکھن کو صاف کرکے اسی طرح رکھتے ہیں۔ عام طور پر یہ بات مشہور ہے کہ بدوؤں کو پنیر بنانا نہیں آتا۔ بدو لوگ سوائے اُن مواقع کے جبکہ اُنکو جانور مجبوراً ذبح کرنا پڑیں، اور وہ صرف دعوت یا مہمانوں کے لیے جانوروں کو ذبح کیا کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ خوشحال بدو شیخ کے پاس اکثر و بیشتر مہمان آتے رہتے ہیں اس لیے اُسکے گھر والوں کو روزانہ گوشت کھانے کو مل جاتا ہے۔ مکھن، اونٹ، اور بکروں کے اُون سے بُنے ہوئے کپڑے اور خاص کر اُس مقام کے جانور اور گھوڑوں کو (جہاں وہ پرورش کیے جاتے ہیں) بدو لوگ بازار میں لاتے اور اُنکا تبادلہ کھجور، غلّہ، کپڑوں اور گھر کی روزمرہ کے استعمال کی چیزوں سے کرکے لے جایا کرتے ہیں۔ اب کافی اور تمباکو کا استعمال بدوؤں کے لیے ناگزیر ہو گیا ہے۔ پُرانے سے پُرانے خیال کے لوگوں کو بھی دُنیا کی موجودہ روش کا ساتھ دینا پڑتا ہے   کمان کی جگہ اب بندوقوں نے لے لی ہے۔ جب تک وہابی لوگ برسر   ت میں تمباکو نوشی کی سخت ممانعت رہی۔

بدوؤں نے تجارت میں بڑے پیمانہ پر صرف قافلوں سے۔ یہ اونٹوں کی فراہمی اور دشمن

کے حملوں سے اُنکو محفوظ رکھنے کی حد تک، حصہ لیا تھا۔ اس خدمت کے لیے انکو معاوضہ ملا کرتا تھا۔ اب بھی طاقتور بدوؤں کو، جو شاہ راہوں پر آباد ہیں حکومت کی طرف سے "تھیلیاں" یا معاوضہ ملا کرتا ہے۔ شہری لوگ جو اِن بدو قبائل کے علاقہ میں سفر کرتے ہیں تو انکو (Brotherhood) "اخوۃ" کا عہد و پیمان ان بدووں سے لازمی طور پر روپیہ کے ذریعہ قائم کرنا پڑتا ہے۔ کمزور قبائل کو بھی اپنی حفاظت کے لیے اس "اخوۃ" کو مول لینا پڑتا ہے۔

شکاری کتوں اور شکروں کے ذریعہ زیادہ شکار کھیلا جاتا ہے۔ بڑے شکاروں میں یہاں ہرن، پہاڑی بکرے، جنگلی ہرن (جنکے وزنی اور سیدھے سینگ ہوتے ہیں) اور صحرائی گدھے ہوتے ہیں۔ عرب لوگ جنگلی گدھے کا خاص طریقے سے شکار کرتے ہیں۔ یہ جانور بہت تیز رفتار ہوتا ہے۔ ہر شخص کا یہ ہی مقصد ہوتا ہے کہ خاص طور پر جنگلی گدھے ہی کا شکار کرے۔ چھوٹے شکاروں میں چند قسم کے تیتر، خرگوش، اور ایک قسم کی چھپکلی (گوہ) ہوتی ہے جسے ضب کہتے ہیں۔ شتر مرغ کا شکار خاص طور سے ہتیم اور صلیب کے افراد کرتے ہیں۔ یہ جانور اب عرب کے شمالی ریگستان میں رفتہ رفتہ ناپید ہوتا جا رہا ہے۔

حملہ آور ہونا، بدووں کی زندگی کا ایک لازمی جزو ہوتا ہے۔ چنانچہ بنی امیہ کے ابتدائی زمانہ میں ایک شاعر القطامی نے کہا ہے کہ "ہم حملہ کر بیٹھتے ہیں ضباب (مضاریوں) کے خیموں پر اور پھر انکو وہی واقعات پیش آجاتے ہیں جنکو آنا چاہیے اور بعض وقت ہم ٹوٹ پڑتے ہیں بکر (بن وائل) پر جو ہمارے ہی بھائی ہیں۔" ہمیشہ سے یوں ہی ہوتا چلا آرہا ہے اور اب بھی ایسا ہی ہوتا رہتا ہے۔ بدووں کا خاص مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی قبیلہ کے اونٹ، عورتوں اور بچوں کو پکڑ لیجائیں، اگر دشمن کے ہوں تو سب سے بہتر ہے اور جہاں تک ممکن ہو خونریزی نہ کی جائے تاکہ انکے قتل سے لڑائی نہ پیدا ہو۔ عورتیں اور بچے رہا کیے جاسکتے ہیں، مال غنیمت کو مقررہ قوانین کے مطابق آپس میں تقسیم کر لیا جاتا ہے۔ شیخ کو چونکہ قبیلہ کی عظمت قائم رکھنی پڑتی ہے اور اسکے لیے ذرائع بھی بھرپور ہونے چاہییں اس لیے اسکو بڑا حصہ ملتا ہے۔ برخلاف اسکے لٹے ہوئے قبیلہ کے افراد کو نقصان کی تلافی کرنی پڑتی ہے اور اس نقصان کی تلافی میں شیخ سے زیادہ حصہ کی توقع ہوتی ہے۔ خصوصاً انھیں حملوں کے لیے گھوڑوں کو تربیت دی جاتی ہے۔ حملہ میں حصہ لینے والے افراد اونٹوں پر سوار ہوتے ہیں، لڑائی یا پسپائی کے وقت گھوڑوں پر سواری کیجاتی ہے۔ ایک اچھا گھوڑا اپنے آقا کے لیے باعثِ فخر ہوتا ہے لیکن اُسکے لیے زیادہ خرچ برداشت

کرنا پڑتا ہے ۔ یہ بات صرف اس واقعہ ہی سے سمجھ لو کہ اُسکو ہر وقت اپنے گھوڑے کے لیے لازمی طور پر افراط سے پانی مہیا رکھنا پڑتا ہے ۔ قزاقانہ تاختیں بالکلیہ ریگستان کے باشندوں کے افلاس کے خاص اسباب میں سے ایک سبب ہیں ۔ یہ لوگ اکثر دُور دراز کے مقام پر حملہ آور ہوتے ہیں، اس لیے انسانوں اور جانوروں کو یہاں تک کا سفر تھکا دیتا ہے ۔ جب وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو پھر وہ گھر کی طرف، دشمن کے تعاقب سے بچنے کے لیے بے تحاشہ بھاگتے ہیں۔ اس طریقہ سے نہ صرف حملہ آور بلکہ غنیمت میں آئے ہوئے انسانوں اور جانوروں کا بھی بہت نقصان ہوتا ہے ۔ اگر تعاقب کنندگان اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں تب بھی اُنکو اور اُنکے جانوروں کو جلد جلد منزلیں طے کرنے میں نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے ۔ نیز ان خوش قسمت افراد کو دوسری طرف سے بھی حملہ ہونے کا خوف لگا رہتا ہے ۔ ان اسباب کی بنا پر ایک کمزور قبیلہ کو مجبوراً کسی طاقتور قبیلہ میں شریک ہو جانا پڑتا ہے ۔ ان حملوں کے نتائج اکثر خطرناک بھی ہوتے ہیں مثلاً اگر خونبہا ادا نہ کیا جائے یا کوئی قبیلہ اسکو منظور نہ کرے تو پھر خون کا بدلہ لینے کے لیے جنگ چھڑ جاتی ہے جس سے پورا قبیلہ فنا ہو جاتا ہے ۔

کسی قبیلہ کا سید (آقا) یا شیخ (بڑا، گو یہ اکثر جوان آدمی ہوتا ہے) اپنے قبیلہ کے سیاہ و سپید کا قطعی ذمہ دار ہوتا ہے ۔ اسکے عہدہ یا رتبہ کا سلسلہ موروثی نہیں ہے ۔ جب تک اُسکے لڑکے قابلیت اور دولتمندی میں بڑھے ہوئے رہیں اُسوقت تک یہ عہدہ اُسی کے خاندان میں رہتا ہے ۔ قاعدہ کے مطابق، لڑائی کے وقت، امیر قبیلہ فوج کا افسر یا قائد ہوتا ہے ۔ قائد کو اب عام طور پر عقید کہتے ہیں ۔ امیر کا خطاب صرف حاکم صوبہ کے لیے مخصوص ہے مثلاً حاکم شمر ۔ علاوہ اس کے شیخ، منصف یا قاضی بھی ہوتا ہے اور اُسکا عہدہ عموماً موروثی ہوتا ہے ۔ مروجہ قانون کے مطابق فیصلہ کیا جاتا ہے جو شریعت اسلامی سے اس حد تک مطابقت کرتا ہے کہ شریعت اسلامی کی قانونِ رائج الوقت سے مطابقت ہو جائے ۔ لیکن چونکہ شیخ صرف مشورہ دیتا ہے، وہ کوئی حکم صادر نہیں کرتا اس لیے قاضی کا فیصلہ صرف اخلاقی حکم کی نوعیت رکھتا ہے ۔

قبیلہ کے استحکام اور پورے قبیلہ کے ہر واحد رکن کی   نظر رکھ کر، امیر قبیلہ کو
نگرانی کے لیے ایک قسم کی پولیس بھی رکھنی پڑتی ہے ۔ اگر قبیلہ   حرکت کر بیٹھے جو
قبیلہ کے لیے ناقابل برداشت ہو، یا یہ کہ وہ اپنے ہی قبیلہ   اسکو قبیلہ سے خارج
کر دیا جاتا ہے اور اگر کوئی دوسرا قبیلہ اُسکو جگہ نہ دے تو پھر   میں رہتا ۔ قبیلہ کے

استحکام اور اُسکے قیام و ترقی کے فرائض میں حتی الوسع دلچسپی رکھنے کے احساس کو عصبیہ کہتے ہیں۔ افسوس ہے کہ یہ احساس فرقہ واری جھگڑوں میں منتقل ہو جاتا ہے۔ ایک شخص کے انتہائی تخیل کے حد تک بدو لوگ معاملہ کے بہت پکے اور قابل اعتماد ہوتے ہیں۔ مذہب کے معاملہ میں یہ لوگ نہ صرف بے پروا بلکہ غافل اور بے اعتقاد بھی ہیں۔ جس مقام پر وہابیوں کا تھوڑا سا بھی اثر رہا وہاں کم از کم بیرونی طور پر احکام اسلامی کی تعمیل کی جاتی رہی مثلاً جس طرح اب نجد میں کیجاتی ہے برخلاف انکے مستقل طور پر سکونت رکھنے والے عرب مذہبی ہیں اور اُن میں آسانی سے مذہبی جوش پیدا ہو جاتا ہے۔

بدوؤں کے اکثر ایک ہی بیوی ہوتی ہے۔ جب پہلی بیوی بانجھ ہو جاتی ہے تو حسب قاعدہ وہ دوسری کر لیتے ہیں۔ مگر پہلی بیوی کو طلاق دینا پسند نہیں کرتے۔ شیوخ کے اکثر تین یا چار بیویاں ہوتی ہیں۔ اکثر وہ اتنی بیویاں سیاسی وجوہ سے کر لیتے ہیں تاکہ با اثر خاندان سے انکا تعلق رہے اور بعض اوقات عورت کو پرورش کی خاطر بھی اپنے نکاح میں لے آتے ہیں مگر ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے۔ لڑکیوں کی اکثر بارہ برس کی عمر میں شادی کر دی جاتی ہے۔ اسوجہ سے، اور چونکہ عورتیں بچے کو دو یا تین برس تک دودھ پلاتی رہتی ہیں، جلد بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ علاوہ اسکے انکو کام بھی بہت کرنا پڑتا ہے مثلاً وہ جلانے کا ایندھن فراہم کرتی اور پانی بھر کر لاتی ہیں، جانوروں کا دودھ نکال کر مکھن بنانا پڑتا ہے، عموماً کھانا پکاتی ہیں خیمے، کمبل اور کپڑے بُننے پڑتے ہیں۔ اُن سے ذرا دولتمند عورتیں نوکروں سے گھر کا کام کاج کراتی ہیں، تاہم بدوی عورتوں کی حالت شہری عورتوں سے بہت بہتر ہوتی ہے اس لیے کہ بدوی عورت آزادانہ طریقہ سے زندگی بسر کرتی اور عموماً اُسکی عزت کی جاتی ہے۔ قبیلہ کی نیک عورت (کریمہ) کو لوگ بہت عزیز رکھتے ہیں۔ بڑی بوڑھی عورتوں کو ضروری معاملات کے فیصلہ میں کافی دخل رہتا ہے عام طور پر برقع نہیں اوڑھا جاتا۔ بچوں کو بہت ہی سادہ طریقہ سے پرورش کیا جاتا ہے لیکن غیر تربیت یافتہ سے غیر تربیت یافتہ قبائل کے بچے بھی اپنے ماں باپ کے فرماں بردار اور اپنے سے بڑے کا احترام کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔

تمام مسافر متفقہ طور سے اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ بدوؤں میں قدرتی طور سے عظمت پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ خلیق اور تربیت یافتہ ہوتے ہیں اور عام طور پر فیاض۔ یہ ہی انسانی برتری کا راز ہے اور اسکو عرب لوگ مروہ (نیکی) کہتے ہیں۔ مالِ غنیمت کے حاصل کرنے

میں تو یہ لوگ بہت تیز ہیں مگر چوری انکی نظر میں جرم ہے - بدو، مہمان نواز ہوتے ہیں گو اکثر اسوجہ سے بھی مہمان نوازی کرتے ہیں کہ انکے مہمان انکی تعریف کیا کریں - ایک دولتمند عرب کا انتہائی نقطۂ خیال یہ ہوتا ہے کہ وہ مشہور و معروف آدمی بنجائے، لوگ اُسکو شریف کہکر ہر جگہ اُسکی تعریف میں رطب اللساں ہوں، اُسے بہادر اور فیاض مشہور کریں، ہر شخص اُس سے ڈرے اور اُسکی تعریف کرے۔

ریگستان کے اطراف کی تمام ریاستیں بدوؤں کے نواح سے ہر وقت خطرے میں رہتی ہیں - ان ریاستوں کو قوی بننا پڑتا ہے تاکہ بدووں کو اُنکے علاقہ میں بلا اجازت آنے کی جرأت نہ ہو - اگر یہ ریاستیں کمزور ہیں تو اُنکو امن و امان خریدنا پڑتا ہے، اور اگر اُنھوں نے ایسا نہ کیا تو پھر بدو لوگ لازمی طور پر انکی سرحدوں کو عبور کر کے ملک کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ ان حالات میں مزروعہ زمینوں کے بڑے بڑے رقبے پھر چراگاہیں بن جاتی ہیں - مثلاً جس طرح اسوقت عراق کا بڑا حصہ اور دریائے دجلہ کے آگے کے علاقے چراگاہیں بنے ہوئے ہیں - یا یہ ہوتا ہے کہ سرحد پر پھر عربوں کی نئی حکومتیں قائم ہو کر تدمر اور حیرہ کی قدیم حکومتوں کے مانند یا شام والی غسانیوں کی حکومت کی طرح، متمدن سلطنتیں بن جاتی ہیں - یا ایسی سلطنت قائم ہو جاتی ہے جیسی کہ بنی لخمیون کی حکومت، عراق میں، عہد اسلامی سے کچھ زمانہ قبل قائم ہوئی تھی - عرب کے اندرونی علاقہ میں، وہابیوں نے اپنی سلطنت میں اچھا نظم و نسق قائم کر لیا ہے - حاکم شمر کا نجد اور ریگستان کے جنوبی حصہ میں بدووں پر اچھا خاصا اثر ہے - سرحدی علاقوں میں بدو لوگ عموماً نصف خانہ بدوشی کی حالت میں ہیں - وہ یا تو چرواہے ہیں یا جانوروں کو پرورش کرنا اُنکا پیشہ ہے، اب بالآخر اُنھوں نے زراعت کا کام بھی شروع کر دیا ہے - یہ اُلٹی ترکیب کہ کاشتکار خانہ بدوش بھی ہو جاتے ہیں بہت ہی کم واقع ہوتی ہے اس لیے کہ ریگستان میں انکی زندگی بہت ہی مشکل سے بسر ہوتی ہے اور اور اُنکو نقصان بھی بہت برداشت کرنے پڑتے ہیں - واقعہ یہ ہے کہ ریگستان میں تو صرف بدو لوگ ہی رہ سکتے ہیں جنکو قدرت نے ایسا ہی بنایا ہے -

دوسرے قبائل کے ساتھ متحد ہو کر، تعلقات کو مضبوط و مستحکم کرنے کا خیال عام طور پر پیدا ہوتا ہے مگر اسکی تکمیل نہیں ہوتی - اس لیے کہ ایک ہی قبیلہ ... نہیں رہتا - صاحبِ حکومت کو اس وجہ سے بہت آسانی سے موقع مل جاتا ہے ... میعاد مقررہ کے اندر ان سرکش قبائل کو یکے بعد دیگرے مفتوح و مغلوب کر ... ناقی کی وجہ سے وہ کسی مشترکہ مہم کو سر کرنے کے لیے اپنی اپنی فوج سے ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے - مسلمہ خرابیاں

جو استحادِ عمل سے بآسانی رفع ہو سکتی تھیں، سالہا سال تک باقی رہتی ہیں اور پھر لوگ خود خدا کی مرضی پر چھوڑ دیتے ہیں۔

عربوں کا باورچی خانہ بہت سادہ ہوتا ہے۔ پہلے انکی روزمرہ کی خوراک، آٹے کا مرکب یا بھنا ہوا اناج اور کھجور یا دودھ کا مرکب ہوتا تھا۔ لیکن اب وہ عموماً ہرغول (فارسی لفظ ہے) کھاتے ہیں۔ یہ بھنے ہوے گیہوں یا ہندوستانی اناج کا ہوتا ہے۔ اسکو پانی میں ڈال کر اُبال لیتے ہیں۔ جب کوئی معزز مہمان آتا ہے تو وہ اس کھانے کے اوپر مکھن، گھی، یا کچا دودھ ڈال دیتے ہیں۔ یا بعض وقت پکا ہوا گوشت بھی اُسکے اوپر رکھدیتے ہیں۔ گیہوں کی بہت پتلی روٹیاں پکائی جاتی ہیں۔ دودھ بہت پیا جاتا ہے۔ حصول فرحت کی خاطر کچا دودھ بھی پیتے ہیں۔ بہت سے عربوں کی خاص خوراک کھجور ہے۔

عربوں کا لباس بھی بہت سادہ ہوتا ہے۔ غربا، صرف قمیص پہنتے اور اُسکے اوپر پٹی باندھکر عبا پہن لیتے ہیں۔ ذرا متمول عرب قمیص (جو ایک قسم کی کتان ہوتی ہے) پہنتے ہیں۔ جاڑوں میں اسکے اوپر دھاریدار صدری پہنی جاتی ہے۔ اکثر لوگ اس کے بجاے پوستین پہنتے ہیں۔ غریب لوگ عمامہ باندھتے ہیں جسکا نام کوفیہ ہے (اب عموماً اسکا تلفظ کفیہ کیا جاتا ہے) یہ کفیہ بالعموم سر پر باندھا جاتا ہے یہ ایک کپڑے کا ٹکڑا ہوتا ہے جو کالے فیتہ کے ساتھ باندھا جاتا ہے۔ عرب پاجامہ نہیں پہنتے صرف متمول عرب جوتے اور زیرجامہ پہنتے ہیں۔ پانی عموماً کمیاب ہے اس لیے کپڑے نہیں دھوئے جاتے۔ پانی کی قلت کی وجہ سے عرب لوگ پابندی سے اپنے جسم کو نہیں دھو سکتے۔ جب کسی عرب کو کوئی تالاب مل جاتا ہے تو سب سے پہلے وہ نہاتا ہے لیکن چونکہ ایسا واقعہ کم پیش آتا ہے اسلیے شریعت اسلامی نے ریگستان کے باشندوں کو پانی نہ ملنے کی صورت میں مٹی سے تیمم کرنے کی اجازت دیدی ہے۔

ہر قبیلہ اپنے اونٹوں کی پہچان کے لیے ایک خاص علامت مقرر کر دیتا ہے جس سے ہر شخص اُنکو شناخت کر لیتا ہے۔ اسی قسم کی علامت اکثر قبیلہ کے علاقہ کی شناخت کے لیے چٹانوں پر بنا دی جاتی ہے۔ جو عرب لکھنا جانتے ہیں وہ اس علامت کے قریب اپنا نام کچھ اضافی عبارت کے ساتھ یا فقط نام لکھ دیتے ہیں۔ پہلے عرب مصوری کرتے تھے مگر اسکو دیکھ کر اُنکی ذہانت کے متعلق کوئی اعلیٰ درجے کی رائے قائم نہیں ہوتی۔ نہ انھوں نے فن تعمیر کو اعلیٰ پیمانہ پر حاصل کیا۔ البتہ عربوں نے فن زیبائش میں بہت زیادہ کمال حاصل کیا اور فن موسیقی کی طرف بھی متوجہ ہوے تھے مگر اسلام نے اسکو اچھا نہیں بتایا ہے۔ یہ لوگ تقریر کے مالک ہوتے ہیں اور اس فن میں

اس ورجہ بڑھے ہوئے ہیں کہ اپنا جواب نہیں رکھتے

تاریخ قدیم | عرب کے متعلق عہد اسلامی سے قبل اور اس سے بھی بہت پہلے یعنی عہد مسیحی سے بھی قبل ہمیں جو کچھ علم ہے وہ قدرتی طور سے دو خاص حصوں میں منقسم ہو جاتا ہے۔ ایک حصہ کا خاص تاریخی واقعات سے تعلق ہے اور دوسرے کا غالبًا تمدن اور مذہب ہے۔

تاریخی حیثیت سے ہمیں جو علم ہے، وہ کچھ تو ملک کے کتبات سے معلوم ہوا ہے، کچھ معاصرین کی ان اطلاعات سے جو وہ ادبیات میں تحریر کر گئے، کچھ دیگر اقوام کی دیگر یادگاروں (مثلاً بابلی، اسیری، مصری، عبرانی، یونانی اور رومانی) سے اور کچھ (بعثت نبوی سے قریب ہی قبل کی صدیوں کے واقعات سے متعلق) عہد اسلام کی ابتدائی روایتوں سے بھی معلوم ہوا ہے۔ اگر (معلومات کے متعلق) ہمارے ذرائع زیادہ مکمل ہوتے اور خصوصًا علم تواریخ زیادہ قابل یقین ہوتا تو پھر ہم ایک ہزار برس قبل مسیح کے بعد سے یا اس سے بھی پہلے کے زمانہ سے غالبًا ایسی تصویر پیش کرتے جو کم و بیش تاریخی معلومات سے پُر ہوتی لیکن ہم کو یہ بات بھی یقینی طور پر معلوم نہیں ہے کہ ہم جنوبی عرب کے بہت سے کتبات کی گذشتہ تاریخ کے متعلق کہاں تک لکھ سکتے ہیں۔

عہد مسیحی سے دو ہزار برس سے بھی قبل کے بابلی کتبوں میں ایک بادشاہ کا نام منیم (مَنِ یُم) لکھا ہوا ہے جو (Magan) یا مشرقی عرب کا بادشاہ تھا۔ (اسکے نام کی زیادہ مکمل صورت منو۔ دنو بھی ہے)۔ اس خیال کے متعلق زیادہ تر یہ کہا جا سکتا ہے کہ (Magan) سمیری زبان کا لفظ تھا جسکو عربی میں معان بنا لیا گیا اور یہ کہ اسی مرکز سے (ایک ایسے زمانہ میں جس کا ہمیں علم نہیں) معان والی جنوبی عربی سلطنت قائم ہوئی تھی (جو بعد میں معین کے نام سے مشہور ہوئی تھی) یا ممکن ہے کہ یہ معینی سلطنت ہو، جس نے غالبًا شروع ہی میں تمام جنوبی عرب کے علاقہ کو (بشمول قتبان اور حضرموت) اپنی مملکت میں شریک کر لیا ہو۔ اسکے علاوہ ان کتبوں میں مَلُخ ("می) ایک علاقہ کا بھی ذکر ہے جو اس ریاست سے آگے واقع تھا اور اس علاقہ میں غالبًا وسطی اور شمالی عرب شامل تھا۔ مَلُخ کے علاقے نیز سرزمین (Magan) سے سمیریوں نے (تقریبًا ۲۳۵۰ قبل مسیح میں) لکڑی، پتھر، اور دھاتیں بڑی مقدار میں اپنے مندروں کی تعمیر کے لیے منگائی تھیں۔ ہربرٹ گرم نے مَلُخ کے نام کی نسبت لکھا ہے کہ عملیق سے ماخوذ ہے

(جو مفرد نام عملوق کی ناموزوں جمع ہے)۔ اُسکا یہ خیال تھا ... ہوتا۔

جنوبی عرب کے کتبات کا آغاز کم از کم ۸۰۰ برس قبل ... لیکن بہت اغلب

ہے کہ اس سے بھی چند صدی پیشتر سے ہو۔ ان کتبات سے زیادہ صحیح معلومات، نہ صرف علم صرف و نحو کے متعلق حاصل ہوتی ہیں بلکہ خصوصاً اصل مضمون کے بارے میں بھی ان سے صحیح واقعات کا پتہ چلتا ہے یعنی نہ صرف ان میں عہد اسلام سے قبل کی تاریخ کے صحیح واقعات مندرج ہیں بلکہ انکو دیکھ کر سامی آثار کے متعلق بھی نئی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ان آثار قدیمہ سے صحیح صحیح واقعات جو گذشتہ نصف صدی تک بہت ہی نایاب تھے (مگر اب ان کے متعلق ہمارے پاس تقریباً دو ہزار کتبے موجود ہیں) سب سے زیادہ ہمیں جو زیف ہالوی اور ایڈورڈ گلیسر کی سائنٹفک تحقیق تلاش سے دستیاب ہوے ہیں۔ یہ کتبات منطقی طور سے دو بڑی جماعتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ صحیح معنوں میں کچھ کتبات تو معینی جماعت سے متعلق ہیں اور کچھ جماعت سبا سے۔ جو کتبے معینی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں ان میں بہت سے کتبے تو نہ صرف شاہانِ معان کے عہد کے لکھے ہوے ہیں (نام کے متعلق اوپر کا بیان ملاحظہ ہو) جن کے صدر مقامات قرناؤ اور یثیل، جوف کے جنوب میں جدا جدا واقع تھے (قرناؤ تو صنعا کے شمال مشرق میں تھا اور یثیل، مأرب کے شمال مغرب میں)۔ بلکہ ان میں شاہانِ قتبان کے عہد کے کتبے بھی زیادہ تعداد میں ہیں جن کو گلیسر نے دریافت کیا تھا اور چند کتبے حضرموت کے ہیں جو اب تک دریافت ہو سکے۔ حضرموت کے دریافت شدہ کتبات کو ساتھ رکھ کر مقام شبوت کو جانا چاہیے، اس لیے کہ یہ اطلاع ملی ہے کہ وہاں اب بھی سیکڑوں کتبات دریافت کرنے کو باقی ہیں۔ یہ مقام حضرموت کا قدیم صدر مقام تھا اور یہاں بغرض تحقیق و دریافت کتبات کوئی اب تک نہیں گیا۔ برخلاف اسکے جو کتبات جماعت سبا سے متعلق ہیں وہ صحیح معنوں میں سبا کے مذہبی بادشاہوں (مکرب یا مکروب یا مُکرِب یا مُکرَّب) کے عہد، تقریباً ۸۰۰ - ۶۵۰ قبل مسیح میں لکھے گئے ہیں (یہ قدیم شاہانِ سبا کا زمانہ ہے اس میں مطلق العنان شاہی کا پہلا عہد بھی شریک کر سکتے ہیں)۔ مطلق العنان بادشاہت کا زمانہ تقریباً ۶۵۰ - ۱۱۵ قبل مسیح تک رہا۔ اس زمانہ میں سرکاری حیثیت سے مأرب کے بادشاہ "شاہ سبا" کا لقب اختیار کرتے رہے۔ انکے بعد کے بادشاہ صرف قتبان اور حضرموت کے بادشاہ رہے بلکہ انکے بعد حمیریوں کا نیا عنصر نمودار ہوا جنھوں نے غالباً پہلے قتبان پر قبضہ کیا اور پھر مأرب لے لئے ہو گئے تھے۔ انکے بادشاہ نے "شاہِ سبا" اور "ذوریدان" کا لقب اختیار کیا تھا جو شاہ تقریباً ایک چھوٹے سے حملہ کے بعد سے جو چوتھی صدی عیسوی کے وسط میں ہوا تھا حکومت کرتے رہے ۳۷۵ عیسوی سے ۵۲۵ عیسوی تک اپنے بڑے خطابات کے ساتھ

یہاں تک کہ وہ اکسومیوں سے مغلوب ہوگئے - ان بادشاہوں کے عہد کے متعلق بھی ہمارے پاس جنوبی عرب کے قدیم کتبات موجود ہیں - خصوصاً سدِ مأرب کے ٹوٹ جانے کا واقعہ ایک بہت ہی قدیم قدیم کتبہ میں لکھا ہوا ہے - اس کتبہ کو گلیسر نے دریافت کرکے شایع کرایا ہے - اسکے سنین ۵۴۳-۵۴۲ء سے مطابقت کرتے ہیں اور یہ کتبہ اس عبارت سے شروع ہوتا ہے :-

"بہ قدرت وفضل وعنایت رحمانی ومسیح وروح القدس، اس کتبہ کو ابرہا، گورنر نے نصب کرایا ہے جو (گورنری پر) متعین تھا منجانب اکسومی بادشاہ رمیس زبیمان (Zubirqaman) شاہ سبا اور ذوریدان اور حضرموت اور یمانت اور اُن عربوں کا جو بلندی اور پستی کے علاقوں میں رہتے ہیں "

اس کتبہ میں اور دوسری باتوں کے علاوہ اُن سفارتوں کا حال بھی لکھا ہے جو شاہ روم، شاہ فارس، شاہ المنذر، شاہ حارث اور بادشاہ ابوکرب نے بھیجی تھیں - عہد نبوی صلعم سے تھوڑے زمانہ قبل جو دو بڑی سلطنتیں تھیں یعنی روم کی مشرقی سلطنت اور مملکت فارس، ان کا ذکر بھی اس کتبہ میں موجود ہے اور ان دونوں حریف قوتوں نے عرب کی سرحد پر حیرہ اور غسانیوں کی حکومتوں کو بطور چوکیوں کے قائم کیا تھا، اُنکا حال بھی لکھا ہے اور ان تمام حکومتوں کے مفاد اور باہمی اتحاد و تعلقات پر بھی پوری پوری روشنی ڈالی گئی ہے -

حبشیوں کے عہد حکومت میں مذکورالصدر ابرہا نے نہ صرف حمیریوں کے آخری فرمانروا ذونواس کو شکست دیکر معزول کیا بلکہ سیدھا مکہ کی طرف اپنے مشہور ہاتھی کو لیے بڑھا ہوا چلا گیا - اسکے بعد تقریباً ۵۷۵ء میں فارس کے بادشاہ خسرو اول نے یمن کو فتح کرکے، اپنے ایک وزیر کو وہاں کا گورنر (حاکم) مقرر کیا تھا - لیکن آخرکار اسلام کی فتحمند قوت کے سامنے یمن بھی فتح ہوگیا تھا - خسرو پرویز ثانی نے فارس کی طرف سے جو آخری گورنر مقرر کیا تھا اُس کا نام باذان تھا - اسنے خسرو مذکور کی وفات (۶۲۸ عیسوی) کے بعد اسلام قبول کرکے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا شہنشاہ تسلیم کرلیا تھا -

حکومتِ سبا کے آغاز کا زمانہ ۷۰۰ قبل مسیح کے زیادہ بعد ... لکھانا چاہیے اس لیے کہ (علم الآثار کے بہت سے نامکمل مواد سے جو واقعی کسی زمانہ ... بادشاہوں کے ناموں کی پہلے تحقیق کرچکے ہیں اُن کا ذکر تو اب یہاں کر بھی نہیں ... وقت میں اکثر باپ، بیٹے، اور بھائی برسر حکومت رہے اس پر بھی ہم کتبوں ... ں کے سلسلے قائم کرسکے

ہیں (اکثر دادا، باپ، بیٹے اور پوتے کے سلسلے میں) اور ہر عہد کے متعلق تاریخی واقعات بھی ہم پہونچا سکتے ہیں لیکن خاص طور پر واقعات قدیم سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ چار ارا کین کی حکومت کا سلسلہ اوسطاً ایک صدی کو پورا کر دیتا ہے۔ لہذا مذکورالصدر تخمینوں (قدیم شاہان سبا کے بعد ۵۰۰ - ۷۰۰ ق م وغیرہ) کو غالباً کم سے کم سنین سمجھنا چاہیے خصوصاً (اور یہ زمانہ واقعی شاہان سبا اور ذو ریدان کے دو سرے دور پر عائد ہوتا ہے) اس وجہ سے کہ ہمیں اب تک تمام بادشاہوں کے ناموں کا پتہ نہیں چل سکا ہے۔ پس بحالت موجودہ اس سے صرف کم یا بیش ناقص نتائج نکل سکتے ہیں۔

اب ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معینیوں کے شاہی کتبات، تاریخ کے کون سے سلسلہ میں سبائیوں کے شاہی کتبات سے مطابقت کرتے ہیں۔ اب سے ذرا کچھ زمانہ قبل ڈی۔ ایچ ملر نے ان دونوں کتبات کے ہمعصر ہونے کے امکان کا خیال ظاہر کیا تھا۔ گلیسر نے اس بات کو تسلیم کیا ہے اور امر واقعہ بھی یہی ہے کہ شاہان معینی کا عہد شاہان سبا سے پہلے گذرا ہے (اور یہ کہ سبا کے پرستار بادشاہوں سے بھی پہلے یہ حکمراں رہے ہیں)۔ ہوگو ونکلر اور راقم الحروف کی تحریر کا ماخذ خصوصاً گلیسر ہی کی کتاب ہے۔ پس یہ ایک قیاس ہے جسکی بنا پر قدرتی طور سے شاہان معینین کی حکومت کے متعلق ذرا زیادہ قبل کا زمانہ (۱۲۰۰ - ۷۰۰ ق م) بیشتر ہی سے فرض کر لینا پڑتا ہے) مگر اسکے باوجود بھی بعد میں ان دونوں کے ہمعصر ہونے کے قیاس کی پھر بہت سے عالموں نے تائید کی ہے۔ اور خاص طور پر ماہر زبان عربی مارٹن ہارٹمین اور مورخ ایڈورڈ میر نے اس قیاس کی حمایت میں زور قلم صرف کیا ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ہارٹمین اب اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ شاہان معینی کا بہترین زمانہ شاہان سبا کے عہد سے پہلے گذرا ہے اور پھر وہ یہ بھی کہتا ہے کہ نہایت قدیم معینی اور سبائی کتبات ایک ہی زمانہ کے ہیں اور اس خیال کی تائید میں بوضاحت لکھتا ہے کہ معینیوں کا ایک کتبہ سبائی کتبہ کا ہم عہد ہے اور اس کتبہ میں یہ مذکور ہے کہ اہل معین، مصر، اشور، اور عبر ہر ان سے خوشبو کی چیزوں کی تجارت کیا کرتے تھے اور اسی کتبہ میں ۵۲۵ قبل مسیح کی اس جنگ کا حال بھی درج ہے جو مصر اور ایک قوم نامی (Mdhy) کے درمیان ہوئی تھی۔ اس نے (Mdhy) قوم کے افراد کو ایرانی بتایا ہے۔

زیادہ سے زیادہ یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ معینیوں کے سب سے پرانے کتبات، سبائیوں کے نہایت قدیم کتبات کے ہم زمانہ ہوں۔ اس اعتبار سے پھر معینی کتبوں میں جنکو دیگر

وجوہ سے بھی سب سے بعد کے سمجھتا ہوں، ایسے سبائی افراد کے متعلق اشارات ملتے ہیں جو پہلے یمن میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ چنانچہ ایک قدیم معینی کتبہ کی عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جماعتِ سبا کے افراد (خولان کے ایک اور دوسرے قبیلہ کے ساتھ مل کر) شمالی یمن میں آوارہ پھرا کرتے تھے یہ لوگ اس عام سڑک پر چلنے والے معینی قافلوں پر حملہ کر دیا کرتے تھے جو Ragmah (نجران) اور معان کے درمیان تھی۔ اسیریوں کے شاہی کتبوں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ... ے قبل مسیح سے کچھ زمانہ قبل سبا کا ایک بادشاہ نامی تیمرہ گذرا ہے۔ کتبہ کے متن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بادشاہ وسطِ عرب میں رہا کرتا تھا۔

ممکن ہے کہ شاہانِ معین نے اپنے عطر کی تجارت کی حفاظت کے لیے مدین کی سرزمین میں ایک نوآبادی قائم کر دی ہو۔ اس نوآبادی کا نام کتبات میں مُصران لکھا ہے۔ اس واقعہ کی تصدیق اُن معینی کتبات سے ہوتی ہے جنکو یوٹنگ نے (مقام) العُلا میں دریافت کیا ہے۔ معینی حکومت کے خاتمہ کے بعد (تقریباً ۶۵۰ ق م میں) غالباً اہل سبا، معینیوں کی مدین والی اس نوآبادی کے وارث قرار پائے ہونگے۔ ہر بات اس خیال کی تائید کرتی ہے کہ لحیانیوں کا عہد شمال مغربی عرب میں معینی سبائی عہد کے بعد شروع ہوا اور یہ کہ نبطیوں کے عہد حکومت سے قبل شاہان لحیانی برسر حکومت رہے اس لیے اُنکا زمانہ تقریباً ۵۰۰ - ۳۰۰ ق م سمجھنا چاہیے۔ یہ تو ایک تاریخی واقعہ ہے کہ ۳۱۲ ق م میں انٹی گونس نبطیوں سے برسرپیکار ہوتا ہے جو غالباً اسوقت مصری سیادت میں تھے۔ دوسری صدی قبل مسیح کے بعد سے تمام نبطی بادشاہوں کے نام ہمیں معلوم ہیں جو قریب قریب بلا کسی وقفہ کے برسر حکومت رہے یہاں تک کہ آخر کار ۱۰۶ء میں انکی سلطنت کا رومیوں نے خاتمہ کر دیا۔ نبطیوں کا صدر مقام پٹرہ (رقیم) تھا لیکن مدین بھی انکی سلطنت کا ایک جزو تھا۔ اس عہد میں الیوس غالوس نے بحکم اگسطس یمن پر حملہ کیا تھا۔

سب سے قدیم عربی کتبہ جو اتنک مشرقی حوران میں دریافت ہوا ہے، وہ مقام نمارہ کا ہے۔ اس کتبہ میں بصرہ کا سنہ ۲۲۳ مندرج ہے جو ۳۲۸ عیسوی سے مطابقت کرتا ہے اور یہ کتبہ بطور یادگار کے ایک بادشاہ نامی امرء القیس پر نصب کیا گیا تھا۔ جو بادشاہ تھا تمام عربوں کا اور سربند پہنا کرتا تھا او ر کا (یعنی جبل شمر کے قریب وسط عرب میں اسد اور طے کے قبائل کا) او مالی مغربی عرب کا)۔ کتبہ کی عبارت سے آگے ظاہر ہوتا ہے کہ اس بادشاہ نے ر بران تک اپنی فتوحات کو

وسعت دی تھی۔ اس بادشاہ کا نام غالباً حیرہ کے اُس بادشاہ کے نام سے ملتا ہے جسکا زمانۂ حکومت عربی روایتوں میں ۲۵۰ - ۳۳۰ عیسوی بتایا گیا ہے۔

اب ہم بنی لخمیون کے متعلق لکھتے ہیں جن کے بادشاہوں کا ذکر قدیم عربی نظم میں موجود ہے۔ بنی لخمیوں کے بادشاہوں کو مملکتِ ایران نے قدیم بابلی، عربی سرحد پر، بطور سرحدی چوکیوں کے عربوں کے حملوں کی روک تھام کے لیے بالکل اسی طرح تخت نشین کیا تھا جس طرح رومیوں کی مشرقی سلطنت نے وادی جودی کے شمالی علاقہ میں غسانی خاندان کے بادشاہوں کو متعین کیا تھا تاکہ سرحد کی حفاظت ہو اور اُنکی سلطنت، عربوں کے حملوں سے (اور اُنکے پیچھے ایرانیوں کی تاخت سے) محفوظ رہے۔ بنی لخمیوں اور غسانیوں کے متعلق بلکہ خصوصاً بنی لخمیوں کے بارے میں، نیز چھٹی صدی عیسوی اور اُسکے بعد ساسانیوں کی حکومت کے خاتمہ اور فتوحات اسلامی کے زمانہ تک، زیادہ صحیح واقعات ہمیں عربی روایتوں سے معلوم ہوے ہیں۔ ہمارے پاس شاہان حیرہ کے مختلف درباری شعرا کی مسلسل نظمیں اور گیتوں کے ٹکڑے بھی موجود ہیں۔

عہد اسلامی سے قبل کی سیاسی تاریخ کے متعلق ہمیں جو کچھ معلوم تھا، اُسکا ہم نے مختصر سا خاکہ کھینچ دیا ہے۔ لیکن مشرق قدیم میں عربوں کو بہت زیادہ اہمیت اُنکے تمدن اور مذاہب کی وجہ سے نصیب ہوئی۔

عہد اسلام

فتح مکہ کے بعد جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی سیادت کو استوار کر دیا تو اُسوقت قریب قریب تمام سرداران قبائل اور جزیرہ نمائے عرب کے چھوٹے چھوٹے فرمانرواؤں نے اظہار اطاعت کی غرض سے رسول اللہ صلعم کی خدمت میں اپنے وفود بھیجے۔ اس لیے اس سال یعنی نویں ہجری مطابق ۶۳۰ - ۶۳۱ عیسوی کو مورخین "وفود کا سال" کہتے ہیں۔ پھر بھی عربوں کا یہ ارادہ نہ تھا کہ وہ اپنی خود مختاری کو خیرباد کہدیتے چنانچہ ۶۳۲ عیسوی میں رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد ہی اُنھوں نے خیال کیا جاتا تھا کہ ہن ناگوار سیادت کے جوے کو اُتار پھینکنے کا وقت آگیا ہے۔ عہد نبوی صلعم ہی میں بنو حنیفہ کے سردار مسیلمہ نے وسط عرب میں نبوت کا دعوی کر دیا تھا۔ اسی قسم کی کوشش بنو اسد میں طلیحہ نے کی تھی۔ یمن میں قبیلۂ عنس کے ایک شخص نامی اسود عنسی نے بھی نبوت کا دعوی کیا تھا اور اسی قسم کی حرکت قبیلۂ تمیم کی ایک عورت سجاح نے کی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے خالد بن ولیدؓ کو طلیحہ کے مقابلہ میں بھیجا تھا، اُنکے جاتے ہی اس فتنہ کا استیصال

ہو گیا تھا مگر سجاح مسیلمہ سے جا کر مل گئی تھی۔ مسیلمہ ایک خونریز جنگ میں کام آیا اور پھر بنو حنیفہ بھی مطیع و فرمانبردار ہو گئے تھے۔ یمن میں اسود خود اپنی ہی قوم کے افراد کی سازش کا شکار رہوا۔ ۶۳۳ء میں جب اسلامی فوجیں یمن پر حملہ آور ہوئیں تو بغاوت کا بہت جلد خاتمہ ہو گیا تھا۔ غرض اس سال اسلامی ہستی کے متعلق جو خطرہ تھا وہ جاتا رہا تھا۔

حضرت عمرؓ کے عہد میں بہت فتوحات ہوئیں۔ اس زمانہ میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اسلام واقعی عربوں کو متحد کر کے ایک طاقتور قوم بنا دینے کے معاملہ میں کامیاب ہو گیا ہے لیکن حضرت عمرؓ کے جانشیں حضرت عثمانؓ نے اپنے خاندان کی طرفداری میں دلچسپی لی تھی اور اس بناء پر پہلی خانہ جنگی کا آغاز ہوا۔ اب یہ بات صاف ظاہر ہو گئی تھی کہ عرب لوگ، کسی سیاسی نظام جمہوریت کو اختیار کر لینے کے بجائے اپنے جداگانہ مفاد اور فرقہ واری جنگ و جدل کو ترجیح دینے لگے تھے۔ یہ سچ ہے کہ بنی اُمیہ کے پہلے فرمانروا حضرت معاویہ، خانہ جنگی کو ختم کرنے اور تمام عرب پر اپنی سیادت برقرار رکھنے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن اُنھوں نے اپنے صدر مقام کو شام میں منتقل کر دیا تھا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ انکے فرزند اور جانشیں یزید اول کے عہد میں مدینہ اور مکہ کے مقدس شہر کے باشندوں نے حکومت کے خلاف علانیہ بغاوت شروع کر دی تھی اور اس بناء پر دوسری خانہ جنگی کا آغاز ہوا تھا۔ اب یہ بات بہت زیادہ واضح ہو گئی تھی کہ اسلام فرقہ واری اختلاف سے نجات نہیں پا سکتا۔ اس بات نے شیعہ اور خارجیوں میں مذہبی مخالفت پیدا کر کے، اُنکے فرقہ واری اختلاف کو اور بھی شدید کر دیا تھا۔ خصوصاً خارجیوں کے اصول، عربوں کے مذاق کے تھے۔ اور یہی اصول بعد کے اموی خلفا کے عہد میں مسلسل فتنہ و فساد کا باعث رہے یہاں تک کہ عبدالملک نے ۷۳ھ (۶۹۲ عیسوی) میں مخالفوں کو شکست دیکر عرب میں امن و امان قائم کیا تھا۔ بالآخر خارجیوں کے اصول نے عرب کے بعض حصوں خصوصاً عمان میں قیام کی صورت اختیار کر لی تھی اور اب تک وہاں اُن کا وہی اثر باقی ہے۔

ملک عرب بنی اُمیہ اور اسکے بعد عباسیوں کے عہد مـ [illegible] ـد کے ایک صوبہ کے
برابر رہ گیا تھا۔ اور نظم و نسق کے اعتبار سے بھی اس [illegible] ـا لیے کہ کوئی
مرکزی حکومت نہ تھی اور نہ کوئی صدر مقام کا شہر تھا۔ [illegible] ـیں مختلف شہروں
اور اضلاع کے نائب حکومت خود جدا جدا تھے جنکا تقرر خود خلیفہ کیا کرتا تھا۔ المتوکل کی وفات

(۱۲۶۱ء) کے بعد جب خلافت کا اثر جاتا رہا تو پھر ہر صوبہ دار کے لیے یہ بات ناگزیر ہوگئی کہ وہ خود مختارانہ حکومت کرے۔ مثلاً یمن میں، جو صدر حکومت سے بہت دُور تھا، اس قسم کا میلان پہلے ہی سے پیدا ہوگیا تھا۔ اس قسم کی تحریکوں کے ساتھ ساتھ مذہبی حیثیت سے اکثر فرقے بھی آپس میں متحد ہونے لگے۔ مثلاً فرقۂ زیدی کے افراد سعدا اور صنعا میں متحد ہو گئے اور قرمطی لوگ بحرین میں۔ القصہ، عرب کی تاریخ کا بحیثیتِ مجموعی کوئی سوال نہیں ہو سکتا وہاں تو صرف خاندانوں، قبائل اور سرداران قبائل کی تاریخ ہے جو عرب کے مختلف حصوں میں نام پیدا کر کے پھر غائب ہو جاتے ہیں۔ بغداد کی مرکزی حکومت کا اثر انتہا سے انتہا طور پر مکہ اور سرحدی علاقوں میں کبھی کبھی خود محسوس کرایا جاتا رہا لیکن جب ۶۵۶ھ (۱۲۵۸ء) میں خلافت کو زوال ہوا تو پھر اُسوقت سے مصری سلاطین، مکہ (پر اُسوقت جب کوئی حادثہ پیش آجاتا تھا) اور بحر احمر کے ساحلی مقامات پر اپنی تھوڑی بہت حکومت جتاتے رہے۔

سلطان سلیم اول کے عہد (۹۱۸-۹۲۶ ہجری = ۱۵۱۲-۱۵۲۰ عیسوی) میں عثمانی تُرک نمودار ہوئے اور اُنھوں نے مقامات مقدسہ اور یمن پر اپنی سیادت کو قائم کر دیا۔ لیکن یہاں ترکوں کو زیدیوں کے مقابلہ میں قدم جمانا مشکل ہوگیا۔ اُنھوں نے اپنے اماموں کی قیادت میں بالآخر (۱۰۴۳ھ = ۱۶۳۳ء میں) ترکوں کو اپنے ملک سے نکال باہر کیا تھا۔

عرب کے باقی حصوں میں ترکی سیادت حسب سابق بحال رہی یہاں تک کہ وہابی لوگ اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں، وسط عرب میں اُٹھے اور اس قدر جلد قوت پکڑ گئے تھے کہ باب عالی کو مجبوراً محمد علی سے امداد طلب کرنی پڑی تھی۔ اس امداد کے باوجود بھی وہابیوں کی قوت کو بڑی کوششوں کے بعد توڑ سکے مگر ترکوں کی سیادت عرب میں حسب سابق محض برائے نام ہی تھی۔ ترکوں نے اُنیسویں صدی کے آخر میں اپنی سیادت کو حقیقی سیادت بنانے کے لیے سخت جدوجہد کی اور عسیر اور یمن کی تسخیر کے لیے ۱۸۷۰-۷۱ء میں مہمیں روانہ کی گئیں۔ مدحت پاشا نے تو ۱۸۷۱ء میں یورش کی تھی اور ردیف پاشا نے ۱۸۷۶ء میں مشرق کی طرف سے بڑھ کر یہاں کے باشندوں کو مطیع و منقاد کر لیا تھا۔ اس حملہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ یمن کا زلی ولایت میں شریک کر کے صنعا کو اُس کا صدر مقام قرار دیا تھا۔ اور مشرقی عرب کے اُس علاقہ کو جتنا کہ اُسوقت تک فتح کیا جا چکا تھا بصرہ کی ولایت میں نجد کے نام سے شریک کر دیا گیا تھا۔ لیکن یمن کی نئی ولایت صرف تحریر میں آئی تھی اس لیے کہ وہاں کے عرب علانیہ طور سے باغی ہوگئے

تھے اور ترک مسلسل کوششوں کے باوجود بھی اُنکو مطیع نہ کر سکے تھے - برخلاف اسکے انگریز تمام جنوبی ساحل پر عدن سے لیکر مسقط تک اور اس سے بھی آگے بڑھ کر خلیج فارس میں اپنی سیادت کو قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں - اور اُنکی سیادت کو تاہم حقیقی سمجھنا چاہیے اس لیے کہ انگریزوں کی مخالفت علانیہ نہیں کی جاتی ہے -

بحالت موجودہ جزیرہ نمائے عرب کی مردم شماری نہیں مل سکتی - رشید بے نے اپنی کتاب "تاریخ یمن وصنعا" جلد ۲ ص ۳۵۵ میں ۱۸۷۵ء کی مردم شماری (۱۰۷۵۲۱۵۰) نفوس بتاتی ہے لیکن یہ تعداد قطعی قیاس پر مبنی معلوم ہوتی ہے

(ترجمہ) محمد نجم الغنی قریشی

دارالترجمہ حیدرآباد - دکن

تاریخ عرب

یہ لاجواب کتاب لاکھوں مطبوعہ اوراق اور سیکڑوں قلمی نسخوں کی مدد سے فرانس کے مشہور عالم و مورخ موسیو سدیو نے ۱۸۷۷ء میں شایع کی تھی اور اب اُسکا ترجمہ ہندوستان میں پہلی بار شایع کیا جا رہا ہے - یہ صرف ملک عرب کی تاریخ نہیں ہے بلکہ دراصل عرب قوم کی تاریخ ہے جسمیں اُنکا ملکی جغرافیہ، نسلی خصائص، قومی شعائر، معاشرتی آئین، اخلاقی نظام، عادات و اطوار، جنگی کارنامے، فتوحات ممالک، طریق حکمرانی، کمالات ذہنی، علوم و فنون صنعت و حرفت اور تجارت، ایجادات و اختراعات اور ہر قسم کی تمدنی ترقیات کا ذکر ہے - اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ عرب کے خشک ریگستانوں اور بے آب و گیاہ پہاڑوں میں بسنے والوں نے جو وحشت و بربریت کا مجسمہ تھے، حضرت خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں اسلامی تعلیم قبول کر کے چند صدیوں کے اندر دنیا میں تہذیب و شائستگی کے کیسے کیسے قصر رفیع بنا کر کھڑے کر دیے - یہ مشہور کتاب تمدن عرب سے بھی پہلے کی تصنیف ہے اور عرب قوم کے عروج و زوال کی مکمل تاریخ کو ایک مرقع میں پیش کرتی ہے اور اس قابل ہے کہ تمام دردمند مسلمانوں کے مطالعہ سے گذرے کہ آ ... خصوصاً عربوں کی جو حالت ہے اُسکو سمجھنے نیز اُسکو بدلنے کے لیے جتنی کوششیں کیجائیں گ ... کے کامیابی محال ہے

حجم ۵۷۲ صفحے تقطیع کلاں طباعت و کتابت دیدہ زیب جلد خوشنما ... عہ قسم عام عہ

ملنے کا پتہ :- الناظر بک ایجنسی - لکھنو